دہلی سمپوزیم کی جھلکیاں

سردار جعفری — حیات اللہ انصاری — خواجہ احمد فاروقی

خواجہ احمد فاروقی — ڈاکٹر شارب ردولوی — سردار جعفری — قیصر زیدی

خواجہ احمد فاروقی — مسز کلیم — ڈاکٹر شمیم نکہت — سردار جعفری — قیصر زیدی

آل احمد سرور

ظ انصاری تاشقند میں تقریر کرتے ہوئے

ماموهن تلخ
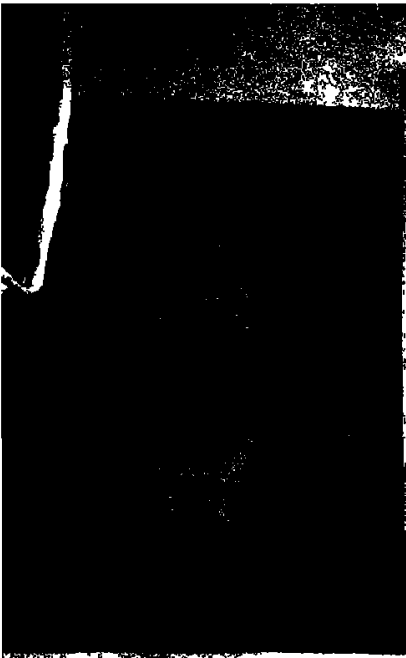
خاص نمبر

لکھنؤ

کتاب

غالب
تین فکر انگیز مضامین

اردو رسم الخط سمپوزیم
——— ایک رپورتاژ

آل احمد سرور
کا
خطبۂ صدارت

جواں مرگ شاعر
وکیل اختر کی
چند تخلیقات

صحت یابی کے بعد
سردار جعفری کی
پہلی غزل

مجلس مشاورت

سید احتشام حسین
حیات اللہ انصاری
عابد سہیل

★

سرپرست

قیصر سرمست

★

شمارہ
۹۲

★

مئی، اپریل سنہ ۱۹۷۱ء

چند لکھنے والے

کرشن چندر
سردار جعفری
سلام مچھلی شہری
ظ۔ انصاری
بلراج کومل
محمود ایاز
ڈاکٹر گیان چند
ڈاکٹر شارب ردولوی
شکیلہ اختر
کملیشور
عمیق حنفی
ذکا صدیقی
ڈاکٹر سید محمد عقیل
متین سرکش
منموہن تلخ
علیقہ شبلی
ڈاکٹر اعجاز عسکری

مفتوماہنامہ کتاب • حیاتی خریداری • قیمت موجودہ شمارہ • طباعت • کتابت • ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر
کیور مارکیٹ لکھنؤ • ۱۰۱ روپے • ایک روپیہ پچاس پیسے • نامی پریس • وقار رضوی • شمیم الدین

فہرست

گوشۂ غالب

اردو رسم الخط

وکیل اختر کی تخلیقات

ناول، افسانے، ڈرامہ

نظمیں

غزلیں

تبصرے

تلخ، تند، شیریں

ایم اے افسر۔ ڈاکٹر اعجاز انصاری۔ معصوم شرقی
ظفر غوری۔ علقمہ شبلی۔ رضوان احمد۔ ڈاکٹر صغیر آفراہیم
مناظر عاشق ہرگانوی۔ اسلم عمادی

سردار جعفری

غزل

شمع کا، مے کا، شفق زار کا، گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ

تہِ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں
لطفِ اقرار ہے یا شوخیِ انکار کا رنگ

آئی جھکی ہوئی پھر حسرتِ ملاقات کی رات
جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ

عکسِ ساقی سے چمک اٹھی ہے ساغر کی جبیں
اور کچھ تیز ہوا بادۂ گلنار کا رنگ

سبحہ میں ہمتِ رندانِ قدح خوار کہاں
ایک ہی جام میں آشفتہ ہے دستار کا رنگ

ان کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیوں کر
بدلا بدلا سا ہے سب کے در و دیوار کا رنگ

اور ہے عشق کی نظروں کا سنوارا ہوا روپ
یوں تو شائستہ تھا پہلے بھی رخِ یار کا رنگ

موجِ طوفاں بھی ہے اور جوشِ بہاراں بھی ہے
کون سا دیکھو گے تم دیدۂ خونبار کا رنگ

شفقِ صبحِ شہادت سے ہے تابندہ جبیں
ورنہ آلودۂ خوں تھا افقِ دار کا رنگ

آفتابوں کی طرح جاگی ہے انساں کی جوت
جگمگاتا ہے سراپردۂ اسرار کا رنگ

وقت کی روح منور ہے نوا سے میری
عصرِ نو میں ہے مری شوخیِ افکار کا رنگ

سلام مچھلی شہری

جون آف آرک

"جون آف آرک" ابھی زندہ ہے
وہ نئے رنگ،
نئے روپ کے ساتھ،
اِسی دھرتی کے گلستانوں میں،
شعلۂ گل کی طرح
ابھی کچھ پہلے بھی تابندہ تھی،
تابندہ ہے !
"جون آف آرک" ابھی زندہ ہے !

"جون آف آرک" ابھی زندہ ہے
وہ کسانوں کے کسی گھر کی نہیں
بلکہ اک قصر کی پروردہ ہے
پھر بھی نادار کسانوں کے لیے
کامگاروں کے لیے
پہلے بھی آزردہ تھی
آج بھی آزردہ ہے

—— جانے کیا چاہتا ہوں
لب پہ تحریکات ہے یہ :
"ہولی" کی دوسری اور رنگ بھری رات ہے یہ۔
ہولی ؟
اک ساعتِ رنگیں جس دم
"جھوٹ کا دیپ" جلایا جائے۔

ہولی ؟
جب "سچ" کا مبارک نغمہ

سازِ جمہور پہ گایا جائے !!

سازِ جمہور کے تاروں پہ یہی نغمہ ہے
مرحبا، جنتِ امروز کی اک دیوی نے
چاند کا حُسن تو خورشید سحر جیت لیا
گل کی پالی تھی
جمالِ گل تر جیت لیا
دل کی شہزادی تھی
خود اہلِ نظر تھی ـــــ آخر
اس نے ہر نغمۂ دل، سازِ نظر جیت لیا ۔ !!

نئی دنیا کو مبارک کہ مری دھرتی پر
فصلِ گل، موسمِ پُرنور کا دور آیا ہے
اور یہ دورِ امر ہے کہ مری دیوی پر
جون آف آرک جسے کہتا ہوں
جس کے لیے پہلے سے
دیوتاؤں کی دعاؤں کی تڑپ
دیویوں کی حیات افروز تمناؤں کی موج
"اندر" کے دستِ حسن پوش کے ساتھ
"شیو شنکر" کے گلے کا امرت
اور زلفوں کا حسیں سایہ ہے" !
فصلِ گل، موسمِ پُرنور کا دور آیا ہے !!

× × × × جون آف آرک :
اجازت ہو تو اب تم سے کہوں
"وہی راہی ہے جو پُرنور و حسیں منزل میں
فتح کی بات نہیں
بلکہ ذرا یہ سوچے .
اس سے پہلے کہ سفر میں شاید
بھول بھی مجھ سے ہوئی ہے شاید"
جائزہ پہلے سفر کا لے کر
آج کی طرح، سدا بڑھتی رہو !

ایک چلتے ہوئے سورج کی طرح
بام افلاک پہ تم چڑھتی ہو ۔ !
—— میں تو شاعر ہوں
سیاست مرا موضوع نہیں (پھر بھی کون اس سے الگ رہتا ہے)
بڑا مسرور ہوں،
اس واسطے یہ کہتا ہوں
اب تمھیں اور بھی گہرائی سے یہ سوچنا ہے :
کسی مفلس کے فسردہ گھر میں
شمع کس طرح بجھا کرتی ہے ؟
تم کو اس بات پہ
اس مسئلے پر
غور کرنا ہے کہ جب
ہم نوا ساز بھی ہو، ساز کے سب تار بھی ہوں
گیت کے بول بھی دلکش ہوں تو کیوں
مطرب بزم کی آواز رکا کرتی ہے ؟

اپنے بچے کے لیے
کوئی ماں کیسے دعا کرتی ہے ؟
—— تازہ تر دور میں
اس مسئلے کو
اور کئی مسئلوں کو
تم کو کچھ اور بھی شدت سے ذرا سوچنا ہے
جون آف آرک !
سدا زندہ رہو
یونہی تابندہ رہو —— !! ؟

بلراج کومل

جواب

تم ہوا سے پوچھتے ہو : کون سی گلیوں سے ہو کر آئی ہے ؟
کون سے آنگن میں روشن تھے گلاب ؟
کون سی کھڑکی میں آویزاں تھی چشم آفتاب ؟
کون سی آواز میں خاموشی اسرار تھی ؟
کون سا آنچل چمکتے نیلگوں آکاش کا ہم راز تھا ؟

ان سوالوں کا کوئی تازہ جواب
اب ہوا دیتی نہیں

لفظ دیواریں ہیں زخموں کی طرح روزن ہیں
ان کی تیرگی کے درمیان
زہر آلودہ سزاؤں کے ہجوم
کون سا در بند تھا ؟
کون سا آنسو کھنڈر میں ڈھلا ؟
جب وہ قصبوں، بستیوں، اجڑے ہوئے شہروں کے سناٹوں سے ہو کر آئے گی
کل ہوا کو روکنا
سب سوالوں کا کوئی تازہ جواب
کل ہوا سے پوچھنا

محمود ایاز

"..... اندیشہ گماں ہا داشت"

آنکھ اس درجہ تہی ہے کہ کوئی اشکِ گہر قلب نہیں

دل وہ صحرا ہے جہاں بادِ بہار آتی نہیں

چار سو بادِ خزاں چلتی ہے خاموشی ہے ویرانی ہے

دن گزرتے ہیں مہ و سال میں ڈھل جاتے ہیں

کوئی احساس نہیں ہوتا کہ ہم زندہ ہیں

کوئی جینے کی لگن ہے

نہ یہ حسرت کہ کسی خواب کو سینے سے لگائے

مر جائیں

اس سے پہلے بھی کئی بار

یہ بے کیفیٔ ایام کی رو دیکھی ہے

مگر اب کے نہ بچیں گے

یہ گماں ہے دل کو

— —

من موہن تلخ

غزل

ان گنت گم شدہ موسموں کی کسک ہے مجھ میں
مت صدا دو کہ قیامت کی لپک ہے مجھ میں

روٹھے گھٹ گھٹ کے کوئی ایسی سسک ہے مجھ میں
شب کو روتی ہوئی آنکھوں کی چمک ہے مجھ میں

جان پڑتا ہے کہ ہر شخص مجھے جانتا ہے
کیا کہوں خود کہ یہی ایک جھجک ہے مجھ میں

بولتا رہتا ہے مجھ سے یہ تعلق تیرا
ان کہی سی تری باتوں کی کسک ہے مجھ میں

مل رہا تھا مجھے آواز کی سرحد کا سراغ
کس نئی دھول کی اب پھر یہ مہک ہے مجھ میں

حرف سے کٹ کے میں تکمیل صدا چاہتا ہوں
جانے کس جنم کے جوگی کی لٹک ہے مجھ میں

میں جہاں ہوں، مجھے رہنے دو خبر لو اپنی
وسعتیں جانتی ہیں کتنی لپک ہے مجھ میں

چھو کے دیکھو مجھے کس شخص پہ کیا بیت گئی
سینکڑوں بھاگتے لمحوں کی دھمک ہے مجھ میں

جل نہ سکنے کی کسک ہے کہ ہوں اندھا پاتی
قرنہا قرن سے سورج کی چمک ہے مجھ میں

کوئی دو دوں کا عجب درد سے جاتا ہے
کچھ عجب سی ترے اندر کی جھلک ہے مجھ میں

وہ نظر ہوں نہ صدا، جو مری پہچان بنی
کچھ الگ دیکھنے سے بولنے تک ہے مجھ میں

کیا دکھاتے ہو مجھے روشنی اپنی اپنی
منہ اگر کھول دوں تو پورا فلک ہے مجھ میں

تیری آواز سے ہوں سوچتی چپ کا عدم
ورنہ پاگل کی صدا کی سی ہمک ہے مجھ میں

کب کا میں ڈوب چکا اپنا ہی سورج بن کر
کیوں اندھیروں کی یہ مدھم سی چمک ہے مجھ میں

آؤ کندھوں پہ اٹھا کر تمہیں اونچا کر دوں
جاننا چاہتے ہو کتنی لچک ہے مجھ میں؟

دیکھئے کتنے قدم اور سنوں میں سب کی
قہقہہ جیسے ہو کوئی، وہ کھنک ہے مجھ میں

پڑ گئے پاؤں سماعت کی زمیں پر شاید
ایک اک لفظ کے معنی کی بھنک ہے مجھ میں

میری چپ سے بھی صداؤں کی شعاعیں نکلیں
ایسے لہجے کی تپسیا کی دمک ہے مجھ میں

تلخ مت دے کسی آواز کا اس کو جواب
اک عجب ٹوٹتا بنتا ہوا شک ہے مجھ میں

متین سروش

غزلیں

آوارگانِ صحرا، کوئے صنم نہ ڈھونڈیں
جلوؤں کی وہ بہاریں زلفوں کے خم نہ ڈھونڈیں

اے شہرِ سنگ تجھ میں زخموں کی کیا کمی ہے
تیغ ادائے جلوہ بہتر ہے ہم نہ ڈھونڈیں

وہ آبروئے وحشت لائیں تو اب کہاں سے
وہ جنتِ تمنّا، وہ دشتِ غم نہ ڈھونڈیں

حاصل نہ ہوگا کچھ بھی جز داغ و دردِ عبرت
اہلِ وفا ہمارا نقشِ قدم نہ ڈھونڈیں

آواز دے رہی ہیں خودداریاں یہ دل کی
اب تیرا آستاں بھی تیری قسم نہ ڈھونڈیں

شعلے کہیں بجھے ہیں شبنم کے آنسوؤں سے
الفاظِ خوش نما میں تسکینِ غم نہ ڈھونڈیں

مقصد ہے صرف اتنا وعدوں کی چاندنی کا
خوابِ سحر تو دیکھیں، تعبیر ہم نہ ڈھونڈیں

اک رقصِ جاں فروشی، عنوان زندگی کا
یارانِ بادپیما، بختِ اُمم نہ ڈھونڈیں

ہم بے نیاز گزرے شہرت کی سازشوں سے
نام و نشاں ہمارا، اہلِ قلم نہ ڈھونڈیں

جاں دی سروش ہم نے راہِ خلوصِ غم میں
فردِ عمل ہماری، دیر و حرم نہ ڈھونڈیں

حُسنِ فروغِ شب ہے زخمِ جگر ہمارا
ہر چند منتظر ہے بامِ سحر ہمارا

احباب کو مبارک یہ شوق تیرگی کا
ہے ذوق روشنی کا، زادِ سفر ہمارا

کیوں باعثِ الم ہوں یہ خونچکاں جبینیں
تھا ابتدا سے دشمن وہ سنگِ در ہمارا

کرتے جو ہم کنارا، اس دانش و ہنر سے
عشرت کدوں میں ہوتا شاید گزر ہمارا

پروردۂ ہوس جو حُسنِ یقیں بھی ہوتا
یہ کربلائے دوراں ہوتا نہ گھر ہمارا

کیا کیا ہے ناز ہم کو اس بختِ نارسا پر
صدق و صفا سے رشتہ ہے معتبر ہمارا

دیکھیں سروش وہ بھی اس منظرِ حسیں کو
جلوؤں کی آبرو ہے زخمِ جگر ہمارا

ڈاکٹر سید محمد عقیل

پس منظر

آج تو
پھر کسی طوفان کے آثار نظر آتے ہیں
گرد اڑتی ہے تو
ہر چہرہ مانوس بگڑ جاتا ہے
رات کیوں آئے
درخشائی فردا لے کر
کیوں کسی دن کو
ہنستے ہوئے سورج کی
راستے بند ہیں سب
گھوم رہے ہیں قاتل
کس کو یارا ہے
کہ نکلے باہر
اجنبی شہروں کے دروازوں پہ
دستک دے کر
قاتل و ظالم دستاؤں سے
انسانوں کو آگاہ کرے
آگ روشن ہے
خیالات کے صحراؤں میں
درد کی ریت نے
احساس کا منہ ڈھانپ لیا
مصلحت
وقت کا عنوان بنی جاتی ہے
زندگی
پیکرِ بے جاں میں ڈھلی جاتی ہے

جاوید وشسٹ

غزل

اس غزل کی بحر کے ارکان میں ترمیم کی گئی ہے۔

بارگاہِ ساقی میں تشنہ لب ہیں باریاب
میکدے میں گونجی ہے پھر صدائے انقلاب
آرزو کے صحرا میں کون خاک ہو گیا
اٹھ کے اک بگولا سا کھا رہا ہے پیچ و تاب
خاک کا وہ ذرہ ہے، پھر بھی اس کا احترام
اس کے گرد پھرتے ہیں صد ہزار آفتاب
آرزو کی خود کامی، ایک پھول، ایک رات
آرزو کی ناکامی، اک خیال، ایک خواب
تم پیو تو امرت ہے، میں پیوں تو بس کا گھونٹ
دیکھتے ہو شیشے میں میرے دل کا خونِ ناب
آج تو اندھیروں کا روپ جیسے روشنی
آہٹیں ہیں قدموں کی، آ رہا ہے انقلاب
یاد گنگناتی ہے ان کی آ کے بار بار
دل کے شبستاں میں چھیڑ درد کا رباب
لمحہ لمحہ سلگے ہے زیست کی بہار کا
کب ملے گا پردیسی؟ دیکھ برہمن کتاب
شاخِ گل کے سائے نے ڈس لیا بہار کو
آگ ہی پلا ساقی! آج ہم کو بے حساب
ہم گئے کہ وہ آ گئے، کچھ ہمیں نہیں خبر
روبرو ہیں وہ دیکھو! جذبِ دل ہے کامیاب
چاندنی میں یادوں کی جام جگمگا اٹھا
غم کو مسکرانے دو! سامنے ہے ماہتاب

ظ۔ انصاری

غالب شناسی کے زینے

مرزا غالب نے سوچا فارسی میں، لکھا بھی زیادہ تر فارسی میں (اشعار کی تعداد گیارہ ہزار تین سو کچھ) زبانوں پر چڑھے اردو میں ــــ ان کے تقریباً دو سو اشعار خاص و عام کی روزمرہ گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔ لیکن ان کی قدر ہوئی انگریزی پڑھے لکھوں کی بدولت یا مغربی ادبیات کا ذوق رکھنے والوں کے دم سے۔ غالب اپنی زندگی میں بھی مقبول تھے، تاہم یہ مقبولیت ایک محدود حلقے تک رہی، خاص طور سے ان تعلیم یافتہ لوگوں تک جو فارسی ادبیات پر نظر رکھتے تھے۔ ان کا اردو دیوان بائیس برس میں پانچ بار چھپ چکا تھا۔ یہ حیثیت غالب کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ فارسی دیوان جو اردو سے تقریباً پانچ گنا ہے، زندگی میں دو بار شائع ہوا اور پچھلے سو سال میں صرف پانچ اشاعتوں تک پہنچا ہے جن میں تین اڈیشن صرف پچھلے سال مختلف مقامات سے نکلے ہیں۔ اردو دیوان اور انتخابات کی سو سے زیادہ اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ کیا راز ہے کہ غالب کی قدر ان کے مرنے کے بعد زیادہ ہوئی؟

اسی سوال کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ غالب کی شاعری اور شخصیت کا وہ کون سا پہلو ہے جو عہدِ حاضر کے ذہن کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟

غالب پر قلم اٹھانے والے قابلِ ذکر اہلِ نظر نے اپنے اپنے طور پر اس سوال کے جواب دیے اور وہ جواب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، غالب کی تلاش میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

غالب کی ان دریافت شدہ خصوصیات کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نظر میں رکھنا چاہیئے کہ کوئی فنکار جو اپنی زندگی کے بعد بھی جیتا ہے، محض ایک رُخی (one-sided) صفات سے نہیں جیتا۔ گہرائی کے سوا حسن، اور حسن کے سوا کوئی نہ کوئی نیا پن بھی ضرور ہوتا ہے اس کے پاس۔ یہ نیا پن ممکن ہے فنکار کے اپنے زمانے میں نمایاں رہا ہو لیکن وہ زمانہ، ایک خاص تاریخی یا سماجی دور گزر جانے کے ساتھ بے حیثیت ہو جائے، پرانے پن میں شمار ہونے لگے۔ اور ممکن ہے ایک خاص دور کے اندر کچھ اہم نہ ہو، وہ دور گزر جانے کے بعد اہم ہو جائے۔

غالب کے ہاں جن خصوصیات کی قدر بعد میں ہوئی اور جنھیں ہم اس کے پورے شاعرانہ وجود میں ابھرا ہوا دیکھتے ہیں وہ پرانے اور نئے پن کا امتزاج ہیں۔ پرانے ذخیرے کی بہترین روایات سے غالب نے قطعی طور پر رشتہ نہیں توڑا بلکہ ان کا رس اپنے ہاں جذب کر کے، ان پر نئے ذہن، فکر اور فن کے لب و لہجہ کا اضافہ کیا۔ وہ دونوں لحاظ سے اہم ہیں: ان کی فکر میں فارسی اور اردو، ادبیات کی بہترین لفظی اور معنوی روایات کے عناصر چھن کر، صاف ہو کر اس طرح آئے ہیں کہ ان میں سوچ کا سامان بھی اتنا ہی ہے جتنا لفظوں اور آوازوں سے لطف اندوز ہونے کا امکان۔ یہ صفات الگ الگ شخصیتوں میں بکھری یا پھیلی ہوئی تھیں۔ غالب کے ہاں وہ

یکجا ہوگئیں اور اس طرح وہ قدیم و جدید کا سنگم
بن گئے، اسی میں ان کا کمال پوشیدہ ہے۔

غالب کے معاصرین میں، جو ان سے قریب رہے اور جن کی
رائے کو ہم عصر تنقید میں جگہ دی جا سکتی ہے، تین نام اہم ہیں:
حالی، شیفتہ، اور میر مہدی مجروح۔

حالی نے غالب کے کمال کا راز ان صفات میں پایا ہے:
سادگی بیان، جدت ادا، شگفتگی اور معنوی تہہ داری یہ بات
کہ مرزا نے اپنے بیان کو دوسروں سے الگ کیا، معمولی سے خیال کو
اچھوتے انداز سے [illegible] طنزیہ مسکراہٹ اور
ظرافت پائی جاتی [illegible] شعر پہلو بدل بدل کر مختلف معانی
دکھاتا ہے، حالی نے [illegible] (یادگار غالب صفحہ ۱۴۰-۱۰۵)

شیفتہ کی دانست میں غالب کا رنگ بہت گہرا ہے،
وہ معانی کی نزاکت اور سلاست کی متانت کو میزان بناتے ہیں اور میر
کے بعد مومن اور غالب کو سب سے زیادہ وزنی قرار دیتے ہیں۔

مجروح نے نیاز مندانہ تقریظ میں (جو فارسی دیوان اشاعت
اول کے آخر میں شائع ہوئی) غالب کی اس خصوصیت کو ابھارا
ہے کہ ؎

براوج چرخ ماہ نو تابندہ | ریاض سخن سرو نو یافتہ

(غزل کی بلندی پر نیا چاند چمکا ہے اور شاعری کے
باغ میں نیا سرو اگ آیا ہے)

سر سید احمد نے بھی غالب کے کلام کی خوب تعریف کی ہے (آثار
الصنادید، باب چہارم) لیکن اس بیان سے کسی خصوصیت کا اندازہ
نہیں ہوتا، اس لیے ہم اس کی رائے کو ادبی تنقید میں شمار نہیں
کریں گے۔

غالب کو عظیم شاعر کی حیثیت سے حالی نے روشناس کیا،
لیکن اس کے کمال کی ستائش ہی اقبال نے کی تھی، جو خود کئی وجہوں
سے غالب کے وارث سمجھے جاتے ہیں۔ اقبال نے غالب کے

"لطف گویائی" میں تخیل رسا اور "فکر کامل" کی ہم نشینی دریافت کی
ہے اور یقیناً غالب شناسی میں یہ ایک اہم نکتہ بلکہ اضافہ ہے:

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی زمانے میں غالب
کو اپنے بہترین نقیب میسر آئے۔ یہی زمانہ متحدہ ہندوستان میں قومی
آزادی کی تحریک کا عنفوان شباب سمجھنا چاہیے۔ عبدالرحمان بجنوری
نے غالب کو فکر و فن کا ایسا بے مثل ہیرو بنا کر پیش کیا جیسے ہیرے ۱۵ کو مختلف
زاویوں سے دیکھنے کے بعد اس کی "تشکیک کامل" پر تان
توڑی اور بتایا کہ غالب کی شاعری میں خود فلسفیانہ دریافت اور
تلاش کے علاوہ مصوری اور موسیقی کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔
(محاسن کلام غالب)

ڈاکٹر عبداللطیف نے جہاں غالب کے ذاتی کردار کے جھول
نمایاں کیے اور اسے زر پرستی کا شکار بتایا، وہیں دیوان غالب
کی تاریخی ترتیب کا آغاز کر کے یہ خصوصیت بھی ظاہر کی کہ لفظی صنعت
گری میں غالب کا مقام دوسرے اردو شعرا سے بلند ہے اور اس کے
تمام کلام میں گہری فکر کے عناصر بکھرے ہوئے ہیں۔ (Ghalib
Hyderabad 1924)

اس زمانے میں غالب کے نظامی اڈیشن پر ڈاکٹر سید محمود
کے دیباچے نے غالب کو ہندوستان کی قومی آزادی کا فکری نقیب
قرار دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بعض اطلاعات بڑھا کر اور ان
پر تبصرہ کر کے، غالب کے اشعار سے جابجا حوالے دے کر عملی طور
سے یہ ثابت کیا کہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں میں بھی غالب کی شاعری
کار آمد نکلتی ہے۔ غالب کو انھوں نے مزاج شاعری کے اعتبار سے
عہد جدید (بیسویں صدی) کا شاعر ٹھہرایا۔ (صفحہ ۲۲۔ غالب اور
ابوالکلام، غالب اکاڈمی، دہلی)

حسرت موہانی اور نیاز فتح پوری بھی مولانا آزاد کی سی مجاہدانہ آزادانہ فکری رجحان کے بزرگ تھے۔ غالب کو نئی نسل کی نظروں میں پسندیدہ کرنے اور جدید تعلیم یافتہ حلقے میں پھیلانے کا ادبی فرض انجام دیتے وقت ان دونوں اہل قلم نے اسے جدت، اختراع، آزادانہ فکر اور زندہ دلی کا شاعر قرار دیا۔ نیاز نے اسکے ہاں "تغافل و حسرت" کا فلسفہ دریافت کیا اور اسی ضمن میں یہ بھی بتایا:

"... غالب کی شاعری دراصل معنی آفرینی اور ندرتِ تعبیر و خیال کی شاعری تھی، لیکن وہ زندہ ہے دراصل اپنی زبان کی شاعری سے ــــ جس کی مثالیں اس کے اردو کلام سے بھی کافی مل سکتی ہیں۔" ("غالب کا آہنگ" نیاز۔ لکھنؤ) اگر ڈاکٹر لطیف نے غالب کے خطوط اور اشعار سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس کے ہاں دنیاوی آسائش، مرتبے اور عزت کی کمی کا رونا بہت ہے جس سے کردار کی کمزوری ٹپکتی ہے اور بڑی شاعری کی صلاحیت برباد ہوتی ہے۔ تو غلام رسول مہر نے غالب کو ہر ایک عیب سے پاک کر کے ولی اللہ ثابت کر دیا۔ مہر نے زیادہ تر اسلامی مجاہدوں کے تذکرے لکھے ہیں۔ غالب کو بھی وہ خدا رسیدہ بزرگ بنا کر پیش کرتے ہیں، تاہم شاعری سے قطع نظر غالب کی نثر، خاص کر خطوط کو وہ اہمیت دی جس کے بغیر شاعر کی عظمت ظاہر نہ ہوتی۔

غالب کی حیات کے علاوہ ان کے فکری رجحانات اور فنکارانہ نظریات کو سمجھنے میں مولوی مہیش پرشاد نے "خطوط" کی اہمیت دریافت کی اور برسوں اس پر کام بھی کیا، لیکن نواب امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" نے فن کار کے ذہن کا سراغ لگانے میں خطوط اور شاعری دونوں سے یکساں کام لیا، دوسروں پر راہ کھولی۔

افراط و تفریط سے ہٹ کر شخصیت کی دریافت کے جدید نظریوں کو سامنے رکھ کر جس شخص نے غالب کی حیات اور شاعری کے رموز تلاش کیے وہ شیخ محمد اکرام ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے اور قیام کے بعد اس علاقے میں غالب پر مہر اور اکرام سے زیادہ کسی نے کام نہیں کیا۔ دونوں کا انداز نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اکرام نے غالب کی خصوصیات کا سراغ لگانے میں یہ واضح کیا کہ شاعر نے کتاب فطرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ ذہن کو قدیم کی تقلید سے آزاد کرانے میں عقلیت پر زور دیتا ہے اور "غالب کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت کے باعث نہیں بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے .... یہ حزن و افسردگی اس آدمی کی ہے جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور جسے اس سے محروم رہنا ناگوار ہے" (غالب نامہ ص ۱۳۷)، غالب کی عقلیت کو Rationalism سے تعبیر کرنے اور اس کی صحت اور برتری دکھانے میں اکرام نے صوفی شعراء خاص کر اقبال سے اختلاف کیا ہے اور غالب کی تائید کی ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام اور قاضی عبدالودود غالبیات کے سلسلے میں ہندوستان کے سب سے اہم نام ہیں، لیکن انھوں نے غالب سے متعلق واقعات کی تصدیق اور تفصیل پر کام کیا ہے، غالب کے فن و فکر کی تلاش پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ مولانا عرشی اور مالک رام، دونوں کے نزدیک غالب کی دین اس کی نظم و نثر میں یکساں ہے اور دونوں میں ندرتِ خیال، معنی آفرینی اور جدت ادا سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ قاضی ودود اسے اردو شعراء میں بالکل علمی اعتبار سے ناقص، اچھا نثر نگار اور شگفتہ مزاج آدمی شمار کرتے ہیں ("علم و فن" ڈائجسٹ۔ دہلی)

دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اسکے فوراً بعد غالب کی مقبولیت اور بڑھی۔ یورپی ادبیات اور ذہنی تحریکوں سے باخبر اہل قلم اس طرف متوجہ ہوئے۔

نواب اثر لکھنوی نے "مطالعۂ غالب" میں یہ ثابت کیا کہ غالب کے ہاں غزل کی روایت سے انحراف ہے، سوز و گداز کی کمی ہے، اردو کے دوسرے شعراء خصوصاً میر کے خیالات کو لہجہ بدل کر لکھتے ہیں اور ان کے فلسفیانہ بیانات میں تضاد ہے، عشق میں بھی اپنی جان اور اپنی آبرو ان کو عزیز ہے۔ پروفیسر شوکت سبزواری نے غالب کے فلسفۂ حیات و موت، غم و نشاط، عشق و عقل پر قرآن و گیتا کے علاوہ

مغربی فلسفے سے بھی روشنی ڈالی (فلسفۂ غالب) اور نتیجہ نکالا.
"... ان کی شخصیت کی عظمت کا راز ... غیر معمولی فکری صلاحیتیں ہیں۔ ان کی شخصیت فعلی ہے۔ انفعال غالب کے نزدیک "ہنگامۂ زبونیٔ ہمت" ہے ... غالب خود بیں، خود پسند اور آزاد منش ہیں۔ خود بینی سے عزتِ نفس، خود پسندی سے غیرت اور آزاد منشی سے خودداری پیدا ہوتی ہے ... غالب کے کلام میں یہ تمام جوہر ہیں۔"
(صفحہ ۴۵۳. غالب فکر و فن. کراچی)

احتشام حسین، آل احمد سرور اور فیض احمد فیض نے [ایک قیمتی مضمون کے ذریعے] غالب کے فکر و فن کے نمایاں اوصاف معلوم کیے۔ پروفیسر احتشام نے غالب کی جدیدیت کا سماجی پس منظر تلاش کرتے ہوئے یہ جتایا کہ دلی سے کلکتے کا سفر، جدید ماحول اور ذہنی تحریکوں سے شاعر کی آگاہی اس کے خیالات تبدیل کرنے میں اہمیت رکھتی ہے۔ مستقبل کی جانب آنکھیں کھلی رکھنے اور قدیم کی فرسودگی سے اکتا جانے کی بدولت غالب کی شاعری اور نثر میں نئے عہد کا مزاج پیدا ہوا ہے۔ آل احمد سرور نے ایک نمایاں اور شگفتہ تجزیے کے ذریعے بتایا کہ غالب اپنے سے پہلے کے اور موجودہ مسلّمات اور نظریوں کو جوں کا توں قبول نہیں کرتا بلکہ ہر ایک ضابطے اور عقیدے پر سوالیہ علامت لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ اس کے ہاں ایک "صحت مند تشکیک" ہے۔ وہ خوشی اور غم دونوں میں کھو نہیں جاتا بلکہ دونوں کی حقیقت پر ایک تیسرے آدمی کی طرح غور کرتا ہے اور یہی تشکیک اس کے کلام کو تازہ دم رکھتی ہے۔ فیض نے غالب کی پریشاں خیالی کے پردے میں ایک "واضح اور مائل بہ وحدت" تلاش کی اور اسے ایک ایسی "اداسی" سے تعبیر کیا جو کسی فرد کے ذاتی غم کے بجائے ایک نسل یا دور کی اجتماعی ذہنی کیفیت ہے۔ اس میں ماضی کی یاد، حال کی بے کیفی اور مستقبل کی امید و ناامیدی کی کشمکش شامل ہے۔

مجنوں اور فراق گورکھپوری نے غالب کی امتیازی خصوصیت رمز و کنایہ، طنز، خودداری اور خودشناسی کو قرار دیا ہے (نکاتِ مجنوں ۱۹۲. حاشیے ۸۴. علم و فن ڈائجسٹ. انٹرویو) فراق نے ادب کے طالب علموں کو یہ جتا کر احسان کیا کہ غالب کے ان عشقیہ شاعری بہت کم ہے اور دنیا کی بڑی شاعری میں عشقیہ حصے کم ہی شامل ہیں۔ ان دونوں فاضل تنقید نگاروں کو اتفاق ہے کہ غالب کے تغزل اور تصوف دونوں کو دل سے کہیں زیادہ دماغ سے تعلق ہو۔ (صفحہ ۴۲. نکات) غالب کے عشق میں سپردگی نہیں، طنز کا لہجہ اور لیے دیے رہنے کی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے مختلف خطبوں میں غالب کی بعض خصوصیات پر زور دیا ہے۔ وہ "فکر کے عنصر، شخصیت کی انفرادیت" اور الفاظ کی خاص طرح کی بندش کو شاعر کا کمال قرار دیتے ہیں۔

"... جن اشعار میں فکر کا عنصر نہیں، وہاں بھی آہنگ اور لہجہ اور الفاظ کی بندش سے شعر پُر فن ہو گیا ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی شخصیت کی انفرادیت ان کے اسلوب کی ندرت بن گئی تھی ..." (افتتاحیہ خطبہ، غالب اکاڈمی۔ دہلی)

قریب قریب آدھی صدی غالب کا سنجیدہ مطالعہ ہو چکنے کے بعد اردو ادب کے جانکاروں میں اب یہ بات بدیہی سمجھی جاتی ہے کہ غالب عہدِ حاضر کے مزاج کا شاعر ہے، اس کے ہاں گہرا تفکر رواں دواں ہے، اس کا لہجہ مردانہ ہے، وہ عشق کے معاملات میں بھی خودداری سکھاتا ہے۔ اس کے آہنگ پر فارسی کے کلاسکی لب و لہجہ کا اثر ہے۔ وہ ذہنی فرسودگی سے نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بیان کی شوخی محض ظرافت نہیں بلکہ بامعنی اور گہرا طنز ہے ایک ایسے ذہن کا جو خود کسی اعتقاد یا نظریے کا پوری طرح پابند نہیں۔

پچھلے دس پندرہ برسوں میں غالب شناسی نے اس مقام سے آگے قدم اٹھایا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے فلسفے کے گہرے مطالعے اور فارسی ادبیات پر وسیع نظر رکھنے کے علاوہ غالب کی حکمت اور شاعری کو اقبال کی ہم نشینی سے بھی حاصل کیا۔ انھوں نے رہنمائی کی کہ وہ [illegible]

کی تعداد فارسی کے کلام میں بہ نسبت اردو مجموعہ اشعار کے کہیں زیادہ ہے .... اس کا فارسی کلام فن کے لحاظ سے اردو کلام کی بہ نسبت بہت سلجھا ہوا ہے" اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ "غالب نے فارسی شاعری اردو کے بہت بعد شروع کی اور ایسے اساتذہ کے نمونے اپنے سامنے رکھے جن کے کلام میں سلاست اور لطافت تھی"۔ (افکار غالب ۲۰-۱۹)، انھوں نے غالب کے فارسی کلام میں "برگزیدہ اشعار" کی تشریح کی اور اس نکتے پر زور دیا کہ غالب کے کلام میں لا متناہی کی تمنا کسی محدود شے سے مطمئن نہیں ہوتی اور اس طرح حرکت و حیات کا سبب بنتی ہے۔ غالب کے اہم فارسی اشعار کی وضاحت اور تفسیر کر کے انھوں نے غالب کی مقبولیت کا ایک اور باب کھول دیا۔

میکش اکبرآبادی نے، کہ خود بھی خاندان صوفیا کے باقیات سے ہیں، غالب کو علم اور عقیدے کے اعتبار سے صوفی قرار دینے کے بعد اپنے مختلف مضامین سے ثابت کیا کہ وجود و عدم اور حیات و موت کی حقیقت دریافت کرنے میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریہ "الحق محسوس و الخلق معقول" سے بھی ہٹ گئے اور شنکراچاریہ کے ویدانت کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ تصوف اور ویدانت کے اصول جہاں ہم زبان ہو جاتے ہیں، غالب وہاں ٹھہر کر آگے نکل تو گئے، لیکن محسوسات کے حسن سے بے نیاز نہیں ہو سکے۔ یہ بھی ان کی شاعری کا ایک دلکش پہلو ہے۔

ممتاز حسین نے مارکسی تعلیمات کی روشنی میں غالب کے 'میں' اور 'ہم' کی تشریح کی اور بتایا کہ غالب نے غزل کی رمزی یا ایمائی زبان میں ذاتی تجربات کو عمومی شکل (Impersonal) دی ہے اور عصری جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وحدت الوجود کے نظریے کی مدد سے یہ سمجھا کہ "کائنات اپنی ذات (essence) میں ایک ہے اور اپنی صفات (attributes) میں کثرت پذیر ہے۔ تمام عالم فطرت ایکائی ہے اور ترغیبات یا خواہشات جو زندگی کا سرچشمہ ہیں، نہ ان سے بے پروائی یا تیاگ میں نجات ہے، نہ بے لگام چھوڑ دینے میں ——— ضرورت ہے ایسی فطرت پرستی کی جس میں انسانی ہمدردی شامل ہو یعنی (Humanized)

Humanism) غالب کی حسن پسندی میں سردار جعفری نے بھی اسی پہلو پر زور دیا ہے (دیباچہ دیوان غالب) ممتاز حسین نے اپنی تازہ تصنیف "غالب کا فن" میں اسی تلاش کو اور آگے بڑھایا ہے اور زندگی کے خارجی واقعات کا عالمانہ تجزیہ کر کے ہمیں ان رشتوں کے سمجھنے میں مدد دی ہے جو شاعر کے فکری اور فنی محرکات میں پوشیدہ ہیں۔

خورشید الاسلام نے غالب کا مطالعہ ہندستان کے فارسی شعرا کلاسیکی اردو ادب کے پس منظر میں کیا اور ثبوت کے ساتھ دکھایا کہ غالب کے ہاں تصوف نمایاں ہے لیکن ساتھ ہی "مادیت یا حقیقت پسندی کا بھی ایک رجحان ملتا ہے جو تصوف کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے" (غالب۔ علی گڑھ ۱۹۶۰ء) نوجوانی میں ہی غالب کے ہاں ایک آفاقی انداز ہے۔ اور یہی انداز ہمارے دلوں کے دامن کھینچتا ہے۔ غالب کا تنگیِ کائنات کا شکوہ، دراصل اپنے حق کا مطالبہ ہے اور یہ حق اس کو پہنچتا ہے جس کے حوصلے قوی، آرزوئیں تازہ اور شوق بے پایاں ہوں۔ غالب کے شاعرانہ کمال کی دریافت میں شیخ اکرام کے پچیس سال بعد موسیٰ خاں کلیم دوسرے آدمی ہیں جنھوں نے نفسیات کی پوری مدد لی ہے۔ شخصیت کی تین سطحوں، شعور، تحت الشعور اور لاشعور کو ایک رشتے میں پرو کر یہ جتایا کہ غالب کی اکثر غزلوں میں باطنی یا معنوی وحدت اور مضمون یا خیال کا ربط پایا جاتا ہے (مقام غالب ۲۱۰-۲۴۰)۔ غالب کے وجدان میں دماغ شریک ہے، وہ شعوری فن کار ہے اور قلبی کیفیت کے بیان کرنے میں تجرد تخیلی (Imaginative reason) سے کام لیتا ہے۔ یہی صفت اسے فارسی اردو شعرا میں منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے خاص طور سے غالب کے آہنگ کو اپنا موضوع بنایا اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ غالب کو صرف اس عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں تلاش نہیں کرنا چاہیے ——— ایک سے حالات کے دو شاعر دو الگ جذباتی دنیائیں رکھ سکتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ غالب کی تخیلی فکر، منطقی اور تحلیلی فکر کے برخلاف

ان کے دیوان سے سیراب ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے تیکھے مردانہ پن کو موسیقی میں رچا دیا ۔" (غالب اور آہنگ غالب ۔ دسمبر ۱۹۶۸ء دہلی) انھوں نے اپنی تازہ ترین تصنیف میں انھیں خصوصیات کو بالترتیب جمع کر دیا ہے' جو آج تک لکھی جا چکی تھیں ' لیکن ' تیکھے مردانہ پن کو موسیقی میں رچانے' کا جواب بے دلیل چھوڑ دیا ۔ غالب کے آہنگ پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے البتہ روشنی ڈالی ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے کہ خود صوتی آہنگ میں شاعر بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے ۔ بحروں اور الفاظ و علامات کے چناؤ میں غالب نے جذبے کی نوعیت سے تال میل کو نظر میں رکھا ہے۔

نیاز فتح پوری نے غالب کے اس اس نکتے پر زور دیا تھا کہ "اچھی غزلوں میں ' اگر غور سے دیکھا جائے تو کوئی نہ کوئی ایک مصرعہ ضرور ایسا پایا جاتا ہے جو غالباً سب سے پہلے ذہن میں آیا اور اسی نے پوری غزل کی تحریک کی ۔ اس مکمل مصرعے ' محاورے یا الفاظ و ترکیب میں خاص قسم کا آہنگ ہوتا ہے جو غالب کی نظر میں جڑھ جاتا ہے اور پھر اسی آہنگ کے سانچے میں پوری غزل ڈھلتی ہے (سالنامہ نگار ۔ جنوری ۱۹۶۱ء) مسعود حسین خاں نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ غالب اپنی غزل کے موڈ کے مطابق حروف اور آوازیں چنتے ہیں ۔ مثلاً وہ غزل ۔ : درد سے بھر نہ آئے کیوں ۔ ۔ ۔ کوئی ہمیں ستائے کیوں " نو شعروں میں شاعر نے ۱۲ بار نون استعمال کیا ہے ۔ (Nasal sounds) کے ذریعے غنائیت اور غمگین موسیقی پیدا کی ہے ۔ ۔ ستائے نہ بنے ستائے نہ بنے " قافیہ ردیف کی غزل میں نون (ں) ۵۱ بار استعمال ہوا ' اس میں نون غنہ بھی ہے اور نون مسقوط بھی ۔ جس کی تکرار سے خاص طرح کی آوازیں پیدا ہوئی ہیں اور پوری غزل میں درد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں ۔ ایک نئی بات موصوف نے یہ بتائی کہ غالب کے منتخب دیوان میں جو دو درجن اشعار ردیف کی غزلیں ہیں ان میں ٹ ' ٹھ ' ڈ ' ڈھ ' ڑ وغیرہ ثقیل آوازوں سے پرہیز کیا ہے تاکہ آہنگ میں تلخی و کرختگی پیدا نہ ہونے پائے (" غالب کا صوتی آہنگ " مقالہ ' سیمنار ۔ دہلی ۔ فروری ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر مغنی تبسم نے لسانیات (Linguistics) کے اصولوں سے جانچ کر یہ دکھایا ہے کہ غالب نے اوزان کے آہنگ سے بڑا کام لیا ہے اور " اکثر صورتوں میں اپنے لہجے کو وزن کے مقررہ آہنگ پر حاوی کر دیا ہے " (شاعر ۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء ۔ بمبئی) ۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے انگریزی کی رومانوی اور جدید شاعری پر تنقیدی ادبیات کی نظر سے غالب کی خصوصیات کا پتہ لگایا اور توجہ دلائی کہ ولیم بلیک (William Blake) کی شاعری کی طرح " نگاہ " کو یہاں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ غالب اپنے نفسیاتی تجربوں ' جذبوں اور تخیلی کیفیتوں کو حسین جسمانی علامتوں کے ذریعے ابھارتا ہے [illegible] اور مقناطیسی صفت پائی جاتی ہے ۔ [illegible] نے مبہم جذبے اور مجسم وجود کا تعلق پیدا [illegible] بے پردہ جسمانی تجربے کو کھل کر بیان کرتا ہے تو اس طرح کہ خیال ان حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے اور تخیل کو مہمیز لگتی ہے ۔ غالب کے شاعرانہ کمال کا نمایاں وصف یہی ہے کہ وہ ہماری آنکھوں اور کانوں کو بیک وقت متوجہ کر لیتا ہے ۔ وہ ایسے رنگ چن دیتا ہے جو ہماری نظر کھینچ لیتے ہیں اور پھر " آتشی چشم و گوش " سے واضح اور بیکراں تصویریں منظر تصور پر جلوہ گر ہوتی ہیں ۔

(مقالہ ' سیمنار دہلی ۔ فروری ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر محمد حسن نے مختلف موقعوں پر غالب کی شاعرانہ صفات کا جائزہ لیا ہے ۔ تازہ ترین جستجو میں انھوں نے غالب کو " نئی داخلیت کی آواز " قرار دیا ۔ کہا کہ اس کا جذبہ [illegible] انفرادی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے اردو شاعری کو [illegible] کی قوت نہیں بخشی بلکہ شکستوں اور ناکامیوں سے [illegible] زندگی کو [illegible] کا موقع دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ابدی جستجو غالب کا [illegible] ۔ ۔ ۔ وہ جس طرح نئی نسل کی افسردگی ، تشکیک ، تلخیت اور شکست خوردگی میں شریک ہوتا اور سہارا دیتے ہیں [illegible] دوسرا شاعر شریک نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ " (فروغ اردو لکھنؤ ۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء)

پروفیسر محمد مجیب نے غالب کے کلام کے فکری پہلو یا فلسفیانہ [illegible]

آہنگ کا تانا بانا معلوم کر کے بتایا تھا کہ نوفلاطونی فلسفے، ایرانی تصوف اور ہندوستانی ویدانت کے باریک تار اس شاعر کی انسانیت دوست نگاہ کے تار سے مل گئے ہیں۔ اور خوش بیانی نے انھیں سننے یا پڑھنے والوں کے لیے دل کش بنا دیا۔ پروفیسر سرور نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ جدیدیت (Modernity : Z.A) سے غالب کا یہ گہرا رشتہ ہے کہ اس کی شاعری شروع دور سے ہی سننے کے بجائے پڑھنے کی چیز ہے، دوسرے وہ کسی نظریہ یا فلسفے کی پابند نہیں۔ تیسرے یہ کہ غور طلب ہے اور سوچنے پر اکساتے وقت وہ اپنی عظمت کا سکہ جاتی ہے (مقالہ سیمینار۔ علی گڑھ، مارچ ۱۹۶۹ء) انہی خیالات کی مزید علمی وضاحت ہوتی ہے تین تازہ ترین مقالوں سے: ایک پروفیسر عالم خوندمیری کا بیش قیمت مضمون "غالب کی ابتدائی شاعری، تلاشِ استناد کی ایک کوشش" وہ کہتے ہیں کہ ۲۵ برس کی عمر میں شاعر کو وجود کی ماہیت کا شاعرانہ وجدان ہو گیا تھا۔ تنہا غالب ہے جس نے "وحشت میں وحدت کا راز پایا" غالب کے نزدیک وحشت اور تمنا یا شوق میں ایک گہرا اندرونی ربط ہے...... انھیں کائناتی تمنا کے مقابلے میں موجود کائنات محدود نظر آتی ہے اور اسی لئے وہ کائنات کو وسیع تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے شوق ایک عقیدے سے کم نہ تھا...... یہی شوق اور تمنا ہے جو وجود کے ہر پیکر کو فردیت عطا کرتا ہے...... فردیت کا یہی شدید احساس غالب کو تنہائی کے اضطراب سے دوچار کرتا ہے اور اس تنہائی کے احساس سے بے چین ہو کر وہ اپنی شخصیت کو مستند یا authentic بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی پوری شاعری تلاشِ استناد کی ایک داستان ہے..." (Radio Blitz 1st March 1969) ڈاکٹر وحید اختر بھی عالم خوندمیری کی طرح غالب کی فلسفیانہ جستجو کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب بیسویں صدی کے فکری میلان کے پیش رو اس لیے ہیں کہ مذہب، فلسفہ، سیاست، ادب، آرٹ، ہر شعبے میں ان کے ہاں تشکیک ہے۔ "غالب نے اپنے کو کسی عقیدے، کسی فلسفیانہ نظام یا کسی محدود تصور سے وابستہ نہیں کیا" اس لیے گزشتہ کل کے بعض نظریات اگر آج رد کر دیے جائیں تو غالب اپنی ناگی (non conformism) کی بدولت قبول کیے جائیں گے...." وہ سب کے ہم نوا ہوتے ہوئے بھی سب سے آزاد ہیں۔" ( )

ڈاکٹر وزیر آغا بھی فلسفہ اور مغربی ادبیات کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے بھی جدید ادبی تنقید کے معیاروں سے غالب کے شاعرانہ اسرار تلاش کیے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنے حالیہ دو مضمونوں میں غالب کی شخصیت کے اندرونی تصادم سے اس کی مقبولیت کا راز معلوم کیا اور اس کے ذوقِ تماشا کو اہمیت دیتے ہوئے بتایا کہ زندگی کے مختلف مظاہر کے لیے غالب ایسا تماشائی ہے جو کھیل میں شریک ہو کر، لطف اندوز ہو کر رائے زنی کرتا ہے اور طنزیہ موڈ میں مسکرا دیتا ہے۔ وہ ہجوم میں رہ کر بھی اس سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ (شاعر۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء۔ بمبئی)

صد سالہ جشن کے ضمن میں غالب شناسوں کے جو نام ابھرے ہیں ان میں پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، خورشید الاسلام، موسیٰ خاں کلیم، آفتاب احمد خاں، افتخار جالب، قدرت نقوی، شکیل الرحمٰن کے علاوہ اطالیہ کے الیکسانڈر بوسانی، لندن کے رالف رسل اور روس کی نتاشا پری گاریناّ بھی قابل ذکر ہیں۔ فکری نظریات کے اختلاف کے باوجود ان سب کی نظر اردو فارسی ادب کے اس تمام سرمائے پر ہے جو غالب کی آخری خاموشی کے بعد سے اب تک منظر عام پر آچکا ہے۔

رالف رسل اور خورشید الاسلام کی مشترکہ تالیف "Ghalib: Life & Letters" اگرچہ محض مستند سوانح مرتب کرنے کی کوشش ہے، تاہم اس میں خطوط اور اشعار کی مدد سے ایک نفسیاتی نکتہ حل کیا گیا ہے: اپنے اردگرد کے حالات، خواہشات، تمناؤں اور عقیدوں کی تشکیل میں اس شاعر کا برتاؤ بچپن سے ہی "بظاہر آشنا، بباطن بیگانہ" کے سانچے میں ڈھل گیا: عاشقی ہو یا شاعری، دربارداری ہو یا بے تعلقی، ہر عمل میں وہ "باہمہ بے ہمہ"

رہتا ہے اور اسی برتاؤ کی ڈھال سے زندگی کی ناگواریوں کو گوارا کر لیتا ہے۔ یہ برتاؤ جو ۱۸۵۸ء "دستنبو" شائع کرتے وقت سامنے آیا، دراصل غالب کے بچپن سے ہی اس کے پورے وجود میں رس بس چکا تھا۔

تنا شاہری نگار بینا نے چند اہم علامات چن کر غالب اور اقبال کے ہاں ان کے تلازمے تلاش کیے اور یہ حیرانی ظاہر کی کہ اقبال جسے [illegible] فن میں غالب کا وارث سمجھا جاتا ہے، غالب [illegible] منا [illegible] سے روشنی تو ضرور لیتے ہیں لیکن اس [illegible] ایک محدود دنیا کی تاریکی دکھاتا [illegible] سے کہیں وسیع، لیکن تخاطب غالب کے مقابلے میں نہایت محدود ہے۔

غالب کی ذہنی اور اس کے فنکارانہ کمال پر مختلف خیالات رکھنے والوں نے پچھلے سو سال میں جو کچھ بیان کیے ہیں، ان سب سے [illegible] کے باوجود اتنا ضرور ہے کہ ہر ایک پہلو سامنے آ جاتا ہے اور غالب کا مطالعہ کرنے والے کو یہ صرف یہ کہ غالب کی نظر و [illegible] پیدا ہوتی ہے بلکہ وسیع پیمانے پر ایرانی اور نئی ادبی [illegible] میں ذہن کو [illegible] اور نگاہ کو وسعت بھی ملتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی بڑھتی ہوئی مصروفیت میں زمانے کے مزاج اور مذاق کی [illegible] کو بہت دخل ہے اور خود شاعر کو اس تبدیلی کا کچھ کچھ احساس تھا۔ اگرچہ اس نے بعض اوقات مایوسی کا اظہار کیا لیکن زمانے کے [illegible] ہے جو [illegible] اس کی نظر [illegible] جاری جہد و استقلال کی ہے۔ وہ آنے والے زمانے کو پہلے کو سنا، اس سے امیدیں وابستہ کرتا ہے۔ وہ اپنے دکھوں اور اپنے طبقے یا ہم وطنوں کی حالت پر کڑھنے اور طنز کرنے کے باوجود زمان و مکان سے تعلق یا بیر [illegible] نہیں ہوتا بلکہ اس کے پوشیدہ امکانات تک نگاہ بھی تاہے۔ [illegible] کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ ایسے دیدۂ ور صاحب نظر لوگوں سے رہنمائی حاصل کرو جو پتھر کے سینے میں چھپے ہوئے شرارے دیکھ لیں (قصیدہ ۲۶۔ ردیف "بعید")۔ اگر انسان کی نگاہ گہرائیوں میں نہ اتر سکے، حقیقت کا سراغ نہ پا سکے تب بھی اس حسنِ فطرت سے منکر نہ ہونا چاہیے جو آنکھوں کو میسر ہے، ذوق و ذہن کو تازگی عطا کرتا ہے۔ مختصر یہ انسانی زندگی میں آسائش و آرائش کی تلاش گناہ نہیں بلکہ جبر میں اختیار کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔ زندگی اور فن کے متعلق غالب تفکر کا قائل ہے۔ علوم میں معقولات (Natural sciences) کی تحصیل پر زور دیتا ہے، ہر ایک منظر پر آنکھیں کھلی رکھنے اور اس کی تہہ میں اترنے کو ذہنی آدمی (Intellectual) کا فریضہ قرار دیتا ہے، تاہم اس کا نقطۂ نظر عملی ہے — حسن و عشق کے معاملات میں وہ انسانی فطرت کے اس المیے سے آگاہ ہے کہ خواہشوں کی کثرت محرومی کا سبب بنتی ہے اور حق کی عبادت کرنے والا ہی پیدا ہو اور جل جانے کا افسوس کرتا ہے۔ حیات و موت میں بھی جبر و اختیار کی یہ کشمکش جاری ہے۔ یہ المیہ یہ کشمکش، یہ اثبات و نفی کے درمیانی حالت اس کا دل ضرور دکھاتی ہے، لیکن شوق، تمنا اور کوشش و کاوش سے اکتاتی نہیں، بلکہ اور اقتضاء پیدا کرتی ہے۔ اگر زندگی اور فن دونوں کے متعلق اس کا برتاؤ عملی اور اس کا اضطراب نتیجہ خیز نہ ہوتا تو اس قسم کے سیکڑوں اشعار اس کے کلام میں اور خطوط میں جابجا بکھرے نہ ہوتے:

بس، ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

گر معنی نہ رسی، جلوۂ صورت چہ کم است؟
خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہے دریاب

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے!
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

یہ عملی نقطۂ نظر اس کی نظم و نثر میں چند غیر معمولی خصوصیات ابھارتا ہے، جنھیں ہم یوں شمار کر سکتے ہیں:

(۱) وہ انتہائی غم اور زبردست نشاط کے لمحوں میں بھی ہوش مندی سے ہاتھ نہیں دھوتا۔ ہر موقع پر لیے دیے رہتا ہے۔ "یک گونہ بے خودی" اس کی پالیسی (policy) یا وقتی تدبیر ہے، کریڈ (creed) یا ایمان نہیں۔ کوئی بھی ذہنی یا جذباتی عالم ہو، اپنے اور کائنات کے وجود سے غافل ہو جانا اسے گوارا نہیں۔

رومانوی دور کے شاعروں کی افتادِ طبع کے خلاف وہ نہایت سنبھلا ہوا شاعر ہے۔ کسی کیفیت میں اسے بے قابو ہو جانا پسند نہیں، اپنی شاعری میں (دو تین شعروں کو چھوڑ کر) اور خطوں میں وہ یہ فضا قائم کرتا ہے کہ انسان کو شہد کی نہیں، مصری کی مکھی بننا چاہیے کہ لذت تو حاصل کرے، اس لذت میں ڈوب نہ جائے۔ غالب سے زیادہ کھل کر ۱۹ویں صدی کے کسی شاعر نے یہ بات نہیں کہی:

در دہر فرو رفتۂ لذّت نتواں بود
بر قند، نہ بر شہد نشیند مگس را:
(دنیا ایسی ہے کہ انسان کو لذّت یا عیش میں
ڈوبنا نہیں چاہیے۔ ہماری مکھی شہد پر نہیں
مصری پر بیٹھتی ہے)

فن کار کو بھی اس کا کچھ ایسا ہی مشورہ ہے کہ اپنے باطن کو، اپنے نئے ضمیر کو منظرِ عام پر لاؤ، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ قدم ڈگمگا جائیں۔ اپنی جگہ مضبوطی سے تھامے رہنا "جا نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص" ادب اور زندگی، دونوں کے بارے میں غالب کی یہ "خود نگری" خودداری، سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ عزتِ نفس کا ماحول پیدا کرتی ہے۔

(۲) دنیا کے کئی عظیم شاعروں کی طرح غالب کی شاعری بھی ایک تاریخی دور کا موڑ دکھاتی ہے۔ مختلف لفظوں میں اس نے خود بھی یہ اظہار کیا ہے کہ "کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے"

زندگی کے حالات اور زندگی کی تمناؤں کا زبردست تصادم اس کے کلام میں دو رنگی دھاریاں ڈالتا ہے۔ اور ایک ایسے دو طرح یا تصوری ہیرو کا پیکر ابھارتا ہے جو روز مرّہ کی زندگی سے اوپر اٹھ کر کچھ خواہشوں، تمناؤں اور آدرشوں میں زندہ ہے۔ وہ غالب جسے امیروں کے آستانوں پر، شکستہ دربار کی ہلکی پھلکی محفلوں میں، گندوں کی بارگاہ میں سر جھکا کر قصیدہ یا قطعہ پیش کرنے کی مجبوری درپیش رہی، روز مرّہ کی زندگی کے ہاتھوں بے بس اور موروثی عادت کے شکنجوں میں جکڑا ہوا غالب ہے، اور وہ جو اپنے طرزِ بیان اور طرزِ فکر میں جدا راہیں تلاش کرتا ہے، ذہنی آزادی کے گن گاتا ہے، فکر کو تلاش کی راہ پر رواں اور تازہ دَم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے، اور اپنے زمانے کی کسی روش سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ اس کی تمناؤں یا آدرشوں کا تراشا ہوا پیکر ہے۔ پہلے وجود کو اس کے بزرگوں نے اور گھریلو حالات نے جنم دیا تھا، دوسرے وجود کو خود غالب نے اپنی تلاش اور فکر و فن کی آمیزش سے تراشا ہے۔ غالب کا یہ تصوری وجود بھی اپنے لئے "میں" اور "ہم" کی ضمیر استعمال کرتا ہے اور یہی مرزا اسد اللہ کا وہ نعم البدل ہے جسے نسلِ حاضر نے غالب کے کلام سے حاصل کیا۔

(۳) فارسی اردو شاعری کے ایک ہزار سالہ ادبی ورثے میں غالب سے بڑھ کر کسی نے 'عقلیت' پر اتنا زور نہیں دیا۔ جرمن فلسفی کانٹ کے "Pure Reason" (عقلِ محض) کی اطلاع غالب کو نہیں تھی، لیکن عقلیت، استدلال، احساسِ تناسب یا غور و فکر کو ہمارا شاعر زندگی میں بڑی اہمیت دیتے ہوئے بھی اسے جذبات سے عاری قرار نہیں دیتا۔ وہ انسانی عقل کو "اندھیری رات کا چراغ" اور "جذبات کو قابو میں رکھنے والی قوت" ٹھہراتا ہے اور اس کے حصول پر زور دیتا ہے۔

عقلیت پر زور دے کر، جہاں وہ ایک طرف قدیم نظامِ زندگی سے اپنا جذباتی رشتہ توڑنے کا اعلان کرتا ہے، وہیں ایک ایسی زندگی کا طلب گار ہے جس میں انسان سربلند ہو، بستی میں بھوکے ننگے نہ ہوں، تعصب یا تنگ نظری کا ماحول نہ رہے اور

کوئی میں عزت نفس کا جذبہ قوی ہے۔

غالب پہلا شاعر ہے جس نے خرد، غم اور آرٹ کا پوشیدہ رشتہ تلاش کیا۔ غم وہ گہری اداسی جو آرزوؤں کی پے در پے شکست سے اور دکھوں بھری دنیا کے ہمدردانہ مشاہدے سے انسانی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ خرد، وہ علم اور تلاش کی قوت جو عالم اسباب کے مظاہر (Phenomena) میں اتر کر ان کے امکانات (Perspective) کا پتہ لگاتی ہے، حالات سے نمٹنے کی تدبیریں سجھاتی ہے اور خواہشوں کو قابو میں رکھ کر برتاؤ کا تناسب دکھاتی ہے۔ شاعری، موسیقی یا مصوری، انسانی روح کی یہ زبان ـــــ جو آرٹ ہے 'خرد' اور غم سے مل کر ایک متفقہ بتاتی ہے۔ اس کو فکر اور جذبے کی آمیزش کہا گیا ہے۔ غالب کے آرٹ میں خود آرٹ کا یہ تصور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ "دل دردمند" اور "خرد خوردہ بیں" دونوں اس ترازو میں ہم وزن ہیں۔ غالب کے ہاں Irrational کے ساتھ Rational کی بھی اہمیت ہے، غم اگر عشق کا رہوار ہوتا، گارگر ہوتا، دل افگار ہوتا، Rationalism [illegible] ہوتا [illegible] روشنی دکھاتا ہے، رہنمائی کرتا ہے لیکن آگے نہیں لے جاتا۔ ان کے لیے عشق کی [illegible] ہے اور [illegible] کی [illegible] جو [illegible] آرٹ محض جذبے یا فکر کا اظہار نہیں [illegible] خوب صورت، دلکش اور دلوں میں اتر جانے والا اظہار ہے جو مخاطب کو بھی کہنے والے کی آنچ میں سینک دے اور ذہنی کیف میں شریک کر لے۔

آرٹ میں عقل اس کی عقلیت ایسا کام کرتی ہے اور اسے لفظوں کے حسن و کشش میں مبتلا ہونے سے بچا لیتی ہے۔ وہ خوب صورت لفظوں کے طلسم میں گرفتار نہیں ہوتا، لفظوں اور بندشوں کو [illegible] رکھتا ہے اور حسب منشا کام لیتا ہے۔

(۴) غالب نے اپنے زمانے میں رائج تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ معاصرین کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف کے مختلف نظریوں، اصطلاحوں اور مسائل پر غالب کی بہت گہری نظر تھی، وہ عمر اور علم کے مختلف مرحلوں میں موت و حیات، جبر و اختیار، خالق اور مخلوق کے بارے میں اپنی رائے بھی بدلتا رہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس مقام پر آکر ٹھہرا جہاں تصوف ایک مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) عقیدہ بننے کے بجائے ایک اخلاقی برتاؤ بن جاتا ہے۔ اس نے تصوف کے مسائل میں سے، انسانی روح کا وَحدت، تمام موجودات کی حقیقت کا ایک ہونا، مایوسی یا بیزاری کو صبر و رضا سے بدل دینا، تمام انسانوں کو ایک برادری شمار کرنا، اپنے اور غیر، خالق و مخلوق کے درمیان فرق اٹھا دینا اور مذاہب کے اختلافات سے، نفرت و حقارت سے ہاتھ دھو لینا، اپنے لئے انتخاب کر لیا، تصوف کو غالب نے اس کی نیم فلسفیانہ بحثوں اور مقررہ رسموں Rituals سے نکال کر اپنا ایک اخلاقی بیوہار بنا لیا اور وحدۃ الوجود کے نظریوں کو نقاب کی طرح نہیں بلکہ چھتری کے طور پر استعمال کیا، ورنہ شعروں اور خطوں میں یہ خیال بار بار کیوں آتا ہے ؎

بر آر از بزم بحث اے جذبۂ توحید غالب را
کہ ترکِ سادۂ ما با فقیہاں بر نمی آید

(۵) تصوف کی جس [illegible] کو شاعر نے اپنایا، وہ مخلوق کو خالق کا پرتو مان کر بھی فرد کی قدر و قیمت سے آگاہ ہے، یہاں بھی اسی قسم کا تضاد نظر آتا ہے جیسا دنیا کے روپ کو بے حقیقت سمجھنے کے بعد اس روپ سے دل لگانے کی کوشش یا خواہش۔ فرد کی حیثیت اور اس کی سربلندی غالب کی شاعری میں پوری طرح ابھر کر آتی ہے۔ اور انسان کی عظمت کا ترانہ بن جاتی ہے۔ وہ انسان کو پوری کائنات کے دائرے کا مرکزی نقطہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا کی رونق انسان کے دم سے ہے۔ مٹی کی یہی [illegible] پورے عالم فطرت کی "غرض آفرینش" ہے اور یہی ہے جو "بے معنی لگنے والی چیزوں" میں ترتیب و تنظیم قائم کر کے اس سے

آلائشوں اور آسائش کا سامان مہیا کرتی ہے۔ انسان کا وجود ایک نعمت ہے اس وجود پر دکھوں اور حسرتوں کا اتنا بوجھ ہو جس کے سامنے گناہ کا قصور اور گناہوں کی حیثیت کچھ نہیں۔

دم از وجود کہ "ذنبٌ" زنند بے خبراں
چو عطیۂ حق را گناہ ما گویند ؟

تصوف کی رسمی عبادتوں اور مابعد الطبیعیاتی بحثوں سے بلند ہو کر غالب نے جہاں فطرت کے حسن کو نظم میں ڈھالا وہیں انسان کو خدا کے سامنے سر بلند پیش کیا، اس کی گردن سے مفروضہ گناہوں اور خوف و دہشت کی ذلتوں کا بار اتار لیا۔

وہ فارسی اردو کی تمام شاعری میں پہلا شخص ہے جس نے اپنے اعمال کا حساب دینے کے بجائے، خدا سے انسان کی حسرتوں کا حساب طلب کیا ہے اور کھلے لفظوں میں انسان کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔

غالب کی تمام اردو فارسی شاعری میں انسانی عظمت، خودداری اور سرکشی و سربلندی کی روح، سنگین ترشے ہوئے پیکر میں شرر کی طرح بیتاب ہے

(۶) غالب اپنے ارد گرد کی دنیا کو ہی نہیں، خود اپنے عمل کو بھی تنقید کی کسوٹی پر رکھتا ہے۔ ساٹھ برس کے طرز فکر اور رنگ سخن کو نظر میں رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے ہاں دنیا کے مفکر اہل قلم کی طرح، تخلیقی عمل ہی تنقیدی عمل بنتا گیا ہے۔ اس نے ہر زمانے میں یقین کو شک کی جان لیوا سرنگ سے گزارا اور حقیقت کی تلاش پر کسی عقیدے کا اجارہ تسلیم نہیں کیا۔ آدمی اور اس کے مسائل پر، حقیقت اور اعتقاد کے اختلاف پر جتنی اس کی نظر گہری ہوتی گئی، وہ اپنی انوکھی روش سے روش عام کا قائل کم ہوتا گیا، دشوار ہی سے سہل بیانی کی طرف، بیزاری سے انس کی سمت اور پیچیدگی سے سادگی کی جانب بڑھتا گیا۔

عمر اور تجربے کی آخری پختگی کو پہنچ کر غالب نے نہ صرف یہ کہ انداز بیان کو عام پسند سانچوں میں ڈھالا بلکہ عام زندگی کی کھردری اور بظاہر غیر شاعرانہ حقیقتوں اور حالتوں کو چن کر اپنی شاعری کا موضوع بنایا، سڑکوں اور گلیوں میں پڑی ہوئی باتوں سے شعر تراشے اور انھیں زبان و بیان کی وہ سادگی و نرمی عطا کی کہ اس کے تقریباً دو سو شعر اور مصرعے دلوں میں اتر گئے اور زبانوں پر چڑھ گئے۔

اس قسم کے خیالات کو غالب سے پہلے شاعری کا موضوع نہیں سمجھا گیا تھا۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

— یا —

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ؟

روزمرہ کی بظاہر معمولی سی باتوں کو شاعرانہ حسن بیان دے کر غالب نے روزمرہ کی زبان کا حصہ بنا دیا اور جب غالب کے یہ تقریباً دو سو شعر اور مصرعے زبان کا جزو بدن بن چکے، تب غالب کے اس کلام کی طرف توجہ ہوئی جو مذاق عام سے بالکل ہٹا ہوا اور دشوار گزار تھا۔

ادب کے ذوق کی شکل، خود غالب کی شاعری بھی مقبولیت کے کئی درجے رکھتی ہے۔ کمتر ایسا حصہ ہے جسے بالکل ہی عام لوگوں تک رسائی حاصل ہوئی، اس سے کچھ زیادہ وہ کلام ہے جو درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ ذوق کی تربیت کرتا ہے اور فارسی و اردو کا کم سے کم مشہور کلام ایسا ہے جو اعلا درجے کا ادبی ذوق رکھنے والوں میں عام ہو چکا ہے اور عام ہوتا جاتا ہے۔ یہی وہ حلقہ ہے جو غالب کے نازک، باریک اور دشوار شعروں سے اپنے علمی و ادبی ذوق کو صیقل کرتا اور غالب کے اشعار سے الفاظ و تراکیب نکال کر اپنے ہاں سجاتا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں پچاس سے

زیادہ ادبی کتابوں کے نام غالب کے کلام سے چن کر رکھے گئے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

(۷) کچھ عرصے سے اردو کے ادبی حلقوں میں ایک رجحان ہے غالب کو عہد حاضر کا شاعر کہنے کی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ غالب نے انفرادیت، تشکیک اور فرد کی تنہائی کو ادبی ابھار عطا کیا۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی شاعری انسان کو اس کے پھیلاؤ یا حد نظر میں افق تا افق ہی نہیں دیکھتی بلکہ اس کی گہرائی میں بھی اترتی ہے۔ تینوں فاصلوں (Three Dimensions) میں آدمی کے وجود اور مسائل کی تلاش ہر زمان کی بڑی شاعری کا وصف رہا ہے، غالب کے ہاں یہ وصف بہت نمایاں ہے۔ وہ آدمی کے باطن کو ایسی کتاب پاتے ہیں جس کے ورق بھی نہیں الٹے گئے "ہے ہر اک دہر میں ورق ناخواندہ" اور تنہائی میں بھی وہ تنہا نہیں رہتا بلکہ خیالوں اور فکروں کا طوفان بپا رکھتا ہے "ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو" "ہیملٹ" میں ڈنمارک کے شہزادے کی طرح ذہن کی بیداری وجود کی بیقراری بن رہتی ہے ؎

رشک ہے آسائش ارباب غفلت پر اسد
پیچ و تاب دل نصیب خاطر آگاہ ہے

غالب اس الجھی ہوئی دنیا میں فرد کو بے بس دیکھنا قبول نہیں کرتا۔ بلکہ زندہ رہنے کے جتنے امکانات ہیں ان پر حاوی یا اثر انداز ہونا چاہتا ہے۔ حیات کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھتا ہے اور زندگی کے ہر سطح سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ "انفعال" یعنی اثر پذیری اور بے بسی اداسی کو وہ انسان کی زندہ رہنے کی امنگ کے خلاف جانتا ہے، اسے ہنگامۂ زبونی ہمت" قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے غالب کی آواز ان وجودی (Existentialists) فلسفیوں ادیبوں سے مل جاتی ہے جو مذہبی عقائد کی رہنمائی اور ماضی و مستقبل کے دونوں پاٹوں سے بے نیاز ہو کر موت و حیات کے رشتے کی تلاش حال میں کرتے ہیں۔

غالب نے خیام اور حافظ دونوں سے آگے جا کر "نہاں خانۂ دل" میں نقب لگائی اور فرد کے باطن کی گہرائی کو چھوا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں "آدمی نہیں، آدم شناس ہوں" (۱۸۶۲ء کا خط بے خبر کے نام)۔ یہ بتایا کہ "آدمی عموماً اور صاحبان ننگ و ناموس خصوصاً، باوجود فراغ معاش ایسی جان گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے!" غم صرف روٹی کی فکر کو نہیں کہتے۔ وہ اس سے بہت گہری کیفیت ہے۔ غم انسان کے باطن کی صفائی اور کردار کی خوبی کے لیے ضروری شرط ہے۔ ان پہلوؤں کو نظر میں رکھنے کے بعد بھی غور طلب نکتہ یہ ہے کہ غالب کے اشعار مفہوم کی کئی تہیں رکھتے ہیں، پڑھنے والے کے اپنے رجحان پر بھی موقوف ہے کہ وہ کسی شعر کو کس مفہوم کے ساتھ کھولنا چاہتا ہے۔ محض شخصی، نفسیاتی، فکری، سماجی یا سیاسی سطح پر ——— یا بیک وقت کئی سطحوں پر ان سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جو لوگ اردو کے حرف سے واقف نہیں، وہ بھی یہ شعر پڑھتے ہیں:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؛ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

بظاہر سامنے کی بات ہے اس لیے عام زبانوں پر چڑھ گئی۔ کسی الجھن میں یہ شعر اپنی اوپر کی تہہ کھولتا ہے۔ پھر دل کی نادانی " درد تنہائی " کے عذاب میں گرفتار ہو کر بھی اس شعر کو اپنے اوپر طاری کر سکتی ہے۔ فرد کا سماج سے اجنبیت محسوس کرنا (Alienation) بھی ایک "درد" ہے جس کی دوا دل ناداں کو نہیں ملتی۔ تخلیق کا کرب بھی ایسا درد ہے جس کی دوا بعض اوقات نہیں پائی جاتی۔ جینے کی امنگ اور موت کا جبر بھی ایک "درد" ہے اور عظیم الشان سلطنت یا تہذیب کے ٹکڑے اڑتے دیکھنا بھی "درد" اٹھاتا ہے جس کی دوا "دل ناداں" کو نہیں معلوم۔ غرض جتنے اور جس قسم کے درد ہوں گے، اتنے ہی پہلوؤں سے اس معمولی سے عام پسند شعر کو سمجھا جا سکے گا۔ مشکل اور باریک شعروں میں یہ تہہ در تہہ کیفیت اس قدر ہے کہ بعض اشعار کو شارحین نے اپنے اپنے

طور پر کچھ نہ کچھ تو مطلب نکال لیے ہیں۔

قوس قزح کی سی اسی رنگا رنگ کیفیت نے دہر کا احساس خود شاعر کو بھی تھا۔ غالب کے کلام کو متضاد فکری اور ادبی حلقوں میں مقبول بنایا ہے اور تلاش کی ترغیب دلائی ہے۔

(۸) غالب کے کلام کا بڑا حصہ ایسا ہے جس میں "اداسی" یا "درد" کو اتنا ہی پایا جا سکتا ہے جتنا مسرت اور شگفتگی کو۔ سوچ کی سنجیدگی نے شاعر کے لہجے میں جو ایک متانت اور وقار پیدا کیا ہے اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غم کا عنصر غالب کے ہاں حاوی ہے۔ لیکن غم کو جس جس پہلو سے دیکھا جائے، میر تقی میر یا میر درد کے کلام میں غالب سے بھی زیادہ ہے۔

غالب کے ہاں غم اور رنج یا درد ہم معنی نہیں ہیں۔ اس کے کلام میں شگفتگی کا لہجہ زندہ دلی کی لَے شوخی اور مسکراتا ہوا طنز محض ایک نقاب نہیں بلکہ زندگی کے برتاؤ اور شخصیت کے سبھاؤ کی حیثیت سے نشاط کی کیفیت میں گھل مل گئے ہیں۔ آنسوؤں کو طنزیہ تبسم بنانے میں غالب کی فنکاری کا راز کھلتا ہے۔ غالب کھلنڈروں اور بے فکروں کی طرح قہقہہ نہیں مارتا، وہ اپنے زمانے پر بھی طنز کرتا ہے، اس کی عادات پر بھی، ننگے اداروں اور اہم شخصیتوں پر بھی اور خود اپنے آپ پر بھی۔ وہ سودا یا انشا کی طرح افراد یا حالات کا مذاق نہیں اڑاتا، خیام و حافظ کی طرح چھیڑ خانی کرتا ہے اور ان دونوں سے زیادہ بیباک اور دو ٹوک لفظوں میں وہ شکایت یا افسوس نہیں کرتا، بے نیازانہ کیٹلے طنز سے درد کو احتجاج بنا دیتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری، غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

یا

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

اس لب و لہجے میں غالب کو اردو کے دوسرے شاعروں سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔

خود غالب کے بقول وہ سینے میں غم چھپا کر اسے تبسم میں ڈھالنا جانتا ہے۔ عام و خاص، دانا اور نادان دونوں پر ہنستا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی زندگی اور آدرشوں کے تضاد پر، اپنے حالات اور تمناؤں کے بے جوڑ پن پر، عقل اور خواہش کے تقاضوں کی کشمکش پر غالب ہی سب سے زیادہ ہنستا اور ہنساتا ہے۔

(۹) غالب کے کلام میں صوتی آہنگ، لفظی حسن اور آوازوں سے ابھرنے والی تصویروں کا ایسا نگارخانہ سجا ہوا ہے جس کی طرف حال میں توجہ کی گئی ہے۔

شروع میں اس کے ہاں چ، ژ، ش کی آوازوں کی کثرت تھی اور فارسی شاعری کا پرشوق لہجہ طاری تھا، پھر ذ، ت، س کی آوازیں بڑھتی ہیں اور آخری پندرہ سترہ سال کے کلام میں نرم غنائیت کا احساس ہوتا ہے، ن، م، ر، س کی آوازوں کی تکرار ہوتی ہے۔ گہری فکر انگیز اور قریب المخرج آوازوں کی جگہ نرم موسیقی لیتی جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں کلاسیکی مثنویوں کی بحر میں چھوڑ کر باقی ۳، ۴ بحروں کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور یہ وہی بحریں ہیں جو "شش مقام" کی عام پسند موسیقی میں رنگ لاتی ہیں اور ہند ایرانی موسیقی سے میل کھاتی ہیں مثلاً مفعول، فاعلات، مفاعیل فاعلن / مستفعلن، مفاعلن، مفتعلن مفاعلن / مفاعلات مفاعیل، فاعلن، فعلن / مفعول، مفاعیلن مفعول مفاعیلن / فاعلاتن اور مستفعلن کو عموماً زحافات کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ فارسی اردو میں بمشکل دس غزلیں ایسی ہیں جن کی بحریں ہندستان میں گائی جانے والی بحروں کی موسیقی سے کسی قدر ہٹ گئی ہیں۔ مثلاً "قرار نہیں ہے"، "قدم آگے"، "لرزد"، "چہ گفتے" کی ردیف والی غزلیں

غالب نے مقررہ بحروں میں زحافات کی کمی بیشی کر کے صوتی آہنگ کا انوکھا تجربہ کیا اور دیکھ لیا کہ ایسا کلام زبانوں پر عام نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) غالب نے اپنے کلام کا صرف انتخاب ہی شائع کیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ اس مجموعے سے باہر جو ملے اُسے میرا کلام شمار نہ کیا جائے۔ اس انتخاب سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ پہلے کے لکھے ہوئے اشعار میں دونوں سمت سے اصلاح کی گئی ہے: ایسے لفظوں کے ذریعے جو ادائے مطلب میں مدد دیں اور ایسے مصرعوں یا ترکیبوں سے جو خیال کی ڈور تھامنے کے علاوہ زبان سے ادا کرنے پر بھی اچھے معلوم ہوں۔ لفظوں کی تراش اور مصرعوں کی مجموعی آواز میں بھی غالب ایک اعلا درجے کا فنکار نظر آتا ہے۔

ایک نکتہ اور اسی ضمن میں ابھرتا ہے: اردو کے کسی شاعر کے ہاں اتنی غزلیں یکجا نہیں ملتیں جو اوّل سے آخر تک منتخب اشعار کا مجموعہ ہوں یا جن میں اوّل درجے کے اشعار ایک ہی غزل میں اس طرح چنے ہوئے ہوں کہ خیال ایک ہی کیفیت کے مختلف پہلوؤں یا مرحلوں کا لطف لے سکے۔ ان میں باطنی رشتے کے علاوہ آوازوں اور لفظوں کا بھی حسن ہموار نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ جہاں دوسرے اساتذہ کے صرف بچے ہوئے شعر یادوں میں محفوظ رہ گئے ہیں، غالب کی سادہ، رواں اور عام فہم غزلوں کا بلکہ قصیدوں اور قطعوں کے بھی کئی ترتیب وار اشعار زبانوں پر رواں اور ذہن نشین ہوتے ہیں اور ادبی ذوق کے مختلف درجوں میں الگ الگ لطف دیتے ہیں۔

غالب کی مقبولیت کا راز اُن کی فنی بصیرت میں اور فنی بصیرت کے اسرار قدیم و جدید کی آویزش و آمیزش میں تہہ در تہہ چلے گئے ہیں۔ غالب نے کیا معنی آفرینی اور کیا لفظ تراشی، دونوں سمتوں سے فارسی اردو کی ادبی وراثت پر ردّ و قبول کا بے رحم عمل کیا ہے لیکن ردّ و قبول کے اس بے رحمانہ عمل نے ہی اس کی شاعری کو توانائی اور تازگی بخشی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند

دیوانِ غالب کے خود نوشت مخطوطے کی بحث

اپریل ۱۹۶۹ء میں بھوپال سے جو مخطوطہ[1] دیوانِ غالب دریافت ہوا تھا اور جسے متفقہ طور پر غالب کی تحریر سمجھا جاتا تھا اس کے بارے میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے ہماری زبان میں بحث اٹھائی کہ یہ غالب کے ہاتھ کی تحریر نہیں۔ اس سلسلے میں انکا پہلا مضمون یکم اگست ۱۹۶۹ء کے پرچے میں آیا۔ اس کے جواب میں کچھ مراسلے آئے۔ ان سب کے جواب میں نظر صاحب نے ایک طویل سہ قسطی مضمون ۱۵ اکتوبر، ۲۲ اکتوبر اور یکم نومبر ۱۹۶۹ء کے شماروں میں شائع کیا۔ اسکے بعد مضامین اور مراسلوں کا سلسلہ جاری ہوگیا جس میں خاص طور سے اکبر علیخاں، ابو محمد سحر اور راقم الحروف نے حصہ لیا۔ میرا ایک مضمون یکم دسمبر اور ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء کے پرچوں میں آیا۔ میں نے نظر صاحب کے اکثر اعتراضات سے اختلاف کیا لیکن ان کی بعض دلائل کے پیش نظر نسخے کے بخطِ غالب ہونے کے بارے میں قدرے تذبذب کا اظہار کیا۔

ہماری زبان میں یہ مضمون لکھنے کے بعد میرے پاس اکبر علی خاں اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کے کچھ خطوط آئے نیز اس مخطوطے پر دو اور مضامین لکھتے وقت کچھ اور حقائق سامنے آئے جن سب کے نتیجے میں شکوک کے بادل چھٹ گئے اور مجھے اطمینان ہوگیا کہ مخطوطے کا متن اور اصلاحیں غالب کے قلم ہی سے ہیں۔ ذیل کی سطور اسی مباحثے کے سلسلے میں تحریری تاثرات پر مشتمل ہیں۔

ہماری زبان میں چھپے مضمون کی یکم دسمبر ۱۹۶۹ء کی قسط میں ایک جملہ یوں چھپا ہے "بھوپال سے برآمد ہوئے دونوں خطوں کی کتابت کا جو بعد میں تجزیہ کیا گیا ہے اسے دیکھ کر غالب کی تحریر کے بارے میں ماہرینِ غالبیات کے قولِ فیصل پر میرا عقیدہ متزلزل ہوگیا ہے۔"

اکبر علی خاں اس جملے سے پریشان ہوئے۔ میں نے صراحت کی کہ میں نے مسودے میں دونوں "مخطوطوں" لکھا تھا۔ "خطوں" چھپنا سہوِ کتابت ہے۔ پھر بھی مجھے مندرجہ بالا عبارت کے دوسرے حصے سے انکار نہیں۔

نسخۂ بھوپال میں دو قسم کی اصلاحیں اور اضافے ہیں، خوشنما خط میں اور بدنما خط میں۔ نسخۂ عرشی طبع اوّل کے دیباچے میں عرشی صاحب ان میں سے بیشتر کو (اغلاطِ املا[2] والی تحریر سمیت) غالب کے ہاتھ کا قرار دیتے ہیں۔ بعد میں انھوں[3] نے یہ تسلیم کیا کہ بدنما خط کے اندراجات بخطِ غالب نہیں ہیں۔ گویا خوشخط کے اضافے بخطِ غالب ہیں۔ ادھر مالک رام صاحب[4] کا قول ملاحظہ ہو۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ کر دینا بیجا نہیں ہوگا۔ نسخۂ حمیدیہ

---

[1] اس مضمون میں نسخۂ حمیدیہ کی اصل گمشدہ مخطوطے کو نسخۂ بھوپال کہا جائیگا۔

[2] دیباچہ ص ۲۲۔ [3] نسخۂ حمیدیہ کی فروگذاشتیں از مولانا عرشی صحیفہ غالب نمبر حصہ سوم جولائی ۱۹۶۹ء ص ۵۔ [4] گل رعنا غالب کا گمشدہ انتخاب مشمولہ نقدِ ذاکر جلد اوّل ص ۲۰۳

کے حواشی کے بارے میں مفتی محمد انوار الحق کا یہ کہنا ہے کہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ٹھیک نہیں۔ ان میں سے بیشتر اضافوں کا خط غالب کے خط سے بالکل نہیں ملتا۔ یہ اضافے کسی اور شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں،

لیکن ڈاکٹر عبداللطیف نے ماہرین تحریر کی مدد سے فیصلہ کیا کہ اس نسخے میں ایک لفظ بھی غالب کے قلم سے نہیں تھا۔ نودریافت نسخے کی ایک یادداشت کے بارے میں مالک رام صاحب[۲] لکھتے ہیں

"اس بے نظیر خطی نسخے کے ص ۴۱ (الف) پر حاشیے میں یہ اندراج ملتا ہے۔ لعل خاں تاریخ اول صفر ۱۲۳۵ در ماہیہ حیار۔ ظاہرا کسی شخص لعل خاں کے ملازم رکھے جانے کی یادداشت ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ تحریر بھی غالب کے قلم سے ہے۔ مجھے اس میں شبہ ہے۔ یہ غالب کے سوادِ خط سے مشابہ نہیں اور اس میں بعض ایسی خصوصیتیں ملتی ہیں جو غالب کی روش نہیں"۔

عرشی صاحب اور اکبر علی خاں عرشی زادہ کا فیصلہ ہو کہ یہ یادداشت غالب کے قلم سے ہے۔ فی الحال اس بحث سے قطع نظر کیجئے کہ عرشی صاحب، مالک رام صاحب اور ڈاکٹر عبداللطیف میں کس کی بات صحیح ہے۔ اہم یہ ہے کہ یہ سب ماہرین غالبیات ہیں اور غالب کے خط کی شناخت کے بارے میں اختلافِ رائے کے باعث ان میں سے کسی ایک کے قولِ فیصل کو آنکھ موند کر تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اپنی محدود فہم کو بھی بروئے کار لانا ہوگا۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ان علماء کے متبحرانہ مطالعے کے باعث غالبیات میں ان کی رائے کو زیادہ سے زیادہ وقعت دینی ہوگی اور اُسے بآسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

غالب کے خود نوشت دیوان تک بیشتر قارئین کی رسائی نقوش غالب نمبر حصہ دوم کے طفیل ہو سکی ہے۔ میں اس کے بارے میں چند باتیں عرض کر دوں۔

۱۔ اس کے مقدمے میں پہلے ہی صفحہ پر جو لکھا ہے کہ بھوپال کے کتب فروش نے مخطوطے فروخت کرتے وقت توفیق احمد سے یہ کہا تھا

" میاں کیا یاد کرو گے تمہیں مرزا غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان دے رہا ہوں۔"

میں نے توفیق احمد سے اس کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے مجھے خط میں لکھا کہ شفیق احمد نے ان سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔

۲۔ نقوش میں مخطوطے کے صفحات کے عکس کے ساتھ ساتھ برابر کے صفحے پر نستعلیق قرأت بھی دی ہے۔ بعض اوقات اس قرأت اور آخر میں دی ہوئی تصریحات کی قرأت میں اختلاف ہے۔ ہر جگہ تصریحات کی قرأت صحیح تر ہے۔ نستعلیق میں حوالے کے بعض نمبر یا تصریحات سے غائب ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ نستعلیق قرأت نقوش کو پہلے بھیجی گئی اور تصریحات بعد میں۔

۳۔ مخطوطے میں جن اوراق پر حاشیے میں غزلوں کا اضافہ ہے وہ سائز میں زیادہ بڑے ہیں۔ نقوش میں سارے صفحوں کو ایک سائز پر رکھنے کے لئے ان بڑے صفحات کو چھوٹا کر کے چھاپا گیا ہے جس کے باعث ان صفحات کی کتابت اصل کے مقابلے میں خفی تر ہو گئی ہے۔

نقوش کے ص ۲۰۸ پر[ے] لعل خاں والی یادداشت اصل نسخے کے مقابلے میں ایک انچ نیچے لگا کر چھاپی گئی ہے تاکہ چوڑائی میں زیادہ جگہ نہ لے۔ اس یادداشت کا علیحدہ سے عکس لے کر نصب کیا ہوگا۔ اور ص ۲۴۲ پر یہ دلچسپ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ یہ شعر

آتش افروزی یک شعلہ ایما تجھ سے
چشمک آرائی یک شہر خموشاں تجھ سے

رُخ اُلٹ کر چھاپ دیا گیا ہے۔ اس کا بھی علیحدہ سے فوٹو لے کر لگایا ہوگا۔ اصل میں یہ شعر متن کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ہے لیکن نقوش کے عکس میں متن کی طرف مُنھ کئے گھور رہا ہے نیز متن سے

[ے] اس مضمون میں صفحات کا حوالہ نقوش کے متعلقہ نمبر کا ہے۔ مجموعۂ عرشی زادہ کا حوالہ جہاں کہیں ہے وہاں صراحت کر دی گئی ہے

[۲] محوالۂ ہماری زبان یکم مئی ۱۹۶۸ء ص ۹
[۳] مقدمہ گل رعنا ص ۲۰ مرتبہ مالک رام

نزدیک تر ہو گیا ہے۔

۲۔ ذیل کے مقامات پر نقوش کا عکس ناقص رہ گیا ہے۔ اس کا اندازہ نسخۂ عرشی زادہ سے مقابلہ کرنے سے ہوا۔

(الف) ص ۷ کے نیچے ترک یار کاب کا لفظ 'ہوا' چھوٹ گیا ہے۔

(ب) ص ۲۷ پر ع خطِ نوخیز کی آئینہ میں دی کس نے آرایش
اس مصرع کا 'دی' جو نیچے کی طرف لکھا ہوا ہے نقوش میں حذف ہو گیا ہے۔

(ج) ص ۱۲۰ کے نچلے حاشیے پر اس مصرع

لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی

کا اوپری حصہ ہونا چاہیئے تھا۔ نچلا حصہ جلد بندی میں کٹ گیا ہے۔

(د) ص ۱۴۹ کے دائیں حاشیے کے الفاظ 'مجمرِ بزم فسردن' حذف ہو گئے ہیں۔

(ہ) ص ۲۶۰ کے دائیں حاشیے کا یہ شعر حذف ہو گیا ہے۔

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

اصل نسخے میں بھی دوسرے مصرع کا بیشتر حصہ کٹ گیا ہے

مجھے ایسی چار اصلاحیں نظر آئیں جو میری رائے میں مصنف ہی کے قلم سے ممکن ہیں۔ ان میں سے تین میں نے خود تلاش کیں اور ایک کی نشان دہی نسخۂ عرشی زادہ سے ہوئی۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) نقوش ص ۱۷۲۔ نسخۂ عرشی زادہ ص ۶۳۔ ایک مصرع ہے

لیکن اسدؔ بہ وقت گزشتن جریدہ ہوں

اس مصرع میں 'لیکن اسد' کے الفاظ بالکل صاف لکھے تھے۔ انھیں کاٹ کر دوبارہ بالکل اسی طرح 'لیکن اسد' لکھ دیا۔ اکبر علی خاں لکھتے ہیں۔

"ممکن ہے غالبؔ تخلص کی خاطر مثلاً 'غالب مگر بوقت گزشتن'۔ بنانا مقصود ہو لیکن ایک بار پھر وہی پہلی شکل نیچے لکھ دی گئی ہے جو مخطوطۂ بھوپال میں بھی نقل ہوئی ہے"

بالکل یہی میرا قیاس تھا۔ شاعر نے 'غالب مگر' لکھنا چاہا لیکن پھر خیال آیا کہ صرف استثنا کا بہتر اور صحیح تر مقام جملے (مصرع) کے شروع میں ہے اس لئے پھر سے قلم زد قرأت لکھ دی۔ یہ گومگو مصنف کے دماغ ہی میں ہو سکتی ہے۔

(۲) اسی صفحے پر ایک مصرع یوں ہے

زبس ہر شمع یہاں آئینہ حیرت طرازی ہے

دونوں ایڈیشنوں کے مرتبین کا خیال ہے کہ اصلاً کاتب نے اس مصرع کو یوں لکھا تھا ع

زبس ہر شمع ہے آئینۂ حیرت طرازی ہا

پہلے 'ہے' کو کاٹ کر تو صریحاً اس کے اوپر 'یہاں' لکھا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ آخری 'ہے'، اصلاً 'ہا' تھا۔ اس 'ہے' کے پیچھے کاتب کے مخصوص انداز کا 'ہا' پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ 'ہا' کی کشش ملاحظہ ہو ص ۸۷ کے پہلے مصرع یا ص ۸۵ کی غزل کی ردیف میں۔ میرا قیاس ہے کہ جس بیاض سے کاتب نے اس غزل کو نقل کیا ہے اس میں یہ مصرع یوں تھا ع

زبس ہر شمع ہے آئینہ حیرت طرازی ہاں

شاعر موجودہ نسخے پر لکھتے وقت 'زبس ہر شمع ہے آئینہ حیرت طرازی' تک لکھ پایا کہ اس کے ذہن نے سجھایا کہ 'ہے' اور 'یہاں' کی ترتیب بدل دی جائے تو جملہ کی نحوی ساخت زیادہ فطری ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے پہلے 'ہے' کو کاٹ کر اس کی جگہ 'یہاں' لکھ دیا اور حیرت طرازی کے آگے 'ہے' لکھ کر جملہ مکمل کر دیا۔

۳۔ ص ۱۸۴ پر کاتب نے اصلاً ایک مصرع لکھا ع

صفائے موجۂ گوہر بلا گردانِ تمکینی

اس کے بعد اصلاح ذہن میں آئی ع

صفائے موجِ گوہر ہے بلا گردانِ تمکینی

اس نے 'موجہ' کو 'موج' بنا دیا لیکن 'گوہر' کے بعد 'ہے' نہ لکھ پایا تھا کہ ایک اور اصلاح سوجھ گئی۔ دوسرے مصرع ع

عرق بھی جن کے عارض پر بہ تکلیفِ حیا گم ہو

میں ضمیر آیا ہے لیکن پہلے مصرع میں اس کا مرجع تو ہے نہیں۔ اسلئے پہلا مصرع یوں بدلا گیا ع

بلا گردانِ تمکینِ بُتاں، صد موجۂ گوہر

دوسری اصلاح کرنا مصنف ہی سے ممکن ہے۔

۴۔ ص ۲۲۰ پر مصرع ہے ؂

گر نہیں پاتا درونِ خانہ ہر بیگانہ جا

اکبر علی خاں نوٹ لکھتے ہیں کہ "پہلے درونِ بزم" لکھنا چاہتے تھے مگر ابھی م نہیں بنا پائے تھے کہ اصلاح ہو گئی اور 'بز' کو 'خا' بنا کر درونِ خانہ صورت دیدی، کتابت کے بیچ اس طرح اصلاح مصنف ہی کر سکتا ہے۔

مجھے اس مطالعے کے دوران ایک ایسی مثال ملی جو اس مفروضے کے خلاف جاتی ہے۔

مخطوطات میں صفحے کے نیچے بائیں گوشے میں اگلے صفحے کے ابتدائی لفظ یا الفاظ لکھ دیتے ہیں جنھیں رکاب یا ترک کہتے ہیں۔ اس مخطوطے میں صرف تین صفحات پر ترک کے الفاظ ہیں۔

نقوش ص ۴ د کے آخر میں ترک کے الفاظ "مگر دستے" درج ہیں لیکن اگلے صفحے کا پہلا لفظ 'حصار' ہے۔ "مگر دستے" ص ۴ ہ ہی کے آخری سے پہلے مصرع ؂

مگر دستے بہ دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

کے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کے بطور ترک درج ہونے کی دو تاویلیں ممکن ہیں۔

(۱) کاتب نے اصلاً اس صفحے کو ؂ مگر دستے ......، والے مصرعے سے پہلے مصرع ؂

نفس حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیِ مژگاں،

پر ختم کیا۔ صفحے کے نیچے ترک کے الفاظ "مگر دستے" لکھ دئے لیکن پھر دیکھا کہ ابھی اس سہ کالمی صفحے کے تیسرے کالم میں کافی جگہ باقی رہ گئی ہے اس لئے اس نے مزید دو مصرع لکھ دئے لیکن سہواً ترک کو نہیں بدلا۔

اس تاویل میں بڑی قباحت یہ ہے کہ اس سہ کالمی صفحے کے پہلے اور دوسرے کالم میں نو نو سطریں (مصرع) ہیں۔ تیسرے کالم کو اگر سات سطور پر ختم کر دیا جائے تو متوازی کالم نمبر ۲ کے مقابلے میں تقریباً ڈیڑھ انچ جگہ سادہ رہ جاتی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کاتب نے اس کالم کو "مگر دستے ....." سے پہلے ہی مصرع پر ختم کرنے کی بات سوچی ہو۔

(۲) کاتب نے یہ غزل جس بیاض سے نقل کی اس کا متعلقہ صفحہ "مگر دستے ...." سے پہلے مصرع پر ختم ہوتا تھا۔ کاتب نے نقل کرتے وقت اپنے نسخے کے ص ۴ پر دو مصرع زیادہ لکھے۔ وہ ترک کے الفاظ کی اہمیت سے ناواقف تھا۔ اس نے اصل بیاض کے نیچے کے گوشے کے الفاظ "مگر دستے" بھی نقل کر دئے گو در اصل اس صفحے پر ترک کے طور پر 'حصار' لکھنا تھا۔ شاعر کیوں ایسی غلطی کرنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے اصل بیاض کا کاتب غالب تھا اور اس نسخے کا کاتب کوئی اور شخص۔

ان تاویلوں میں سے ایک کا انتخاب میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

کسی کا خط پہچاننے میں دو عناصر سے مدد ملتی ہے

۱۔ اس کی ہیئت کا مجموعی تاثر یعنی مختلف حروف کی کشش وغیرہ کا انداز۔

۲۔ کاتب کا بعض حروف کو لکھنے کا مخصوص ڈھنگ

جن حضرات کی لکھائی پختہ اور خوشخط ہوتی ہے اس کو شناخت کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ تیزی سے شکستہ لکھی ہوئی تحریر کو پہچاننا سہل تر ہوتا ہے۔ یوں بھی ہیئتِ خارجی کے عام تاثر سے دھوکا ہو سکتا ہے لیکن بعض حروف کی کتابت کا عجیب مخصوص انفرادی طریقہ کاتب کی شناخت میں بہت ممد ہوتا ہے۔

یہ طے ہے کہ اس مخطوطے کی لکھاوٹ کو دیکھنے سے مجموعی تاثر بالکل غالب کی دوسری تحریروں (جن میں مکتوبات سب سے زیادہ مستند ہیں) جیسا ہوتا ہے۔ اس کی لکھاوٹ کی عجیب قسم کی خصوصیات حسب ذیل ہیں

۱۔ ایجاد، انجام جیسے الفاظ میں الف کو اوپر نیچے اس طرح موڑ کر جوڑنا جس سے بالکل ص کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے مثلاً۔

ص ۲ پر ؂ لذتِ ایجادِ ناز، افسونِ عرضِ ذوقِ قتل [illegible]

ص ۱۰۱ پر مطلع "آگہی میں نہیں شوخیٔ ایجاد صدا ہیچ" میں "ہیچ"
ص ۱۰۳ پر مطلع "کرے ہے جز مردہ انجامی کو داغِ یادِ گل" میں "بجھا"
دیں "گ"، "د" کو اس طرح ملانا کہ طبیعت کا ٹیڑھا پن
ظاہر ہوتا ہے مثلاً
ص ۷۲ پر مطلع "شعلہ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا" میں "گرداب"
ص ۱۰۱ پر مطلع "چشمِ مستِ یار سے ہے گردنِ مینا بہ ہاتھ" میں "گردن"
گ، د کے جوڑ کی معتدل صورت یہ ہے
ص ۱۰۸ پر مطلع "نہ جاتا مان کر بے جرم، غافل تیری گردن پر" میں "گردن"
ص ۱۱۲ پر مطلع "میں دور گردِ قربِ بساطِ نگاہ تھا" میں "گرد"

۳۔ بادہ، آمادہ کو ایسے لکھنا جیسے بالہ، آمالہ لکھا ہو مثلاً
ص ۲۳۰ پر غزل کے قافیے میں بالہ، آمالہ۔ اور اسی طرح بالا کو ص ۵۲ پر
مطلع "مبارکباد اسد ..... دردمند آیا" میں "بالا"

۴۔ "دد" کو یوں ملانا
ص ۶۶ پر مطلع "دودِ بجمرِ لالہ ساں، درد تہِ پیمانہ تھا" میں "درد"

۵۔ ٹ کی بالائی ط کی جگہ چار نقطے :: لگانا اور ڈ، ڑ
پر ط بنانا۔

پہلی چار خصوصیات شکستہ خط میں لکھنے پر ظاہر ہوتی ہیں کاتب
بعض اوقات خوشخط لکھتا ہے تو یہ وضع باقی نہیں رہتی۔

غالب کی تحریر کے سب سے زیادہ نمونے پرتھوی چندر کے
"مرقع غالب" میں ملتے ہیں۔ افسوس کہ مرتب نے مرقع کے حصۂ دوم
میں صفحات کے نمبر نہیں دیے جس کی وجہ سے اس کے صفحات کا حوالہ
دینا بڑا مشکل ہے۔ اس مضمون کے قارئین سے التماس ہے کہ وہ صفحات
کے نمبر سلسلے کو پکڑ کر آخر تک ہر صفحے پر خواہ وہ تصویر ہو کہ تحریر
کہ سادہ ہو نمبر ڈال لیں۔ اس طرح آخری خط پر صفحہ نمبر ۲۹۰ آئے گا۔
میں انھیں نمبروں سے حوالہ دوں گا۔

غالب کے چند خطوط نقوش کے زیر بحث شمارے میں بھی ہیں
نیز اس میں گل رعنا بخطِ غالب کے چار صفحوں کا بھی عکس ہے۔ اب
مندرجہ بالا خصوصیاتِ تحریر کا وقوع ملاحظہ ہو۔

۱۔ نقوش [illegible] مخطوطے کے علاوہ "ایجاد"، "انجامی" [illegible] الف
کا ص نما ابتدائی الف کہیں نہیں ملتا۔ شاید یہ ابتدائی طرزِ تحریر تھا
جو بعد میں ترک کر دیا گیا۔

۲۔ "گرداب" اور "گردن" میں زیادہ پیچ پیچ والی شکل "گ" محض
لڑکپن کا کھلنڈرا پن تھی۔ بعد میں ترک کر دی گئی لیکن گرد کی معتدل
شکل بعد میں بھی ملتی ہے مثلاً مرقعِ غالب میں ص ۲۹۶ پر
اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے میں "کھلایا"
ص ۲۱۹ پر مطلع "میتواں کرد جاں فشانی ہا" میں "کرد"
گل رعنا کے عکس میں اس کی مثال نظر نہیں آئی۔

۳۔ اس کی مثالیں خطوط میں کثرت سے ملتی ہیں مثلاً مرقعِ غالب
کے خطوط مورخہ ۸ نومبر ۱۸۶۵ء (ص ۲۳۹)، ستمبر ۱۸۶۱ء (ص ...)،
۱۷ دسمبر ۱۸۶۱ء (ص ۲۸۰) وغیرہ کے آخر میں "زیادہ حدِ ادب"
میں "زیادہ" کو "زیالہ" لکھا۔ گل رعنا کے عکس میں نقوش ص ۳۴۲
پر فارسی مصرع "بہ موجِ بادہ ماند پرتوِ شمعِ مزارِ ما" میں "بالہ"

۴۔ دد کو ملا کر "دو" لکھنے کی مثالیں خطوط میں اور گل رعنا
میں بکثرت ہیں۔

۵۔ ٹ، ڈ پر چار نقطوں اور ڈ، ڑ پر ط کی مثالیں خطوط
اور دیگر تحریروں میں بکثرت ہیں۔ گل رعنا کے عکس میں ۳۳۱ پر اس کی
مثال یہ ہے۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
پھر دل میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں

یہاں بھی بیٹھے پر ط کی جگہ چار نقطے لگائے ہیں

غالب کی تحریر کی اور بہت سی معمولی خصوصیات ہیں جو زیرِ نظر
مخطوطے، گل رعنا اور خطوط میں مشترک ہیں۔

اس مخطوطے میں غالب نے اشعار کو لکھتے وقت بعض صفحوں
پر طرح طرح سے ترچھے مربع بنائے ہیں مثلاً ص ۶۸ پر یا لعل خاں
والے صفحے پر۔ گل رعنا (نقوش ص ۳۴۲) پر بھی اسی طرح مربع
بنا کر شعر لکھے ہیں اور اس رنگین مزاجی کی جھلک مرقعِ غالب کے
مکتوب مورخہ ۱۸ محرم ۱۲۸۳ھ (ص ۲۷۴) میں بھی ایک رباعی کی

اسی قسم کی کتابت میں نظر آتی ہے۔ ان مماثلتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ صرف زیرِ نظر مخطوطہ دیوان بلکہ گل رعنا نسخۂ خواجہ محمد حسن بھی غالب ہی کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

کہا گیا ہے کہ عمر کے گزرنے کے ساتھ کسی شخص کی لکھاوٹ میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ مجھے اس میں کسی قدر شک ہے۔ جب انسان لکھنا سیکھتا ہے تو اس کا ہاتھ پکا ہونے میں کچھ سال لگتے ہیں لیکن پندرہ سولہ سال کی عمر کے بعد اس کے خط میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہیں ہوتی جس سے خط کا مجموعی تاثر ہی بدل جائے ہاں بعض مخصوص حروف کی کشش میں ترمیم واقع ہو سکتی ہے۔ میں کسی زمانے میں شاعری کیا کرتا تھا۔ تیس بتیس سال پہلے کی شاعری کی کاپیاں نکال کر دیکھیں مجھے اپنی اُس وقت کی اور آج کی تحریر میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے کوئی دوسرا دیکھے تو فرق معلوم کر سکے۔ اس کے ساتھ مجھے یہ تسلیم ہے کہ گو کسی شخص کی لکھائی کی عام معیاری ہیئت یکساں رہتی ہے لیکن وہ تیزی سے شکستہ لکھے تو اس کی ہیئت مجموعی میں فرق آ جائے گا۔ یہ ماہرینِ تحریر ہی کے بس کا ہے کہ وہ کسی کی سنبھال کر لکھی ہوئی تحریر کو دیکھ کر اس کے خطِ شکست کو صحت کے ساتھ پہچان سکیں۔

زیرِ بحث مخطوطے کے متن میں ص ۱۴۴ کے اوپری حاشیے پر مقطع درج

اے اسد ہیں آشنا بیگانۂ سوزِ نگار
ورنہ کس کو ہے بے افسانے کی تاب استماع

ڈاکٹر انصار اللہ نظر[1] نے اس مقطع کو الحاقی غیر قرار دیا۔ میں اس میں ایک 'اصلاح' کا اضافہ کرتا ہوں۔

ع راہِ صحرائے حرم میں ہے جرس ناقوس دلیں ص ۱۳۰

اس مصرع کے الفاظ 'میں ہے جرس' بھی اس قدر رواں اور شکستہ خط میں ہیں۔ ان پر مستزاد دیکھیے لعل خاں والی یادداشت۔ ان تینوں تحریروں کا عام تاثر متن کی کتابت کے انداز سے مختلف ہے لیکن کون جانے کہ اگر غالب تیزی سے رواں شکستہ لکھتے تو یہی انداز نہ ہو جاتا۔ ان تینوں میں کم از کم مقطع کو ضرور مشکوک کی ذیل میں رکھنا ہوگا۔

بقیہ اصلاحوں کا خط اکثر جگہ متن کے خط سے زیادہ صاف ستھرا، پختہ اور خوشنما ہے۔ کسی قلم زد مصرع اور اس کے اصلاحی مصرع کے مشترک الفاظ کا مقابلہ کرنے سے یہ بات سامنے آ جائے گی مثلاً ملاحظہ ہو ص ۶۶ پر اصلاحی مصرع

ع حیرت اپنے نالۂ بیداد سے غفلت بنی

میں 'حیرت'، اور 'غفلت'، اور قلم زد مصرع میں یہی الفاظ۔ یا ص ۸۸ پر مطلع اور مقطع کے مشترک مصرع ثانی

ع جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

میں یہی فرق۔ متن میں س، ش، ن وغیرہ کے دائروں میں دائیں اور بائیں طرف زاویے جیسے بن جاتے ہیں لیکن اصلاحوں میں یہ دائرے خوشنما اور گولائی کے ساتھ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف بیشتر اصلاحیں متن کے کئی سال بعد کی گئیں بلکہ انھیں اطمینان سے زیادہ توجہ سے لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود ان اصلاحوں کا عام انداز متن کی تحریر جیسا ہی ہے۔ ان کے خوشنما دائروں سے مماثل مثالیں متن میں بھی کہیں کہیں مل جائیں گی اور متن جیسی شکستہ اور کم خوشخط کشش کی مثالیں اصلاحوں میں بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہیں۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر[2] نے اپنے مضمون میں مخطوطے سے اغلاطِ کتابت کی بہت سی مثالیں دے کر مجھے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ سب سے پہلے ان اغلاط کی نشان دہی نسخۂ عرشی زادہ میں کی گئی ہے اور اس کے بعد نقوش کے بابِ تصریحات میں۔ میں ان اغلاط کو دیکھ کر بدظن ہو گیا تھا کہ کوئی موزوں طبع کاتب تسامحات نہیں

---

[1] دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ، ایک جائزہ۔ ہماری زبان یکم اگست سنہ ص ۵

[1] کاش میں نے دلی یونیورسٹی کا مخطوطات شناسی کا کورس لیا ہوتا تو تحریر کی شناخت میں اس قدر بے یقینی کا شکار نہ ہوتا

[2] دیوانِ غالب کا نو دریافت نسخہ۔ ہماری زبان [illegible]

کر سکتا لیکن میں نے اپنے ایک حالیہ مضمون "خود نوشت دیوانِ غالب اور اس کی اصلاحیں" لکھنے اور صاف کرنے کے دوران جو غلطیاں کیں ان کی فہرست بنانے پر میری آنکھیں کھل گئیں یا شکوک کا ازالہ ہو گیا۔ ملاحظہ ہو۔

غلط	صحیح	غلط	صحیح
جا سکتا ہے	جاتا ہے	بہت سے	بہت سی
چشمۂ سے	چشمۂ روزن سے	راہِ صحرائے عدم	راہِ صحرائے عدم
گرفتارِ الفت	گرفتارانِ الفت	اسے	اسد
مرتب	مرتب نے	خط	ختم
اندازہ	انداز	فیصلہ	فاصلہ
		برقِ وجد	وجد برق

ان میں سے آخری دو کو میں نے لکھنے کے بعد ہی دیکھ لیا اور فوراً کاٹ کر تصحیح کر دی۔ زیرِ نظر مضمون کے مسودے کے ابتدائی چند صفحات میں یہ غلطیاں ملیں۔

غلط	صحیح
'ص ۳۲۲'	'ص ۳۰۳'
جہ موج بادہ پرتو	بہ موج بادہ مانند پرتو
کھائی سکتا ہے	کھائی سکتا ہے
دیوانہ گیا	جوانانہ گیا
مثالیں ..... ہے	مثالیں ..... ہیں

ان سب کی نظرِ ثانی میں اصلاح کی۔ ان میں سے کئی مثالیں مصرعوں کے اجزا میں سے ہیں جہاں میری غلطی سے مصرع غیر موزوں ہو گیا۔ ان اغلاط کے ارتکاب کی واحد وجہ یہ ہے کہ میرا قلم جس رفتار سے لکھتا ہے میرا ذہن اس سے بہت تیز رفتار سے دوڑتا ہے۔ میں لکھتا کچھ ہوں اور ذہن اسی موضوع سے متعلق کن کن خیالوں میں بھٹک جاتا ہے جس کے نتیجے میں بعض اوقات قلم مسودے کے نقش کی بجائے خیال کا پرتو اتار دیتا ہے۔ مسودے کی تبییض کے دوران جب میں نے یہ جملہ لکھا دیکھا۔

؎ یہاں سے معروف پر خط ہونے والے الفاظ پر اضافت لگائی جائے۔

تو 'ختم' کی بجائے 'خط' دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ 'خط' کا ذکر آگے پیچھے کہیں نہ تھا۔ محض صوتی مماثلت نے دھوکا دیا۔ میں نے یہ مسودے عالمِ سرخوشی میں نہیں لکھے۔ میں نہ کم سواد ہوں نہ غیر موزوں طبع۔ اگر مجھ سے یہ غلطیاں ہو سکتی ہیں تو غالب سے بھی ممکن تھیں۔ اہم یہ ہے کہ مخطوطے کی ہر غلطی کا صحیح لفظ پہلی نظر ہی میں سمجھ میں آ جاتا ہے۔ میں نے نظرِ ثانی میں اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لی۔ معلوم ہوتا ہے غالب نے اپنی تحریر پر نظرِ ثانی نہیں کی۔ بعد میں جن مصرعوں میں اصلاح کی گئی صرف انھیں کو دیکھا۔ وہ غیر محتاط کاتب تھے۔

اب لیجئے 'رعنا نیے' کا سوال۔ میں اکبر علی خاں کا مراسلہ[1] پڑھنے کے بعد بھی اسے 'رعنا نیے' مانتا تھا۔ ابو محمد سحر نے بھی مجھے ایک خط میں یہی لکھا۔ مجھے یہ خلش ضرور ہوتی تھی کہ کاتب (وہ کوئی بھی ہو) اگر اتنے مشکل اشعار اور بہت سے اجنبی مشکل الفاظ کو صحیح لکھ سکتا ہے تو 'رعنا' جیسے معمولی لفظ کے املا میں کیونکر ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ آج اس مضمون کو لکھتے وقت میں نے دوبارہ اکبر علی خاں کا مراسلہ پڑھا، مصرع کی عکسی نقل کو گھورتا رہا اور نقوش میں جگہ جگہ 'سے' کی مختلف لکھاوٹوں کا تجزیہ کیا۔ کاتب بیشتر 'سے' کو تین شوشوں والے 'س' کے ساتھ لکھتا ہے لیکن اس سے کم تر جگہوں پر بغیر شوشوں کے لمبی کشش سے بھی لکھ دیتا ہے۔ ان مثالوں میں بالعموم ابتدائی سرا اتنی اوپر اٹھا نہیں ہوتا لیکن ایک آدھ جگہ تقریباً اتنا بلند بھی مل جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس سے پہلے ہی صفحے ۱۵۴ پر

؎ افشاں غبارِ سر سے فردِ صدا کروں میں 'سے'

مرقع غالب میں مکتوب مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۶ء ص ۱۴۲ کی دوسری سطر ملاحظہ ہو

'دلّی سے رام پور تک ذوقِ قدم بوس میں جوانانہ گیا میں 'سے'

---

[1] نسخۂ عرشی زادہ کے بارے میں' مراسلہ از اکبر علی خاں۔ ہماری زبان ۲۲ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۷۔

یہ مسلّم ہے کہ اس مخطوطے میں اکثر جگہ فالتو نقطے لگے ہوئے ہیں جو غالباً سامنے کے صفحہ کی گیلی روشنائی کی چھاپ ہیں۔ مصرعہ 'نسے' کے 'ٹ' پر اور 'نسے' کی شروعات ہی میں ایک نقطہ جڑا ہوا ہے۔ اگر 'نسے' لکھنا ہوتا تو نقطے کشش شروع ہونے سے پہلے ہی لگتے تو اکبر علی خاں نے لکھا کہ کتابت کے مطابق ہی پڑھنا ہے تو 'رعنا نسے' پڑھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پہلے مصرعے کے 'سیدا' کے الف کے اوپر دو فاضل نقطے اوپر آتلی لگے ہوئے ہیں اسی طرح 'رعناسے' کے سے کے اوپر بھی مقابل صفحہ سے مست کرم داشتن کے طور پر دو نقطے مل گئے ہیں جن میں سے ایک نے ستم ڈھاکر 'سے' کو 'نسے' بنا دیا ہے۔ اگر یہ دو نقطے فاضل مان لئے جائیں تو اس 'سے' کے اوپری سرے کی کشش ویسی ہی ہے جیسی اوپر درج کی ہوئی دو مثالوں میں کی۔

حاشیے کی غزلوں کو عام طور سے غالب کے علاوہ کسی اور کے خط میں مانا جاتا ہے اکبر علی خاں[1] کے نزدیک یہ تین اشخاص کے قلم سے ہیں۔

ع روئے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے۔
ایک شخص کے قلم سے 'ع سمجھا کے اسے یہ وضع چھوڑئے' دوسرے شخص کے قلم سے اور بقیہ تمام اضافے کسی تیسرے قلم سے۔ لیکن میں اس غزل کی طرف توجہ چاہتا ہوں۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

نقوش ص ۲۲

اس کے دوسرے مصرعے میں 'زیادہ' بالکل اسی طرح لکھا ہے جیسے متن میں ملتا ہے یعنی 'زیاده'۔ متن کے مطابق اور حاشیے کی دوسری غزلوں کے برعکس گ پر کہیں دوسرا مرکز نہیں۔

ع سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر، میں،
'پوچھے' کو 'پوچھے' نہیں لکھا جیسا کہ حاشیے کی دوسری غزلوں میں ہے۔

ع بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے (مجھے) بتا کہ یوں ص ۱۲۹
ع پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ خاک ص ۲۴۳
ع تقریر کا اس کی حالی مت پوچھو ص ۲۵۲

غزل کے دوسرے کئی الفاظ غالب کی تحریر کی غمازی کرتے ہیں لیکن بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں دو جگہ ٹ پر چار نقطوں کی بجائے بالائی ط ہی لکھی ہے۔

ع یہاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
ع جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

میرا خیال ہے کہ یہ غزل اگر کاتبِ متن کے قلم سے نہیں تو حاشیے کی دوسری غزلوں کے کاتبوں کے قلم سے بھی نہیں۔ 'زیادہ' کی تحریر مجھے سوچ میں ڈالتی ہے۔

تاریخ، شفیق احمد بھوپالی کی ڈائری میں مخطوطے کی تاریخ ۱۲۴۵ھ لکھے ہونے کا راز وہی ہے جو انصار اللہ[1] صاحب نے اپنے مضمون میں قیاس کیا ہے۔ 'نذرِ مقبول' میں لکھنے سے پہلے نثار صاحب ہماری زبان بابت ۸ر اگست ۱۹۷۰ء کے ایک مراسلے میں خبر دے چکے ہیں کہ مخطوطے کے ساتھ فارسی میں قصۂ لیلیٰ مجنوں تھا جو ۱۲۳۱ھ کی کتابت تھا۔ مراسلے میں ۱۲۳۱ھ غالباً سہوِ کتابت ہے۔ نذرِ مقبول میں اس کی تاریخ ۱۲۴۵ھ درج ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کو دیکھ کر شفیق احمد نے دیوان کی تاریخِ کتابت بھی ۱۲۴۵ھ فرض کر لی۔

میں ڈاکٹر انصار اللہ کے اس بیان سے متفق ہوں کہ ہجری مہینے کے معاملے میں محض جنتری کے اندراج کو حرفِ آخر مان کر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غرّہ شوال کے متعلق ایک دن کا اختلاف ہم آئے سال دیکھتے رہتے ہیں۔ میرے شعبے کے کتب خانے میں پٹنہ کی شائع شدہ ایک ہندی انگریزی جنتری ہے جس میں ہجری عیسوی، بکرمی اور بنگالی سالوں کی ایک دو صدی کی تفصیل

---

[1] نسخۂ عرشی زادہ کے بارے میں، مراسلہ از اکبر علی خاں۔ ہماری زبان ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۰ء ص، [2] مقدمہ نسخۂ عرشی زادہ ص ۲۲

[1] دیوانِ غالب کا قدیم ترین مخطوطہ۔ ہماری زبان ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۶

[illegible] کے مطابق ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ کو جمعہ ہی کا دن نکلتا ہے
[illegible] دسمبر ۱۹۷۰ء کے اردو نامہ میں سید قدرت نقوی کا ایک
مضمون اس مخطوطے کی تاریخ کتابت کے بارے میں چھپا ہے ان میں
انھوں نے علمِ ہیئت کے حساب سے ثابت کیا ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں ۱۴ رجب
کو [illegible] کا دن تھا۔ علمِ ہیئت کا حساب کیا بلا ہے میری سمجھ میں
قطعاً نہیں آیا۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں توفیق احمد صاحب
کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے خبر دی ہے کہ برہانِ
قاطع کے ایک قلمی نسخے پر کاتب نے غرّۂ رمضان ۱۲۳۱ھ کو شنبہ
کا دن لکھا ہے اور نول کشور کی جنتری سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ان
شواہد کے ہوتے دوسرے سالوں کے مقابلے میں ۱۲۳۱ھ ہی کو سنہ
کتابت ماننا صحیح ترین معلوم ہوتا ہے۔

۲۲ دسمبر ۷۰ء کے ہماری زبان[1] میں ڈاکٹر انصار اللہ نے
دبی زبان سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے نسخۂ بھوپال کی کتابت
کی تاریخ ۱۲۳۱ھ نہ ہو کر ۱۲۴۳ھ ہو۔ ظاہراً ان کا مطلب ہے کہ
نسخے کی تاریخِ ترتیب ۱۲۴۳ھ ہو۔ ان سے پہلے ۱۵ دسمبر ۷۰ء کے
ہماری زبان میں ان کے کسی شاگردِ معنوی محمد آفاق صاحب نے ۱۲۴۳ھ
کی وکالت کی ہے۔ گستاخی نہ ہو تو یہ کہوں کہ یہ بیان غیر ذمہ دارانہ
ہے۔ اگر اس طرح ہر مسلّمہ مدلّل فیصلے کو چیلنج کیا جائے گا تو تحقیق میں
بالکل نراج کا عالم ہو جائے گا۔ اردو کلامِ غالب کے مختلف نسخوں کی
تاریخیں محض مصنّف کے بیان ہی سے ثابت نہیں ہوتیں بلکہ مقدارِ کلام
اور مصرعوں کی ترمیم و اصلاح سے بھی ان کے عہد کی تائید ہوتی ہے۔
غالب نے ۱۲۴۸ھ میں اپنے قدیم کلام کا انتخاب کیا اور بقیہ کلام
کو قلم زد قرار دیا۔ نسخۂ بھوپال میں وہ قلم زد کلام متن میں موجود ہے
اور جو کلام بعد کے متداول انتخاب میں جگہ پا گیا ہے اس کے بہت
سے مصرعوں کی روایت بعد کے مجموعوں کی نسبت فرسودہ تر ہے۔
نسخۂ بھوپال کی ترتیب کو کسی طرح ۱۲۴۳ھ کے بعد نہیں لے جایا
جا سکتا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کے ترقیمے میں صریحاً مندرج تاریخ کو
رد کیا جائے۔

اور اسی وجہ سے تو دریافت مخطوطہ، نسخۂ بھوپال سے
قدیم تر ہے۔ اس کے متن کے متعدد اشعار نسخۂ بھوپال کے اشعار
کی نسبت زیادہ فرسودہ ہیں۔ اگر دو چار مثالوں میں اسکے برعکس
ہے تو یہ غالب کے مزاج کا تلوّن ہے جس کی مثالیں اس کے کلام کی
ہر منزل میں بکثرت ملتی ہیں یعنی ایک متن کو اگلے نسخے میں بدلا اور
اس سے اگلی منزل میں پھر سابق متن پر واپس آ گئے۔

نقوش ص ۲۴۳ پر ایک قلم زد مطلع ہے جو مرتبِ قیاس
کے مطابق حسبِ ذیل ہے۔

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

چونکہ خود نوشت مخطوطے میں لکھ کر کاٹ دیا گیا ہے اور نسخۂ بھوپال
میں موجود ہے ڈاکٹر نذیر[1] نے اپنے موقف کی تائید میں ایک اور
دلیل قرار دیا کہ یہ نسخہ، نسخۂ بھوپال اوّل سے موخر ہے۔ چونکہ یہ
مطلع اس طرح کاٹ دیا گیا ہے کہ اس کا پڑھنا ممکن نہیں اس لئے
میں نے اوّل اوّل شبہ کیا تھا کہ ممکن ہے قلم زد مطلع کوئی اور ہو۔
اب مجھ پر اس مطلع کا راز عیاں ہو گیا۔ اب مجھے تسلیم ہے کہ یہ وہی
مطلع ہے لیکن غالباً انھیں الفاظ میں نہیں بلکہ اس کا نقشِ اوّل ہے۔
"ہر قدم" کے بعد "دوریِ منزل" کے الفاظ نہیں جھلکتے بلکہ کچھ اور ہیں۔
دوسرے مصرع کا پڑھنا اور بھی محال ہے۔ بہر حال ہے یہ اسی مطلع
کا قدیم ترین متن۔

اس زمین میں شاعر نے اصلاً سات شعر کہہ کر نسخے کے متن میں
لکھے۔ بعد میں اسے یہ زمین اتنی پسند آئی کہ مزید نو شعر کہہ کر دو غزلہ
کر دیا۔ یہ دو غزلہ نسخۂ بھوپال نیز نسخۂ شیرانی میں موجود ہے۔
"ہر قدم..." والا مطلع دوسری غزل کے حصّے میں آیا اس لئے
خود نوشت مخطوطے سے قلم زد کر دیا۔ اسکی تلافی کے لئے ایک نیا شعر۔

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایما تجھ سے
چشمک آرائیِ یک شہرِ خموشاں تجھ سے

---

[1] دیوانِ غالب کا متنازعہ مخطوطہ۔ ہماری زبان ۲۲ دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۵ فٹ نوٹ

[1] مضمون متذکرہ ہماری زبان ۲۲ اکتوبر ۷۰ء ص ۵

اس غزل کو دیا اور یہ شعر مخطوطے کے حاشیے پر لکھ دیا۔ دوسری غزل اس مخطوطے میں نہیں۔ اس میں 'ہر قدم . . .' والا مطلع اور آٹھ نئے شعر شامل ہیں۔ بعد میں ان دونوں غزلوں سے انتخاب کرکے ایک غزل متداول دیوان میں لی گئی جس میں 'ہر قدم . . .' والا مطلع موجود ہے۔ جب یہ مطلع خود نوشت مخطوطے کے بعد کے ہر قلمی اور مطبوعہ مجموعے میں ملتا ہے تو اول الذکر میں اسے کاٹ دینے کی یہ وجہ نہیں کہ شاعر نے اسے کلام سے خارج کرنا چاہا بلکہ یہ کہ اسے پہلی غزل سے خارج کر دیا جس غزل کے حصے میں یہ آیا وہ نسخہ میں ہے ہی نہیں۔

نسخہ عرشی زادہ اس کے فاضل مرتب اکبر علی خاں نے غالب تخلص کی تبدیلی کو ۱۲۳۱ھ کا واقعہ قرار دیا ہے۔ میں یہاں مالک رام[1] صاحب کا قول نقل کرنا چاہتا ہوں۔

"یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی بے محل نہ ہو گا۔ غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں تیار کروائی تھیں: اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ اور اسد اللہ الغالب۔ بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ اسد اللہ الغالب مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سال (۱۲۳۱ھ میں) غالب تخلص اختیار کیا حالانکہ نہ ان کا نام اسد اللہ تھا نہ تخلص 'الغالب' صحیح بات یہ ہے کہ اس مہر میں لفظ غالب بطور تخلص استعمال ہی نہیں ہوا۔"

آگے چل کر فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت علی سے عقیدت کی وجہ سے انھوں نے یہ مہر بطور سجع تیار کرائی تھی بعد میں اسی سجع نے غالب تخلص تک پہنچنے میں ان کی رہنمائی کی۔

بالکل یہی بات ڈاکٹر ابو محمد سحر[2] نے اپنے مضمون "نسخۂ بھوپال بخط غالب" پر ایک نظر میں کہی ہے۔ مقطعوں میں اسد کی جگہ غالب لانے کی یہی حد ۱۲۳۱ھ نہیں مقرر کی جا سکتی۔ جن دو تین مقطعوں میں غالب نے اصلاح کے بعد بھی اسد

تخلص برقرار رہنے دیا ان کی ترمیم شدہ شکل کو ڈاکٹر انصار اللہ[1] نے ۱۲۳۱ھ سے متعلق کیا، کتابت متن اور تبدیلی تخلص کے بیچ لیکن ساتھ ہی اصلاحی تحریر کی پختگی پر اظہار تعجب کیا۔ یہاں میں اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتا ہوں کہ غالب تخلص اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اسد کا استعمال یک قلم ترک کر دیا۔ غالب تخلص نسخۂ بھوپال کی کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ تک ضرور اختیار کر لیا گیا تھا لیکن متعدد مقطع ایسے ہیں جو متن نسخۂ بھوپال کے بعد کی تصنیف ہیں لیکن ان میں اسد تخلص آیا ہے مثلاً

(ا) پہلی بار نسخۂ شیرانی میں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا ۔ دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد ۔ کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں۔

(ب) پہلی بار نسخۂ شیرانی کے متن نیز نسخۂ بھوپال کے آخر میں اضافہ

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے
اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"

اور ضمناً یہ ذکر کر دوں کہ خود نوشت مخطوطے میں دو مقطعوں میں اسد کو بدل کر غالب تخلص کیا لیکن وہ نسخۂ بھوپال تک پہنچنے سے پہلے ہی غزل کے ساتھ ہمیشہ کے لئے قلم زد ہو گئے۔

غیروں سے اسے گرم سخن دیکھ کے غالب
میں رشک سے جوں آتش خاموش رہا گرم ص ۱۵۰

ہم آئے ہیں غالب رہ اقلیم عدم سے
یہ تیرگی خاک لباس سفری ہے ص ۲۵۸

تخلص کے سلسلے میں ایک اور شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین ایک مراسلے میں لکھتے ہیں۔

تخلص کو عمداً چھوڑ دیا گیا ہے اس کے دوسرے اسباب

---

[1] گل رعنا مرتبہ مالک رام مقدمہ ص ۲۵
[2] مضمون مشمولہ شاعر بابت جولائی ۱۹۷۰ء ص ۲۸

[1] نو دریافت خطی دیوان غالب میں محذوف تخلص۔ ہماری زبان یکم نومبر ۱۹۷۰ء ص ۹

جو کچھ بھی ہو ان ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقطع میں اصلاً کوئی دوسرا تخلص تھا جس کو حذف کرکے باقی مصرع کو تحریر کر لیا گیا ہے[1]۔

کاش انھوں نے اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے مخطوطے میں جھانک کر دیکھ لیا ہوتا۔ نسخے میں کل ۲۵۳ غزلیں ہیں۔ ان میں سے صرف ۵۵ میں تخلص غائب ہے چند اہم ردیفوں کی تفصیل یہ ہے۔

ردیف	کل غزلیں	محذوف تخلص والی غزلیں
الف	۵۰	۱۴
ن	۲۶	۳
و	۷	صفر
ہ	۸	صفر
ی	۱۱۰	صفر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں انھوں نے بعض مقطعوں کو سادہ چھوڑا۔ آخر میں ردیف و۔ ہ اور ی کی ۱۲۵ غزلوں یعنی تقریباً نصف میں ایک بھی مقطع میں تخلص محذوف نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ محذوف تخلص والی صرف دو غزلیں ایسی ہیں جو کسی دوسرے مستند مجموعے میں نہیں ملتیں۔ ان کے مقطع یہ ہیں۔

اے (اسد) واشدنِ عقدۂ غم گرچہ ہے
حضرتِ زلف میں جوں شانہ دل چاک چڑھا ص ۸۰

(اسد) کے واسطے رنگے بر شئے کار ہو پیدا
غبار آوارۂ سرگشتہ ہو یا بوتراب اس کا ص ۹۶

ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے ۲۲ اکتوبر ۔۔۔ء کے مضمون میں ایک مقطع

خدایا بزمِ غالب اس قدر گرم تماشا ہو

ذکر کیا تھا اور اسے نسخۂ بھوپال کے بعد کی ترمیم قرار دیا تھا۔ میں نے اپنے مضمون[2] میں اس سے اختلاف کیا تھا۔ تخلص میں تبدیلی کی ایسی تین مثالیں ہیں اور ان پر مزید غور کی ضرورت ہے۔

ا۔ اصل شعر: اسد مایوس مت ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے
توقع ہے کہ بعد از زاریٔ بسیار ہو پیدا ص ۱۰۰

نہ ہو مایوس غالب گرچہ رونے میں اثر کم ہے
اصلاح: توقع ہے کہ بعد از زاریٔ بسیار ہو پیدا ص ۱۰۰

نسخۂ بھوپال: اسد مایوس مت ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالب ہو کہ بعد از زاریٔ بسیار ہو پیدا

چونکہ نسخۂ بھوپال میں دوسرا مصرع بھی اصلاح شدہ ہے اس لئے یہی ماننا ہوگا کہ خود نوشت دیوان کے اصلاحی مصرع کا تخلص 'غالب' نسخۂ بھوپال میں اسد اور غالب کے تلازمے پر قربان کر دیا اور اس طرح خود نوشت کے اصلاحی مصرع کو ترک کرکے اسد تخلص والے مصرع کو واپس لے لیا

ب۔ اصل شعر:
نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا اس قدر بزمِ اسد گرمِ تماشا ہو

دوسرے مصرع میں اصلاح:
نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا بزمِ غالب اس قدر گرمِ تماشا ہو ص ۱۸۲

نسخۂ بھوپال، نسخۂ شیرانی:
نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا اس قدر بزمِ اسد گرمِ تماشا ہو

اسد تخلص والے مصرع کی غالب تخلص والے اصلاحی مصرع پر کوئی فوقیت نہیں۔ 'اس قدر' کا تعلق 'گرم' سے ہے اور اس کے بیچ میں فقرہ 'بزمِ اسد' حائل ہے۔ اصلاحی مصرع میں 'اس قدر گرم' یک جا ہو جاتا ہے۔ غالب والے مصرع کو کاٹ کر اسد والے مصرع کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ قیاس میں نہیں آتی۔ اس لئے اپنے سابق[3] بیان میں ترمیم کرکے اب میری رائے یہ ہے کہ خود نوشت دیوان میں غالب تخلص والا اصلاحی مصرع نسخۂ بھوپال نیز نسخۂ شیرانی کی تکمیل کے بعد کی ترمیم ہے اور خود نوشت نسخے میں دونوں کی کتابت کے بعد لکھا گیا۔

ج۔ اصل شعر
بزمِ ہستی وہ تماشا گاہ ہے جس کو اسد
دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے ص ۲۳۰

اصلاح
بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ غالب ہم جسے
دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے

---

[1] ہماری زبان ۸ دسمبر ۔۔۔ء ص ۴

[2] ہماری زبان ۸ دسمبر ۔۔۔ء ص ۴

نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی مصرعِ اولیٰ

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسد

یہاں بھی نسخۂ بھوپال اور شیرانی کے مصرع میں کوئی ایسی فوقیت نظر نہیں آتی کہ اسے غالب تخلص والے مصرع کے بعد پسند کیا جاتا۔

خود نوشت دیوان کا قلم زد مصرع نقشِ اول ہے جس کی دوسری منزل نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی میں تھا

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسد

میں ملتی ہے۔ اصلاح کی تیسری منزل

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ غالب ہم جسے

ہے جو نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کی کتابت کے بعد خود نوشت دیوان میں معرضِ اظہار میں آئی۔

ص ۲۰۸ کی لعل خاں والی یادداشت کو عرشی صاحب بخطِ غالب اور مالک رام صاحب بخطِ غیر مانتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دونوں میں کون درست ہے۔ گو ایک ضعیف سا امکان یہ بھی ہے کہ یہ ۱۲۳۵ھ کے بعد لوٹ کی گئی ہو لیکن اس سے بدرجہا زیادہ قوی امکان یہی ہے کہ یہ اپنی صدورِ تاریخ ۱۲۳۵ھ ہی میں درج کی گئی۔ اب اس نکتے پر بھی غور کیجئے کہ متن کے کاتب نے اس نسخے کو بڑی توجہ اور چاؤ سے آرائشی انداز میں لکھا ہے۔ ص ۲۰۸ کے بعد بھی آخر تک کے صفحات میں اسے مختلف جہات میں نقش و نگار بناتے ہوئے قلم بند کئے گئے ہیں۔ ایسی تیاری سے لکھے ہوئے نسخے کو ڈائری کی طرح یادداشت لکھ کر خراب کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(ا) یا تو یہ یادداشت کاتبِ متن کے علاوہ کسی اور بے درد نے لکھ ماری ہے

(ب) یا اگر کاتبِ متن نے لکھی ہے تو اس وقت لکھی جب اس نسخے کی ایک اور صاف نقل تیار ہو گئی ہے اور پھر اس نسخے کی اہمیت نہیں رہا۔

یہ تصنیف بھی کہ یادداشت ص ۲۰۸ کے متن کی کتابت کے بعد کی تحریر ہے کیونکہ وہ خالی بچی ہوئی جگہ پر لکھی گئی ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ نسخے کی تکمیل کے بعد لکھی گئی۔

اس سے زیرِ نظر مخطوطے کی اصلاحوں یا 'ازیں جا شروع'

والی نقل کو متعلق کرنا خلافِ احتیاط معلوم ہوتا ہے لیکن اکبر علی خاں نے یہی کیا ہے۔ نسخۂ عرشی زادہ کے مقدمہ ص ۱۹ پر لکھتے ہیں۔

"۱۲۳۵ھ کی یادداشت کے قلم کا خط اور روشنائی کا پھیکا رنگ زیرِ نظر نسخے کی اصلاحوں اور مذکورہ یادداشت کے قلم کے قط اور روشنائی کے رنگ سے بے حد ملتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام اصلاحیں بھی تقریباً ۱۲۳۵ھ میں ہوئی ہیں"

میری عرض ہے کہ نسخے کی تمام اصلاحوں کا نہ قط یکساں ہے نہ اندازِ خط۔ یہ مختلف اوقات میں تحریر کی گئی ہیں۔ اگر دو تحریروں کا قط اور روشنائی مختلف ہو تو یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ وہ دونوں ایک وقت میں نہیں لکھی گئیں لیکن مخطوطے کے مختلف صفحات پر دور افتادہ تحریروں کا قط اور روشنائی یکساں ہو تو یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ یہ ایک وقت کی تحریریں ہیں۔ مختلف اوقات میں بھی قلم کا قط اور روشنائی مماثل ہو سکتی ہے۔

ص ۲۵ پر مرتب نے اسی یادداشت کے لئے لکھا ہے۔

"اس یادداشت کی روشنائی اور اندازِ خط اس صفحہ پر نیز دیگر صفحات پر بنائے گئے صح کے نشان کی روشنائی اور اندازِ خط سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں یادداشتیں ایک ہی وقت کی ہیں۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صفر ۱۲۳۵ھ میں زیرِ نظر نسخے سے تیار ہونے والا نسخہ تیاری اور نقل کی منزل سے گزر رہا تھا"

مصرعوں کی اصلاحوں اور لعل خاں والی یادداشت قلم کے قط اور روشنائی کی یکسانیت کی بنا پر ہم عصر قرار دیا تھا۔ اندازِ خط کا کوئی مذکور نہ تھا۔ لعل خاں کی یادداشت اور غزلوں کے اوپر صحیح کے نشان صح کو اندازِ خط اور روشنائی کی مماثلت کے سبب ایک ساتھ رکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اصلاحوں، لعل خاں کی یادداشت اور صحیح کے نشانوں کا اندازِ خط بھی یکساں ہونا چاہیئے۔ لیکن اصلاحیں عموماً بہت خوشخط لکھا وٹ میں ہیں، لعل خاں کی یادداشت کسی قدر گھسیٹ میں ہے جب کہ صح کے نشان گھسیٹ میں اور بعض اوقات نہایت شکستہ [illegible]

بگہ نچیاں نہیں اس لئے میری رائے میں لعل خاں کی یادداشت
تاریخ (صفر ۱۲۳۵ھ) کو اصلاحوں اور دوسرے مخطوطے کی
س کی تاریخ قرار دینا قیاس کو کچھ زیادہ دور تک پہنچا دینا ہے۔
... حاشیے کے اضافے بھی مختلف اوقات میں عمل میں آئے۔
ے پہلے میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر کی اس غلط فہمی کا ازالہ کر دوں کہ

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

غزل میں چونکہ ضعیفی و پیری کے مضامین ہیں اس لئے یہ زمانۂ
شیب کی تخلیق ہے۔ یہ غزل شروع شروع میں تین مقامات پر
تی ہے۔

ا۔ خود نوشت دیوان کا حاشیہ ۲۔ نسخۂ بھوپال کا حاشیہ
۔ نسخۂ شیرانی کا متن۔

میں آخر الذکر کی تاریخ قطعیت کے ساتھ معلوم ہے یعنی یہ غزل
۱۸۲۱ء تک تصنیف ہو چکی تھی اور یہ غالب کے شیب کا زمانہ نہیں تھا۔
اس نسخے کے حاشیے کی جو تین غزلیں نسخۂ بھوپال کے متن میں
جود ہیں وہ ۱۸۲۱ء سے پہلے کی تصنیف ہیں۔ جو تین غزلیں نسخۂ
بھوپال میں نہیں لیکن نسخۂ شیرانی میں ہیں وہ ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء
کے درمیان کی تصنیف ہیں۔ حاشیے کی ایک غیر مطبوعہ غزل ہے

بھاؤ اسے یہ وضع چھوڑے

نکہ بخط غیر ہے اور غالب کے رنگ سے گری ہوئی ہے اس لئے
س کے بارے میں قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غالب ہی
تصنیف ہے۔ پورے نسخے میں یہ غزل جتنی شکستہ لکھی ہوئی ہے
ئی اور کوئی نہیں۔ میرے لئے اس کے بعض مصرعوں کا پڑھنا
محال تھا۔

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نسخے کے بخط غالب ہونے کے
شواہد اس کے بخط غیر ہونے کے دلائل سے بدرجہا قوی تر ہیں۔
سلسلۂ اصلاح کے بارے میں کسی قدر شک ہے کہ وہ مصنف کے
لم سے ہے یا نہیں۔ بقیہ تمام بدست مصنف ہیں۔ حاشیے کی غزلیں
سی اور کے قلم سے ہیں۔ اور جیسا کہ اکبر علی خاں نے لکھا ہے ایک سے

۱۔ مقدمۂ نسخۂ عرشی ایڈیشن ص ۲۲

زیادہ اشخاص کا کام معلوم ہوتی ہیں۔ میرا یہ منشا نہیں کہ قاری
میری رائے سے ضرور اتفاق کرے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ
اس موضوع پر اب تک جو تحریریں آئی ہیں ان سب کو نیز میری
موجودہ تحریر کو پڑھ کر غور و فکر کے بعد اپنی رائے قائم کرے۔
تحقیق میں بسا اوقات کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ ---

....کیونکہ کسی سے بڑھ کر اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بچوں کو تعلیم اور ترقی ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مستند مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔

خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے

اعجاز عسکری
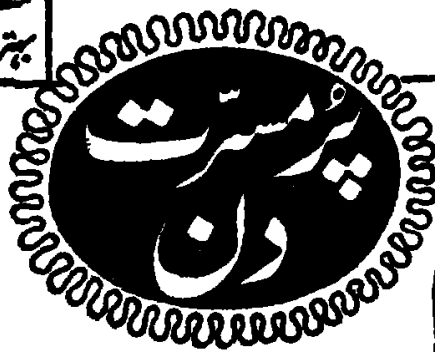
بیاضِ غالب
محقق اور ناشر کا قرض

میرزا، فردوس مکانی نواب محمد یوسف علی خاں ناظم، والیِ رام پور کو لکھتے ہیں:

"اُجیرہ دار پہنچا، مگر لٹا ہوا، بھیگا ہوا اور بھاگا ہوا۔ گوجروں نے اُسے لوٹ لیا، اور روپیہ کُل سب لے لیا۔ خط اس دار و گیر میں گر پڑا۔ بھیگ گیا۔ لفافہ مجھ تک نہ پہنچا.... مجھ کو غم یہ ہے کہ غزلہائے اصلاحی اور دیوانِ اُردو کی رسید میں نے نہ پائی۔"

ایک خط میں مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں:

"میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاءالدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیا کرتے تھے۔ جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ اون دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپئے کے کتب خانے برباد ہوئے، اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر، کہ وہ خوش آواز بھی ہے زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اوس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔"

ایک اور خط میں منشی شیو نرائن آرام کو لکھتے ہیں:

"صاحب، میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے؟ اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں، بہت غزلیں اوس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم اور اکمل تھے، وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے جہاں بکتا ہوا نظر آ جائے۔ لے لو۔"

ایک اور خط میں جو منشی شیو نرائن آرام کے نام ہے، میرزا صاحب فرماتے ہیں:

"میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا، سرنامے پر لکھا تھا: عرضداشت عظیم الدین احمد امن مقام میرٹھ۔ واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے، اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہر حال پڑھا معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چپ ہو رہا۔"

(۲)

سو سال بیت گئے، کلامِ غالب، لوٹ اور کتب فروشی کی تثلیث بدستور قائم و دائم ہے اور وہ سب بھی جو لوٹ اور کتب فروش کی سوداگری میں مضمر ہے۔

(۳)

لوٹ کا مال خرد برد ہو گیا اور کلامِ غالب کے قلمی نسخے، اپنی ملکیت تبدیل کرتے ہوئے شہر بہ شہر بلکہ ملک بہ ملک طباعت کے ذریعے

آراستہ ہوتے رہے اور کتب فروشی کے کاروبار کو چمکاتے رہے۔ لوٹ کے اسی مال میں سے، وہ بیاض غالب بھی تھی جو عین غالب صدی کے سال، اور علم و ادب کے گہوارے بھوپال میں یکایک دریافت ہوئی۔ اس کی دریافت، ملکیت کے تبادلے اور طباعت کی کہانی اس لوٹ، سوداگری اور منافع خوری کی روایت کو ایک بار پھر تازہ کر دیتی ہے۔ جو کلامِ غالب کے ساتھ ہمیشہ سے وابستہ رہی ہے۔

دیوانِ غالب کے اس نسخۂ بے بہا کی دریافت کی کہانی جناب نثار احمد فاروقی کے حوالے سے ہم تک پہنچتی ہے، (نقوش لاہور، غالب نمبر ۲، ص ۹) مگر میں اسے بہت حد تک نامکمل سمجھتا ہوں۔ دراصل واقعات جس طرح رونما ہوتے رہے ان سے یہ تصویر خود بخود واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اسے ہماری زبان علی گڑھ کے مراسلہ نگاروں کے بیانات کے مطابق از سرِ نو ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

"قلمی کتابوں کا کاروبار کرنے والے ایک صاحب، توفیق احمد چشتی، قادری (مالک شیل بکڈپو، امروہہ، ضلع مراد آباد) کو دیوانِ غالب کا ایک نہایت اہم مخطوطہ دریافت ہوا ہے، یہ غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ میں نے یہ نسخہ دیکھا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ غالب ہی کے قلم سے ہے ... امید ہے کہ غالب کے قدر دان اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اور توفیق احمد صاحب کو اس کے لئے مناسب معاوضہ ادا کرنے والی کوئی پارٹی سامنے آجائے گی۔" نثار احمد فاروقی (ہماری زبان، ۲۲ر اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۴)

• غالب اکاڈمی یا انجمن ترقی اردو کے اہتمام دسمبر ۱۹۶۹ء تک غالب کی صد سالہ برسی کی اہم ترین کتاب یعنی امروہے کے اس مخطوطے کو شائع ہو جانا چاہیئے۔" محمد عباس طالب صفوی۔ (ہ، ز، یکم مئی ۱۹۶۹ء ص ۱۰)

مطبوعہ اور خود نوشتہ کلام کی دریافت غالب پرستوں کے لئے خاصے کی چیز ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ مخطوطہ واقعی اصلی ہے؟ ... امروہے والے توفیق احمد چشتی صاحب کو بھی ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ یہ مخطوطہ ان کو کہاں اور کیسے ملا؟ توفیق صاحب پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں ... مخطوطات کا کاروبار کرنے والے حضرات کا تب سے ... لکھوا کر زمین کے اندر دفن کرا دیتے ہیں اور چند سال بعد جب زمین سے تحریریں برآمد ہوتی ہیں تو انکی شکل پرانے نسخوں جیسی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کے کلام کا یہ مخطوطہ کسی تجربہ کار کاتب کا لکھا ہوا ہو اور غالب کی برسی کی موقع پر نکالا گیا ہو۔" نقاد اکبر آبادی۔

• پی ٹی آئی کی خبر اور قومی آواز لکھنؤ میں یو پی اڈیٹوریل کے جناب جلال الدین صاحب کے مراسلے کی اشاعت سے بھی قلمی دیوان کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ سیاست جدید، کانپور، کی خبر میں یہ اضافہ بھی تھا کہ مولانا امتیاز علی عرشی مدظلہٗ نے اس قلمی نسخے کے اصل ہونے کی تصدیق فرمادی ہے ... میری تجویز ہے کہ اسے مرکزی نیشنل آرکائیوز کو جلد از جلد خرید کر محفوظ کر لینا چاہیئے۔ چونکہ یہ غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس لئے اس کو منظرِ عام پر لانے کی سب سے اچھی صورت یہ ہوگی کہ اس کا عکس شائع کر دیا جائے۔" ابو محمد سحر۔ (ہ، ز، ۸ر مئی ۱۹۶۹ء ص ۸)

• حال ہی میں مالکِ نسخہ کی مہربانی سے یہ نسخہ میرے پاس بارہ روز رہا۔ اس عرصہ میں، میں نے اس کے ایک ایک لفظ کا ہی نہیں ایک ایک نقطہ کا تقابل نسخۂ حمیدیہ سے کیا، اور تفصیلی نوٹ تیار کئے، نسخہ بڑی خستہ حالت میں تھا، اسی لئے میں نے اپنی نگرانی میں اس کی دوسری جلد بندھوائی، نیا حاشیہ ڈلوایا ... بغیر کسی مبالغے کے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ غالب کے قلم کے جتنی کثیر تعداد میں اصل تحریریں میں نے دیکھی اور استعمال کی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسرے شخص کی نظر سے گزری ہوں ... چنانچہ مجھے یہ عرض کرتے ہوئے بے حد مسرت ہے کہ نو دریافت نسخہ تمام و کمال سوائے حاشیے کے اضافوں کے بخطِ غالب ہے ... یہ بھی اطلاع دینا ضروری جانتا ہوں کہ زیرِ بحث نسخہ بھی نسخۂ حمیدیہ کی اصل کی طرح بھوپال سے ملا ہے ... یہ اکیسویں صدی کا عظیم علمی سانحہ ہے

"دیوانِ غالب کا نادر روزگار مخطوطہ جو خود غالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور وسط اپریل ۱۹۶۹ء میں ... ملا ہے، غالب صدی کی سب سے اہم اور انقلاب آفریں دریافت ہے، ... میں نے پہلی بار یہ نسخہ ۱۳ر اپریل ۱۹۶۹ کو دیکھا تھا.... غالباً اسی دن ہماری زبان کو میں نے اطلاع دیدی تھی...."
نثار احمد فاروقی دہلی (۲)، (ز، یکم جون ۱۹۶۹ء ص ص ۸-۹)

"یہ نسخہ ۴ر اپریل ۱۹۶۹ء کو دریافت ہوا تھا، ۸ر اپریل ۱۹۶۹ء کو اخبار الجمعیۃ، دہلی، میں توفیق احمد صاحب نے اس کا اشتہار چھاپا، اسے دیکھ کر میں نے انھیں خط لکھا، اور وہ ۱۲ر اپریل کو یہ نسخہ لے کر مجھ سے ملے، اسی دن میں نے ہماری زبان کو ایک مختصر مراسلہ بھیجدیا.... ۲۳ر اپریل کے اخبار الجمعیۃ میں میرا دوسرا مراسلہ.... شائع ہوا، اس وقت تک میں بھی اس نسخے کو اچھی طرح دیکھا نہیں تھا...." نثار احمد فاروقی۔
(۲)، (ز، ۸ر جون ۱۹۶۹ء ص ص ۸-۷)

"۱۳ر اپریل کو میں امروہے پہونچا، اور وہاں وہ چیز دیکھی کہ بار بار یہی مصرع زبان پر آتا رہا،

این کہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب،

یہ مجھے کیا معلوم تھا کہ دیوانِ غالب کی بازیافت میرے اس سفر میں مضمر تھی۔ جناب توفیق احمد صاحب نے.... ازراہِ کرم مجھے .... یہ دیوان دکھایا.... میں نے .... اس کے چار صفحات کا فوٹو بھی حاصل کرلیا۔ جب میں .... الہ آباد پہنچا .... یہ خبر اخبارات میں دیدی اور ۱۶ر اپریل کو .... بعض خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں نے ... میرا انٹرویو لیا اور آن کی آن میں یہ خبر اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے سے پوری دنیا میں پھیل گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ راقم سطور نے اس نسخے کو دریافت کیا.... " جلال الدین۔

"اہلِ علم کی اطلاع کے لئے یہ بیان شائع کر رہا ہوں۔ مجھے یہ نسخہ ۵ر اپریل ۱۹۶۹ء کو بھوپال سے ملا تھا....."
توفیق احمد چشتی قادری، امروہہ۔ (۲)، (ز، ۱۵ر جون ۱۹۶۹ء ص ۶)

"نثار احمد صاحب فاروقی کی 'زیارت' سے قبل میں نے امروہے میں ۱۲ر اپریل کی شب میں نادر روزگار دیوان کی زیارت ... کی تھی"۔ جلال الدین۔

"میں حیران ہوں کہ.... بعض ماہرینِ غالبیات اس دریافت کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتے ہیں... ایک غلط فہمی جو ہماری زبان کے حلقوں میں جگہ پا رہی ہے ... یہ ہے کہ گویا دیوانِ غالب کی دریافت جلال الدین صاحب کے علاوہ ایک دوسرے صاحب نے کی ہے.... نثار فاروقی نے.. پی ٹی آئی کی خبر کا حوالہ دیا ہے لیکن پی ٹی آئی نے جس شخص... کے حوالے سے یہ خبر مشتہر کی اس کا نام لینے سے جان بوجھ کر انھوں نے گریز کیا ہے .... فاروقی صاحب نے ... اس دریافت کی اولیت کا شرف خود سے حاصل کرنے کی کوشش فرمائی ہے ....."
سید شمس الرحمٰن رحمانی۔ (۵)، (ز، ۲۲ر جون ۱۹۶۹ء ص ۹-۱۰)

"بھوپال میں ایک صاحب ہیں قاری شفیق الحسن خاں فضلی پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں.... انھیں غالب کا ایک ... قلمی دیوان ملا۔ وہ خود اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے .... قاری شفیق الحسن نے اسے ... ایک الماری میں اپنی دیگر کتابوں کے ساتھ ڈال دیا... ایک دن اچانک امروہے کے توفیق احمد صاحب آگئے... لیکن مقطع اور وہ بھی مقطع غالب، انھیں قاری شفیق الحسن ہی کی چند کتابوں کے بعد ہاتھ آگیا۔ ترقیمہ دیکھنے کے بعد انھیں اس قدر عجلت ہوئی کہ پھر انھوں نے کوئی دوسری کتاب نہیں دیکھی اور چند منٹوں میں اس دیوان کو گیارہ روپے میں لے کر رخصت ہوگئے۔ قاری شفیق الحسن نے اولاً پچیس روپئے طلب کئے تھے... میری اس تحریر کو پڑھ کر قاری شفیق الحسن صاحب نے نیچے اپنے دستخط بھی کر دئے ہیں، شفیق الحسن خاں فضلی، بقلم خود، ۱۳ر جون ۶۹ ۱۹ء۔"
ابو محمد سحر۔ (۵)، (ز، یکم جولائی ۱۹۶۹ء ص ۷)

"مجھے نہ تو دیوان غالب کی تصنیف میں شرکت کا دعویٰ ہے نہ اسے 'دریافت' کرنے کا۔ میں نے ابھی تک اپنے قلم سے

کوئی گراہ کن بات نہیں لکھی، نہ کوئی غلط دعویٰ کیا ہے، نہ میں اپنی کلاہ کو "اس دارۂ افتخار" سے سجانے کے لئے کسی نچلی سطح پر اترنے کو آمادہ ہوں... مفتی شفیق الحسن صاحب بھوپالی جنھوں نے توفیق احمد صاحب کو یہ نسخہ دیا انھوں نے کبھی یہ کہہ کر فروخت کیا کہ: "غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیاض ہے"... یکم مئی ۱۹۶۹ء کو برادرم اکبر علی خاں صاحب امروہہ تشریف لائے اور مالک نسخہ کو اپنے ساتھ رامپور لے گئے۔ " نثار احمد فاروقی (ق، ز، ۱۵ جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۵-۷)

" بھوپال مجلس اردو کی ایک حالیہ نشست جناب شفیق الحسن صاحب فضلی نے دیوان غالب کے قلمی نسخے پر اپنی تقریر کے ذریعہ تفصیلی روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا کہ دیوان غالب کا قلمی نسخہ میں نے فروخت نہیں کیا بلکہ بطور امانت دیا ہے۔ توفیق احمد صاحب چشتی امروہوی کے سامنے قطعی بے بنیاد ہیں۔ "
سکریٹری نشر و اشاعت مجلس اردو (ق، ز، ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۲)

" بھوپال کے کسی سکریٹری نشر و اشاعت، مجلس اردو نے ایک مراسلے کے ذریعہ شفیق الحسن صاحب فضلی کی کسی تقریر کی رپورٹ شائع کی ہے۔ مگر یہ رپورٹ سراسر جعلی اور بے بنیاد ہے۔ یہاں بھوپال میں ایسا کوئی جلسہ کسی انجمن کی طرف سے نہیں ہوا، یہ انجمن مجلس اردو بھی ایک گڑھا ہوا نام ہے ...."
جمیل احمد خاں۔ بھوپال۔

" یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ اس نسخے سے متعلق سترہ ستمبر ۶۹ء میں جتنے اعلان، مراسلے اور مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں قاعدہ طور پر اس کے ماخذ کو پردۂ ظلمات میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، حد یہ ہے کہ "آجکل" کے جون اور جولائی کے شماروں میں نثار احمد فاروقی صاحب اور عرشی صاحب کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں، اس میں بھی نسخے کے ماخذ کو پراسرار تاریکی میں رکھا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نثار احمد فاروقی، جلال الدین اور عرشی صاحب، تینوں کو اس

نسخے کے ماخذ کے بارے میں صحیح معلومات رہی ہوں گی، ان سب کے سکوت کی وجہ مالک نسخہ کی تاکید ہوگی۔ یہ تاکید کیوں کی گئی، شاید انھیں اندیشہ ہو کہ ماخذ کا بھید کھل جانے پر کوئی شفیق احمد بھوپالی کو اکسا سکتے ہیں کہ وہ اس بیش بہا مخطوطہ کو واپس طلب کرے، یا پھر اس کی قلیل قیمت خرید (گیارہ روپے) کا انکشاف ہونے پر مخطوطے کی قیمت گر جائے گی۔ میری رائے میں ان محققین کو ایک تاجر کے تاجرانہ مفادات پر تحقیق کے تقاضوں کو ترجیح دینی چاہیئے تھی، ...." گیان چند (ق، ز، ۱۴ اگست ۱۹۶۹ء، ص ۷)

" مجلس اردو قطعاً گھڑا ہوا نام نہیں ہے.. شفیق الحسن فضلی کے جلسے کی کارروائی بھی جعلی نہیں ہے، کیونکہ .... اس جلسے کی کارروائی بھوپال کے قریب قریب تمام روزناموں میں بھی شائع ہوئی، اور کسی نے اس کی تردید نہیں کی ..."
آفاق احمد، بھوپال۔ (ق، ز، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲)۔

(۴)

یہ تھی دیوانِ غالب کے اولین اور شاعر کے خود نوشت نسخے کی دریافت کی کہانی۔

(الف) اس پر سب متفق ہیں کہ یہ نسخہ بھوپال میں دریافت ہوا تھا مگر جس طرح ابتدائی مراسلوں اور مضامین میں دیدہ و دانستہ اس حقیقت پر پردہ ڈالا گیا، اس سے شکوک و شبہات کا ایک دفتر کھلتا ہے۔ یہ امر کچھ کم عبرتناک نہیں ہے کہ مولانا امتیاز علی عرشی جیسا عالم بھی اس کے ماخذ کی نشاندہی سے گریز کرے اور اس سلسلے میں ایسا تجاہل عارفانہ برتے جو کم از کم "عالموں" کو زیب نہیں دیتا۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ خیال کہ "ان محققین کو ایک تاجر کے تاجرانہ مفادات پر تحقیق کے تقاضوں کو ترجیح دینی چاہیئے تھی۔" حقیقت حال کی طرف مبہم لیکن بلیغ اشارہ کرتا ہے، میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ ان محققین کو اندیشہ یہ نہیں تھا کہ ماخذ کا انکشاف، تاجر کے تاجرانہ مفادات کو صدمہ پہنچائے گا۔ کیونکہ تاجر کے ساتھ تو غالب کے قدردانوں کی ہمدردی بھی ہوئی

کے ساتھ برادرانِ یوسف نے بھی نہیں کیا تھا کہ ــــ بلکہ اس انکشاف سے دراصل ان تاجرانہ مفادات کو ٹھیس لگتی تھی جنھیں بیاضِ غالب کے ساتھ خود محققین نے وابستہ کر دیا تھا، اور جن کا واضح اظہار وہ دعوٰے ہے جو مخطوطے پر تاجرانہ دست درازی اور حق جتانے کے سلسلہ میں شروع ہوئی!

(ب) بیاض کی دریافت کا سہرا کس کے سر باندھنا چاہیئے اس پر بھی کافی اوچھی بحث ہوئی ہے۔ پہلی بار نسخے کی "زیارت" کس نے کی تھی اس سلسلہ میں جو مراسلے بازی ہوئی ہے اس سے غالب کے قدردانوں کی کم سوادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ ساری خرافات ہماری زبان جیسے ثقہ پرچے میں جگہ پا گئی تھی۔

(ج) بیاض کی ثقاہت پر کسی ایک کو شبہ ہوا تھا۔ مگر ان بجا قسم کے شبہات کا غالب شناسوں خصوصاً جناب نثار احمد فاروقی اور جناب اکبر علیخاں نے جس طرح استقبال کیا اس سے اس شبہ کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ نسخہ ضرور نقاد اکبرآبادی والی ترکیب سے ایجاد کیا گیا ہوگا۔ دلی کے ماہر غالبیات کی یہ خوش فہمی کہ ان کے مراسلے کی اشاعت کے بعد علمی حلقے بیاض غالب کے بخط غالب ہونے پر ایمان لے آئے تھے، محض تعلّی ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا یہ بیان بھی کہ یہ دیوان بخطِ غالب ہے ــــ جو نثار احمد فاروقی صاحب کے بقول ان جیسے ایک درجن لکھنے والوں کے بیانات پر بھاری ہوگا۔ نسخے کی ثقاہت پر کوئی حتمی فیصلہ اس وقت تک نہیں کرتا جبتک کہ غالب کی تحریر کا عکس عام طور پر دیکھ نہ لیا جائے اور عام طور پر یہ اعتراف نہ کر لیا جائے کہ یہ غالب ہی کا خط ہے۔ اس معاملہ میں ایک یا دو رائیں جس ذوق و شوق اور زعم سے سامنے آئیں اور جس طرح اصحابِ رائے کے پس پشت تاجرانہ مفادات کام کر رہے تھے انکے پیش نظر نسخے کی ثقاہت پر شک نہ کرنا غیر فطری بات ہوتی۔

(د) یہ مسئلہ نزاعی ہے کہ یہ بیاض بھوپال سے امروہے کس طرح پہنچی۔ بدیہی ہی سہی اگر یہ اعتراف کر لیا گیا کہ یہ نسخہ بھوپال میں دریافت ہوا تھا تو پھر اس بات کی کوئی وجہ جواز موجود نہیں ہے کہ اسے نسخۂ امروہہ کے نام سے موسوم کیا جائے۔ صرف کسی غالب شناس کے کسی جگہ اس بیاض کا نسخۂ امروہہ کے نام سے حوالہ دینے سے یہ مسئلہ طے نہیں ہو جاتا۔ نہ پوری طرح اس نیت کا اندازہ ہوتا ہے جو اُسے نسخۂ امروہہ کہلانے کے پیچھے کارفرما رہی ہے۔

(ہ) ایک بیان کے مطابق دیوانِ غالب کا یہ نادرروزگار مخطوطہ وسطِ اپریل ۱۹۶۹ء میں ملا تھا۔ دوسری جگہ دریافت کی تاریخ ۴ اپریل بتائی گئی ہے، ایک تیسرے بیان کے مطابق یہ نسخہ ۵ر اپریل کو دریافت ہوا تھا۔ تاریخوں کا یہ تقاضا بھی کچھ کم معنی خیز نہیں۔

کلامِ غالب کے مسودوں کی انیسوی صدی میں، غالب کی حیات میں، لوٹ تو اندوہناک تھی ہی، ان کی نو دریافت کی جو کہانی ہم تک پہنچتی ہے اور آج اہل علم کے بازار میں وہ جس طرح لٹتے ہیں، وہ بھی کچھ کم عبرتناک نہیں ہے۔ اس میں وہ سب عناصر موجود ہیں جو کلامِ غالب کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب کو گوجروں، دلی کے لیٹروں اور میرٹھ کے کتب فروش عظیم الدین احمد سے شکایت تھی، بیسویں صدی اس داستان میں ایک اور کردار شامل ہو گیا ہے ــــ محققین کے تاجرانہ مفادات۔ میرا دعویٰ ہے کہ غالب کے ان قدردانوں سے وہ پوری نسل غیر محفوظ ہے، غالب جس کے لئے ایک مشترکہ تہذیبی میراث کی حیثیت رکھتا ہے اور جس پر اس میراث کی حفاظت کا فرض کلّی طور پر عائد ہوتا ہے۔ زیرِ نظر کوشش اس سلسلہ میں پہلا اقدام ہے۔

(۵)

بیاض غالب کے بھوپال سے امروہے پہنچنے کا قصہ تو معرضِ بحث میں ہے ہی، بحث اس پر بھی ہونا چاہیئے کہ غالب کی بیاض تمام کمال عکسی حالت میں پاکستان کس طرح ہجرت کر گئی! انیسویں صدی میں اس کی گمشدگی ایک سانحہ تھی، بیسویں صدی میں اسکی ہجرت پاکستان دوسرا سانحہ ہے۔ دونوں میں غالب کے قدردانوں کا ہاتھ ہے۔ پہلے سانحے پر صرف تاسف کیا جا سکتا ہے، دوسرے پر بازپرس ہونی چاہیئے، کیونکہ اس حادثے سے ہندوستانی قوم کے ناموس کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس سلسلہ میں پوری چھان بین کی ضرورت ہے کہ آخر وہ کیا حالات تھے، جن میں اس نادرروزگار مخطوطے کے عکس کو

اردو ادب کا ایک دیدۂ بے بہا ہی نہیں، صرف غالب کی صد سالہ برسی کی عظیم ترین پیش کش ہی نہیں، بلکہ اردو کی ادبی تاریخ میں تمام زمانوں کے لئے ایک بیش بہا دستاویز ہے، عین غالب کی صد سالہ برسی کے بیچ ایک دوسرے دیس میں اسمگل کر دئے گئے۔ یہاں بیاضِ غالب کی داستان کے اس دوسرے حصّے کی کچھ کڑیاں جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ بیاضِ غالب کا یہ نسخہ بھوپال سے امروہہ پہنچا تھا۔ امروہے سے اس کے چار صفحات کے عکس یوپی آرکائیوز کے جلال الدین صاحب لے گئے تھے۔ جناب نثار احمد فاروقی کا بیان ہے کہ "توفیق صاحب نے ازراہِ عنایت مجھے اس نسخے سے استفادے کی اجازت دی۔" قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ استفادے کے وقت ان کے ساتھ ایک مشّاق فوٹوگرافر بھی موجود تھا جس نے بیاض کے ہر ہر صفحے کے مکمل عکس تیار کر لئے تھے جناب اکبر علیخاں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ نسخہ بارہ روز ان کے پاس رہا تھا، نسخۂ حمیدیہ سے اس کے "ایک ایک نقطے کا تقابل" کیا گیا یا نہیں، یہ طے ہے کہ اس کے ایک ایک نقطے کی فوٹو کاپیاں ضرور تیار کی گئیں۔ کیوں؟ محقق اور بیاضِ غالب کے بیچ میں کیمرہ کیوں حائل رہا؟ یہ ایک سربستہ راز ہے جس پر سے کسی نہ کسی کو نقاب اٹھانی ہی چاہیئے۔ غالب کے ان قدر دانوں میں سے ایک کا تعلق یوپی آرکائیوز سے ہے، ایک کا دلی کی دانش گاہ سے، ایک کا رام پور کے عظیم الشان کتب خانے سے۔ نسخہ خریدنے یا اس کا حقِ ملکیت کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے کو منتقل کرنے کے لئے ان حضرات نے کیا کیا؟ یہ ایک کھلا سوال ہے۔ میں ایک اور سوال اٹھاؤں گا۔ کیا فوٹو کاپیاں تیار کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندوستانی قوم کی اس بے بہا میراث کو ذاتی ملکیت بنا لیا جائے اور اسے نجی منافع خوری کے لئے استعمال کیا جائے؟ مجھے اعتراف ہے کہ میرے پاس اس سوال کا کوئی ایسا معقول جواب موجود نہیں ہے جو اردو ادب کے مورخ کو مطمئن کر سکے۔

یہاں سے واقعات بالکل صاف ہیں۔ بیاضِ غالب کا یہ نسخہ بھوپال سے امروہے آیا، امروہے سے دلی، پھر رام پور، دونوں جگہوں پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے، دونوں جگہ اس کے عکس تیار کئے گئے۔ قیاس ہے کہ دونوں جگہوں سے اس کے عکس لاہور کے ایک مشہور رسالے کے مدیر اور ناشر کو بھیجے گئے۔ فریقین کے مابین سودے بازی ہوئی۔ اور جیسا کہ ہر سودے میں ہوتا ہے لاہور کے مدیر نے رام پور کے ماہرِ غالبیات پر دلی کے ماہرِ غالبیات کو ترجیح دی اور بیاضِ غالب کو اپنے رسالے کے ایک خصوصی نمبر میں انتہائی اہتمام سے شائع کر دیا۔ اب یہ نسخہ مدیرِ موصوف کے اصرار پر "نسخۂ لاہور" کے نام سے موسوم ہے، اور مطبوعہ شکل میں ہندوستان کے علاوہ، دنیا بھر کی لائبریریوں کی زینت ہے۔

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

(۶)

لاہور کے مشہور جریدے "نقوش" نے ۱۹۶۹ء میں دو غالب نمبر شائع کئے۔ دوسرے نمبر کے سرورق کی عبارت ہے: "مع نو دریافت بیاضِ غالب، بخطِ غالب۔" گرد پوش پر اس شمارے کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے "اس شمارے کی سب سے نمایاں پیش کش غالب کی وہ بیاض ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہے" مدیرِ نقوش کو اس غیر معمولی شمارے کی اشاعت کے لئے، جس کے ذریعہ بیاضِ غالب پہلی بار منظرِ عام پر آئی، کسی ہندوستانی غالب شناس کا احسان مند ہونا چاہیئے تھا۔ مگر رسالے میں اس قسم کے کسی حوالے سے مصلحتاً گریز کیا گیا ہے۔ رسالے پر تاریخِ اشاعت اکتوبر ۱۹۶۹ دی گئی ہے۔ جو انتہائی اہم سراغ فراہم کرتی ہے۔ غالب نمبر میں مدیر کی طرف سے جو بیانات شامل ہیں اس میں اس بیاض کی دریافت یا ہجرتِ پاکستان کا کوئی اتا پتا دینے سے بالالتزام اجتناب برتا گیا ہے۔ فہرست مندرجات میں بیاضِ غالب کے سامنے نثار احمد فاروقی کا نام درج ہے۔ بیاض سے پہلے ایک دیباچہ بھی ہے جس میں دیوانِ غالب کی اس اولین ترتیب کی خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ فہرست مندرجات

اس بات کا انکشاف ضرور ہوتا ہے کہ صفحات ۹ سے ۲۱۲ تک کے مشتملات کے لئے جن میں مخمور بیاض اور اس پر تفصیلی دیباچے کے علاوہ، آخر میں تشریحات بھی شامل ہیں، نقوش نگار احمد فاروقی صاحب کا مرہون منت ہے۔ اس سب کے باوجود دیباچہ نگار کا یہ جملہ کہ "آج پہلی بار اس نسخے کا تفصیلی تعارف لکھ کر "تلاش غالب" میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں" انتہائی گمراہ کن معلوم ہوتا ہے۔

دیباچے کے بعض اور پہلو بھی غور طلب ہیں۔ دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ پورا مخطوطہ بالکل محفوظ اور صاف حالت میں ہے کرم خوردگی یا آب زدگی کا کوئی نشان اس پر نہیں ہے۔ اس کا تقابل اکبر علی خاں کے اس مراسلے سے کرنا چاہیئے، جس میں نسخے کی خستہ حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دیباچے میں تحریر کی تاریخ اپریل ۱۹۶۹ دی گئی ہے جو بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے، چونکہ دیباچہ نگار اپنے ایک مراسلے میں، جو اوپر نقل ہوا ہے، (ہماری زبان ۸ جون ۱۹۶۹) یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ ۲۲-۲۳ اپریل تک انہوں نے اس نسخے کو اچھی طرح نہیں دیکھا تھا۔ یہ امر وضاحت طلب ہے کہ اپریل کے آخری ہفتہ میں (جس میں یہ دیباچہ مکمل کیا گیا ہوگا) کس طرح انہیں اس نسخے سے وہ قرب میسر آگیا جو نسخے کا تفصیلی مطالعہ کرنے اور اس پر اس شرح و بسط سے لکھنے کے لئے اشد ضروری تھا۔ اس ہفتہ میں نسخہ بلاشبہ امروہے میں رہا تھا اور نثار فاروقی صاحب دہلی میں!

(۷)

بیاضِ غالب کا یہ نادر روزگار نسخہ، جس نے پاکستانی چھاپے خانے کے مراحل سے گزر کر چار دانگ عالم میں شہرت حاصل کر لی ہے دلی اور رام پور کے بیچ امروہے کی چھوٹی سی، پرسکون بستی میں ایک بینک کی الماری میں مقفل پڑا ہے۔ غالب کے قدردان اس کے عکس حاصل کر کے، اور انھیں پاکستان اسمگل کر کے مطمئن نظر آتے ہیں۔ یہ بات ہنوز صیغۂ راز میں ہے کہ توفیق احمد صاحب کو، جن کے سر اِس دُرِ بے بہا کی ملکیت کی تہمت آتی ہے، اس اسمگلنگ میں کوئی حصہ ملا یا نہیں؟ انھیں مناسب معاوضہ ادا کرنے والی کوئی پارٹی سامنے آئی یا نہیں؟ ہماری کم نصیبی ہے کہ کسی انجمن ترقی اردو یا کسی غالب اکادمی نے غالب کی صد سالہ برسی کی اہم ترین دستاویز کو شائع نہیں کیا۔ اسے مرکزی یا ریاستی آرکائوز نے خرید کر محفوظ کر لینے کی بھی کوئی سعی نہیں کی،

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

مجھے نہیں معلوم کہ اسمگلنگ کی اس نئی قسم کے لئے ہمارے قانون میں کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو قانون میں مناسب ترمیم ہونی چاہیئے تاکہ ہم تہذیبی طور پر ایسی غربت کا آئندہ شکار نہ ہوں اور کوئی غالب کا قدردان، اردو، غالب اور ہندوستان کے ساتھ "وفاداری" کا حق ادا نہ کر سکے۔ ■■

5%
ٹیکس سے
بری سود
کمائیے
7- سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس
سرمایہ لگانے کے عمدہ وسیلے ہیں۔ یہ ٹیکس سے بری 5 فیصد سود پیش کرتے ہیں
اگر آپ کا تعلق اونچی آمدنی والے طبقے سے ہے (جیسا نیچے دکھایا گیا ہے) تو سود کی شرح کچھ اس
طرح ہوگی ....
اگر آپ کی آمدنی ہے
آپ کو ملے گا
20,000 روپے
6.37 فیصد
30,000 روپے
7.90 فیصد
40,000 روپے
9.30 فیصد
50,000 روپے
14.71 فیصد
تفصیل اپنے ڈاک گھر سے معلوم کیجئے۔
قومی بچت آرگنائزیشن

تیسری قسط

کرشن چندر

مشینوں کا شہر

پانچواں باب

"بے حد مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔" ڈاکٹر پارکنز نے سیما سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں آپ کی آمد کی خبر سب اخباروں میں بھجوا دی جائے۔"

سیما نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں، نہیں۔" وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جائیے مس اوڈاما۔" جنرل منیجر نے سیما سے کہا۔ "اگر آپ کو شہرت ناپسند ہے تو نہ سہی۔ مگر کرسی پر تو بیٹھ جائیے۔"

اس موقعہ پر چاروں آدمی اپنی اپنی کرسی پیش کرنے لگے چند لمحے عجیب افراتفری کا عالم رہا۔ بالآخر سیما نے بادل کی پیش کی گئی کرسی لے لی اور اس پر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر پارکنز بولے۔ "راکٹ کا سفر کیسا رہا"؟

دوسرا بولا۔ "فاصلہ اس قدر کم ہو جاتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب چلے کب پہنچے۔ میں اسی لئے راکٹ کے بجائے جیٹ یا ریل گاڑی کو ترجیح دیتا ہوں۔ معلوم تو ہوتا ہے کہ سفر کر رہے ہیں۔"

تیسرا کہنے لگا۔ "ہماری فیکٹری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

یکایک جنرل منیجر نے تحکمانہ لہجے میں بلند آواز میں کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ مس سیما کو کہنے دو۔"

"میں کیا کہوں ان سے"؟ سیما جنرل منیجر کی طرف دیکھنے لگی۔

"جو آپ کے جی میں آئے آپ ان سے کہہ سکتی ہیں۔ انھیں سننا پڑے گا۔"

سیما ان چاروں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا میں ان سے صاف صاف باتیں کر سکتی ہوں۔؟"

"کیوں نہیں۔" جنرل منیجر بولا۔ "اس میں ہرج ہی کیا ہے۔"

سیما ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "جس طرح کا سلوک آپ سے کیا جاتا ہے۔ کیا اس سے آپ کو تکلیف نہیں؟"

"کس طرح کا سلوک؟" ڈاکٹر پارکنز نے پوچھا۔

"کون ہمیں تکلیف دیتا ہے۔" دوسرا کہنے لگا۔

تیسرا بولا۔ "آپ کے دل میں یہ خیال کیسے آیا۔؟"

سیما بولی۔ "کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ آپ اس سے بہتر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔"

چوتھا بولا۔ "اس بہتر زندگی سے آپ کا مطلب کیا ہے؟"

سیما ایک دم جوش میں آ گئی۔ "یہاں تو شدید بے رحمی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اور آپ مجھ سے سلوک کی بات پوچھ رہے ہیں۔ ساری دنیا میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اسی لئے میں یہاں آئی ہوں۔ تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ اور جو میں نے سن رکھا تھا اس سے ایک ہزار گنا زیادہ بے رحمی میں یہاں دیکھتی ہوں۔"

"کس طرح کی بے رحمی"؟ چوتھے آدمی نے پوچھا۔

"ذرا سوچو۔" سیما بولی۔ "آپ لوگ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ ہم میں اور آپ میں کیا فرق ہے۔ مگر جس طرح سے آپ یہاں رہتے ہیں وہ بے حد شرمناک ہے۔"

ڈاکٹر پارکنز بولا۔ "ہاں اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ دنیا کی تہذیب کی بہت سی سہولیات سے ہم لوگ اس جزیرے میں

بلکہ میں کہوں گا اس تہ خانے میں رہتے ہوئے محروم رہ جاتے ہیں۔"

سیما بولی۔ "کیا میں آپ کو بھائی کہہ سکتی ہوں"؟

"کیوں نہیں۔" دوسرا بولا۔

سیما اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی —"بھائیو۔ میں صدر محترم کی بیٹی کی حیثیت سے نہیں آئی ہوں۔ میں انسانیت پرست لیگ کی طرف سے یہاں بھیجی گئی ہوں تاکہ میں آپ لوگوں کو بتا سکوں کہ انسانیت پرست لیگ کے دس لاکھ ممبروں کی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے — اور جو کچھ آپ کے ساتھ یہاں ہوا ہے میں اس کے خلاف پرزور احتجاج کر سکتی ہوں۔ ہم لوگ آپ کو ہر طرح کی مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔"

"کس طرح کی مدد؟"

"ذرا ٹھہریئے۔" پروفیسر گھوش مسکرا کر بولے۔ "میرا خیال ہے مس سیما اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اس وقت روبو لوگوں کو خطاب کر رہی ہیں۔"

"بلاشبہ یہ لوگ روبو ہی تو ہیں"۔ سیما نے کہا۔

وہ چاروں ہنسنے لگے۔ اور پھر چاروں اکٹھے بول پڑے۔

"ہم لوگ روبو نہیں ہیں۔ مس سیما ہم لوگ تمہاری طرح انسان ہیں۔"

سیما نے پلٹ کر پروفیسر گھوش کو مخاطب کر کے کہا۔ "مگر آپ ہی نے تو مجھے بتایا تھا کہ اس فیکٹری کے تمام آفیسر روبو ہیں، نقلی انسان ہیں۔"

"ہاں، آفیسر لوگ نقلی انسان ہیں۔ مگر ہر شعبے کا منیجر ایک انسان ہے۔ معاف کیجئے گا مس سیما۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔" پروفیسر گھوش ہنس کے بولا۔ "میں اپنے ساتھیوں کا تعارف کرانا بھول گیا۔ یہ ڈاکٹر پارکنسن ہیں، جن کا تعارف میں پہلے کرا چکا ہوں۔ یہ ہماری تجرباتی لیبارٹری کے انچارج ہیں۔ یہ ڈاکٹر جاوید ملک ہیں۔ یہ معاشیات کے ماہر ہیں۔ یہ ڈاکٹر پاٹل ہیں۔ جن کے ساتھ مل کر میں نے اس نقلی انسان کی تخلیق کی ہے۔ یہ ڈاکٹر روبن ہاشر ہیں اعصابیات کے ماہر۔"

سیما نے سب سے ہاتھ ملا کر معافی مانگتے ہوئے کہا۔

"میں بےحد شرمندہ ہوں۔ میں نے آپ کو نقلی انسان سمجھا۔ اور نقلی انسانوں کو اصلی انسان سمجھ لیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" بادل بولا۔ "نئے آنے والوں سے ایسی غلطی ممکن ہے۔ ذرا یہ پنیر کی پھلکیاں چکھئے۔"

"اور یہ کھوئے کے لڈو۔" جاوید ملک بولے۔ ان کی چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ جو ان کے ذہین چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر جاوید ملک نریندر گھوش سے کوئی دس سال بڑے ہوں گے۔ سیما نے غور سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں قیاس کیا، اور پھر ان کی بات کا پاس کیا اور کھوئے کا لڈو لے کر اس کا آدھا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال لیا۔ کھاتے کھاتے اس نے دیکھا کہ نریندر گھوش کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا اور گزر گیا۔

سیما لجا کر بولی —"آپ لوگ اپنے دل میں کتنا برا سمجھتے ہوں گے کہ میں یہاں آپ کی فیکٹری کے روبو لوگوں کو بغاوت پر اکسانے کے لئے آئی ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔" پروفیسر گھوش بولے۔ "ہمارے روبو سب کی باتیں سن لیتے ہیں۔ مگر ان پر کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔ وہ ہنستے تک نہیں۔ یہاں طرح طرح کے دیوانے آتے رہتے ہیں۔ پگلے۔ صوفی۔ منش اور دنیا کا سدھار کرنے والے رشی۔ پرچارک۔ بھکشک۔ سیاست داں اور مذہب پرست۔"

"اور آپ انھیں روبو لوگوں کو خطاب کرنے دیتے ہیں؟"

"بےشک۔ کیوں نہیں۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ میں آپ کو اپنی فیکٹری میں جانے کی اجازت دوں گا۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ میں آپ کو اس امر کی اجازت دوں گا مس سیما۔ کہ آپ ہمارے بنائے ہوئے روبو سے جو جی چاہیں کہہ دیں۔ بغاوت پر اکسائیں۔ یا انجیل قرآن وید ان کے سامنے پڑھیں۔ یا فرانسیسی انقلاب یا اشتراکی انقلاب کی باتیں کریں۔ یا ان کے لئے انسانی حقوق کا تقاضہ کریں ان پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے —" پروفیسر گھوش نے اپنے سگار کی راکھ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ آپ [illegible]"

اور محبت کا سلوک بھی نہیں کرتے۔"

"کسی روبوٹ سے محبت نہیں کی جا سکتی۔" ڈاکٹر بارکنر بولے!

"تو پھر آپ ان کی تخلیق کیوں کرتے ہیں؟" سیما نے پوچھا۔

"کام کی خاطر" پروفیسر گھوش بولے۔ "ایک روبوٹ ایک آدمی سے تقریباً ڈھائی گنا زیادہ کام کر سکتا ہے۔ انسانی مشین میں بڑی خامیاں ہیں۔ لیکن ایک دن انسانی مشین کو کارخانے سے نکلنا ہی تھا!"

"انسانی مشین کارخانے کے لئے اور کارخانے داروں کے لئے بہت مہنگی پڑتی ہے۔ انہیں تنخواہیں دینا پڑتی ہیں۔ کپڑے۔ کھانا۔ رہائش گھر۔ الم غلم۔ پراویڈنٹ فنڈ۔ پنشن۔ تعلیم۔ چھٹی۔ تفریح۔۔۔۔ بابا رے۔ کارخانے کے لئے انسانی مشین اب بالکل بیکار ہے۔"

ڈاکٹر روبن بائر بولے۔ "اور یہ بھی تو سوچئے کہ انسانی مشین کارخانے میں کام کرنے کے لئے کتنا وقت لیتی ہے۔ پورا بچپن بیکار ہے۔ پیدا ہونے سے اٹھارہ برس کی عمر تک کا عرصہ کارخانوں کے لئے بیکار ہے۔ وہ وقت ہم نے روبو بنا کر بچا لیا ہے۔"

ڈاکٹر جاوید ملک نے تعریفی نگاہوں سے سیما کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی انسانیت پرست لیگ کا اصلی مقصد کیا ہے۔؟"

"ہمارا اصلی مقصد روبو یعنی نقلی انسان کو ان کے حقوق دلوانا ہے۔ ان کی حفاظت کرنا ہے۔ اور ان کے لئے بہتر سلوک حاصل کرنا ہے۔"

"بہت اچھا مقصد ہے۔ مجھے اپنی لیگ کا ممبر بنا لیجئے۔" ڈاکٹر جاوید ملک بولے۔

ڈاکٹر بارکنر بولے۔ "میں بھی ممبر بن جاؤں گا۔"

"آپ ٹھیک سے نہیں سمجھے" سیما بولی۔ "ہمارا مقصد روبو لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔"

"کس طرح؟" بادل نے پوچھا۔

"[illegible]"

"یعنی ووٹ۔؟" ڈاکٹر گھوش نے پوچھا۔ "اور تنخواہ لیکن ووٹ لے کر وہ کیا کریں گے۔ اور تنخواہ ان کے کس کام آئے گی۔ وہ کیا خرید سکیں گے۔ کس سے؟ معدہ ان کے پاس نہیں ہے۔ کپڑے کارخانے دار مہیا کرتے تھے۔ جنسی اعتبار سے ان کا شمار نیوٹر جنس میں کیا جائے گا۔ علاوہ روبی عورتوں کے جیسے اسٹینو ٹائپسٹ ریسپشنسٹ (Receptionist) وغیرہ۔ ہم روبو لوگوں کی عورتیں نہیں بناتے آج تک کسی نے روبو کو مسکراتے نہیں دیکھا۔

"مگر وہ ذہین تو ہیں۔" سیما نے پوچھا۔

"بے حد ذہین روبو بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کی کوئی روح نہیں ہوتی۔ وہ لوگ انسان نہیں ہیں۔ انسان سے مشابہت ضرور رکھتے ہیں۔"

"اگر آپ ان سے محبت کا سلوک کریں؟" سیما نے پوچھا۔

"وہ محبت کے جذبے سے آشنا ہی نہیں۔ وہ لوگ اپنے آپ سے بھی محبت نہیں کرتے۔"

"بغاوت بھی نہیں کرتے کبھی۔"؟

"بغاوت؟ نہیں۔" ڈاکٹر جاوید ملک بولے "ہاں کبھی کبھی ان کا دماغ پھر جاتا ہے۔ وہ اپنی مٹھیاں کسنے لگتے ہیں اور دانت پیسنے لگتے ہیں۔ میں نے اس بیماری کا نام مرد باتشس رکھا ہے۔"

"آپ ایسے روبوں سے کیا سلوک کرتے ہیں؟"

"اس کے ٹکڑے کر کے پگھلا دیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر روبن بائر بولے۔ "میں اس بیماری کا علاج ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"یہ ایک کمزوری ہے۔ ہمارے روبو میں۔ جیسے ہم علاج کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"یہ کمزوری نہیں ہے۔" سیما نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "یہ ان کی روح ہے۔"

"کیا روح دانت پیس کر احتجاج کرتی ہے؟" پروفیسر گھوش نے طنزاً پوچھا۔

"یہ شاید علامت ہے اس بات کی کہ اندر کوئی جدوجہد

چل رہی ہے ۔ روبو کے دماغ میں بغاوت کی پہلی نشانی۔ ڈاکٹر روبن ہائڈ کوشش کرکے ان سے بہتر سلوک کیجئے۔" سیما نے ہمدردی سے کہا۔
ڈاکٹر جاوید ملک بولے "ابھی تو ہم ایک نئی قسم کا روبو بنانے میں مصروف ہیں ۔ تب اسے ڈوبو کہوں گا۔"

"ڈوبو ـــــ؟"

"ہاں ۔ ڈوبو ۔ روبو ۔ سے ذرا مختلف ۔ روبو کو درد کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔" پروفیسر جاوید ملک نے کہا۔ "کبھی کبھی کارخانے میں کام کرتے ہوئے وہ غلط طریقے پر کسی مشین میں اپنا ہاتھ دے دیتا ہے۔ تو اس کا ہاتھ کٹ جاتا ہے۔ مگر چونکہ اُسے کسی درد کا احساس نہیں ہوتا اس لئے اُسے اپنا بازو کٹ جانے پر ذرا افسوس بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی اس کا سر کسی مشین سے کٹ جاتا ہے اگر میں اس کے اعصاب میں درد کا ردِ عمل پیدا کر دوں گا تو اس سے وہ خود بخود اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے گا۔ اور کسی طرح سے بہتر مزدور بن سکے گا۔ بہت جلد میں ڈوبو بنانے میں کامیابی حاصل کر لوں گا۔"

"آپ اِن روبو یا ڈوبو لوگوں میں روح کیوں نہیں پیدا کرتے ہیں ـــ؟" سیما نے پوچھا۔

"یہ ناممکن ہے ـــ" پروفیسر گھوش نے کہا۔

"یہ ہمارے حق میں بھی نہیں ہے۔" ڈاکٹر پارکنز نے کہا۔

"دیکھئے مس سیما، روبو کی تخلیق کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ خرچ کم کیا جا سکے تاکہ اشیاء کی گرانی کم ہو جائے۔ کیونکہ کارخانے دار روبو کو کوئی تنخواہ نہیں دیتے اس لئے ان کا خرچ ایک تہائی کم ہو گیا ہے۔ اس حساب سے موجودہ قیمتیں پچھلی قیمتوں کے مقابلے میں ایک تہائی کم ہیں۔ اگلے دس سال میں جب ہم مزید روبو تیار کر سکیں گے اور دنیا کے ہر کارخانے کو روبو دے سکیں گے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ دنیا کا ہر انسان کام کی ذلت سے نجات پا جائے گا اور قیمتیں صفر تک پہنچ جائیں گی۔ روبو ہر چیز فراوانی سے پیدا کر سکیں گے۔ گیہوں ۔ چاول ۔ ریڈیو ، ٹیلی ویژن فرنیچر ۔ کپڑے پر دے فیشن ۔ کھانا ۔ لباس ۔ گھر ۔ مکان ۔ بلڈنگیں ۔ وہ سب بنا سکیں گے۔ صحیح معنوں میں اُسی وقت انسان اِس سیارے کا مختارِ کل ہوگا ۔ اپنی روح کا مکمل مالک۔"

"جنت کا سا تصوّر ہے۔" سیما حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"تم ایک نوجوان لڑکی ہو۔ میرے بیٹے بادل کی طرح۔" پروفیسر گھوش بولے۔ "ممکن ہے ہم لوگ وہ دن نہ دیکھ سکیں مگر آپ لوگ وہ دن ضرور دیکھیں گے۔"

سیما بولی: "میں کچھ گڑبڑا سی گئی ہوں۔ آئی تھی کسی اور کام کے لئے ۔ یہاں آپ کا مقصد کچھ اور نظر آتا ہے۔"

بادل نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر کہا۔ "بہت بحث ہو چکی میرے خیال میں مس سیما میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوں تو میں آپ کو فیکٹری دکھا دوں گا۔"

سیما اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ بولی "چلئے۔ ..."

چھٹا باب

بادل نے سیما کو پہلے وہ شعبہ دکھایا جہاں بڑے بڑے آہنی کڑھاؤں میں روبو بنانے کا خام مادہ گوندھا جاتا تھا۔ گوندھنے کا عمل بجلی کے ذریعہ ہوتا تھا۔ بڑی حیرت سے سیما نے اس مادے کو دیکھا۔ جو دیکھنے میں گلابی رنگ کا تھا مگر بٹن دباتے ہی یہ خام مادہ بڑے بڑے کڑھاؤں میں اس طرح اُبلنے لگتا تھا جس طرح اس نے صابن بنانے والے کارخانوں میں دیکھا تھا۔

بادل کہا۔ "بنیادی طور پر صابن بنانے اور روبو بنانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ترکیب وہی ہے ۔ صرف اجزا مختلف ہیں۔ اور عمل صابن بنانے سے بہت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔"

پھر سیما نے وہ شعبہ دیکھا ۔ جہاں گوشت بنتا تھا اور اس مادّہ سے رگ و ریشے تیار ہوتے تھے۔

ایک شعبے میں صرف نقلی اعصاب بنانے کے تار میلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ تیسرے شعبہ میں روبو کے لئے صرف دماغ تیار کیا جاتا تھا۔

چوتھے شعبہ میں روبو کے لئے جلد تیار کی جاتی تھی ۔ بادل اس شعبے کا انچارج تھا ۔ وہ بڑے فخر سے سیما کو اپنے ڈپارٹمنٹ میں

لے گیا۔

"یہاں جلد بنائی جاتی ہے۔" بادل نے سیما کو بتایا۔

اس ڈیپارٹمنٹ میں چاروں طرف لوم اور سپنڈل چل رہے تھے اور کتائی ہو رہی تھی مشینوں پر۔

"قدرت نے ہماری جلد کی تین تہیں رکھی ہیں۔" بادل سیما سے کہنے لگا۔ "لیکن روبوٹوں کے لئے صرف ایک مضبوط تہ کافی ہے۔ البتہ عورتوں یعنی روبی بنانے میں دو تہیں استعمال ہوتی ہیں پھر بھی وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو عورت کی جلد میں ہے۔"

سیما نے بات کا رخ پلٹ کر کہا۔ "تو یہاں جلد الگ سے بنتی ہے؟"

"یہ تم جو مشین دیکھ رہی ہو کہیں پر مہین تار بُنے جا رہے ہیں۔ کہیں پر اُن سے ذرا موٹے۔ لیکن میرے لئے سب سے مشکل کام وہ تھا جب میں نے سائی لین ایجاد کیا۔"

"سائی لین کیا۔؟" سیما نے پوچھا۔

"سائی لین نائی لون ہی کی ایک قسم ہے ایک طرح کا کیمیکل دھاگا جس سے روبو کی جلد بنی جاتی ہے۔ میری کوشش یہ رہی کہ میں ایک ایسا تانا کاتوں۔ جو پائیداری میں لائی لون سے زیادہ ہو اور ملائمت میں ریشم کو مات کرتا ہو کئی سال کے تجربوں کے بعد میں سائی لین بنانے میں کامیاب ہو گیا

اس وقت تم اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں۔ چاروں طرف جن مشینوں کا شور سنتی ہو اور جن باریک تاگوں کے جال کو مشینوں سے نکلتے ہوئے دیکھتی ہو یہ سب سائی لین کے تاگے ہیں۔ یا ان تاگوں سے بنی ہوئی کتائی ہے۔ جو سب سے آخر میں روبو کے جسم پر چڑھائی جاتی ہے۔"

سیما نے حیرت زدہ ہو کے اپنے چاروں طرف دیکھا۔

چاروں طرف مشینوں کی دبی دبی گونج کے درمیان ہزاروں گز لمبے تاگے نکل رہے تھے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے مختلف ساری کی بنائی میں ان کی کتائی ہو رہی تھی۔ انواع و اقسام کی جلدیں اس کی آنکھوں کے سامنے تیار ہو رہی تھیں۔

"عورتوں کی جلد کے لئے بہت ہی مہین نائی لون قسم کا سائی لین استعمال ہوتا ہے۔"

"یعنی۔؟" سیما کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر رک گئی۔

"یعنی جس قسم کی جلد تم نے شیلا کے چہرے پر دیکھی۔" بادل بولا۔

"آؤ تمہیں وہ سیکشن بھی دکھا دوں۔"

سیما کا ہاتھ پکڑ کر مشینوں کے گھیرے سے گزرتے ہوئے وہ اس کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں بے حد مہین اور ریشم سے بھی نازک تاگوں کا جال بنا جا رہا تھا۔ چاروں طرف خودکار مشینوں کی "غوں۔ غوں" خوابناک گونج تھی۔ اور فضا میں ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی ــــ

سیما نے ذرا آگے جھک کر ان ریشم سے باریک تاگوں کو چھونا چاہا۔ جو ایک مشین سے نکل رہے تھے کہ ایکدم زور کا جھٹکا سیما نے محسوس کیا۔ دوسرے لمحے میں اُس نے دیکھا کہ بجلی کی تیزی سے بادل نے اس کا ہاتھ ہٹا لیا۔ مگر اتنے میں سیما بادل کی باہوں میں بے ہوش ہو چکی تھی۔"

جب وہ ہوش میں آئی تو اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس کا بستر بے حد آرام دہ تھا۔ اور جس کی کھڑکیوں سے بجلی کی روشنی ہلکے ہرے پردوں سے چھن کر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے کرسی پر قریب ہی بادل بیٹھا تھا۔ مگر اس کی بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے آنکھیں کھلتے دیکھ کر بادل نے کہا۔ "شکر ہے تم بالکل بچ گئیں۔"

"مگر مجھے بجلی کا سا جھٹکا محسوس ہوا تھا۔"

"غلطی میری تھی۔ میں تم سے کہنا بھول گیا کہ کسی مشین یا تاگے کو ہاتھ نہ لگانا۔ ان سب میں بجلی کی رو دوڑ رہی ہے۔ شکر ہے تمہیں ذرا ہی سا جھٹکا لگا۔ اور میں اپنے ہاتھ سے تمہارے ہاتھ کو پرے لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اس جھٹکے نے تمہیں آدھے گھنٹے کے لئے بیہوش کر دیا۔"

"اور تمہارے ہاتھ پر یہ پٹی کیسی بندھی ہوئی ہے انگلیوں پر۔؟" سیما نے پوچھا۔

"یہ میری غلطی کی سزا ہے۔"

"زخم آیا ہے؟"

"نہیں۔ میرے بائیں بازو کی دو انگلیاں تاگے سے کٹ گئیں ہیں۔"

"...سنگ کی دھار کیسے تیز ہوتی ہے۔؟"
"جب مجھ سے نکلتی ہے تو اس کے اندر بلیڈ کی سی تیز دھار ہوتی ہے۔ تمہارے ہاتھ نے ابھی اُسے چھوا بھی نہ تھا کہ میرے ہاتھ نے تمہارے ہاتھ کو کھینچ لیا۔ مگر اس جھٹکے میں میرا ہاتھ تلنگ سے لگ گیا اور میری انگلیاں کٹ گئیں۔"
"میری خاطر۔؟" سیما آہستہ سے بولی۔
"تمہاری خاطر جان بھی چلی جاتی تو کیا تھا۔" بادل نے اُٹھتے ہوئے بادل نے بڑے درد بھرے لہجہ میں کہا۔ جیسے وہ کسی اور سے مخاطب ہو۔
سیما بستر پر اُٹھ بیٹھی۔ اپنے بال ٹھیک کئے۔ بادل نے اس سے کہا۔
"لیٹی رہو۔"
"نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" سیما نے بستر سے اُٹھ کر کہا۔ وہ بادل کے قریب آئی۔ اور اس نے بڑی ملائمیت اور نرمی سے بادل کے زخمی کو چھوا اور حیرت سے بولی۔ "میری خاطر۔؟"
بادل چپ رہا۔
سیما نے حیرت سے کہا۔ "حیرت تو اس بات کی ہے کہ جس فیکٹری میں ہر مورت سے اس قدر دور رہتے ہوں۔ وہاں اس قسم کی حرکت ہو جائے۔"
بادل سوز نگاہوں سے سیما کو دیکھ رہا تھا۔
سیما نے پوچھا۔ "کیا سب ڈپارٹمنٹ تم نے مجھے دکھائے ہیں؟"
"تقریباً سب۔"
"لیکن میں نے تمہارے شعبہ میں کسی روبو کو کام کرتے نہیں دیکھا۔"
"جیسے خود کار ہیں۔ ان میں روبو لوگوں کو کبھی جانے نہیں دیا جاتا۔"
"کیوں۔؟"
"تاکہ وہ اپنی تخلیق کے راز سے واقف نہ ہو سکیں۔ وہ بہت ذہین ہوتے ہیں۔"
"دوست۔" سیما جھجک کر بولی۔ "تقریباً سب کا کیا مطلب تھا۔؟"
"بس وہ شعبے تمہیں نہیں دکھائے۔" بادل بولا۔ "ایک تو

وہ شعبہ جہاں روبو کی ہڈیوں کا پنجر تیار کیا جاتا ہے۔ دوسرا وہ شعبہ جسے ہم اسمبلی پلانٹ کہتے ہیں۔ جہاں روبو کو آخری شکل دی جاتی ہے۔ وہ بھی ایک خود کار شعبہ ہے۔ اور اس کی نگرانی پروفیسر پاٹل اور میرے پتاجی کرتے ہیں۔ لیکن پروفیسر پاٹل سے بھی زیادہ میرے پتاجی روبو کی ساخت کو بہتر جانتے ہیں۔ اسمبلی پلانٹ میں ان کی رائے آخری اور قطعی مانی جاتی ہے۔ اور یہ اسمبلی پلانٹ کسی کو دکھانے کی اجازت نہیں ہے۔"
"اور اگر میں کہوں تو؟" سیما نے پوچھا۔
بادل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اگر تم کہو تو ضرور دکھا دوں گا۔ لیکن اس کے بعد مجھے گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔"
سیما کانپ کر بولی۔ "تو مجھے منظور نہیں ہے۔"
بادل چپ رہا۔
"اب اس کمرے سے چلیں۔؟"
"تم بالکل ٹھیک محسوس کرتی ہو۔؟"
"بالکل ٹھیک۔"
"یہی ڈاکٹر نے بھی کہا تھا۔ جو تمہیں ابھی دوا دے کر گیا ہے۔ اس نے کہا تھا جب تم اُٹھو گی تو بالکل ٹھیک محسوس کرو گی۔"
"ہاں میں بالکل تازہ دم محسوس کرتی ہوں۔"
"ہاں تو۔ اب تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں خاص طور پر فیکٹری کا ایک حصہ دکھانا چاہتا ہوں۔"
پہلے تو وہ لفٹ میں اوپر گئے۔ بہت اوپر گئے۔ جب لفٹ ختم ہوئی اور سب ان کے سامنے سیڑھیاں تھیں۔ پیچیدہ نیم دائرے کی شکل میں یہ سیڑھیاں اوپر دور اوپر کہیں جا رہی تھیں۔
بادل سیما کو ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ شروع شروع میں سیڑھیاں بہت چوڑی تھیں۔ اور تعداد میں زیادہ تھیں۔ جوں جوں وہ اوپر چڑھتے گئے۔ اور ان کی سانس پھولتی گئی۔ تو سیڑھیاں پتلی ہوتی گئیں۔ اور ان کی چوڑائی بھی [illegible] کہ بادل کی بانہوں نے اسے تھام لیا۔

سیما نے اوپر دیکھ کر کہا۔ "میں تھک گئی ہوں۔ اب میں اور اوپر نہیں جا سکتی۔"

بادل نے سیما کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا۔ آخری چند سیڑھیاں وہ اُسے اٹھائے ہوئے اوپر آیا۔ اور ایک ٹاور میں داخل ہوا۔

ٹاور میں پہنچ کر بادل نے سیما کو اپنی بانہوں سے آزاد کر دیا۔ سیما گھوم کر اس ٹاور کو دیکھنے لگی۔

اس ٹاور کی چھت کانچ کی تھی۔ اور یہاں آ کر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تہ خانے سے باہر نکل آئے ہیں۔ اس ٹاور کی دیواروں میں اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مگر چھت کانچ کی تھی۔ اور ٹاور کے اندر اور چاروں طرف بہت سی بڑی بڑی کانچ کی کھڑکیاں ایستادہ تھیں جن سے سورج کی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔

یہاں سے سیما بحر ہند کی لہروں کو اچھلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اور آسمان کو۔ اور آسمان پر اڑتے بادل کو۔۔۔

بادل نے کہا۔ "تم نے کہا تھا نا کہ تم نے آج تک آسمان نہیں دیکھا آسمان پر اڑتے بادلوں کو نہیں دیکھا۔ سر شام پھوٹتی ہوئی شفق کو نہیں دیکھا۔ اب دیکھ لو یہاں سے سب نظر آ رہا ہے۔"

"اس کانچ کی چھت پر وہ کیا ہے۔"؟

"ہیلی کاپٹر ہے۔"

"کاہے کے لئے؟"

"کسی خاص خطرے کے وقت استعمال کرنے کے لئے ایمرجنسی کے لئے۔"

سیما نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا۔ "اس ٹاور کی ہوا نیچے کے تہ خانوں سے گرم معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ ٹاور ایمرجنسی کے لئے ہے۔ اور ایک طرح سے یہ ٹاور ٹیرس گارڈن۔ یا کانچ کے باغیچے کا کام بھی دیتا ہے۔"

بادل ایک گملے کے قریب گیا۔ اور ایک بہت بڑا پیلا گلاب اس نے توڑ کر سیما کے بالوں میں اٹکا دیا۔

سیما نے [illegible] سے اس گلاب کو ٹھیک طرح سے اپنے بالوں میں سجا لیا۔۔۔

"میں کبھی کبھی اکیلا اس ٹاور میں آ جاتا ہوں۔" بادل بولا۔ "اور سمندر کا منظر دیکھتا ہوں۔ سمندر کی طرح ہی میرے دل میں عجیب سی ترنگیں اٹھنے لگی ہیں۔ میں سائنسدان ہو کر بھی ٹھیک طرح سے تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر تمہیں دیکھ کر۔۔۔"

وہ چپ ہو گیا۔

"ہاں مجھے دیکھ کر۔؟" سیما شوخی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہمیں شروع ہی سے اکیلے رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ [illegible] کے حساب سے کلاس میں بیٹھا ہوں۔ اس لئے مجھے [illegible] خاص طور پر باہر کی کھلی فضا سے محروم کر دیا گیا ہے۔ دوسرے انجینیر اور سائنسدان عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ سوائے پروفیسر جاوید ملک کے۔ جو ان لوگوں کے بہت بعد میں آئے۔ وہ بھی جینئس سے کم کے نہ ہوں گے۔ ان لوگوں کے لئے بہت آسان ہے باہر کی دنیا کو چھوڑ دینا۔ مگر میرے لئے۔۔۔"

وہ پھر چپ ہو گیا۔

سیما بولی۔ "ہاں تمہارے لئے۔؟"

"میرے لئے بھی آسان ہو گیا تھا جب تک تمہیں دیکھا نہ تھا ہر چیز آسان تھی۔ کوئی فیصلہ مشکل نہ تھا۔ کوئی کام دشوار نہ تھا میں سائنس میں مگن تھا۔"

سیما نے دھیرے سے کہا۔ "سائنس بہت اچھی چیز ہے۔"

"بہت اچھی ہے۔ مگر تمہیں دیکھ کر معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ نہیں ہے۔ اس دنیا میں سائنس سے بھی قیمتی چیزیں موجود ہیں۔"

"مثال کے طور پر۔"؟

"انسان۔ عورت۔ پھول۔ سمندر کا مدوجزر۔۔۔ دل میں اٹھتی ہوئی ترنگیں۔۔۔ تم۔۔۔"

بادل نے سیما کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

سیما نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے پپوٹوں کے اندر اسکی آنکھوں کی پتلیاں رنگ برنگی تتلیاں بن کر کیسے کیسے خواب دیکھنے لگیں۔ اسکے سینے میں سمندر کا سا مدوجزر ڈولنے لگا۔ آہستہ سے اسکا سر بادل کے سینے سے لگ گیا۔ جھک گیا۔ اسکے سسکتے بند ہونٹوں سے ایک آہ سی نکلی۔۔۔ جیسے وہ انتہائی خوشی کے درد کو محسوس کر رہی ہو۔

بادل نے اپنے خشک انگارہ [illegible] جلتے ہوئے ہونٹ [illegible] ہونٹوں پر رکھ دیئے اور ہولے ہولے سمندر شانت ہوتا گیا۔ (باقی)

محدود خاندان خوشیوں سے بھرپور ہوتا ہے کیونکہ سب کو بہتر
تعلیم، اچھی غذا اور کپڑے فراہم ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر طرح
اسے خوشی ہی خوشی میسر رہتی ہے۔
منظم اور خوشحال گھر کی طرح ایک محدود کنبہ بھی ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے خوشیوں سے بھرپور رہتا ہے۔
اپنے خاندان کو محدود کیجئے
اور بچوں کی پیدائش میں وقفہ ڈالئے۔
خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مفت مشورہ
چھوٹا کنبہ
خوشحال کنبہ
حسن ہمیشہ خوشی
کا سرچشمہ
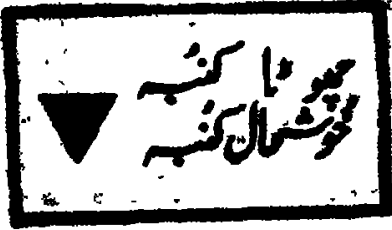
وکیل اختر

غزل

زندگی دست تہہ سنگ رہی ہے برسوں
یہ زمیں ہم پہ بہت تنگ رہی ہے برسوں

تم کو پانے کے لئے تم کو بھلانے کے لئے
دل میں اور عقل میں اک جنگ رہی ہے برسوں

اپنے ہونٹوں کی دہکتی ہوئی سرخی بھر دو
داستاں عشق کی بے رنگ رہی ہے برسوں

دل نے اک چشم زدن میں ہی کیا ہے وہ کام
جس پہ دنیائے خرد دنگ رہی ہے برسوں

کس کو معلوم نہیں وقت کے دل کی دھڑکن
میری ہر آزو ہم آہنگ رہی ہے برسوں

میری ہی آبلہ پائی کی بدولت اختر
رہگذر انکی شفق رنگ رہی ہے برسوں

غزل

نہ غیر بھائے نہ اپنا لگے بھلا مجھ کو
مرے شعور نے کیسا بنا دیا مجھ کو

اسی خیال نے پاگل بنا دیا مجھ کو
کوئی سمجھتا مجھے کوئی سوچتا مجھ کو

ہے کچھ سبب جو سر رہ گذار بیٹھا ہوں
سمجھ رہے ہو تو سمجھو شکستہ پا مجھ کو

زمانہ تجھ سے ملے گا تو خود بتائے گا
نہ پوچھ مجھ سے زمانے سے کیا ملا مجھکو

نہ مرنے ہی دے مجھے چین سے نہ جینے دے
اک ایسے شخص سے اختر ہے واسطا مجھکو

ایک نظم

جانے کتنی ہی صدیوں سے گہرے سمندر کی تہہ کو
یہی آرزو ہے
اسے کوئی سورج کا چہرہ دکھادے
مگر یہ بھی سوچو کہ دنیا کی ہر شے سمندر کی تہہ تو نہیں ہے

متفرق اشعار

ہر قدم وقت کی ٹھوکر پہ نظر ہو جیسے
آدمی سنگِ سرِ راہ گذر ہو جیسے

یوں تو تنہائی میں گھبرائے بہت
مل کے لوگوں سے بھی پچھتائے بہت

منکر عیش و طرب ہے یارو
دل کا اب حال عجب ہے یارو

خرد کی آندھیاں، اُنکا تغافل، اپنی مجبوری
تمناؤں کی لو مدھم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

یہ شہر بھی میرے لئے صحرا ہی رہا ہے
رستے میں کبھی میرے در و بام نہ آئے

دیکھتے ہی دیکھتے کل رات کو
برف سا اک جسم انگارہ ہوا

ڈاکٹر سید محمد عقیل

عجیب سانحہ

سانحہ
ہم پہ یہ گزرا
کل جناب

رات اتری
پنکھ پھیلائے ہوئے
بہہ گیا جب شام کا سونا تمام
آبِ رودِ نیل میں
اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر
روشنی
رات کے کالے لہو میں گھل گئی
میری نسبی قوتیں
کر چکیں انکار میرا تین بار
اور میرا جسم تھراتا ہوا
زندگی کے اس بھرے
بازار میں
ہر طرف سے پتھروں کی مار میں
شمر کی تلوار
کے سائے تلے
سجدۂ آخر کی خاطر
خنجروں کی دھار میں
تڑپا گیا
لوگ سمجھے کہ یہ سُولی ہے
میری ذات کی

واقعہ یہ ہے کہ لوگو!
میں نے چاہا تھا کہ فرازِ دار سے
شمر کی چلتی ہوئی تلوار سے
بے خطر ہو کر کروں
ایک حرفِ حق بلند
لیکن اب
حرفِ حق، صدق و یقیں
کردار و ایماں
بن گئے سب مہملات
ہر طرف
ٹوٹی پڑی اقدار ہیں
کون سنتا ہے کسی کی
زیست کے بازار میں
اک حسین اور اک مسیح
پھر رہے ہیں سر برہنہ
اس بھرے بازار میں
خوں میں ڈوبی ہے صلیب
ریگِ صحرا پہ شہیدوں کا لہو پھیلا ہے

عبدالرحیم نشتر

غزل

مجھے گدگدا کر وہ خود بھی ہنسی
ہوا بھی ہے لڑکی کوئی شوخ سی

مگر ہاتھ کب آئی موجِ صبا!
جگایا ہوس کو جو چھو کر چلی

میں پیاسا بکھرا تڑپتا رہا
کہ بہتی رہی خامشی سے ندی

اُسے کون کہتا وہ دھیرے چلے
ہوا نے کسی کی سنی ہے کبھی

نجانے مچل جائے کس بات پر
ہے بگڑا ہوا بچہ مجھ میں کوئی

پگھلتا بھی کیسے یہ سنگِ صدا
فضا تو وہاں برف آلود تھی

مجھے بھی کبھی گدگدا کر چلے
کوئی شبنمی سی ہوا صبح کی

جعفر عسکری

غزل

کھائے جب تلخیٔ حالات کے کوڑے ہم نے
رشتے، خود اپنے ہی احباب سے توڑے ہم نے

خانہ برباد ہوئے بھی، تو سکوں کی خاطر
شہر کے کوچہ و بازار نہ چھوڑے ہم نے

تھا فضاؤں میں وہاں بھی تو بلا کا آسیب
دن گذارے تھے ترے شہر میں تھوڑے ہم نے

ایک سیلاب بلا چار طرف پھوٹ پڑا
اشک جب چاک قمیصوں سے نچوڑے ہم نے

نہ کوئی قیدِ وفا تھی، نہ وفا کی زنجیر
رشتۂ خواب تھے، توڑے کبھی جوڑے ہم نے

جعفر عسکری

غزل

صبح کا احساس آخر بن گیا آزارِ شب
گر پڑی انوارِ احساسات پر دیوارِ شب

حکمرانِ شہر سویا سو گیا دربارِ شب
چاند ہے تنہا فلک پر قافلہ سالارِ شب

موسمِ سرما میں کیسی سست ہے رفتارِ شب
جو مسیحائے سحر تھے بن گئے بیمارِ شب

دشت و دریا کوہ و صحرا آفتاب ماہتاب
ایک ہی جیسے مسلط سب پہ ہیں آثارِ شب

کوئی قاتل شہر میں ایسا بھی ہوگا جو کبھی
منکشف مقتول پر کر دے سبھی اسرارِ شب

سب دکانیں بند لیکن چند دروازے ہیں وا
صبح کے بازار سے ہے مختلف بازارِ شب

عقیل شاداب

ہے جینا کتنا مشکل ۔ اور مرنا کتنا آسان ہے

ابھی کچھ دیر پہلے
ہاں ، ابھی کچھ دیر ہی پہلے
کسی نوبیاہتا کی چوڑیاں ہولے سے کھنکی تھیں
ابھی دو چاہنے والے
اسی پیپل کے پیچھے
اسی برگد کے سائے میں
گھروں سے اپنے اپنے چپکے چپکے ملنے آئے تھے
ابھی اس چھت سے اک پائل نے میٹھا گیت گایا تھا
ابھی اس کچے گھر میں ایک بچہ کنمنایا تھا
ابھی اس پیڑ کے پتوں نے لے پر تالیاں دی تھیں
ابھی جھینگر نے خاموشی کا اک نغمہ سنایا تھا
ابھی دلہن کے اس کمرے نے ہنس کر جھرجھری لی تھی
ہوا کا نرم جھونکا خوشبوؤں کو ساتھ لایا تھا
ابھی اونچی حویلی میں کسی نے جھوم کر پی تھی
ابھی اس رات کی رانی نے اک انگڑائی سی لی تھی
ابھی اک کھیت لہکا تھا
ابھی اک اُلّو بولا تھا
ابھی کچھ دیر باقی تھی
ابھی کچھ دیر سی پہلے

اچانک کیوں ؟
یہ جنت بن گئی دوزخ سے بھی بدتر
فضائیں گونج اٹھیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے
ہوائیں چیخ اٹھیں
چاند تارے کپکپا اُٹھے
جہازوں کی گرج ، بارش بموں کی، شور ٹینکوں کا
ہر اک جانب دہکتی آگ
اُبلتے خون کے دریا
فضاؤں میں بسی بارود کی دم گھونٹتی بدبو
جدھر دیکھو
ادھر بے آسرا، بے آبرو لاشیں
کٹے بازو، پھٹے سر، زخمی سینے، ننگی ابلائیں
کہیں معصوم بچے
خون پیتے دودھ کے بدلے
کہیں مسلی ہوئی کلیاں
کہیں کچلے ہوئے گجرے
کہیں اکڑی ہوئی ٹانگیں
کہیں بگڑے ہوئے چہرے
ابھی کچھ دیر پہلے، ہاں ابھی کچھ دیر ہی پہلے
جہاں پر زندگی معصومیت سے رقص فرما تھی
وہاں ۔۔ اب موت مادرزاد ننگی ہو کے رقصاں ہے
۔۔ جینا کتنا مشکل، اور،
مرنا کتنا آسان ہے۔

علقمہ شبلی

پسلی کی لاش

آسماں حدِّ نگاہ،
پتھروں کا ڈھیر چاند،
اور خلا؟
آدمی کی سیرگاہ
ارتقا کے ساز پر
رقص فرما زندگی
چھم چھما چھم چھم ——
پھر بھی
پسلی کی تلاش
ہو رہی ہے آج بھی

■■

نشاط پروین

صبح، دوپہر، شام

صبح کی پہلی کرن؟
بیتے زمانہ کا خیال
دوپہر کی دھوپ، جیسے
تم کو پانے کا سوال
اور سکوتِ شام؟
تم سے چھوٹ جانے کا ملال

■■

ظفر حمیدی

پرچھائیں

میں لمحات میں جینے والا مسافر
میں قیدِ زماں و مکاں میں گرفتار ہوتے ہوئے بھی
میں ماضی کے سنگین رشتے سے آزاد ہو کر
میں لمحوں کو اپنا سمجھتا رہا ہوں!
کسی موڑ پر ایک لمحہ تھا آیا تمھاری نگاہ گریزاں ملی تھی
میں گھبرا کے آگے بڑھا تھا
تمھیں ایک لمحے کی خاطر ہم آہنگ کر لوں
مگر اتنی ہی دیر میں اُف وہ مخصوص لمحہ
کہیں بربِ ماضی کی تہہ میں مری حسرتوں کو لئے سو چکا تھا!
میں اِس موڑ پر آج بھی پھر کھڑا ہوں
میں پرچھائیں سا لگ رہا ہوں
یہ پرچھائیں میری ہے یا ہے تمھاری؟
مرے سامنے بیکراں دشتِ آفاق پھیلا ہوا ہے"
کہیں آدم —— لاہوت شاید مرا منتظر ہے
میں شاید فنا ہو رہا ہوں
تم اپنی پرچھائیں واپس بلا لو!

■■

شاہد کبیر

بلندیاں تھیں نہ تھا فاصلہ زمانوں کا
قطار سنگ لگا سلسلہ مکانوں کا
سفینے موجوں کی آغوش میں سمٹ آئے
ہوا نے توڑ دیا زور بادبانوں کا
سروں کو ریت کے اندر دبائے بیٹھے ہیں
ہے سب کو خوف یہاں اپنی اپنی جانوں کا
مفر کہاں ہے صداؤں کے سنگ ریزوں سے
تماشہ ہے یہ بستر ٹوٹتی چٹانوں کا
ہوا میں نقش بناتا رہا لہو شاہد
میں ایک زخمی پرندہ تھا آسمانوں کا

شہاب عراقی

سر پر لٹک رہا ہوں میں شمشیر کی طرح
بکھرا ہوا ہوں فرش پہ زنجیر کی طرح
اس شہر میں دلوں کے دریچے نہ کھولئے
ہر شخص دوڑتا ہے یہاں تیر کی طرح
وہ مجھ کو گھورتا ہے مصور کی آنکھ سے
آتا ہوں جس کے سامنے تصویر کی طرح
تنہائیوں کی آنچ سے آنکھیں پگھل گئیں
دل بجھ گیا جلی ہوئی تحریر کی طرح
تہذیب عہد وسطیٰ کے مانند ہے دماغ
اور زندگی گھسی ہوئی تقریر کی طرح

رشید افروز

غبارِ راہ کو لشکر سمجھ رہا تھا میں
ہوا کا لمس تھا خنجر سمجھ رہا تھا میں
حسد، غرور، رقابت کی آگ تھی ان میں
جنھیں خلوص کا پیکر سمجھ رہا تھا میں
مجھے خریدنے والا کوئی نہ تھا لیکن
خود اپنی ذات کو گوہر سمجھ رہا تھا میں
سفر میں تھا تو محبت کا پیڑ سوکھ گیا
یہ چند اشک سمندر سمجھ رہا تھا میں
جو میری روح میں زندہ تھا آرزو بن کر
اُسے بھی راہ کا پتھر سمجھ رہا تھا میں

غزلیں

یوسف عثمانی

دوستوں کی محفل میں اس طرح جئے تنہا
ہر درخت جنگل میں جس طرح بڑھے تنہا

چاندنی کے دریا میں خواہشوں کی کشتی پر
ہم سفر تھے یوں تو تم پھر بھی ہم رہے تنہا

سر اُٹھا نہیں سکتا اس کے بارِ احساں سے
غم کی نعمت عظمیٰ بخش دی مجھے تنہا

ساتھ میرا چھوڑا ہے اسکی یاد نے ڈر کر
دل کے اس خرابے میں کیسے وہ رہے تنہا

مومن و دکی یوسف عشق میں ہوئے مشہور
لے کے داغ بدنامی ہم ہی رہ گئے تنہا

■■

یوسف عثمانی

جینے کی جیسے کوئی ادا یاد بھی نہیں
پژمردہ غنچہ مائل فریاد بھی نہیں
مدت کے بعد آج ہمیں یاد آگیا
وہ شخص جس کا نام ہمیں یاد بھی نہیں
ملنے کی اُس سے ایک تمنا ضرور تھی
لیکن بچھڑ کے دل مرا ناشاد بھی نہیں
پھر کون چل رہا ہے مرے دل کے ساتھ ساتھ
سایہ نہیں ہے یہ مرا ہمزاد بھی نہیں
ماحول شاعری کے لئے چاہیئے ضرور
یوسف مگر یہ ورثہ اجداد بھی نہیں

■■

ساغر مہدی

اب کوئی اشک کبھی آنکھوں کے سمندر میں نہیں
بے حسی وہ ہے کہ شاید کسی پتھر میں نہیں
میں نے چہروں پہ جو دیکھی وہ اذیت ناکی
سر پہ لٹکے ہوئے حالات کے خنجر میں نہیں
آبدیدہ یہ ہوا کون مری حالت پر
یہ فرشتہ تو کہیں خاک کے پیکر میں نہیں
مصلحت کتنا بدل دیتی ہے انساں کا مزاج
گھر کے باہر ہوں میں جو شخص وہ کیوں گھر میں نہیں
کتنے دل ٹوٹ چکے کتنے وطن ٹوٹ چکے
فیصلہ کیا ہو کہ سیتا ہی سوئمبر میں نہیں

■■

مریم غزالہ

کس لیے؟

گنگناتے شہر کی خاموش گلیاں
کیا نغمہ سُن رہی ہیں

لیمپ کے دھندلے سے اُجیارے میں کوئی
سوچتا ہے
کون ہے وہ ؟
وہ کہاں ہے ؟
جس کے پیچھے پیچھے وہ آیا یہاں تک
پر یہاں کوئی نہیں
(ساتھ تھا جو قافلہ گم ہو گیا جانے کہاں)

پتا! اس کو کچھ نہیں
بس وہ اس لیمپ کے دھندلے سے اُجیارے میں وہ
کھویا کھڑا ہے
سوچتا ہے
کس لیے، کیسے اچانک وہ یہاں ہے
کس لیے ؟
اور اب جائے کہاں ؟

—

شاہد کلیم

آدمیت

مجھے ساز مت دو
مرے پاس اک نغمۂ درد و غم کے سوا
اور کچھ بھی نہیں ہے
میں اس نغمۂ درد و غم کو سُنانا نہیں چاہتا
تمہیں بے بسی کے بھیانک سمندر میں غرقاب کرنا نہیں چاہتا
نشاط و مسرت کی محفل تمہاری بکھر جائے گی
مری طرح تم بھی اُداسی کے سانچے میں ڈھل جاؤ گے
غم کے پیکر نظر آؤ گے
تم
مجھے ساز مت دو
مرے پاس اک نغمۂ درد و غم کے سوا
اور کچھ بھی نہیں ہے

—

فاروق شفق

غزلیں

ہم ردا خوابوں کی اوڑھے ہوئے شب بھر جاگے
لمس شاید کسی پیکر کا بدن پر جاگے

روشنی جاگتی تھی جب تلک آنکھیں تھیں کھلی
روشنی سوئی تو پھر کتنے ہی پیکر جاگے

جانے سنسان پڑی کب سے ہے اک راہ گذار
کوئی گذرے تو پڑا راہ کا پتھر جاگے

سطح پر صرف پھیلنے سے نہیں کچھ حاصل
کوئی گہرائی میں اترے تو سمندر جاگے

سخت چٹانوں میں محبوس سکتا ہے کوئی
کب تلک قید رہوں کوئی تو آذر جاگے

پتیاں خواہشوں کی ٹوٹ ٹوٹ گرنے لگیں
ایسے ماحول میں اب کیا کوئی منظر جاگے

ایک وہ شئے کہ جگائے رکھا جس نے گھر کو
جب وہی شئے نہ رہی کس لئے پھر گھر جاگے

لفظوں کی شکل میں کاغذ پہ شفق پھیلا دو
کس لئے کوئی خلش سینے کے اندر جاگے

جسم پر خواہش کے کل اک دھندلا سا پیکر ملا
جب ٹٹولا تو کئی پردوں کے وہ اندر ملا

تنگ کمرے کی گھٹن میں پھنک رہا تھا کب سے میں
کچھ نہ پوچھو کیا مزہ کل سونے میں چھت پر ملا

جانے کیسے خواب کی کرچیں تھیں آنکھوں میں گڑی
صبح جب اٹھا تو تکیہ آنسوؤں سے تر ملا

سب کی آنکھوں میں کسی منظر کا گہرا عکس تھا
جس کے چہرے کی طرف دیکھا وہی ششدر ملا

ان کے بارے میں مری خوش فہمیاں نکلیں غلط
جس طرف سے مجھ کو آج آوازے کا پتھر ملا

راہ میں حائل چٹانیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں
خود بخود ہی دریا اپنے اصل سے کٹ کر ملا

سبزۂ و گل کے لہو کا آخری قطرہ تھا خشک
پھر بھی تشنہ تشنہ جیسے دھوپ کا شہپر ملا

غور سے دیکھا تو اپنے عہد کا انساں تھا وہ
راہ میں بکھرا، شکستہ کل جو اک پنجر ملا

اس کی واضح شکل ابتک ذہن میں ابھری نہیں
یوں تو وہ ہر موڑ پر بازار میں اکثر ملا

چلتے پھرتے منظروں کو آنکھوں میں بھر کر شفق
کچھ نہ پوچھو گھر میں جب آیا تو کیا منظر ملا

حباب ہاشمی

میری خاطر کوئی نامہ کوئی پیغام تو ہو
دلِ مضطر کو کسی طور سے آرام تو ہو

مجھ سے آوارہ کو مل جائے مگر جائے اماں
آرزو ہے ترے کوچے میں کبھی شام تو ہو

بیگناہی کا مرے قتل پہ چرچا ہوگا
کوئی بہتان سراشو، کوئی الزام تو ہو

موج خوں سر سے گذر جائے تو کچھ بات بنے
آج زنداں میں بھی تزئین در و بام تو ہو

تپتے صحرا میں بھی سایہ کہیں مل جائے گا
پہلے اے دوست تجھے جرأتِ یک گام تو ہو

مجھ کو پھر ہے اُسی حسرت گہِ ہستی کی تلاش
دلِ معصوم! ذرا خوگرِ آلام تو ہو

انگلیاں اٹھتی ہیں جس سمت بھی جاتے ہو حباب
نہ سہی کچھ مگر اک شاعرِ بدنام تو ہو

■■

فہیم اسعد صدیقی

ایک پرچھائیں کو اس شوخ کا پیکر جانے
دل زدہ پیاسا ہے کہ صحرا کو سمندر جانے

اس کا احسان ہے غم اس نے دیا ہے مجھ کو
کیسی دنیا ہے اُسی کو یہ ستمگر جانے

جاگتے میں بھی کہیں خواب نظر آتے ہیں
کیسے اُس گل سے بدن کو کوئی پتھر جانے

ہم سے منسوب ہوا تلخ حقیقت بن کر
وہ فسانہ کہ جسے شہر کا گھر گھر جانے

آپ کا کام ہے سو حشر اُٹھاتے چلنا
مٹ گیا کون کہاں آپ کی ٹھوکر جانے

کیوں میں ہر لمحہ پریشان رہا کرتا ہوں
کون اس راز کو اب آپ سے بہتر جانے

کون سمجھائے گا اسکو کہ دوانہ ہے فہیم
چند ٹوٹے ہوئے خوابوں کو مقدر جانے

■■

یونس ظفر منگری

بھنورا چپ ہے۔ گُل بھی ملول
کون بتائے کس کی بھول

آنگن تیرا رشکِ قمر!
چاندنی تیرے "گھر" کی دھول

میں نے کہا ہے تجھکو خدا
میری خطا ہے۔ میری بھول

موسمِ گل میں اپنے گھر
ہم نے دیکھی اڑتی دھول

آبلہ پائی لائی رنگ
صحرا صحرا۔ مہکے پھول

■■

اُردو مَر جائے گی!
اُردو مَر رہی ہے!!
اُردو مَر گئی!!!

ایک سمپوزیم پر رپورتاژ

ڈاکٹر شارب ردولوی

اُردو نہیں مرے گی!
اُردو نہیں مر رہی ہے!!
اُردو زندہ ہے!!!

اِدھر چند ماہ سے اردو ہندی رسائل و اخبارات میں اردو رسم خط کی تبدیلی کے مسئلہ پر پھر بحث شروع ہوگئی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ اردو رسم خط کی مخالفت اور موافقت میں وہی باتیں دہرائی جا رہی ہیں جو پندرہ بیس سال پہلے اس سلسلے میں کہی جاتی تھیں جب اُس وقت تمام مخالفت کے باوجود اردو والے اس بات پر تیار نہیں ہوئے تھے کہ رسم خط بدل دیا جائے تو اب اس بحث کو شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ظاہر ہے کہ اس وقت یہ بحث لسانی یا ادبی نہیں ہے۔ یقیناً اس کے پس پردہ کچھ اور عوامل کام کر رہے ہیں یا ہم الجھانے میں اور شر دوں کا مقصد حل کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے 'اردو بلٹز' میں اس سلسلہ میں بہت سے خطوط شائع ہوئے عصمت چغتائی کا ایک مضمون 'میں اردو کا فائدہ چاہتی ہوں' بھی شائع ہوا جس نے اس بحث کو اور ہوا دی۔ شاعر بمبئی، ہماری زبان علیگڈھ، قومی آواز لکھنؤ اور دوسرے اخباروں اور رسائل میں رسم خط کی تبدیلی کے خلاف، خبریں، تجاویز، اداریے اور مضامین شائع ہوئے۔ کچھ لوگوں نے افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس (وگیان بھون نئی دہلی) کے سامنے مظاہرہ کیا اور تبدیلیٔ رسم خط کے خلاف نعرہ لگا کر اپنے غم و غصّے کا اظہار کیا۔ یہ ساری فضا جذباتی تھی۔ دھرم ویر بھارتی ہوں یا عصمت چغتائی یا بمبئی کے فلمی ادیب انھیں رسم خط کی تبدیلی کا فیصلہ دینے کا کوئی اختیار نہیں عصمت چغتائی نے کہا کہ "اب محرم کی طرح اردو کا تہوار منانے سے کیا ہوگا۔ رسم الخط مٹ رہا ہے تو اس کے ملبے میں سے اگر اردو ترکیبیں بچالی جائیں تو کیا ہرج ہے اسمیں ہندی کا بھی نقصان نہیں۔ الفاظ ایک ملک کی دولت ہوتے ہیں وہ کسی بھی زبان میں سمو دیے جائیں۔ فائدہ ہی ہوگا ——— اردو کا رسم الخط مٹ رہا ہے تو اس کی لطافتوں کو مٹنے سے روک لیجئے۔" انھوں نے مضمون کے شروع میں تین جملے اس طرح لکھے تھے۔

اُردو مر جائے گی!
اردو مر رہی ہے!!
اُردو مر گئی!!!

یہاں پر ان کے مضمون پر رائے دینا مقصود نہیں۔ صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس فضا میں ضروری تھا کہ اس مسئلے پر ماہرین لسانیات اُردو کے اساتذہ، ادیب اور نقاد ادبی اور لسانی پہلوؤں سے غور کریں۔ ہر ایسے موقع پر جہاں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور تدریس کا سوال ہو یا تحقیقی اصول اور قدیم اردو مخطوطات کی ترتیب و تحقیق کا معاملہ ہو۔ اردو اساتذہ کی تنظیم یا تدریسی مسائل کا سوال ہو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو نے ہمیشہ پیش قدمی کی ہے اور فکر و عمل کی راہوں کو ہموار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی وقت کے تقاضے

کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے اردو رسم خط پر ادبا اور ماہرین لسانیات کا ایک سیمنار کرنے کا اعلان کیا۔ ۲۹ اور ۳۰ جنوری ۱۹۸۰ء کو دہلی یونیورسٹی کے ٹیگور ہال میں یہ سیمنار حیات اللہ انصاری، پروفیسر آل احمد سرور اور علی سردار جعفری کی صدارت میں ہوا۔ موضوع کی اہمیت کے خیال سے اس پر یہ رپورتاژ پیش خدمت ہے۔

آج (۲۹ جنوری ۱۹۸۰ء) اردو رسم خط سیمنار کا افتتاح تھا صبح جلدی جلدی ہم اور شمیم تیار ہوئے فاروقی صاحب ایسے موقعوں پر کچھ زیادہ گھبرائے ہوئے رہتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات آنے والوں کا استقبال۔ لوگوں کے صحیح جگہ پر بیٹھنے کا انتظام۔ صفائی۔ نفاست۔ وقت کی پابندی۔ کافی اور دیگر لوازمات کا انتظام یہ ساری باتیں انھیں اس وقت تک پریشان کئے رہتی ہیں جب تک جلسہ ختم نہ ہو جائے حالانکہ وہ ان سب کاموں کو کم از کم جلسہ سے ایک ماہ پہلے لوگوں کو تقسیم کر چکے ہوتے ہیں پھر بھی آخر وقت تک دوڑتے رہتے ہیں اور ہر شخص کی ڈیوٹی لگاتے رہتے ہیں۔ دہلی میں ایک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس عہد کے آخری مغل بادشاہ ہیں اسی طرح وقت کی پابندی، ہر کام میں ترتیب نفاست اور صفائی کے سلسلہ میں فاروقی صاحب ہندوستان میں بچے ہوئے آخری انگریز ہیں۔ اسی لئے ہم لوگ چاہتے تھے وقت سے پہلے پہنچ جائیں ورنہ سخت شرمندگی ہوگی۔ میں شمیم کے ساتھ جب یونیورسٹی کے احاطہ میں داخل ہوا تو سوا گیارہ بجے تھے۔ سب سے پہلے مجھے رشید حسن خاں صاحب ملے۔ وہ ہمیشہ ہی بڑی محبت سے ملتے ہیں بات بات میں ان کا لطیف مزاح بڑا لطف دیتا ہے آپ ان سے چاسوسی ناول کو نمنٹ، انگراؤنڈ کے کسی میچ کے بارے میں بات کریں یا تحقیق کے کسی مسئلہ پر ان کی جوش مزاجی میں فرق نہیں آئے گا اور آپ کو یہ محسوس نہیں ہوگا کہ تحقیق میں ان کا شجرہ قاضی عبدالودود صاحب سے ملتا ہے۔ انہوں نے ملتے ہی کہا۔

دیر کر دی آپ لوگوں نے ـــــ!

دیر کیوں ـــــ سیمنار تو ساڑھے گیارہ بجے شروع ہونا ہے۔ ابھی تو گیارہ بجے۔ دیکھئے فاروقی صاحب سامنے کھڑے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ فاروقی صاحب ٹیوٹوریل بلڈنگ کے سامنے کھڑے آنے والوں کا استقبال کر رہے ہیں میرا خیال تھا کہ سیمنار ساڑھے ۱۱ بجے شروع ہونا ہے خاں صاحب نے ۱۱ بجے کہہ کر آدھی جان نکال دی حالانکہ یہ صرف 'مزاح المومنین' تھا ہم لوگ آگے بڑھ کر فاروقی صاحب سے ملے اتنے میں سردار جعفری صاحب آگئے۔ مجھے معلوم نہیں کیوں ان سے بے حد محبت ہے میں ہمیشہ انھیں سردار بھائی کہتا ہوں اور کمزوری کی حد تک انکو چاہتا ہوں پچھلی بار جب ان سے ملاقات ہوئی تھی تو بہت کمزور تھے چہرے کا رنگ بالکل اڑا اڑا سا تھا میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیسے ہیں ـــــ کہنے لگے اب تو بہت اچھا ہوں لیکن مجھے سخت تشویش رہی ہم اور شمیم اکثر ان کے بارے میں بات کرتے۔ اس بار جب میں نے ان کو دیکھا تو واقعی اچھے نظر آئے تو بڑی خوشی ہوئی ہم لوگ انھیں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ عابد سہیل نے میرے سر ایک بے گارڈ ڈالا تھا کہ سیمنار پر رپورتاژ اور اس کی تصویریں چاہئیں۔ میرے پاس فہیم کا کیمرہ تھا جسے میں نے پہلے استعمال نہیں کیا تھا میں نے سوچا کہ لاؤ کچھ تصویریں ہی لے ڈالوں حالانکہ بعض وقت مجھے خود اچھا نہیں لگتا کہ ایسے موقعوں پر تصویریں لیتا پھروں لیکن عابد سہیل کو کون سمجھائے جو کسی بات کا جواب تو مانگتے نہیں صرف لکھ دیتے ہیں کہ یہ کر دو۔ میں کیمرہ نکال ہی رہا تھا کہ حیات اللہ انصاری صاحب آگئے انصاری صاحب اس سیمنار کے لئے الیکشن چھوڑ کر لکھنؤ سے آئے تھے جو واقعی ان کے ایسے سیاسی آدمی کے لئے بہت بڑی بات تھی اور اس بات سے محسوس ہوا کہ اردو رسم خط کا مسئلہ کتنی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حیات اللہ صاحب نے اردو تدریس، رسم خط اور املا کے مسائل پر بہت محنت اور جانفشانی سے کام کیا ہے ان کے آنے سے

سب کو خوشی ہوئی۔

میں چاہتا تھا کہ میں گروپ فوٹو کے بجائے ویسے ہی لوگوں کی گھومتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے فوٹوز لوں لیکن جیسے ہی میں نے اپنا کیمرہ ٹھیک کیا یہ لوگ بھی میری طرف مخاطب ہوگئے میں نے ایک تصویر لے لی چار بج چکے تھے فاروقی صاحب نے کہا کہ اب ادھر چلیں ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے ٹیگور ہال میں آگئے۔

ٹیوٹوریل بلڈنگ کی پہلی منزل پر ٹیگور ہال ہے زینے طے کرکے جیسے ہی آپ برآمدے میں داخل ہوں سامنے رابندر ناتھ ٹیگور کا سنگ مرمر کا بنا ہوا بہت خوبصورت مجسمہ نصب ہے چہرہ پر ایسا سکون اور نرمی ہے کہ دیکھنے والا بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی ساری پریشانی بھول جاتا ہے۔ برآمدے کے بائیں جانب ٹیگور ہال ہے اردو کے جلسے عام طور پر یہیں ہوتے ہیں۔ ہم لوگ جب ہال میں پہنچے تو آدھے سے زیادہ ہال بھر چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بقیہ جگہیں بھی پُر ہوگئیں ہم لوگ نہیں سوچتے تھے کہ رسم خط کے سیمنار میں اتنے لوگ دلچسپی لیں گے۔ میں نے ہال میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مختلف کالجوں کے اردو اساتذہ۔ ایم اے ایم لٹ اور دوسرے کورسز میں پڑھنے والے طلبا اور طالبات شعبۂ فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر نور الحسن انصاری، جامعہ ٹیچرس ٹریننگ کالج کے پرنسپل سلامت اللہ صاحب جامعہ کے شعبہ اردو کے قیصر عابدی صاحب اور بہت سے جانے پہچانے لوگ بیٹھے تھے۔

پروگرام کے مطابق خواجہ احمد فاروقی صاحب کی خیر مقدمی تقریر کے بعد رشید احمد صدیقی صاحب کو افتتاح کرنا تھا۔ سب ہی آنکھیں رشید صاحب کو تلاش کر رہی تھیں ان لوگوں میں ان کے مداح، عقیدت مند اور انکی زبان و انداز کے مارے ہوئے تو سب ہی تھے لیکن کچھ ان کے شاگرد بھی تھے اور کچھ زیادہ قربت رکھنے والے جو بہت بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ خطبۂ صدارت کے لئے پروفیسر مسعود حسن خاں صاحب کا نام تھا وہ بھی نظر نہیں آرہے تھے مسعود صاحب اردو کے سب سے بڑے ماہر لسانیات ہیں ان کی موجودگی اس موقع پر ضروری بھی تھی آخر فاروقی صاحب نے کھڑے ہو کر لوگوں کو اس کشمکش سے نجات دلائی۔ انھوں نے حیات اللہ انصاری صاحب سے صدارت کی درخواست کی اور بتایا کہ رشید احمد صدیقی صاحب ناسازیٔ طبع کی وجہ سے نہیں آسکے ہیں انھوں نے خطبۂ افتتاحیہ بھیجدیا ہے اس اعلان سے لوگوں کو خوشی ہوئی کہ وہ ملاقات سے محروم نہیں رہے وہ خواہ نصف ہی کیوں نہ ہو۔

فاروقی صاحب نے سب سے پہلے ساہتیہ اکادمی چیرمین نیشنل پروفیسر آف انڈیا اور ہندوستان کے مشہور لسانیات جناب سنیتی کمار چٹرجی کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ جب تک سارا ہندوستان ایک طرح کے اصلاح شدہ رومن رسم خط کو تمام ہندوستانی زبانوں اور ان زبانوں کے لئے جو ہندوستان میں مستعمل ہیں (بشمول سنسکرت، فارسی، اور عربی) منظور نہیں کر لیتا میرے خیال میں کسی ایک رسم خط کو ہندوستان کی تمام زبانوں پر لادنا اور زیادہ الجھنیں پیدا کریگا ایک زبان سے دوسری زبان یا ایک رسم خط سے دوسرا رسم خط بدلنا اتنا آسان مسئلہ نہیں ہے جتنا کوٹ تبدیل کرنا۔ ہمیشہ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی زبان یا رسم خط سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے محسوسات کے سلسلے میں بہت اہم ہوتی ہیں۔ ایک زبان کو ہندوستان کے مختلف الزبان لوگوں پر ٹھونسنا ملک کو انتشار کی طرف لے جائے گا۔ ہندوستان میں ایک رسم خط کو سب سے افضل مان کر ہمیں اپنی پریشانیوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہماری مختلف زبانوں اور رسوم خط میں بھی ہم آہنگی پیدا ہونے دیجئے جس طرح ہمارے مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں ہے جس نے ہندوستان کو ایک خاص کردار دیا ہے جیسے سینکڑوں پنکھڑیوں والا شگفتہ کنول کا پھول۔ اور انگریزی کو مختلف زبانوں اور مقامی تہذیبوں کے درمیان رابطہ اور بندھن کے طور پر باقی رہنے دیجئے جو کام کہ وہ اب تک انجام دیتی رہی ہے۔ انگریزی جو کہ ہمارے ملک کی اتحاد کی صرف

ایک علامت ہی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ عملی اہمیت کی حامل ہو۔ دیوناگری کی جے۔ خط اردو زندہ آباد ـــ بنگالی رسم خط کی جے (بنگالی رسم خط زندہ آباد) تامل اور ٹوروڈ آگ (تامل رسم خط زندہ آباد)

ادھر فاروقی صاحب نے رسوم خط زندہ آباد کے نعروں پر پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کا پیغام ختم کیا اُدھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ پروفیسر چیٹرجی رومن رسم خط کے بہت پرانے وکیل ہیں ان کی اس بات سے کسی کو بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کوئی سمجھدار آدمی ان کی اس بات سے اختلاف نہ کرے جب تک تمام زبانوں (بشمول ہندی) کے لئے کسی ایک رسم خط پر سب کا اتفاق نہ ہو اس وقت تک کسی رسم خط پر سب کا اتفاق نہ ہو اس وقت تک کسی رسم خط یا زبان کو فوقیت دینا اور اس کو سب پر لادنے کی کوشش کرنا ملک کو انتشار کی راہ پر لگانا ہوگا۔

اس کے بعد خواجہ احمد فاروقی صاحب نے اپنے منفرد اسلوب میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا جو روایتی خطبۂ استقبالیہ نہیں بلکہ زبان اور رسم خط کا ایک جامع جائزہ تھا۔ جس میں بڑے مدلل انداز میں اردو رسم خط کی خوبیاں اور ان تاریخی و سماجی حالات کا جائزہ لیا گیا تھا جن سے پچھلے بیس سال میں اردو دوچار رہی ہے۔ انھوں نے رسم خط کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ قول نقل کیا جو میری کہانی جلد اول صفحہ ۲۹۵ سے ماخوذ تھا جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"رسم خط اور ادب کا بہت گہرا تعلق ہے اور رسم خط کی تبدیلی ہر زبان کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم خط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں آوازیں بدلیں اور خیالات بدل جاتے ہیں قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل ہوئی اور ۱۹۵۰ء میں نیا آئین نافذ ہوا دستوری ضمانتوں کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ ہندوستان کی سب ہی قومی زبانوں اور ان کے رسوم خط کو پھولنے پھلنے کا موقع ملے گا لیکن تاریخ کی بوالعجبی ملاحظہ ہو کہ جو لوگ جمہوریہ ہند کے دشمن تھے اور جو نہیں چاہتے تھے کہ ملک میں ایک نا مذہبی اشتراکیت پسند اور سیکولر ریاست قائم ہو انھوں نے سب سے زیادہ اپنے اعتراضات کا ہدف اردو کو بنایا اس لئے کہ وہی متحدہ قومیت اور ملکی سالمیت کی سب سے اہم علامت تھی سب سے پہلے تو کہا گیا کہ اردو غیر ملکی اور فرقہ وارانہ زبان ہے جب یہ بات پاؤں نہ چلی اور تاریخ نے ثابت کیا کہ آزادی کی جدوجہد، ملک کی ترقی پسندانہ تعمیر، اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج و اشاعت میں اردو کا حصہ سب سے زیادہ ہے ــــ تو اردو پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہندی کا اسلوب ہے اور اس کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں ـــ سبحان اللہ ـــ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے ـــ!

اب یہ اصرار ہے کہ مکمل یک جہتی اور قومی یک رنگی کی خاطر اس کا رسم خط بدل دیا جائے اور وہ دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس طرح اردو کا بدیسی پن جاتا رہے گا اور وہ ہندوستان کی ان تمام زبانوں کی صف میں آجائے گی جن کا رسم خط براہمی سے نکلا ہے۔"

فاروقی صاحب نے زبان پر بدیسی پن کے الزام سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ "اس میں دیسی الفاظ ۸۵ فیصدی سے زائد ہیں ۱۵ فیصدی سے کم بدیسی ہیں۔ جب بدیس کے لوگ آئے تو ان کے ساتھ ان کی نئی چیزیں نئے خیالات اور نئی ضرورتیں آئیں اور جس طرح پرتگالی لفظ اردو میں داخل ہو گئے ویسے ہی فارسی ترکی اور عربی کے ــــ انھوں نے بتایا کہ اردو میں تمام افعال تمام حروف اور تمام اسماء جو عام ضرورت کے ہیں وہ دیسی یا ہندوی ہیں اس طرح اس میں آوازوں کی ایک بڑی تعداد ہندستانی ہے اور جو باہر کی ہیں ان میں بھی بیشتر کو مورّد کر لیا گیا ہے آگے چل کر سماجی و تاریخی جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہاں مختلف قومیں اور تہذیبیں آئیں ان میں آویزش بھی ہوئی اور

آمیزش بھی لیکن ان مغلوں نے اس تہذیب کی مٹی کو پہلے سے زیادہ زرخیز بنا دیا اور اس تمدن میں وہ رنگا رنگی اور خوبصورتی پیدا کر دی جو ہمارا ہی نہیں بنی نوعِ انسان کا بیش قیمت ورثہ ہے۔ مغلوں کے زمانے میں جو مغل ہندی اور پیوند کاری کے تجربات سے گزر چکے تھے یہ تہذیبی نقوش اور زیادہ حسین ہو گئے انھوں نے ہندوستانی تہذیب میں ایرانیوں کی لطافت خوش سلیقگی اور ذوقِ جمال کی قلم لگا کر اسکو حسین تر بنا دیا اس زمانے کی عمارتیں تصویریں تصوف کی تحریکیں اور شعر و موسیقی کے کارنامے اور اسلامی تصوف باہم مل گئے ہیں اسی طرح فتح پور سیکری احمد آباد اور سری نگر کی عمارتوں میں ادھر اُدھر یوں منوہر اور عبدالصمد کی تصویروں میں امیر خسرو رحیم فیض اور غالب کی شاعری میں یہ امتزاج ابھر صاف نظر آتی ہے یہاں امتیازات مٹ گئے ہیں اور فنونِ لطیفہ نے اپنے حدود کے اندر ہندوستانی روح کو پالیا ہے بالکل یہی صورت اردو زبان کی ہے جو کھڑی بولی کی نکھری ہوئی شکل ہے جو نئے تاریخی و تہذیبی عوامل کی بدولت نئے رموز و علائم نئے قواعد نئے عروض اور نئے رسم خط میں ڈھلتی ہے۔"

"اردو رسم خط اردو زبان کی طرح اپنی انفرادیت رکھتا ہے اس کی اصل نسخ ضرور ہے جو مختلف ادوار سے گزرتا ہوا کشش کے فرق اور حروف کے اضافے کے ساتھ ایران میں فارسی ملایا میں ملائی مراکو میں مغربی اور ہندوستان میں اردو رسم خط بن گیا۔ اردو رسم خط بنگالی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے انیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک اس کے مخطوطے اردو رسم خط میں بھی ملتے ہیں اسی طرح پد ماوت کا اولین مخطوطہ اردو رسم خط میں ہے پنجابی کے سینکڑوں مخطوطے اسی رسم خط میں ہیں۔ سندھی تو اسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے جنوبی ہند میں عربی تامل کے بہت سے نمونے ملتے ہیں" انھوں نے نتیجہ نکالتے ہوئے بتایا کہ "اردو رسم خط ہندوستانی آوازوں کے ادا کرنے کا اہل ہے اضافہ ایک مخلوط زبان کی ذمہ داریوں کو بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے سندھی میں چار آوازیں مخصوص ہیں چار آوازیں عربی کی ہیں اس کے علاوہ سنسکرت ترکی فارسی کے صدہا الفاظ ہیں جن کو یہ رسم خط بخوبی ادا کر سکتا ہے۔"

فاروقی صاحب نے اپنا خطبۂ استقبالیہ ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے رشید احمد صدیقی صاحب کا خطبۂ افتتاحیہ پیش کرنے کی درخواست کی حسن صاحب دوسری صف سے نکل کر مائیک پر گئے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں پڑھنا شروع کیا۔

"بہت دن ہوئے غالباً کسی مغربی دانشمند نے کہا تھا کہ گھوڑے پر سوار کوئی دریا پار کر رہا ہو تو منجدھار میں کبھی رہوار نہ بدلنا چاہیئے اس مشورہ یا تنبیہہ کے مطابق جس سیاسی دھارے میں آج ہم آپ اردو سماج اردو زبان و ادب اور رسم خط رواں دواں یا کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں اسمیں رہوار بدلنے کا سوال ہی نہیں بلکہ اس پر خوب جم کر بیٹھنا چاہیئے یہاں تک کہ سفینہ کنارے پر آلگے پھر ہم سب کو اختیار ہوگا کہ ناخدا کے ستم و جور کا ذکر یا خدا کا شکر ادا کریں۔" رشید صاحب کے خطبہ کا عنوان 'کچھ اردو رسم خط کے بارے میں' تھا ان کے اسلوب کے بارے میں کچھ کہنے کا یہ موقع نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے آبدار جملے اور مسکراتے ہوئے نشتر ہال میں واہ واہ اور سبحان اللہ کی فضا پیدا کر دی تھی۔

انھوں نے آگے چل کر کہا کہ "رسم خط کی تبدیلی کا مشورہ دو زبانوں کو خاص طور پر دیا جاتا ہے ایک اردو دوسری سندھی ـــــ اس کا ایک سبب بظاہر یہ ہو سکتا ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں کی ایسی کوئی قوت موجود نہیں جو کسی سیاسی دباؤ کی شکل اختیار کر سکے جس کا لحاظ کرنے پر ارباب اختیار مائل یا مجبور ہوں۔ دوسرے یہ کہ اردو اور سندھی رسم خط بدیسی زبانوں یعنی فارسی اور عربی سے مستعار ہیں اس لئے ان کو تو مٹانے کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر کلچر کے معیار اور مقاصد کے تعین میں عالمگیریت کے اصول کو اپنانے اور برتنے کے بجائے دیسی اور بدیسی کی تخصیص پر زور دیا جائے گا یہ ہمارے ہی نہیں کسی تہذیبی مستقبل کے بارے میں کوئی امید افزا علامت نہیں ہے انصاف اور مصلحت اندیشی کا تقاضہ یہ تھا کہ ناگری لپی کو اختیار کرنے کا مشورہ پہلے ان علاقائی زبانوں کو دیا جاتا جن کی لپیاں ناگری کے مماثل یا قریب تر ہیں اور

جن کی بیشتر لغت بیشتر سنسکرت سے اخذ کی گئی ہے یا کی جائیگی "
انھوں نے کہا کہ میں اردو رسم خط کو ترک کر دینے کے حق میں نہیں ہوں لیکن اس کی پرزور تائید کروں گا کہ اردو کی قابلِ قدر تصانیف ہندوستان کی دیسی بدیسی زبانوں میں بڑی احتیاط اور اہتمام سے شائع کی جائیں۔

رسم خط کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے رشید صاحب نے فرمایا کہ اردو رسم کا طین ادب اور شرفائے فن کے بڑے طویل مسلسل اور مقدس ریاض شوق اور شغف کا نتیجہ ہے ..... بے سوچے سمجھے کسی رسم خط ترک کرنے کا مشورہ دینا یا اس کا مرتکب ہونا یا اس سے کھیلنا ایک بڑے ہی قیمتی ورثہ اور تعمیر کو تاراج کرنا ہوگا۔ رسم خط زبان کا لباس نہیں ہوا کرتا کہ جب جی چاہا اتار دیا اور دوسرا اختیار کر لیا۔ یہ زبان کی مخصوص ہیئت، حسن، مزاج اور اس کا نشانِ امتیاز ہوتا ہے جسکو اس کی شخصیت یا ذات سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کا بدلنا نہ آسان ہے نہ عقلمندی اس کے بدلنے سے اردو زبان و شعر و ادب اور اسکے پیچھے جو تاریخ و تہذیب ہے وہ ایک گورستان بن کر رہ جائیگی یہاں اقبال کا ایک مقولہ یاد آتا ہے جو کہیں سنا یا پڑھا تھا کہ رسمِ خط زبان کی عزت نفس self respect ہوتا ہے اس کو ترک نہ کرنا چاہیے "
زبان کی موجودہ صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا کہ موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ اولاد اپنی ماں کی ہیں اور زبان دوسرے کی ماں کی بولتے ہیں۔ انھوں نے تفصیل سے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ان ریاستوں کا ذکر بھی کیا جنھوں نے اپنے پرانے رسم خط کو ترک کر کے نئے رسم خط کو اپنایا ہے مثلاً ترکی، انڈونیشیا، جرمنی وغیرہ اور ان خاص حالات کو بتایا جن میں وہاں کے لوگوں نے اس تبدیلی کو مان لیا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ دیکھنا یہ ہے کہ اردو والوں کو اس سعئ صفادر ماسے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے یا نہیں۔

رشید احمد صدیقی صاحب کے مقالے کے بعد خواجہ صاحب نے اس اجلاس کے صدر جناب حیات اللہ انصاری سے گزارش کی کہ وہ خطبۂ صدارت ارشاد فرمائیں۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے کہا کہ انھوں نے کوئی خطبۂ صدارت نہیں لکھا ہے۔ انھوں نے "اردو رسم خط دقتیں الجھنیں اور حل" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جو بہت ٹکنیکل ہے۔ اور واقعی بڑا ٹکنیکل نکلا۔ موضوع پر حیات اللہ صاحب کی نگاہ اور گرفت میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن کم از کم میں نہیں سوچتا تھا کہ وہ قواعد اور املا کے اتنے بڑے ماہر نکلیں گے کہ مقالے کو سن کر کم از کم میرے لئے تو سمجھنا مشکل ہو گا۔ انھوں نے حروف، آوازوں، تلفظ، املا اور طباعت وغیرہ کی دشواریوں اور ان پر قابو پانے کے طریقوں سے مفصل طور پر بحث کی۔ انھوں نے بتایا کہ اردو رسم خط فارسی سے لیا گیا ہے اور فارسی میں عربی سے لیا گیا تھا جب یہ رسم خط فارسی میں منتقل کیا گیا تو محسوس ہوا کہ وہاں بعض آوازیں ایسی ہیں جو عربی میں نہیں ہیں اس لئے منتقل کرنے میں ان آوازوں کے لئے علامات اور حروف بنائے گئے فارسی میں یائے خفیف اور واوِ خفیف پایا جاتا ہے جو کہ عربی میں نہ تھا اس لئے عرب والے ان آوازوں کو یائے مجہول اور واوِ مجہول کہنے لگے فارسی میں ان کو ایک آواز زے سے ملتی جلتی ملی تو اس کے لئے "ز" پر ایک جگہ تین نقطے لگا کر "ژ" بنا دیا گیا اسی طرح کاف پر ایک مرکز لگا کر گاف بنایا گیا اور جیم کے نیچے ایک کی جگہ تین نقطے لگا کر چے بنا لیا گیا اس طرح فارسی خط کی ضرورتوں کو پورا کیا گیا اردو میں آنے کے بعد اس خط میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں ہو گئیں ایک تو یہ کہ آٹھ حروف نے اپنی آوازیں کھو دیں وہ ہیں۔ ث۔ ص۔ ح۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ ع۔ ط۔ ان کی آوازیں وہی ہیں جو س۔ ہ۔ ز اور ت کی ہیں۔ ہمزہ (ء) کا عربی تلفظ بھی چلا گیا دوسری طرف بارہ آوازیں بڑھ گئیں وہ یہ ہیں۔

بھا (بھاتی) پھا (پھاہا۔ پھل) جھا (جھاڑو) تھا (تھاپی) ٹھا (ٹھاکر) چھا (چھاتا) دھا (دھان) ڈھا (ڈھال) ڑھا (اڑھا) کھا (کھایا) گھا (گھاٹی) لھا (آلھا) ان تبدیلیوں کے علاوہ اردو میں ٹ، ڑ اور ڈ کا اضافہ کیا گیا۔

اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ واقعی بہت کم ... میں کسی لفظ کا صحیح پڑھنا ہندی کے مقابلے میں مشکل ہے حیات اللہ انصاری صاحب نے ان اعتراضات کا بڑی وضاحت کے ساتھ جواب دیا اور بتایا کہ اردو میں ... [illegible]

جاتے ہیں ان کی تعداد در اصل سات نہیں ۱۲ ہے۔ ان ۱۲ واولوں کو انہوں نے آکھرے واول کا نام دیا ہے دوسرے ۱۴۴ واول اور تیسرے ۱۷۲۸ واول بتائے، اس طرح کل تعداد ۱۸۸۴ ہوئی۔ انھوں نے بڑی وضاحت اور تفصیل سے ایک ایک بات سمجھائی پھر بھی میرے لئے ساری مثالیں نوٹ کرنا مشکل تھا۔ اس کے بعد انھوں نے رسم خط اور املا کے سلسلے میں پیدا ہونے والی دشواریوں اور ان کے حل سے بحث کی مثلاً نئے حروف کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ سنسکرت کے ڑاں (ڑ) کی کمی کو نون غنہ کے اندر طا بنا کر پورا کیا جا سکتا ہے جیسے سپورٹ نانند۔ آخر میں انھوں نے دیوناگری سے اردو رسم خط کا مقابلہ کیا اور بتایا کہ ہمارا رسم خط دیوناگری کے مقابلہ میں زیادہ جامع ہے جس میں زیادہ صحیح تلفظ ادا کیا جا سکتا ہے۔ اشاعت کی دشواریوں کے سلسلہ میں طباعت کے خط نسخ کے استعمال کا مشورہ دیا۔

حیات اللہ انصاری صاحب کے مقالے کے بعد پہلا اجلاس ختم ہوگیا۔ دوسرا اجلاس تین بجے سہ پہر سے تھا اس لئے لوگوں کو کھانے کی فکر ہوئی سردار جعفری اور حیات اللہ انصاری کو فاروقی صاحب اپنے ساتھ لے کر چلے گئے کچھ لوگ کافی ہاؤس روانہ ہوئے میں نے سوچا کہ دو گھنٹے میں ماڈل ٹاؤن سے کھانا کھا کر واپس آیا جا سکتا ہے اس لئے ہم لوگ گھر آ گئے۔ سب کو اس بات کی خوشی تھی کہ سیمنار کی ابتدا اچھی ہوئی ہے اور اب تک بڑے فکر انگیز مقالے پڑھے گئے ہیں اس کے لئے دوسرے اجلاس بھی اچھے ہوں گے۔ ہم لوگ تین بجے واپس پہنچ گئے جب میں ہال میں پہنچا تو کچھ لوگ بیٹھے تھے کچھ چہل قدمی کرتے ہوئے آ رہے تھے اور کچھ لوگ ہال کے باہر کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ اتنے میں آل احمد سرور صاحب آتے ہوئے نظر آئے جو وہ سیاہ بالوں والی ایک اونچی ٹوپی دیے ہوئے تھے جو ماسکو کی برف باری کی یاد دلا رہی تھی۔ ان کے چہرے پر وہی جانی پہچانی اور ہمیشہ رہنے والی مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہے ہوں ـــــ اچھا تم بھی ہو ـــــ! سرور صاحب میرے استاد ہیں لکھنؤ یونیورسٹی میں میں نے ان سے کئی سال تعلیم حاصل کی ہے اس لئے ان کی مسکراہٹ کی تہوں کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ وہ خفا ہوں تب بھی یہی مسکراہٹ ہوگی اور خوش ہوں تب بھی۔ اردو غزل کی اشاریت اور لفظوں کی تہہ داریوں سے تو آپ واقف ہی ہیں بس وہی اشاریت اور تہہ داری اس مسکراہٹ میں بھی ہے۔ فاروقی صاحب بڑھ کر ملے سرور صاحب نے بھی جلدی جلدی سب سے ہاتھ ملایا کسی کے سلام کا جواب ہاتھ اٹھا کر دیا کسی کو جنبشِ سر سے ـــــ

اس اجلاس میں جو لوگ صبح تھے وہ تو تقریباً تھے ہی لیکن جو دو ایک چہرے نئے نظر آ رہے تھے ان میں جاں نثار اختر صاحب اور مسٹر لائڈ موری (اگر مجھے نام اور تلفظ صحیح یاد ہے) نمایاں تھے۔ امریکن بھی عجیب و غریب چیز ہیں ان کی ہندوستانی زبانوں، تہذیبوں اور مذاہب سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی کبھی کبھی بعض لوگوں کو بدگمان کر دیتی ہے کیونکہ یہ آپ کو ہر جگہ مل جاتے ہیں خواہ وہ جدیدیت پر سیمنار ہو یا رسم خط پر۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہو یا انجمن ترقی اردو کا جلسہ ـ

آل احمد سرور صاحب نے اس اجلاس کی صدارت کی سب سے پہلے انھوں نے خطبۂ صدارت پڑھا جس میں انھوں نے ان حالات اور ان لوگوں کا جائزہ لیا تھا جو رسم خط بدلنے کی بات کرتے ہیں انھوں نے شروع میں بتایا کہ اردو رسم عربی یا فارسی رسم خط نہیں ہو جس طرح ہم نے عرب و ایران کی بہت سی چیزوں کو اپنے رنگ میں ڈھال لیا ہے اسی طرح یہ رسم خط ہے اس میں ہم نے متعدد اضافے کر کے اسے اردو رسم خط بنا لیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ

"اردو کے لئے جو لوگ ناگری رسم الخط اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں وہ خدا جانے کیسے اس وسوسے میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اردو اگر مری نہیں تو نیم جان ہے اور اس کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ دیوناگری رسم الخط سے یہ ہندی پڑھنے والوں کے دلوں میں پہنچ جائے گا..... میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اردو نیم جان ہے یا مر رہی ہے.... اردو پر نہ ایسا برا وقت پڑا ہے نہ اردو کی جان کے لالے پڑے ہیں نہ اردو سمٹ کر چند شہروں تک رہ گئی ہے نہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے نہ

اردو جاگیرانہ ماحول کی یادگار ہے نہ یہ مصنوعی زبان ہے۔ اُردو ہماری مشترک تہذیب کا سب سے شاندار عطیہ ہے۔" اردو کو ہندی کا ایک اسٹائل کہنے والوں کو جواب دیتے ہوئے سرور صاحب نے فرمایا کہ "بحث کے لیے کوئی دھرم ویر بھارتی کوئی لیش پال یہ کہہ دیتا ہے کہ اردو کا سارا سرمایہ بھی ہندی کا سرمایہ ہے مگر آج تک میری نظر سے کسی یونیورسٹی کا ہندی کا ایسا نصاب نہیں گزرا جس میں پرساد، نرالا، مہتیلی شرن گپت، بھارتیندو، تلسی، سور، میرا اور کبیر کے ساتھ میر، سودا، نظیر، انیس، اکبر، اقبال، چکبست، سرسید، سرشار، نذیر احمد، حالی، شبلی کو جگہ دی گئی ہو ہندی رسم الخط میں تو اب وہ نقطے بھی اڑا دیئے گئے ہیں جو اردو آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں۔" اردو رسم خط کی ایک اہمیت سیاسی بھی ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ اردو رسم الخط کی وجہ سے پڑوسی ملکوں سے ہمارا رشتہ استوار ہے پاکستان اور ہندوستان میں پانچ زبانیں مشترک ہیں اردو، بنگالی، پنجابی، سندھی، کشمیری۔ اس میں بنگالی کو چھوڑ کر چار کے لئے اردو رسم الخط استعمال ہوتا ہے۔" آخر میں انھوں نے اصلاح املا کے سلسلہ میں بعض اہم باتوں کی طرف اشارے کئے۔ "اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یکساں آوازوں والے حروف کو کم کر دینا چاہیئے اس سے رسم خط سیکھنے والوں کو آسانی ہوگی اور طباعت میں سہولت ہوگی۔ سرور صاحب نے بتایا کہ "۔۔۔ عربی و فارسی الفاظ کو جو ہماری زبان میں آگئے ہیں بگاڑنے کا قائل نہیں محبت چھوٹی "ہ" سے لکھی جائے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں محبت کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں ہاں خورشید کو و کے بجائے پیش سے غالب نے بھی لکھا ہے کہ زکوٰۃ کو عربی قاعدے سے لکھنے کے بجائے زکات، رحمٰن کو رحمان۔ اسمٰعیل بلکہ عیسٰی اور موسٰی کو الف سے لکھنے کے حق میں ہوں۔ میرے نزدیک یائے معروف اور یائے مجہول عام طور پر پوری لکھنی چاہئیں ہاں لیے۔ طے۔ نے کی آواز کو ظاہر کرنے کے لئے آدھی یائے معروف یعنی ای۔ طرح۔ تحریر لکھی جاسکتی ہے اس قاعدے کے مطابق میز کو مے ز، میر کو می ر، لکیر کو لکی ر سے کرو تو ٹھیک رہے گا۔

ہمزہ کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمزہ صرف وہاں لکھنا چاہیئے جہاں آواز ٹوٹ جائے۔ دیکھیے بغیر ہمزہ کے اور گئے، نئے، آئے، جائے ہمزہ کے ساتھ لکھنا چاہئیں ۔۔۔۔ جہاں آخر میں الف کی آواز آتی ہے وہاں ہ لکھنے کی ضرورت نہیں پتہ کے بجائے پتا، بٹوارہ کے بجائے بٹوارا۔ پردہ کے بجائے پردا، کوئلہ کو کویلا لکھنا بہتر ہوگا۔ کنواں، ہنسنا پھانسی میں نون غنہ کے اظہار کے لئے ں کا نشان ضرور بنانا چاہیے۔ بل کل، فورن۔ ادنا اعلا تو اب لوگ لکھنے لگے ہیں میں تو عبدالحفیظ کو بھی عبدل حفیظ اور فضل الرحمٰن کو فضل رحمان لکھنے کے حق میں ہوں۔"

سرور صاحب مقالہ پڑھ رہے تھے کہ کوثر چاند پوری صاحب دو حضرات کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے اور ایک جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئے۔

سرور صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد رشید حسن خاں صاحب سے درخواست کی گئی انھوں نے صحت املا اور اس کے مسائل پر مقالہ پڑھا رشید حسن خاں صاحب اس موضوع پر کئی سال سے کام کر رہے ہیں انھوں نے ایک طویل مقالہ اس موضوع پر لکھا ہے۔ یہ مقالہ صرف اس کا خلاصہ یا تمہید تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا کہ لوگ رسم خط اور املا کے مسائل کو ملا دیتے ہیں جسکی وجہ سے مباحث سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ انھوں نے دونوں مسائل کو الگ رکھنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "ہم روزمرہ کی زندگی میں چیزوں کو خلط ملط کرنے کے عادی ہوگئے۔ اس طرز عمل سے علمی موضوعات بھی محفوظ نہیں رہ پائے یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ رسم خط اور املا کے مسائل کو آمیز کر دیا گیا ہے ۔۔۔۔ کس لفظ کو کن حرفوں سے مرکب ہونا چاہیئے یہ مسئلہ رسم خط کا نہیں ہے یا کہ کون سے حروف ابھی ختم کر دیئے جائیں اور کون سے رکھے جائیں اسکا تعلق بھی رسم خط سے نہیں ہے یہ املا کے مسائل ہیں فرض کیجئے آپ نے ۸ حروف نکال دیئے اور ۱۰ نئے حروف بڑھا دیئے لیکن اس سے رسم خط کی صورت تو تبدیل نہیں ہوئی ۔۔۔۔ املا کا تعلق درحقیقت مفرد الفاظ سے ہے لیکن چونکہ اردو میں مرکب الفاظ کی تعداد بہت ہے اور ان کی مختلف صورتیں ہیں ایک زمانے میں دو لفظوں کو ملا کر کس طرح لکھا جاتا [illegible] کسی

اور طرسا الجھ جاتا ہے اگر پرانے طریقہ سے لفظ کو لکھا جائے گا تو بظاہر لفظ اجنبی معلوم ہوگا مثلاً پہلے مصادر میں جب دو نون جمع ہو جاتے تھے تو کبھی کبھی ایک نون کو حذف کرکے پہلے نون کو مشدّد بنا دیا کرتے تھے جیسے مانّا کہ اسکو مانتا بھی لکھا جاتا تھا اس میں بھی دو ہم جنس حرفوں کو کبھی مدغم کر دیا کرتے تھے جیسے اِتّے اور اتے کہ اب ان کو اس سے الگ ان سے لکھا جاتا ہے یا تشدید کے بغیر ہی ایک حرف کو حذف کر دیتے تھے جیسے 'میں نے' کہ اس کو بلا تکلف 'مینے' لکھا جاتا تھا آج ان کو پرانے ڈھنگ سے لکھا جائے تو فوراً احساس ہوتا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں لکھا گیا۔"

رشید حسن خاں صاحب نے کہا کہ املا کی سب سے زیادہ اہمیت تدوین کا کام کرنے والے اور لغت نگار حضرات کے لئے ہے اس کے علاوہ بچوں کے قاعدے اور ابتدائی کتابیں مرتب کرنے والوں اور غیر ملکی طلبا کی تدریس کا کام کرنے والوں کے لئے اسکی بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ "ہم سب اس بات کو مانتے ہیں کہ شروع میں بچے کے سامنے جو نقش تکرار کے ساتھ آتے رہتے ہیں وہی اس کے ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں اگر شروع کی کتابوں میں لفظوں کے اجزا کا صحیح صحیح تعین نہیں کیا گیا ہے اس صورت میں ابتدائی مشقیں غلط خوانی کی مشقیں بن کر رہ جائیں گی۔ یہ ابتدائی مشقیں لفظوں کو اس حد تک پائیدار بنا دیتی ہیں کہ اگر آگے چل کر کسی منزل پر علم ہو کہ فلاں لفظ کی صحیح صورت یہ ہے تب بھی قلم سے وہی اولین صورت منتج ہے..... اس مشکل کا زیادہ احساس اس وقت ہوتا ہے جب کتاب اور استاد کی تحریر میں اختلاف ہے مثلاً کتاب میں مہندی کا لفظ اس طرح چھپا ہوا ہے کہ نون میم کے بعد آیا ہے۔ استاد نے جب خود اس لفظ کو لکھا تو پہلے میم پھر ہ اور پھر نون (مھندی) لکھا وہ بچہ تو خیر کیا کہتا لیکن اس کی جگہ پر اگر کوئی غیر ملکی طالب علم ہوا جس نے زبان کو سائنٹفک طریقہ سے پڑھا ہے اور جو Spelling میں حروف کی ترتیب کی اہمیت سے واقف ہے وہ اس اختلاف پر استاد سے الجھنا شروع کر دیتا ہے اور لطیفہ یہ ہے کہ استاد کو اس اختلاف یا اسکی اہمیت یا اس کے اثرات کا نہ علم ہے نہ اندازہ۔

انجام کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔"

رشید حسن صاحب کے بعد ابوالفیض صاحب سے درخواست کی گئی۔ یہ نام بیشتر لوگوں کے لئے نیا تھا سب نے آنے والے کو دیکھا دُبلے سے ایک صاحب سوٹ پہنے مائک پر آئے۔ معلوم ہوا کہ آپ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں اور پبلک سروس کمیشن میں اردو ریسرچ آفیسر ہیں۔ آپ کا مقالہ بھی رسم خط پر ایک ریسرچ تھی۔ مقالہ کا عنوان تھا "اردو رسم خط آغاز و ارتقا اور اسکی خصوصیات"، ابوالفیض صاحب نے بڑی محنت اور تلاش کے ساتھ رسم خط کے آغاز و ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی اور اردو رسم خط کی اہمیت اور خصوصیات کو بیان کیا۔ انھوں نے مختلف مورخین، اور ماہرین لسانیات کے حوالوں سے اپنی بات کو ثابت کیا اور یہ بتایا کہ اردو رسم خط کھروشٹی (یا کھروشچی) سے نکلا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "کھروشچی رسم خط سامی رسم خط سے ہی ماخوذ ہے تقریباً نصف سے زائد حروف ابھی تقریباً ویسے ہیں جیسے اردو کے قدیم حروف رہے ہیں"۔ انھوں نے اور مماثلات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "کھروشچی رسم خط کو بجا طور پر اردو رسم خط کی ابتدائی شکل قرار دیا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو زبان اور رسم خط کا تعلق جس خاندان السنہ سے ہے اس کے اثرات ہندوستانی تہذیب، تاریخ پر ہڑپا موہن جداڑو کے عہد سے ہی افتاد زمانہ کے ساتھ ساتھ کبھی محسوس کبھی غیر محسوس کبھی مبہم اور کبھی واضح انداز میں مرتب ہوتے آ رہے تھے۔" رسم خط کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے جہاں انھوں نے مختلف اہم باتوں سے بحث کی وہاں یہ بھی کہا کہ یہ رسم خط مشرق وسطیٰ کی اہم زبانوں سے لسانی رابطہ کا کام دیتا ہے اس لئے اس کو باقی رکھنا ضروری ہے۔

ابوالفیض صاحب کے مقالے کے بعد تھوڑی دیر کے واسطے اجلاس کی کارروائی کافی پینے کے لئے روک دی گئی ہال کے باہر کافی انتظام تھا لوگ باہر آ گئے سردی خاصی تھی اس لئے کافی نے بڑا لطف دیا یہاں بھی لوگ مقالوں سے ہی متعلق گفتگو کر رہے تھے ابتک جتنے مقالے بھی پڑھے گئے تھے انھیں لوگوں نے

پسند کیا تھا اس لئے کسی کے چہرے پر بوریت کے آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ کھانے کے بعد لوگ پھر ہال میں آگئے اور اب عتیق احمد صدیقی صاحب کے نام کا اعلان ہوا۔ عتیق صاحب شعبۂ اردو علیگڑھ یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ لسانیات آپ کا موضوع ہے۔ آپ نے "زبان رسم خط اور اس کا تعلق" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے مقالے کی ابتدا میں بتایا کہ "زبان اور تحریر کو زمانۂ قدیم میں دیوتاؤں سے منسوب کیا جاتا تھا سنسکرت دیو بانی کہلاتی تھی۔ دیوناگری کا نام ابتک اس عقیدے پر دلالت کرتا ہے کہ رسم خط کی ایجاد کا سہرا دیوتاؤں کے سر ہے برہمی رسم خط (جسکی ایک شکل ناگری رسم خط ہے) برہما ہی ایکا خیال کیا جاتا ہے بابلی تہذیب میں تحریر کا دیوتا نبو تھا.... چینی روایات کے مطابق چار آنکھوں والا اژدہا رخ دیوتا سنگ چین نے تحریر ایجاد کی غرض بیشتر ممالک میں زبان اور فن تحریر سے متعلق ایسے ہی عقیدے رائج تھے غالباً انھیں عقیدوں کا سا نتیجہ تھا کہ اکثر ممالک میں تحریر کا علم صرف اعلیٰ اور مذہبی طبقوں تک محدود تھا۔"

آگے چل کر تحریر کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے عتیق صدیقی صاحب نے کہا کہ "تحریر کی ابتدائی تاریخ اور فلسفۂ تحریر کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ صورت میں تحریر زبان کی بصری علامت ہے زبان کی طرح اس کی بصری علامات بھی مفروضہ اور خود اختیاری ہوتی ہیں یعنی آوازوں کو علامات میں پیش کرنے کے لئے نشانات مقرر کر دیئے جاتے ہیں جن کو نوع انسانی کا ایک طبقہ متفقہ طور پر تسلیم کر لیتا ہے۔ . اب یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنی ابتدائی شکل میں زبان اور تحریر کا تعلق مفروضہ سے شروع ہوتا لیکن آخر آخر میں تحریر زبان کی امین بن جاتی ہے اس کے عناصر کی پائیداری کرتی ہے تبدیلیوں کے خلاف زبان کی مدافعت کرتی اور اس کے لئے محفوظ قلعہ کا کام کرتی ہے۔" انھوں نے رسم خط کی خامیوں اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دنیا بھر میں جو رسم خط اختیار کئے گئے کوئی بھی تکمیل کی منزل کو نہیں پہنچا۔ اپنے تمام مباحث سے نتیجہ نکالتے ہوئے آخر میں عتیق صاحب نے کہا کہ "اگرچہ زبان اور رسم خط میں کوئی فطری تعلق نہیں لیکن جب کوئی زبان عرصہ تک ایک خاص خط میں لکھی جاتی ہے تو ان میں لازم و ملزوم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور عوام تو عوام خواص بھی ایک دوسرے کو جدا تصور نہیں کر سکتے۔"

آج کے اجلاس کے آخری مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالحق صاحب تھے۔ عبدالحق صاحب۔ پوسٹ گریجویٹ ایوننگ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔ آپ نے اردو رسم خط کی تاریخ (تاریخ تہذیب، تحریر اور تلفظ کے آئینے میں) پر مقالہ پڑھا۔ مقالہ کافی طویل تھا لیکن جن دلائل و شواہد سے اسکی تکمیل ہوئی تھی اور جس جوش میں عبدالحق صاحب اس کو پڑھ رہے تھے اس نے سب کو ہمہ تن گوش کر دیا تھا۔ عبدالحق صاحب نے سب سے پہلے تحریر کی ابتدا، تصویری تحریر، مصری تصویری تحریر، اور [illegible] سے حروف ابجد کی ایجاد سے بحث کی اور تفصیلی تاریخی و تہذیبی جائزہ لیا۔ اس کے بعد مختلف خطوط کی ایجاد، خط کوفی، کتابت کے فن خطاطی و خوشنویسی کی تاریخ عرب و ایران کے حوالے سے بتائی۔ انھوں نے زبان و تہذیب کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "زبان تہذیب کا جزو لاینفک ہے یہ صرف تہذیبی قدروں کی ترجمانی ہی نہیں ہے بلکہ تہذیبی اقدار و افکار کی تربیت بھی کرتی ہے.... ہندوستان میں تہذیبی لین دین سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی اس نئی زبان کے لئے رسم خط کی دشواریاں بھی حائل تھیں دیوناگری رسم خط ناقص اور نامکمل تھا بعض آوازوں کی ادائیگی ناممکن تھی لب و لہجہ بھی زیادہ ساتھ نہیں دے رہا تھا حروف کے دروبست زیادہ چست نہ تھے اعراب کا بدل نہ تھا کیونکہ دیوناگری رسم خط میں حروف صحیح کے ساتھ علت آ کی آوازیں شامل ہوتی ہیں کافی غور و خوض اور تجربہ کے بعد فارسی رسم الخط اپنایا گیا اور خالص آریائی آوازوں کے لئے (ہکار اور سکوک) نئے حروف ایجاد کئے گئے جیسے ٹ، ڈ، ڑ اور بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ۔ دھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ چونکہ فارسی میں مشابہ حروف موجود تھے لہذا انھیں حرفوں کے ساتھ مخصوص علامتیں جوڑ دی گئیں نستعلیق کے جمال اور نسخ کے جمال و جلال کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحق صاحب نے کہا۔

"ایران میں نستعلیق کا ایجاد ہوا اسکی تزئین و نوک و پلک کی درستی کا کام ہندوستان میں انجام پایا جہاں [illegible] تک

ہندوستان میں خطاطی اور خوش نویسی کا عام رجحان پیدا ہو چکا تھا اس خط کو خوش نویسی کا کمال سمجھا گیا۔ یہی عروس الخطوط یا ایران الخطوط اردو رسم الخط کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور جامع و مکمل سمجھا گیا ہے حروف و الفاظ کو الگ الگ لکھنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ ترکیب، نشست، کرسی، النسبت، ضعف، قوت، سطح، اتار، چڑھاؤ، دامن، دائرہ، حد یا کشش، نوک پلک، تناسب، اعتدال، موزونیت، وصل و فصل، گردش، صفائی، شان، نقطہ، قط مرکز پیمائش کے علاوہ معنوی حسن کاری کے آداب مقرر کئے گئے۔ اس خط کو حسن آفرینی سے اتنی قربت دی گئی کہ اصول کے طور پر ہر حرف کو جسم کے مانند تصور کیا گیا اور جسم کی طرح حرف کے بھی اعضا مقرر کئے گئے مثلاً سر، پیشانی، ابرو، چشم، زبان، گردن، پشت، سینہ، کمر وغیرہ یہاں بھی وہی ایران کی نازک خیالی موجود ہے۔" اردو رسم خط کی پرزور حمایت پر عبدالحق صاحب نے اپنا مقالہ ختم کیا اور آخر میں مختلف تحریریں اور خطاطی کے نمونے بھی دکھائے۔

جس وقت عبدالحق صاحب نے مقالہ ختم کیا اس وقت ۱½ بجے تھے یعنی مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ زیادہ اجلاس چلتا رہا آخر میں اس اجلاس کے صدر آل احمد سرور صاحب نے اب تک کی کارروائی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان مقالات نے رسم خط اور اس سے متعلق پہلوؤں اور مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرف ہم کو روایت کا احساس ہونا چاہیئے لیکن دوسری طرف ہمیں لکیر کا فقیر نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں ضرورت ایک مستحکم عقیدے کی ہے جس پر ہم سب کا عقیدہ ہو۔ انھوں نے بہت زور دے کر یہ بات کہی کہ جو مایوسی اور بدحالی پھیل رہی ہے اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے زندگی جدوجہد کا نام ہے اور اس وقت استقامت کی ضرورت ہے رسم خط کی بات کرتے ہوئے انھوں نے آخر میں کہا کہ یہ ہمارا ورثہ ہے ہمارا مسلک ہے ہم اس کو کس طرح چھوڑ دیں۔

سرور صاحب کی تقریر کے بعد سیمنار کا دوسرا اجلاس ختم ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے کچھ لوگ مقالہ نگار حضرات کو مبارکباد دے رہے تھے میں سرور صاحب کے پاس چلا گیا مجھ سے دریافت کیا۔

آپ کا قیام کہاں ہے۔

میں تو اسی وقت واپس جا رہا ہوں

کل کے لئے تو رک ہی جائیے۔

میں نے تو محبین کو بھی اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی کہ رکنا پڑے گا۔ میرا جانا ضروری ہے انھوں نے کہا اتنے میں کچھ لوگ اور آ گئے اور میں رخصت لے کر چلا آیا۔

دوسرا دن ۳۰ جنوری ۷۱ء

سیمنار ۱۰½ بجے شروع ہونا تھا میں کچھ پہلے پہنچ گیا ہال میں کوئی نہیں تھا سردی خوب تھی میں نے سوچا کہ نیچے چل کر دھوپ کا لطف لیا جائے میں زینے اتر رہا کہ لائنڈ موری صاحب ایک وزنی بیگ اٹھائے ہوئے بھاری قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نظر آئے میں نے ان سے انگریزی میں کہا کہ ابھی وہاں کوئی نہیں ہے ۱۰½ بجے تک لوگ آئیں گے انھوں نے اردو میں جواب دیا مجھے ٹیپ ریکارڈ لگانا ہے اس لئے پہلے سے اس کی جگہ مقرر کر لوں۔ مجھے ان کے صاف لہجے پر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین ہسٹری میں کام کرتے ہیں اور اچھی خاصی اردو جانتے ہیں۔ میں باہر آیا تو قیصر زیدی صاحب مل گئے قیصر صاحب جامعہ ملیہ کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں ہم لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ فاروقی صاحب اور چند حضرات اور آ گئے ذرا دیر میں سردار جعفری صاحب بھی آ گئے میں نے موقع غنیمت جان کر دو ایک تصویریں لیں اس کے بعد لوگ اوپر ہال میں چلے آئے۔

آج کے اجلاس کے صدر سردار جعفری صاحب تھے فاروقی صاحب نے سردار جعفری صاحب سے خطبۂ صدارت پڑھنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ سردار جعفری صاحب بڑے صاحب علم اور دیدہ ور نقاد ہیں انھیں سوویٹ انعام مل چکا ہے اور یہ ہنرد اسکالر بھی ہیں لیکن انھوں نے کہا کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جعفری صاحب نے دل و نگاہ و نفس اردو کی خدمت اور اس کے رسم خط کے تحفظ پر لگا دئے ہیں۔

سردار جعفری صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اُردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے پچھلے بیس پچیس سال سے عملی طور پر کوشش کر رہے ہیں اُنھوں نے اُردو اور اس کے رسم خط کی لڑائی صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندی کے میدان میں بھی لڑی ہے۔ انھوں نے "اُردو رسم خط کی تہذیبی اہمیت" پر مقالہ پڑھا۔ اُنھوں نے بڑے مدلل انداز میں رسم خط کی اہمیت پر روشنی ڈالی انھوں نے شروع میں بتایا کہ رسم خط کے بدلنے کی آواز تین حلقوں سے آتی ہے پہلا حلقہ تو وہ ہے جو desperate ہے دوسرا وہ ہے جو کہتا ہے سارے لوگ اب دیوناگری پڑھ رہے ہیں اس لئے اسکو بدل دینا چاہیئے۔ اور تیسرا وہ ہے جو غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ اردو کو بغیر ہندی کی ترقی نہیں ہو سکتی انھوں نے کہا سوچنے کا یہ انداز غلط ہے دراصل اردو رسم خط ایک تہذیب ہے کئی سو سال پہلے جب اردو اور ہندی نے ترقی شروع کی اسوقت انکو ایک ترقی یافتہ آریائی زبان فارسی سے سابقہ پڑا اس لئے ابتدا میں ہندی کے بعض نمونے فارسی رسم خط میں ملتے ہیں۔ کبیر جاہل تھے انہوں نے کوئی رسم خط استعمال نہیں کیا لیکن جائسی نے پدماوت اردو رسم خط میں لکھی۔

انھوں نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُردو ہندی کی گرامر ایک ہے لہٰذا ایک زبان ہے۔ گرامر تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ انسان اور گوریلے کا ڈھانچہ ایک طرح کا ہوتا ہے لیکن ڈھانچے کے ایک ہونے کی وجہ سے دونوں کو ایک تو نہیں کہ [illegible] اسی طرح اردو اور ہندی کو بھی ایک کہنا غلط ہے۔ یہ جارحانہ توسیع کی علامت ہے کہ اُردو کو ختم کرنے اور اس کے رسم خط کو بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہوں نے طباعت کی دشواریوں کو حل کرنے کے سلسلہ میں نستعلیق ترک کر کے نسخ کی طرف رجوع کرنے پر زور دیا اور اصلاح املا کے سلسلہ میں بعض اشارے کئے۔

سردار جعفری صاحب کے بعد ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے "اُردو رسم خط کا تہذیب سے رشتہ" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ سیمنار کا مختصر ترین مقالہ تھا۔ آپ نے مختصر مگر واضح انداز میں رسم خط کی تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمارے موجودہ رسم خط کا ہماری صدیوں کی تہذیب سے رشتہ ہے اور اسکو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ آواز کس طرف سے اٹھائی جاتی ہے کہ حکومت بظاہر یہ بات نہیں کہہ سکتی اس لئے کہ دستور میں ہر جگہ اردو زبان کی حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے البتہ دو گروہ اس پر مصر ہیں کہ ایک کا تعلق اکثریت سے ہے جو ہندوستان کی ہر تہذیب اور ہر زبان کا بھارتیہ کرن یا اُن کے نام پر ہندو کرن کرنا چاہتا ہے اور دوسرا اقلیت کا وہ گروہ ہے جو احساس کمتری یا سیاسی خود غرضی کی وجہ سے اور ایک خاص طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس طرح کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہمیں اس طرح کی تحریکوں کا مقابلہ کرنا ہے اور بتانا ہے کہ ہم زبان رسم خط اور تہذیب کے سلسلہ میں کوئی سیاسی دباؤ نہیں برداشت کر سکتے۔

صدیقی صاحب کے بعد ڈاکٹر محمد حسن نے "اُردو خط کا تہذیبی رشتہ" کے عنوان سے مقالہ پڑھا انھوں نے تاریخی سماجی اور سائنٹیفک نقطۂ نظر کے تحت زبان اور رسم خط اور تہذیب سے اس کے تعلق پر روشنی ڈالی انھوں نے یہ سوال اٹھاتے ہوئے کہ زبانیں کوئی خاص رسم خط کیوں اختیار کرتی ہیں کہا کہ "ابتدائی زمانے میں یہ معاملہ اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن جب سے ہماری نام نہاد تہذیب کا چلن ہوا ہے رسم خط کا انتخاب اتفاقیہ نہیں تہذیبی سماجی اور سیاسی تقاضوں کے تابع ہوتا ہے۔ تہذیب انسان کے فطرت کے خلاف صف آرا ہونے اور تنازع البقا کے نتیجے کے طور پر وجود میں آتی ہے گویا تہذیب انسانی فطرت کو نکھارنے کے عمل سے پیدا ہوتی ہے اور ساری خیر و برکت تمام فنون لطیفہ زبانیں اور ادب اسی کشمکش سے نمو پاتے ہیں اس کی ایک مثال وہ مشترکہ آوازیں ہیں جو آج بھی ہر دفعہ کسی بھاری بوجھ اُٹھاتے ہوئے زبان سے ادا کرتے ہیں "ہیا ہیا" ان آوازوں کو کسی رسم خط میں لکھنا ہو تو ہم کون سا رسم خط اختیار کریں گے۔ سوال کا جواب 'ہم' کی ضمیر کی تفصیل پر منحصر ہوگا گویا ہم کا گروہ پیش اس کا تہذیبی سیاق و سباق اس رسم خط کو متعین کرے گا۔

اس رسم خط کے اختیار کرنے کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن نے کہا کہ "جس طرح آج بین الاقوامی تہذیب اور جدید سائنس سے واقفیت جدید زندگی سے واقفیت کی دلیل ہے اسی طرح عہد وسطیٰ میں عربی فارسی سے واقفیت بین الاقوامی تہذیب سائنس اور جدید زندگی سے واقفیت کی ضمانت تھی۔ اس لئے بہت سے ملکوں میں جب ابھرتی ہوئی زبانوں کے لئے رسم خط کی ضرورت پیش آئی تو اس دور کے جدید طرز حیات سے رشتہ قائم کرنے کے [illegible]

اختیار کیا ایران میں جدید فارسی کے لئے عربی رسم خط پر مبنی رسم خط کا
انتخاب اس کی ایک مثال ہے ہندوستان میں بھی یہ تاریخ دہرائی
گئی اور اردو رسم خط اپنے دور میں بین الاقوامی سطح پر جدید تہذیبی تقاضوں
کا نشانہ تھا.... عربوں سے ربط و ضبط پہلے سندھ میں شروع ہوا
وہاں کی زبان نے عربی الفاظ کو بھی کثرت سے اپنایا اور رسم خط بھی۔
پنجاب اور دہلی کے علاقوں میں ترک ایرانی اثرات ابھرے تو یہاں
کی زبان میں مخلوط لفظیات کا چلن بھی ہوا اور رسم خط بھی جدید یعنی
عرب ایرانی رسم خط کی تبدیل شدہ شکل اختیار کیا گیا۔ یہ صورت پنجابی
زبان کی بھی رہی اور کھڑی بولی اور اودھی کی بھی۔ جس زبان میں یہ
جدید طرز اظہار اور طرز احساس زیادہ ابھرا اس زبان نے اس نئے
رسم خط کو بھی زیادہ اپنایا۔ اودھی میں سید محمد جائسی کی پدماوت اسی
رسم خط میں لکھی گئی مگر یہ رسم خط عام نہیں ہوا کیونکہ اودھی کا ادب
اس طرز اظہار اور طرز احساس سے قریب نہ تھا یہ بات شاید اس طرح
بھی واضح ہو سکتی ہے کہ یہ نیا طرز احساس زیادہ دنیوی اور آج کی اصطلاح
میں زیادہ سیکولر تھا اور اودھی اور برج اور بعض دوسری بولیوں کا
ادب اس سے قریب تر تھا۔ لہذا اس رسم خط کا چلن عام نہ ہو سکا جو
نئے طرز احساس اور طرز اظہار کا آئینہ دار تھا اسی زمانہ میں ایک نئی
زبان ابھی جس کی روایت قدیم مثنویات کی دکنی زمین میں کھوئی ہوئی
تھی اور کھڑی بولی سے قریب اس بولی کا ارتقا تقریباً تمام تر اسی رسم خط
کے ساتھ ہوا۔" انھوں نے اردو رسم خط کے خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے
کہا کہ کل یہ رسم خط بین الاقوامی تہذیب کا وسیلہ تھا آج بین ایشیائی
رابطے کا ذریعہ ہے اور ہماری مشترک تہذیب کی نشانی بھی اور علامت بھی۔

ڈاکٹر محسن نے اس کے ساتھ اپنے ایک مطبوعہ مضمون اردو کا
معاملہ اور رسم خط کا قضیہ، کے کچھ حصے بھی پڑھ کر سنائے انھوں نے
کہا "اب رہا مسئلہ رسم الخط کا، اسے یاروں نے غلط مبحث کے طور پر
بڑی خوبصورتی سے الجھایا ہے بات وہی ہے' فسادات کا حل ہے کہ
مسلم پرسنل لا میں ترمیم کر دی جائے اردو کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ رسم خط
بدل دیا جائے باتیں معقول یا غیر متعلق ہیں اسے کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے
آنکھ، اب اگر رسم خط کے مسئلے پر گفتگو کیجئے اس کے خلاف یا اس کی
حمایت میں دلیلیں دیجئے تو حریفوں کا مقصد پورا ہوتا ہے یعنی معاملہ اردو کے
جائز حقوق سے ہٹ کر رسم خط کی بحث پر آکر ٹھہرتا ہو دیکھئے تو سمجھا جائے گا کہ اس پار لگا۔

"جس زبان کا نام اردو ہے اور جسے آئین نے تسلیم کیا ہے اس کا
تصور اس کے مروجہ رسم خط کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اس لئے موجودہ شکل
میں اردو کو آئینی حقوق ملنے میں نہ کوئی رکاوٹ ہے نہ مسئلہ۔" ڈاکٹر محمد حسن
نے اپنے مضمون میں یہ بھی بتایا کہ اردو زبان صرف ہندوستان تک محدود
نہیں ہے وہ ہندوستان سے باہر پاکستان، ماریشس، کینیا اور برما میں
بھی بولی اور پڑھی لکھی جاتی ہے لندن سے اردو کے کئی ہفتہ وار اخبار شائع
ہوتے ہیں اگر ہندوستان میں اسکا رسم خط بدل دیا گیا تو ان ساری جگہوں سے
اسکا رشتہ کٹ جائیگا۔ انہوں نے رسم خط کی تبدیلی کی حمایت کرنے والوں سے سوال
کرتے ہوئے کہا کہ سارے ملک کی زبانوں کا رسم خط ناگری تو نہیں ہے
اس لئے اگر میسور والے ناگری رسم خط کی جگہ اردو کے لئے کنڑی رسم خط
بنگال میں اردو بولنے والے بنگالی رسم خط بمبئی والے مراٹھی رسم خط اور پنجاب
والے گورمکھی رسم خط اختیار کریں تو اردو کہاں رہے گی۔ ڈاکٹر محسن نے پر زور
علمی اور مدلل انداز میں اردو رسم خط کی حمایت پر اپنا مضمون ختم کیا۔

اس اجلاس کے آخری مقالہ نگار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام کا اعلان ہوا
نارنگ صاحب شعبۂ السنہ ٹورنٹو میں اردو کے استاد ہیں لسانیات اور
صوتیات آپ کا خاص موضوع ہے آپ نے اپنے خاص انداز میں اردو رسم خط
کی حمایت کی۔ نارنگ صاحب نے اپنے مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا
پہلے حصے میں ان لوگوں اور دلیلوں کا جائزہ تھا جو رسم خط کی تبدیلی کے
سلسلہ میں پیش کی جاتی ہیں۔ دوسرے حصہ میں رسم خط کی خوبیوں اور خامیوں
کا ذکر تھا اور تیسرے حصہ میں کچھ مشورے تھے۔ نارنگ صاحب کے پہلے
دو حصے کافی زوردار تھے ان میں انہوں نے رسم خط کی خامیوں کو ظاہر
کرتے ہوئے اور رسم خط کی تبدیلی کی مانگ کرنے والوں کے مطالبہ کی لسانی
اہمیت کو پیش کرتے ہوئے بتایا کہ رسم خط کی تبدیلی مناسب نہیں ہوگی۔
انہوں نے پورے مقالے کے مباحث کا نتیجہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

(۱) "جو لوگ رسم خط کی تبدیلی کا مشورہ دیتے ہیں ان کے خلوص
پر شبہ کرنا یا انھیں اردو دشمن قرار دینا غلط ہے۔ یہ لوگ فرقہ وارانہ
جذبات کی فضا میں اردو کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بہت بڑی قربانی

دینے کی کوشش کر رہے ہیں ــــــ البتہ ان کے مشوروں کے پشت پر جو لسانی نظریہ ہے وہ اُردو اور ہندی کے مخصوص تہذیبی اور لسانی رشتہ کو سمجھنے میں معاون ثابت نہیں ہوتا اس سے غلط نتائج نکلتے ہیں۔"

(۲) "قومی یک جہتی کے نام پر بھی رسم الخط میں تبدیلی مناسب نہ ہوگی اس سے قومی یک جہتی کو اتنا فائدہ نہیں جتنا نقصان پہنچے گا۔ اگر پورے ملک کی لسانی یکسانیت کے لئے سب زبانوں کے رسم الخط میں تبدیلی کا سوال ہو تو بات دوسری ہے ورنہ صرف اُردو کے لئے ایسی تجویز پیش کرنا خود قومی یک جہتی کے منافی ہے کیونکہ ایک لسانی اقلیت ہمیشہ کے لئے اپنے رسم الخط سے محروم ہو جائے گی جس کا نتیجہ مستقل بدگمانی اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(۳) یہ بات صحیح نہیں کہ اگر رسم الخط نہ رہے تو زبان ختم ہو جائے گی زبان رسم الخط کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے لیکن اردو اور ہندی میں جو مخصوص لسانی رشتہ ہے اور جس طرح دونوں کی بنیاد ایک ہی عوامی بولی پر ہے اس کے پیش نظر رسم الخط کی تبدیلی سے اردو کی انفرادیت کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے۔

(۴) اردو کا رسم الخط غیر ملکی نہیں یہ اپنی اصل کے اعتبار سے عربی فارسی ہے لیکن یہ اس حد تک اردو لیا جا چکا ہے کہ یہ اردو کا اپنا رسم الخط بن چکا ہے۔۔ اس رسم الخط کو اردو رسم الخط کہنے پر اصرار کرنا چاہیئے"

(۵) اُردو رسم الخط کی سب سے بڑی خوبی مصوت آوازوں کے لئے علامتوں کی حیرت انگیز کمی ہے'

(۶) اُردو والوں کی سب سے بڑی ضرورت اس وقت نسخ کو رائج کرنے کی ہے'

(۷) اُردو ایک آزاد اور خود مختار زبان ہے، اس کا رسم الخط اس کا اپنا رسم الخط بن چکا ہے البتہ تشدید کا عمل رک جانے سے جو ضمنی اصلاحیں اب تک نہیں ہو سکیں، ان کو نافذ کرنا چاہیئے اردو میں ۱۹۳۳ء کی ناگپور کانفرنس سے اصلاحوں پر غور ہو رہا ہے لیکن کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا اس سلسلہ میں ہماری بے حسی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے کم از کم اب تو ہمیں اپنے باعمل ہونے کا ثبوت دینا چاہیئے۔

نارنگ صاحب کے مقالے میں باوجود اس کے کہ اس طرح کے تضاد کا احساس بار بار ہوتا تھا کہ اردو رسم الخط کی تبدیلی اصولی طور پر قابل قبول ہے، اور پھر یہ کہ اس سے اُردو کی انفرادیت کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے۔ انہوں نے ایک بڑی سچی اور پتے کی بات کہی کہ ہندوستان میں تقسیم کا بدلا کسی اور چیز سے لیا جاتا ہو یا نہیں لیکن اُردو سے لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مقالے کے بعد صدر نے حاضرین سے کہا کہ اگر کوئی صاحب کسی بات کے سلسلے میں وضاحت چاہیں یا کوئی سوال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے رفعت فیاض (ریسرچ اسکالر) نے نارنگ صاحب سے ایک سوال کیا۔ ان سوالات و جوابات میں رشید حسن خاں، ڈاکٹر عبدالحق، سردار جعفری، ڈاکٹر فضل الحق، شہاب جعفری اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے حصہ لیا لیکن یہ سلسلہ کوئی اہمیت نہ اختیار کر سکا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ لوگ مقالوں میں اُٹھائے گئے مسائل اور پیش کئے گئے حلقوں سے متفق ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر خلیق انجم نے صدر سے کچھ کہنے کی اجازت مانگی صدر نے دریافت کیا کہ آپ سوال کرنا چاہتے ہیں یا کوئی وضاحت انھوں نے کہا مجھے کچھ کہنا ہے لہٰذا مائک پر آکر انہوں نے تقریر شروع کی اور فرمایا:

اردو کبھی علمی زبان نہیں رہی۔

ڈاکٹر فضل الحق نے ٹوکا۔ جامعہ عثمانیہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ان کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا اردو ہندی کا جھگڑا فورٹ ولیم کالج نے ڈالا تھا جب اورنگ زیب اور شیواجی کی لڑائیوں کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

شہاب جعفری نے لقمہ دیا۔ رسم خط پر کچھ کہئے۔

خلیق انجم:۔ اچھا میں اپنی بات کہتا جاؤں گا اور بیچ بیچ میں رسم خط' کہتا جاؤں گا۔ اس طرح کے سوال و جواب کے درمیان خلیق انجم صاحب نے کہا کہ اگر میر کا دیوان ناگری خط میں چھپا ہوتا تو ہم ان کو اُردو کا شاعر نہ کہتے یہ اتفاق کی بات ہے کہ ان کا دیوان اُردو میں شائع ہوا انھوں نے آگے چل کر کہا کہ ہماری یہ غلطی رہی ہے کہ ہم نے ہندوستان کی زبانوں کو نہیں اپنایا۔ اب انگریزی ختم ہو رہی ہے ہر چیز ہندی میں پڑھائی جائے [illegible] اردو بھی ہم

ہندی میں یکجا شائع کروانے پر بھی غور کر رہی ہیں۔

دو دن سے لوگ سنجیدہ اور علمی مقالات سنتے رہے تھے اس لئے خلیق صاحب کی مکالمہ نما تقریر سے محظوظ ہوئے۔

آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نے مقالہ نگاروں شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا خصوصیت سے سردار جعفری اور حیات اللہ انصاری صاحب کا جنہوں نے شدید مصروفیت کے باوجود سیمینار میں شرکت کی۔ انھوں نے فرداً فرداً رشید احمد صدیقی صاحب اور تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار ختم نہیں ہوا ہے بلکہ شروع ہوا ہے اسکی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے مسائل کو چھان پھٹک کر سامنے کر دیا ہے اور غور و فکر کی راہیں کھول دی ہیں۔ ان کے شکریہ پر سیمینار ختم ہو گیا۔ حالانکہ پروگرام کے مطابق چوتھا اجلاس ہونا باقی تھا لیکن مسعود حسن خاں صاحب اور ڈاکٹر نذیر احمد کی عدم موجودگی کی وجہ سے اُسے ملتوی کر دیا گیا۔ تیسرا اجلاس کافی طویل ہو گیا تھا اس لئے شہاب جعفری صاحب نے اپنا مقالہ نہیں پڑھا۔ وقت کی کمی کے باعث ڈاکٹر اختر اورینوی اور فیاض گوالیاری صاحب کے مقالے نہیں پڑھے جا سکے۔ یہ حضرات سیمینار میں شریک نہیں ہو سکے لیکن ان کے مقالے آ گئے تھے۔

بلاشبہ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیمینار بہت کامیاب رہا مقالہ نگار حضرات نے بہت اچھی طرح مسائل سے بحث کی اور نتائج پیش کئے۔ سارے مقالوں کو سننے کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے وہ یہی تھے کہ اُردو رسم خط ہندوستانی تہذیب سے گہرا تعلق ہے اور اردو زبان کی طرح اس کی ایک آزاد حیثیت ہے۔

(۲) اردو رسم خط ایک ایسی کڑی ہے جو ایشیا سے ہمارا رشتہ جوڑتی ہے۔

(۳) دیوناگری رسم خط اردو آوازوں کو ادا نہیں کر سکتا اس کا احساس اردو کتابوں کو دیوناگری میں منتقل کرنے میں ہوتا ہے

(۴) املا اور رسم خط دو الگ الگ چیزیں ہیں اصلاحِ املا ضروری ہے لیکن رسم خط کی تبدیلی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

یہ اجتماع اپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہے گا اردو رسم خط کے سلسلے میں جس طرح کی بدگمانیاں اور پست ہمتی پھیلائی جا رہی تھی اس کے پیشِ نظر یہ سیمینار بہت ضروری تھا۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی اس اقدام کے لئے قابل مبارکباد ہے ■■

چند ضروری باتیں

- خط و کتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔
- جملہ خریداروں کو رسائل دو بار چیک کرنے کے بعد بھیجے جاتے ہیں۔ پھر بھی اگر آپ کو رسالہ نہ ملے تو دفتر سے دوبارہ طلب کر لیجئے۔ لیکن رسالہ نہ ملنے کی تحریری شکایت اپنے ڈاکخانہ سے بھی کیجئے۔
- تجدید خریداری منی آرڈر سے کیجئے۔ وی۔ پی سے رسالہ منگوانے میں پونے دو روپے زائد خرچ ہوتے ہیں اور وی۔ پی کی واپسی کی صورت میں ادارہ کو زبردست خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔
- اپنے شہر کے کتب فروش حضرات کے پتوں سے ہمیں مطلع کیجئے تاکہ ہم ایجنسی قائم کرنے کے لئے ان سے خط و کتابت کر سکیں۔
- باذوق حضرات و خواتین کے پتے ارسال کیجئے تاکہ ہم ان کو نمونہ کا پرچہ بھیج کر آپ کی طرف سے خریداری قبول کرنے کی درخواست کر سکیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

خطبۂ صدارت

(رسم خط سمینار - دہلی یونی ورسٹی)

پادشی بخیر اکبر الہ آبادی نے ایک قطعے میں آنے والے چند خطرات کا ذکر کرتے ہوئے رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں اپنے خدشے کا اس طرح ذکر کیا تھا۔

نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیب قلم ہونگے

اکبر ہر تبدیلی سے خائف تھے یہاں تک کہ پائپ کا پانی پینے سے اور ٹائپ میں تحریر پڑھنے سے لیکن سچی بات یہ ہے کہ انھیں اپنی تہذیب اور زبان سے بڑی محبت تھی اور اس کو کسی طرح پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اکبر عاشق بھی تھے اور عارف بھی اس لئے انھوں نے عرصہ ہوا جو کچھ زبان و ادب کے سلسلے میں کہا تھا، آج بھی ہمارے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے تہذیبی سرمایے میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر تہذیب کے بنیادی عناصر باقی رہتے ہیں۔ تہذیب کی بنیاد ہل جائے تو انسان کی شخصیت کا رنگ محل ڈانواں ڈول ہو جائے۔ تہذیب میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ سب پر روشن ہے۔ زبان صرف معلومات کے اظہار کا ذریعہ نہیں، خیال کی تخلیق اور ترسیل کا ذریعہ بھی ہے۔ پھر یہ جذبے کی جان بھی ہے اور علامت کے رمز و ایما کی کان بھی۔ کوئی شخصیت اس وقت تک اپنے پورے قد کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے منہ میں اسکی اپنی زبان نہ ہو۔ زبان پر قدرت کے بغیر نہ خیالات کی پرواز ممکن ہے نہ علم کی صحت، نہ ادب کی جادوگری۔ اور یہاں مانگے کے اجالے سے کام نہیں چلتا، اپنے لہو کا چراغ جلانا پڑتا ہے، اپنے باطن میں جھانکنا پڑتا ہے، اپنے سرمایے پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ تو دوسروں کی زبانیں سیکھ کر ہم عالم فاضل بن سکتے ہیں مگر اپنے گھر کا چراغ نہیں بن سکتے، اپنے باغ کا پھول نہیں کہلائے جا سکتے۔ ہم میں علم آسکتا ہے، بصیرت نہیں آسکتی، ہم معلومات کی مشین بن سکتے ہیں، انسان نہیں بن سکتے۔

مالی نوسکی نے کہا ہے کہ دنیا کی سب زبانیں بالقوۃ برابر ہیں۔ ہر ایک میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ افکار و اقدار کی اعلیٰ ترین منزلوں تک پہنچ سکے۔ ابتدائی قبائل کی چھوٹی چھوٹی اور بکھری ہوئی زبانوں کو موقع ملتا تو انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی روسی، عربی، چینی جیسی زبانوں سے ہمسری کر سکتی تھیں۔ اس لئے ہر زبان برابر ہے۔ زبان کی عظمت بولنے والوں کی تعداد سے نہیں، اس کے ادب کی بلندی، اس کے افکار و اقدار کی ہمہ گیری، اس کے علمی سرمایے کی وسعت اور گیرائی اور اس کے فن کاروں کے گنجینۂ معنی کے طلسمات سے متعین ہوتی ہے۔ ہندستان میں بہت سی زبانیں ہیں۔ یہ سب قومی زبانیں ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت ہے نہ کوئی کسی معنی میں کسی سے کمتر ہے۔ ہاں یہ بالکل دوسری بات ہے کہ سہولت کے لئے کسی ایک زبان کو رشتے کی زبان Link Language کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر سب زبا[illegible] والے

ہندی کو تو Link Language مان لیں تو ہندی کو یہ درجہ ملنا چاہیئے۔ مگر لوگوں کا یہ اصرار ہو کہ جب تک ہندی پر سب کا اتفاق نہ ہو، انگریزی کی موجودہ حیثیت برقرار رہے تو سنجیدہ اور معقول اور ملک کے بہی خواہ انگریزی اور ہندی کو ساتھ ساتھ چلانے پر زور دیں گے۔ اردو کا جھگڑا نہ ہندی سے ہے نہ بنگالی سے نہ تامل سے۔ اردو کسی زبان کی جگہ لینا نہیں چاہتی یہ اپنا جائز حق اور مناسب درجہ چاہتی ہے۔ سچی قومیت، کسی زبان کو دبانے میں نہیں، ہر زبان کو اس کا مناسب درجہ اور حق دینے میں ہے بات سیدھی سادی ہے مگر جب تعصب اور تنگ نظری کی عینک چڑھی ہوئی ہو تو یہ سیدھی اور سچی بات لوگوں کو نظر نہیں آتی مگر ہمیں تو ہر حال میں اپنی بات کہے جانا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ بالآخر حق و صداقت کی آواز کو دبایا نہیں جاسکتا۔

اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ نہ ہندی کی شیلی ہے نہ عربی، فارسی کی ذیلی تعبیر۔ کھڑی بولی کا ابتدائی ادب اور درمیانی ادب بیشتر اردو کا ہے۔ جدید ہندی تو، خواہ لوگ کچھ کہیں، انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ اردو اور ہندی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ دونوں بہنیں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں۔ ان کے نقش و نگار اور خط و خال میں خاصی مشابہت بھی ہے مگر ان دو بہنوں میں سے ایک کو راج سنگھاسن پر بٹھانا اور دوسری کو ٹھکرانا تہذیب، ادب، انسانیت سبھی کی شریعت میں قابلِ اعتراض ہے۔ یہ اردو زبان جب سے وجود میں آئی اس رسم الخط میں لکھی گئی جسے آج ہم اردو رسمِ خط کہتے ہیں۔ کیا ہوا اگر یہ رسم الخط عربی اور فارسی رسم الخط پر مبنی ہے۔ عربوں اور ایرانیوں سے ہم نے بہت سی چیزیں لی ہیں مگر ان چیزوں کو اپنے طور پر برتا ہے۔ ہم نے فارسی رسم الخط میں متعدد حرفوں کے اضافے کرکے اسے اپنا رسم الخط بنا لیا ہے۔ اب یہ اردو رسم الخط ہے، اسے فارسی یا عربی رسم الخط

نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ بالکل شروع میں اور آج کل اردو کی بہت سی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی ملتی ہیں۔ اردو کے لئے رومن رسم الخط بھی استعمال ہوا ہے اور فوج میں تو بہت عرصے تک اس کا رواج رہا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے مقالے میں ایسی بہت سی ہندی کتابوں کی نشان دہی کی ہے جو پہلے اردو رسم الخط میں لکھی گئیں۔ اس لئے اگر کسی موقعے پر اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط کے بجائے اپنا رسم الخط مان لیں۔ اس منطق کی رو سے تو اردو رسم الخط ہندی کے لئے بھی استعمال کرنے کی دلیل آتی ہے مگر ابتدائی دور کی طفلانہ باتوں کو لوگ جوانی میں ترک کر دیتے ہیں۔ آدمی اپنے بچپن سے نہیں اپنی جوانی سے پہچانا جاتا ہے جب اس کا کردار بن جائے اور اس کی شخصیت مکمل ہو جائے۔ اردو کے لئے صدیوں سے موجودہ رسم الخط استعمال ہو رہا ہے۔ اب یہ وہ جلد ہے جو زبان کے جسم پر ہے۔ اس جلد کو آپ بدل دیں تو زبان کے جسم کو آنچ آئے گی۔ رسم الخط کوئی لباس نہیں ہے کہ ایک اتارا اور دوسرا پہن لیا، یہ کوئی غلاف نہیں ہے کہ ایک علٰحدہ کیا اور دوسرا چڑھا دیا۔ اگر ڈرنگر کا یہ قول صحیح ہے کہ فن تحریر تہذیب انسانی کی کلید ہے تو رسم الخط اس تحریر کا کوڈ یا قفل ہے۔ جب تک یہ قفل نہ ہو آپ کلید سے صحیح کام نہیں لے سکتے۔

رسم الخط صرف علم نہیں دیتا ذہنی کشادگی اور نفسیاتی طمانیت بھی عطا کرتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ الفاظ کے معنی جانتے ہیں مگر شعر کا مطلب نہیں بتا سکتے۔ یہ ماورائے شاعری اور ماورائے سخن بات جو ذہن بناتی ہے اور ذہن کی ساری اعصابی توانائی سے عبارت ہے۔ اسی رسم الخط کے ذریعے سے ممکن ہے جس سے ہم مانوس ہیں جو ہمیں صرف استاد نے نہیں پڑھایا، بلکہ ہم نے گھر کی کتابوں میں دیکھا، دیواروں پر دہلیزوں میں پایا، مراسلات کو ماں باپ کے حوالے کرتے ہوئے دیکھا، اور خود حرف پہچاننے سے پہلے

ہم جس سے آشنا ہوئے۔ اس لئے میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ کتاب اردو دیوناگری یا رومن رسم الخط کے ذریعہ بھی پڑھا سکتے ہیں۔ آپ بے شک کچھ الفاظ، کچھ اسباق، کچھ حکایتیں، کچھ کار و باری باتیں سکھا دیں گے۔ مگر پڑھنے والوں کو اردو زبان اچھی طرح نہیں آئے گی اور ادب کی روح تک تو ان کی رسائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ درست ہے کہ عام لوگوں کی ہمارے سارے کلاسیکل سرمائے تک رسائی نہیں ہوتی۔ مگر ہو تو سکتی ہے۔ دیوناگری یا رومن رسم الخط میں تو اس ناپیدا کنار سمندر کے چند قطرے ہی مل سکیں گے اور ہر دریا کو کوزے میں بند کیا بھی نہیں جا سکتا۔ ترکی میں اتاترک نے رومن رسم الخط رائج تو کر دیا مگر ترک اس جھٹکے سے ابھی جانبر نہیں ہو سکے ہیں۔ ہمارے یہاں تو سارے سرمائے کے منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فراق نے ایک دفعہ اپنی کتابوں کی الماری میں کتابوں کی قطار کی طرف اشارہ کر کے بڑے مزے کی بات کہی تھی۔۔

I do not read them, I need them.

میں انھیں پڑھتا نہیں ہوں مگر ان سب کی مجھے ضرورت رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو کی سب کتابیں کون پڑھ سکتا ہے مگر ان سب کتابوں کی ضرورت سبھی کو ہے اور پھر بقدر شوق اور حسب استعداد ہر ایک انھیں پڑھ سکتا ہے۔ اس لئے رسم الخط کے سلسلے میں یہ مسئلہ میرے نزدیک بنیادی ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کتابوں تک پہنچ سکے۔ گو یوں میں سے بغداد Tabloids سے ہم چاند تک تو پہنچ سکتے ہیں مگر دھرتی پر سے سہارا نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح دیوناگری رسم الخط یا رومن رسم الخط میں اردو کی چند کتابوں یا چند سو کتابوں تک رسائی کے معنی اردو ادب تک رسائی کے نہیں ہیں۔ بقول پوپ کے تھوڑا علم خطرناک ہے۔ خوب سیر ہو کر پیو یا مقدس چشمے کو آلودہ نہ کرو یا اتنا تو کرو کہ پینے کا دعوا نہ کرو۔ اردو کے لئے جو لوگ ناگری رسم الخط اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں وہ خدا جانے کیسے اس وسوسے میں مبتلا ہیں کہ اردو ناگری نہیں تو نیم جان ہے اور اس زبان کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ دیوناگری رسم الخط کے ذریعے سے یہ ہندی پڑھنے والوں کے دلوں میں پہونچ جائے اور بالآخر رسم الخط کو ترک کر کے کسی طرح اپنی جان بچا لے۔ اوّل تو یہ ایک خطرناک خوش فہمی ہے کہ دیوناگری رسم الخط اختیار کر لینے کے بعد اردو کی مقبولیت بڑھ جائے گی، دوسرے میں تو سرے سے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوں کہ اردو نیم جاں ہے یا ہو گئی ہے۔ جن لوگوں کا ایمان ضعیف ہے وہ ذرا ہوا تیز چلے یا آندھی آئے تو تلے اوپر ہونے لگتے ہیں، اردو پر نہ بمبری وقت پڑا ہے نہ اردو کی جان کے لالے پڑے ہیں، نہ اردو سمٹ کر چند شہروں تک رہ گئی ہے، نہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، نہ اردو جاگیردارانہ ماحول کی یادگار ہے، نہ یہ مصنوعی زبان ہے۔ اردو ہماری مشترک تہذیب کا سب سے شاندار عطیہ ہے۔ یہ ہندستان کی دھرتی سے اُگی، ہندستان کے کھیتوں کھلیانوں میں پھلی پھولی، یہاں کے بازاروں خانقاہوں اور درباروں میں بڑھی اور جوان ہوئی اور یہاں کی ہر کروٹ ہر تحریک، ہر کشمکش، ہر درد و داغ، سوز و ساز، آرزو اور جستجو کی امین ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دو کروڑ اڑتیس لاکھ ہندستانی یہ زبان بولتے ہیں۔ یہ تعداد بہت سے ملکوں کی آبادی سے بڑی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری مارچ میں ہونے والی ہے۔ اندازہ ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد موجودہ حالات کے باوجود اور دقتوں اور دشواریوں کے باوصف تین کروڑ سے زیادہ ہی ہوگی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اردو بولنے والے کم ہو رہے ہیں۔ اگر ملک کی تقسیم کے وقت کچھ اردو بولنے والے چلے گئے تو ان کی جگہ بہت سے آ بھی گئے۔ ہمارے صنم خانے کو کعبے سے بھی پاسبان ملے ہیں۔ پھر ہندستان کی کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جس میں اردو بولنے والے موجود نہ ہوں اور اتر پردیش میں بہتر لاکھ، بہار میں اتالیس لاکھ، مہاراشٹر میں ستائیس لاکھ، آندھرا پردیش میں پچیس لاکھ، میسور میں بیس لاکھ، مغربی

بنگال میں آٹھ لاکھ، مدھیہ پردیش میں آٹھ لاکھ، تامل ناڈ میں چھ لاکھ گجرات میں چھ لاکھ، راجستھان میں پانچ لاکھ، اڑیسہ میں دو لاکھ، ہماچل میں دو لاکھ اور دہلی میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آبادی تو ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں دکھائی گئی ہے، یہ تعداد برابر بڑھ رہی ہے اور دقتوں دشواریوں کے باوجود بڑھ رہی ہے۔ اس کی تعلیم کا ریاستی حکومتیں مناسب انتظام نہیں کرتیں۔ اس کے چلن پر رکاوٹیں ہیں۔ اس کے خلاف کچھ حلقوں میں تعصب ہے۔ یہ تعصب دور ہو جائے، یہ رکاوٹیں نہ رہیں اور اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو تو آپ اردو کی ترقی دیکھئے گا۔ اعلیٰ سطح پر اردو کی تعلیم پہلے سے بہت زیادہ بڑھی ہے۔ تک بھگ چالیس یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اردو میں تحقیق و تنقید دونوں کا معیار پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اردو میں اخبار آج بھی انگریزی اور ہندی کے بعد سب سے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اردو میں ہر سال جو کتابیں نکلتی ہیں ان کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے کم نہیں ہو رہی ہے۔ اردو کشمیر کی سرکاری زبان ہے آندھرا پردیش میں تلنگانہ اور ہماچل پردیش کی ثانوی زبان ہے۔ پنجاب کی ثانوی زبان منوانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، آندھرا، میسور اور دہلی میں اسے سرکاری زبان منوانے کی تحریک اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسے تسلیم نہ کر لیا جائے۔ میں ہندستانی جمہوریت سے مایوس نہیں ہوں۔ ہندستانی عوام پر میرا ایمان مستحکم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انھیں کچھ عرصے تک اور بہکایا جا سکتا ہے مگر بالآخران کا ضمیر جاگے گا اور وہ اردو کو اس کا حق دیں گے۔ اردو کسی دوسرے دریا کے معاون کی حیثیت سے نہیں، ایک آزاد، خود مختار، اپنی موجوں کے زیر و بم سے ہزاروں آئینے دکھلانے والے دریا کی حیثیت سے اپنا فیض عام کرتی رہے گی۔ اپنے سے مایوس، دوسروں پر تکیہ کرنے والے سیاست کے شکار یا تجارت کے غلام اردو سے مایوس ہوں تو ہوں، ہندستان کے کروڑوں عوام جن کی زندگی، جن کا وجود، جن کی شخصیت، جن کا کردار، جن کا خمیر اردو سے بنا ہے، وہ نہ اپنے سے مایوس ہیں نہ

اپنی زبان سے۔ اردو ہر زبان سے فیض حاصل کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ اردو ہر زبان کو بہت کچھ دیتی رہے گی۔ یہ آزادانہ اور دوستانہ لین دین جاری رہے گا اور اسے جاری رہنا چاہئے۔ اردو بدلے گی بھی، نئے نئے الفاظ بھی لے گی اور خیالات بھی۔ اظہار کے سانچے بھی اور افکار کے ڈھانچے بھی۔ اس کے خمیر میں وسیع المشربی، کشادگی، وسعت قلب، قلندری اور آزادی ہے۔ یہ رسم خط دے کر زبان کا سودا کیوں کرے۔ آپ نے وہ پرانا قصہ سنا ہوگا، شاہا دو رخ بدہ و دلارام را مدہ۔ یہاں رخ دیتے ہیں تو دلارام بھی جاتی ہے بلکہ رخ دلارام کے پاسبان ہیں اور پاسبانوں کی نگہداشت ہر مستعد اور چوکنے ادارے کا فرض ہے۔ دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کے حامی بڑی شد و مد سے کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی تو ایک ہی زبان ہیں۔ اردو اپنے الگ اسٹائل میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے بچانے کی صرف یہی صورت ہے کہ یہ ہندی اسٹائل میں مل جائے۔ مجھے ایسے لوگوں کی فہم و فراست پر حیرت ہوتی ہے۔ بحث کے لئے کوئی دھرم ویر بھارتی، کوئی یش پال یہ کہہ دیتا ہے کہ اردو کا سارا سرمایہ بھی ہندی کا سرمایہ ہے مگر آج تک میری نظر سے کسی یونی ورسٹی کا ہندی کا ایسا نصاب نہیں گزرا جس میں پرساد اور نرالا اور میتھلی شرن گپت اور بھارتیندو اور تلسی، سور، میرا، کبیر کے ساتھ میر، سودا، نظیر، انیس، اکبر، اقبال، چکبست، سرشار، نذیر احمد، حالی، شبلی کو جگہ دی گئی ہو۔ ہندی رسم الخط میں تو اب وہ نقطے بھی اڑا دیئے گئے ہیں جو اردو کی آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ نے مسعود حسین خاں کا وہ پر لطف مضمون پڑھا ہوگا جس میں ہمارے ممتاز شعرا کے ان اشعار کا نمونہ دیا گیا ہے جو ہندی رسم الخط میں کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ چند سیاسی مداریوں یا ادبی شعبدہ بازوں کے کہنے میں آ کر ہم کس طرح اپنی متاع عزیز ایک امید موہوم پر قربان کر دیں جب کہ آج تک کسی نے ان حضرات کے کہنے پر عمل کر کے اردو اور ہندی ادب کا ایک مشترک نصاب نہیں بنایا۔ ہم کیسے یہ گوارا کریں

کہ ہماری زبان کچھ سے کچھ ہو جائے۔ ہم اپنے دریا کا سارا پانی ایک بڑے دریا میں کیسے ملا دیں۔ جمنا بھی جب گنگا میں ملی تو کچھ دور تک اس کا ہلکا نیلا رنگ باقی رہا مگر ذرا آگے چل کر وہ گنگا میں غائب ہو گیا۔ بقول شاعر:-

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

جن لوگوں کا قومی یک جہتی کا تصور ایک مذہب یا ایک زبان کا ہے، وہ ہندستانی جمہوریت کے مزاج کو نہیں سمجھتے ہندستانی جمہوریت کی بات آپ غالب کی زبان سے سنیئے:-

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیئے

ہندستانی جمہوریت، تصوف کی طرح کثرت میں وحدت کی قائل ہے اور یہاں کثرت اور وحدت دونوں پر اصرار ہے اور کثرت میں وحدت پر بھی۔ اس لئے یہاں ہر زبان کو آزادانہ ترقی کرنی چاہئے اور کسی دوسری زبان پر تکیہ کرکے نہ کسی کی وسیع قلمرو کا ایک حصہ بن کر۔ آخر دو بہنوں کو بھی تو بالآخر اپنی زندگی الگ الگ گزارنی پڑتی ہے وہ ساری عمر ساتھ نہیں رہتیں۔ ایک بہن دوسری کی خاطر اپنا مستقبل بیچ سکتی ہے اردو سے یہ توقع کیوں ہو۔

جب لوگ اردو کے زوال کا ماتم کرتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے ذریعے سے ہندی کا قلعہ جیتنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے افسوس ہوتا ہے لیکن جب لوگ یہ کہہ کر دیوناگری رسم الخط زیادہ سائنٹفک ہے یا صوتی حیثیت سے مکمل ہے، ہمیں طعنہ دیتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ دنیا کا کوئی رسم الخط مکمل نہیں ہے۔ ہر رسم الخط میں کچھ خوبیاں ہیں اور کچھ خامیاں۔ کوئی ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کوئی دوسرے لحاظ سے جیسے حسن کا کوئی مطلق معیار وضع کرنا آسان نہیں اور جیسے اس میں نظارے کے علاوہ ذوقِ نظر کو بھی دخل ہے تو کسی رسم الخط کو سائنٹفک کہہ کر دوسرے کو گرانا میرے نزدیک فریب دہی ہے خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ۔ یہ صحیح ہے کہ دیوناگری صوتی حیثیت سے بہتر ہے مگر آخر صوری حیثیت بھی تو کوئی چیز ہے پھر سائنس کا لفظ کوئی ایسا منتر نہیں کہ پڑھ کر پھونک دیا اور سب ڈھیر ہو گئے۔ زبان، مذہب، ادب، تہذیب، عقیدے کے معاملے میں سائنس نہیں چلتی۔ انسان مشین نہیں ہے۔ وہ جذبات و جبلتوں کی پوٹ ہے آج کے انسان میں ابتدائی انسان سے لے کر موجودہ دور کے تہذیبی سفر تک کے اثرات موجود ہیں۔ انسان فارمولوں، چارٹوں، حسابی اعداد میں بند نہیں ہے۔ سائنس کا لفظ کوئی اسم سم نہیں ہے کہ آپ نے پڑھا اور خزانے کا دروازہ کھل گیا۔ زبان سے کہنے عقل سے جاننے اور دل سے ماننے میں فرق ہے۔ میں عقل کو مانتا ہوں۔ سائنس کی اہمیت کا قائل ہوں مگر دل کی بات بھی سمجھتا ہوں اور رسم الخط کے سلسلے میں برنارڈ شا کی پر زور تلقین کے باوجود انگریزوں کی قدامت پسندی کا راز بھی جانتا ہوں۔ زبان کے معاملے میں سائنس کے اصول کام نہیں دیتے زبان کی اپنی سائنس ہے لسانیات کے ماہرین کتابی قواعد کو نہیں مانتے چلن کی منطق کو تسلیم کرتے ہیں۔ سائنس کے طاعت و زہد کا سارا ثواب تسلیم مگر زبان و ادب میں بالآخر قولِ فیصل یہی ہے پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔ یہ ہٹ دھرمی نہیں ہے، نفسیاتی صداقت ہے اور آپ چاہے اور کتنی ہی صداقتوں سے انکار کر دیں نفسیاتی صداقت سے انکار کیا اور آپ نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنی شخصیت کی کمی یا ناہمواری گوارا کر لی۔

اردو رسم الخط کی وجہ سے پڑوسی ملکوں سے ہمارا رشتہ استوار ہے۔ پاکستان اور ہندستان میں پانچ زبانیں مشترک ہیں۔ اردو، بنگالی، پنجابی، سندھی، کشمیری۔ ان میں بنگالی کو چھوڑ کر چار کے لئے اردو رسم الخط استعمال ہوتا ہے۔ جب

آزادی کے بعد ہندو بڑی تعداد میں ہندوستان آ گئے تو پھر سرکاری
حلقوں کے اثر سے ان کے یہاں سندھی کو دیوناگری رسم الخط میں
لکھنے کی تحریک چلی مگر میں یہ بات اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ
سندھیوں کی بڑی تعداد ہر طرح کے دباؤ کے باوجود اپنے رسم الخط
کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ملک
میں زبان ایک رسم الخط میں لکھی جائے اور دوسرے میں
دوسرے رسم الخط میں۔ زبان وادب کا رشتہ بعض اوقات
جغرافیائی حدود کو پار کر کے اپنا اثر دکھاتا ہے۔ مجھے اب تک
آنند شنکر رے، مشہور بنگالی مصنف کی بات یاد ہے جو انھوں
نے کئی سال ہوئے شملے کے ایک سمینار میں کہی تھی۔ مشرقی بنگال
کے ادب کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے بڑے فخر سے وہاں کے
رسالوں اور نئی مطبوعات کا ذکر کیا۔ صبیح الدین کی عظمت کا اعتراف
کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں عقیدت کی چمک تھی۔ شکاگو میں
ایک نوجوان بنگالی مسلمان شمس الباری سے ملاقات ہوئی۔ وہ
ٹیگور کا اس خلوص اور محبت سے ذکر کرتا تھا گویا وہی اس کا
نام لیوا ہو۔ اُسے پاکستان کی حکومت سے شکایت تھی کہ اس نے
ایک زمانے میں ٹیگور کے گیتوں پر پابندی لگا دی تھی۔ غرض
ہمسایہ ملکوں میں ایک ہی زبان کا چلن ہو تو زبانوں کے دو رسم الخط
دو دیواریں بن جاتے ہیں۔ ایک رسم الخط دونوں کے درمیان
تہذیبی رشتے استوار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اردو رسم الخط کے
ذریعے سے صرف پاکستان و افغانستان سے نہیں پورے مغربی ایشیا
اور شمالی افریقہ سے ہمارے تہذیبی روابط برقرار رہ سکتے ہیں۔

ہاں جو لوگ تدریسی ضروریات یا موجودہ طباعتی ضروریات
کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان کی بات توجہ سے سننی چاہیئے اور
اس پر غور کرنا چاہیئے۔ ہمیں رسم الخط میں تبدیلی کی بات نہیں
کرنی چاہیئے۔ ہاں آج کے دور کی ضروریات کے مطابق رسم الخط
میں اصلاح ضرور کرنی چاہیئے۔.................

.... دراصل ہمارے رسم الخط کی بہت
سی الجھنیں نستعلیق طرز تحریر سے وابستہ ہیں۔ چونکہ اس رسم الخط
میں حرفوں کی شکلیں بدل جاتی ہیں مثلاً ب کی آٹھ شکلیں ہوتی ہیں
اس لئے بچوں اور غیر ملکیوں کے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے اور اس کے
سیکھنے اور یاد کرنے میں دیر ہوتی ہے۔ دوسرے اگرچہ آف سیٹ
کی وجہ سے نستعلیق کی بہت سی دشواریوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور
فوٹو لے کر ہم بڑی تعداد میں کتابیں اور اخبار چھاپ سکتے ہیں مگر
کتابت میں بہر حال بہت وقت صرف ہوتا ہے اور پھر آف سیٹ
میں اتنا خرچ ہوتا ہے کہ ہر ایک کے بس کا نہیں۔ اس لئے
آج سے نہیں کچھ عرصہ سے اردو زبان وادب کے کچھ بہی خواہ
اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہمیں طباعت کے لئے نسخ طرز تحریر
کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ چھوٹے پریسوں میں ہاتھ سے کمپوزنگ ہو سکتا
ہے اور بڑے پریسوں میں مانو ٹائپ اور لائنو ٹائپ مشینیں لگائی
جا سکتی ہیں۔ لائنو ٹائپ میں پوری پوری سطریں ایک ساتھ ڈھل
جاتی ہیں اور مانو ٹائپ میں ایک ایک لفظ ڈھلتا ہے۔ لائنو میں
ایک ایک لفظ ڈھلتا ہے۔ لائنو میں ایک لفظ کی صحت کرنی ہو تو
سطر بدلنی پڑے گی۔ مانو میں صرف اس لفظ کو نکال دینا کافی
ہوگا۔ اخباروں کے لئے لائنو اور کتابوں کے لئے مانو ٹائپ زیادہ
موزوں رہے گا۔ ہم چونکہ نستعلیق سے مانوس ہیں اور اس کے
دائروں کے شیدائی، اس لئے ہمیں نسخ بھدا معلوم ہوتا ہے
لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بچپن سے نستعلیق طرز میں لکھی
ہوئی کتابیں پڑھتے آئے ہیں۔ میں نے حال میں پاکستان کی
وہ کتابیں دیکھیں جو بچوں کو تیسرے اور چوتھے درجے میں پڑھائی
جاتی ہیں۔ یہ نسخ ٹائپ میں چھپی تھیں۔ حروف جلی اور روشن
تھے اور چونکہ کاغذ اور طباعت دونوں اچھے تھے اس لئے مجھے تو یہ
کتابیں دلچسپ معلوم ہوئیں۔ نستعلیق رسم الخط کو ترک کرنے کا سوال
نہیں ہے۔ عام لکھاوٹ کے لئے یہ اب بھی استعمال ہو سکتا ہے
اس کے علاوہ خاص قسم کی مطبوعات کے لئے جو خاص موقعوں پر
تیار ہوں یا خاص خاص کاموں کے لئے نستعلیق رسم الخط میں فوٹو
آف سیٹ کے ذریعے سے بھی کتابیں چھاپی جا سکتی ہیں۔ آخر ایران
میں بھی تو یہی ہو رہا ہے جہاں عام رواج نسخ ٹائپ کا ہے

خاص مطبوعات نستعلیق میں چھاپی جاتی ہیں۔ نستعلیق صرف خط نہیں فن لطیف بھی ہے۔ اس فن لطیف کو باقی رکھنا چاہیئے مگر عام تدریسی اور طباعت کے لئے نسخ کا استعمال ضروری ہے۔ ہمیں بڑے پیمانے پر درسی کتابیں تیار کرنا ہیں ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کے ایڈیشن نکالنے ہیں۔ اس کا انتظام کرنا ہے کہ ہمارے اخبار لاکھوں کی تعداد میں چھپیں جب یہ نسخ ٹائپ کے ذریعے سے ہو سکتا ہے تو اختیار کر لینے میں پس و پیش کیوں۔

انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۴۲ء ۱۹۴۳ء میں رسم الخط میں اصلاحات کے سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس کی تجاویز رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھیں۔ ان اصلاحات پر انجمن کی حیدرآباد کی درسی کتابوں میں ایک حد تک عمل بھی ہوا تھا۔ پھر ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے ہماری زبان میں ایک اور کمیٹی کی روداد چھپی تھی۔ اصلاحات کے سلسلے میں در اصل مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی خدمات ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔ ان حضرات نے انشا کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے کہ اردو میں کوئی لفظ خواہ عربی کا ہو یا فارسی کا یا ترکی کا، جس طرح اردو میں رائج ہو گیا ہے، خواہ اصل کی رو سے صحیح ہے یا غلط اسے اردو کا لفظ سمجھنا چاہیئے۔ املا کے لئے بہت مناسب اصلاحات کی خوبی یہ تھی کہ ان میں چلن، استعمال، آواز اور تلفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے آج کی تدریسی اور طباعتی ضروریات کے لئے گنجائش نکالی گئی تھی۔ ان سفارشات پر کچھ لوگوں نے عمل کیا اور ایک زمانے میں رسالہ اردو اور انجمن کی مطبوعات میں بھی ان کا لحاظ رکھا گیا مگر آئے دن کی ضروریات، کاتبوں کی عادت اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے ان پر پورا عمل نہ ہو سکا۔ انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۵۶ء میں پھر رسم الخط کی اصلاح کے لئے ایک ماہرین کی کمیٹی بنائی۔ اس کے سوال نامے کے جواب میں اسی جواب موصول ہوئے۔ اسی میں سے اگرچہ بیشتر نے سفارش کی تھی کہ چھپائی کے لئے نسخ اور لکھاوٹ کے لئے نستعلیق استعمال ہو مگر انجمن کی جولائی ۱۹۵۹ء کی کانفرنس میں اس کی اتنی مخالفت ہوئی کہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بہر حال میری رائے میں ہمیں اس معاملے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے اور تمام متعلقہ حضرات کو اس پر آمادہ کرنا چاہیئے کہ وہ رفتہ رفتہ چھپائی کا سب کام ٹائپ میں کریں۔ اس کے لئے حکومت اور بڑے اداروں کو تجارتی حلقوں کے لئے سہولتیں پیدا کرنی پڑیں گی۔ ٹائپ فی الحال مہنگا پڑتا ہے اس لئے ٹائپ کی مشین لگانے کے لئے امداد دینی پڑے گی۔ جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں ان کو اس پر راضی کرنا پڑے گا کہ فی الحال ٹائپ کی کچھ مہنگی کتابیں خریدیں لیکن ایسے معاملات میں سب فوراً ساتھ نہیں ہوتے۔ یہ عمل رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس تبدیلی میں بھی کچھ دیر لگے گی۔ میرے نزدیک حسب ذیل اصلاحات پر عمل کرنے سے ہماری بہت سی تدریسی اور طباعتی ضروریات پوری ہوں گی اردو کی خود مختار اور آزاد حیثیت برقرار رہے گی، موجودہ روپ میں کوئی ایسی تبدیلی بھی نہ ہوگی کہ تحریر نامانوس ہو جائے، نو آموز حضرات کے لئے آسانی پیدا ہو جائے گی، ہمارے رسم الخط پر اعتراضات کم ہو جائیں گے۔ یہ جو آئے دن کوئی نہ کوئی ضعیف ایمان کا شکار احساس کمتری کا مریض یا ابن الوقت رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دیتا رہتا ہے، اس کی اپیل باقی نہ رہے گی۔

طباعت کے لئے نسخ ٹائپ اختیار کرنے کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ ہر ملنے والے حرف کی دو سے زیادہ شکلیں نہ ہوں۔ ایک پوری ایک آدھی۔ مثلاً ع کی شکل عہد میں کچھ ہے "بعد" میں کچھ "شمع" میں کچھ ہے اور "سماع" میں کچھ۔ اگر ایک "عہد" کی سی شکل شروع یا درمیان میں اور ایک سماع کی عین شکل آخر میں رہے تو نو آموزوں کی الجھن اور پریشانی دور ہو جائے گی۔ اسی طرح آدھی ب اور پوری ب کے لئے بد اور باب میں ب کی شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ سجاد مرزا کے بنیادی ٹائپ میں اس کا اہتمام رکھا گیا تھا۔ اس طرح کرسی کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ بنیادی ٹائپ کو اختیار کیا جائے یا نہیں مگر جوڑوں کی زیادتی سے ٹائپ میں جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا [illegible] درمیان

مانوس حسن کا سوال نہیں آنا چاہیئے، آسانی، سہولت، صحت اور کفایت کو دیکھنا چاہیئے۔ کچھ لوگ س، ص، ث میں سے ایک حرف اختیار کر لینے پر زور دیتے ہیں۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ جس طرح غالبؔ کے ابتدائی کلام کے رنگ اور آرزو لکھنوی کے رنگ دونوں کو میں اردو کے دائرے سے خارج کرنے کو تیار نہیں ہوں، جس طرح ابوالکلام آزاد کے اسٹائل اور عبدالحق کے اسٹائل دونوں کے حسن کو مانتا ہوں، اسی طرح ان عربی و فارسی الفاظ کو جو ہماری زبان میں آ گئے ہیں بگاڑنے کا قائل نہیں۔ محبت چھوٹی ہ سے لکھی جائے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں محبت کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ ہاں خورشید کو بجائے ش کے س سے غالبؔ نے بھی لکھا ہے۔ زکوٰۃ کو عربی قاعدے سے لکھنے کے بجائے زکات، رحمٰن کو رحمان، اسمٰعیل بلکہ عیسیٰ اور موسیٰ کو الف سے لکھنے کے حق میں ہوں۔ لغت میں ان کا اصلی تلفظ مل جائے گا اور اصل زبان کی شکل بھی لیکن عام طور پر جس طرح بولا جائے اسی طرح لکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ "ے" کے استعمال کے سلسلے میں بھی کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے تھی کہ بڑی ے کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے۔ میرے نزدیک یائے معروف اور یائے مجہول عام طور پر پوری لکھی جائیں۔ ہاں اَے۔ طے۔ خے کی آواز کو ظاہر کرنے کے لئے آدھی یائے معروف یعنی ای۔ طی۔ خی کی جا سکتی ہے۔ اس قاعدے کے مطابق میز کو مےز۔ میر کو میر۔ فکیر کو فکی رہنے کو رہنے لکھنا ٹھیک رہے گا۔ دشواری یہ لکھنے میں پڑے گی تو اس کے بجائے صرف یے سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ صوتی لحاظ سے مناسب بھی ہے۔ ہمزہ صرف وہاں لکھنا چاہیئے جہاں آواز ٹوٹ جائے۔ دیے لیے بغیر ہمزہ کے اور گئے، آئے، جائے ہمزہ کے ساتھ لکھنے چاہئیں۔ کوئی پائی۔ کو، کوری۔ پاوی لکھنا بہتر ہوگا۔ جہاں آخر میں الف کی آواز آتی ہے وہاں ہ لکھنے کی ضرورت نہیں پتہ کے بجائے پتا، بٹوارہ کے بجائے بٹوارا، پردہ کے بجائے پردا، کوئلہ کے بجائے کوئلا لکھنا بہتر ہوگا۔ کنواں، ہنسنا، پھانسی میں نون غنہ کے اظہار کے لئے ٭ کا نشان ضرور بنانا چاہیئے۔ بل کل، فورمن، ادنا، اعلا تو اب لوگ لکھنے لگے ہیں۔ میں تو عبدالحفیظ اور فضل الرحمٰن کو فضل رحمان لکھنے کے حق میں ہوں۔ عبدل دہلوی کا ابراہیم نامہ ابھی مسعود حسین خاں کی ترتیب سے شائع ہوا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ عبدل علٰحدہ تو اردو کے قاعدے سے لکھا جائے مگر عبدالحفیظ عربی قاعدے سے لکھنا ضروری ہو۔

رسم خط کے سلسلے میں ایک آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اردو کی کتابیں ان لوگوں کے لئے جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں، دیوناگری رسم الخط میں چھاپی جاتی ہیں تو نہ صرف مجھے اس پر کوئی اعتراض ہے، بلکہ میں اس کی حمایت کرتا ہوں۔ کیوں کہ اس ہماری زبان کے الفاظ کسی نہ کسی طرح ایک وسیع تر حلقے تک پہنچتے ہیں۔ کوئی گھر بیٹھے اپنے ٹیلی وژن پر باغ کا منظر دیکھتا جاتا ہے تو وہ ہمارے پھولوں کے حسن، ان کی آنکھوں میں ٹھنڈک پہنچانے اور روح کو بالیدہ کرنے والے رنگوں، ان کی مست کرنے والی خوشبو کا اندازہ نہ کر پائے گا مگر ہمارے باغ کی بہار کا کچھ تو فیض اس تک پہنچ ہی جائے گا۔ ہم کیوں اسے اس سے محروم کریں۔ ہاں جو ہماری زبان و ادب کی قدروں، اس کے فکر و فن کے تاج محل، اس کی ساحری، اس کے رزم و بزم، اس کی گیرائی، اس کی نفاست اور اس کی صلابت۔ اس میں مستی اندیشہ ہائے افلاکی اور زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا عزم، اس کی روایت اور اس کے تجربے، اس کی شیرینی، اس کے مزے، اس کی گمبھیرتا اور اس کی اعلیٰ سنجیدگی سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو اسے ہمارے رسم الخط کو سیکھنا چاہیئے۔ مغرب کے لوگ تو مشرق کی مردہ زبانوں اور معدوم لکھاوٹوں کے سیکھنے میں عمریں گزار دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ سہل پسندی کیوں ہے۔ زبان و ادب پر ہی نہیں، تہذیبوں اور قوموں پر بھی مشکل وقت آتے ہیں مگر زبانوں کے شیدائی اور تہذیبوں کے عاشق ہر مشکل پر قابو پانے کا عزم کرتے رہیں۔ مایوس نہیں ہوتے، ماتم

نہیں کرتے۔ حالات کے حوالے اپنے کو نہیں کرتے۔ دریا میں تنکے کی طرح نہیں بہتے۔ جب لندن پر جرمن ہوا باز طوفانی گولہ باری کر رہے تھے تو ایک دکان پر یہ تختہ لگا ہوا تھا:

کاروبار اسی طرح چالو ہے۔ ہماری زبان و ادب کا کاروبار کاروبارِ شوق ہے اور کاروبارِ شوق میں وقتی نقصان کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مستقل نفع نقصان کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ میں نہ اردو کو قریب مرگ سمجھتا ہوں، نہ روز بروز سکڑنے والی زبان، آزادی کے بعد ایک بڑے حلقے کی تنگ نظری کے باوجود یہ زبان زندہ اور توانا ہے۔ اس کے ادب میں آج کی ہر موج اور ہر ذہنی رو کے نقوش ملتے ہیں۔ فراق اور فیض ابھی موجود ہیں اور نئے فراق اور فیض ابھر رہے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان میں ہی نہیں، اردو زبان کا چرچا امریکہ اور روس اور نئی دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات عالمگیر پیمانے پر منائی گئی تھیں۔ دقتیں اور دشواریاں ہیں مگر ان کو دور کرنے کی سعی بھی جاری ہے اور ہم انھیں دور کر کے رہیں گے۔ اب بھی کچھ لوگ سادہ لوحی یا ایمان کی کمزوری یا احساس کمتری یا سراسیمگی یا ذاتی مفادات کی وجہ سے کبھی رسم خط بدلنے کی بات کرتے ہیں یا کبھی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی منزل پر مادری زبان کے بجائے ریاستی یا علاقائی زبان پڑھانے کی تو ان سے چکبست مرحوم کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے:۔

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

ہم نہ جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہیں کیونکہ ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے۔

شکیلہ اختر

پوپی

جس دن پہلے پہل بڑے انتظار کے بعد اوما کو ایک بڑا پیار نرم نرم روئیں والا کتے کا چھوٹا سا پلّا ملا تھا تو اس پلپلے اور ریشم کی طرح چکنے اور چمکیلے پلے کو پاکر وہ خوش ہونے سے زیادہ الجھن میں پڑ گئی تھی۔ اوما کو بہت دنوں سے ایک چھوٹے سے قد والے اور اچھی نسل کے کتے کے پلے کی تلاش تھی۔

گھر کے بچوں نے بڑے شوق اور پیار سے اس پلے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند گھڑی دیر کے لیے اس ننھے سے پلے کے آنے سے گھر میں خوشی اور ہماہمی سی چھا گئی تھی اور گھر کا ہر ایک بچہ اس پلے کو اپنی گود میں لینے کو بے چین ہو رہا تھا۔ کالے سیاہ اور چمکیلے رنگ کا ریشم جیسے ملائم روئیں والا ننھا سا پلّا ہر کسی کو بڑی خوشی سے تک رہا تھا اور رہ رہ کر اس کا ننھا سا جسم کانپ کانپ اٹھتا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں ایک عجیب طرح کی بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ معصوم افسردہ اور مظلوم آنکھیں، نہ جانے اس کی زندگی کا کون سا درد ننھا سہی کراہ اس کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔ اوما نے اس کو بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ گرم گرم کالے ریشم کے گچھے جیسا ملائم بچہ اس کے ہاتھوں میں تھرتھرا رہا تھا۔ اوما کو اس بچے کی ماں یاد آگئی۔ ماں کی گود سے چھوٹ کر شاید یہ بچہ اس طرح سے سسک رہا تھا۔

اس نے بڑے پیار سے اس بلکتے ہوئے بچے کو اپنے کلیجے سے لگا لیا [illegible] جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور اس کے مرجھائے لبوں پر اس ننھے سے بچے کو چوم لینے کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بے اختیار جھک گئی۔ مگر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ اسکی گود میں بیٹھا ہوا آنکھیں بند کئے ایک کتے کا بچہ سو رہا تھا۔

اوما کے جسم کی گرمی میں پلے کو شاید اپنی ماں کی ممتا مل رہی تھی۔ بچے نے پل بھر کے لیے اوما کی گود میں اور بھی سمٹتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر اس کو دیکھا اور پھر بڑے آرام سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اوما کی گود میں اور بھی سمٹتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر اس کو دیکھا اور پھر بڑے آرام سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اوما دھیرے دھیرے بچے کا ننھا سا سر سہلاتی رہی اور پھر اس کے لبوں پر آپ ہی آپ کوئی نغمہ مچلنے کو بے قرار ہونے لگا۔ نغمہ؟ —— مگر کون سا گیت؟ لبوں کی ان تھرتھراہٹوں پر کسی راگ، یا کسی لے کی ضرورت ہی کیا تھا۔؟ کس لیے تھی؟ اوما نے دل کے اندر اٹھتی ہوئی جب اس پکار کو رد کیا جب اپنی روح کی اس پیاسی طلب کو کچلا تو بے اختیار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اور پھر اس کے ہونٹوں سے کسی لوری کی جگہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کی ایک کراہ ٹکرا کر رہ گئی۔

اور یہی وہ پہلا دن تھا جب اوما نے بچے کو اپنی گود میں تھپک تھپک کر سلایا تھا اور بہت سے ناموں میں سے تلاش کر کے اس کا نام پوپی رکھا تھا۔

آنکھوں کی پتلیوں سے لے کر سر سے پیر تک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا نرم نرم بچہ جب اوما کو دیکھ کر خوشی کے مارے اچھل اچھل پڑتا

تو اس کے پیار کو دیکھتے ہوئے ادما کا دل مسرتوں سے بھرپور ہو جاتا تھا۔

وہ اس کو بڑے لاڈ سے پکارتی ــ "پوپی ــ پوپی" ــــ اور پوپی جہاں کہیں بھی ہوتا دوڑتا اُچھلتا کودتا ہوا ادما کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگتا تھا وہ اُس کے پیروں کو چاٹتا، کبھی اس کی گود میں اُچھک کر بیٹھ جاتا اور جب تھک جاتا تو پھر ادما کی چپلوں سے کھیلنے لگ جاتا تھا۔ یہی اس کی محبت کا اظہار تھا اور بس یہی اس کے پیار کی انتہا تھی۔

ادما کی زندگی جس تپتے ہوئے سنسان صحرا میں گزر رہی تھی اس کو ادما کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ دریا کے ساحل پر کھڑی ہو کر بھی وہ پیاسی تھی، اس کی تمناؤں کی ساری کلیاں اس کے غم کی آنچ سے جھلس چکی تھیں۔ فطرت نے جیسے اس کی زندگی کو خوشیوں، مسرتوں اور پیار میں سے کچھ بخشا ہی نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اور ان ساری ناکامیوں سے گزرتے ہوئے بھی وہ ہر کسی کی مسرتوں میں حصہ دار بن کر اپنے آپ کو بہلا دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی قسمت کا کبھی گلہ نہیں کیا۔ جہاں کہیں آرزوؤں اور مسرتوں کو رقص دیکھتی، وہ بڑے خلوص اور پیار سے ان چمکتی ہوئی کرنوں کو اپنی زندگی کے دامن میں سمیٹ لینے کو آگے بڑھتی اور پھر ان مانگے ہوئے اُجالوں سے اپنے دل کی تاریک دنیا کو سنوار لیتی سجا لیتی اور ان جگمگاہٹوں میں اپنے غموں کو بھول جاتی اور اس طرح چند لمحوں کے لیے اس کو ایک پُرفریب سہارا مل جاتا تھا۔ مسرتوں کے یہ چند لمحے اُسے بہلا دینے جانے تھے اور پھر وہ اپنے آپ کو اپنے گردوپیش کو اور اپنی ازلی اور ابدی تاریکیوں کو فراموش کر بیٹھتی۔ اس کی آنکھوں کی اُداسی مٹ جاتی اس کے ہونٹوں پر بھی تبسم ہوتا پھر وہ بھی کچھ نقشے بنانے لگتی۔ اس کے تصور میں بھی پھول مسکرانے لگتے اور پھر وہ ... ہر ایک نقش و نگار میں تیزی سے رنگ بھرنے لگتی۔ لال۔ پیلے ہرے۔ گلابی ... اور پھر سیاہ رنگ، اور اسی ایک سیاہ نقطے پر آ کر وہ چونک پڑتی تھی۔ اچانک اس کو جیسے محسوس ہوتا تھا۔ یہی سیاہی یہی تاریکی اور اسی اندھیرے نے اس کی زندگی کو مٹا کر فنا کر دیا ہے۔ اس کی آرزوؤں کے سارے حسین رنگوں کو اپنی سیاہیوں سے اپنے اندر غرق کر رکھا تھا۔ اور ادما بڑی بے بسی میں اچانک پھر اپنی جانے پہچانے ہوئے اندھیروں میں ڈوبتی چلی جاتی تھی مگر ڈوبتے ہوئے بھی اس کی کمزور انگلیاں، دور کھڑی مسکراتی اور شاداب زندگی کا ہلکے سے دامن تھام لیتیں اور جیسے سسکتی ہوئی کہتیں "مجھ کو بھی ــــ اپنی ان مسکراہٹوں سے تھوڑا سا سہارا دے دو۔"

اس طرح اسے تبسّم کی مانگی ہوئی چند کرنوں کا اجالا مل جاتا اور پھر یہی اس کی تسکین اور جینے کا سہارا بن جاتا۔ ادما کا ایک خوبصورت گھر تھا جس میں اس کا شوہر ہریش تھا۔ اس کی ساس تھی اور سسرالی خاندان کے بہت سے پیارے پیارے بچے بھی تھے مگر اس جگمگاتی ہوئی دنیا میں وہ اک دم اکیلی تھی۔

اس کے شوہر ہریش کو ساری دنیا اور ساری انسانیت سے اتنا پیار تھا کہ ایک اکیلی لڑکی پر توجہ دینے کی اس کو کبھی فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ وہ ساری دنیا کو امن اور شانتی کی زندگی کا حق دلوانا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے بڑے بڑے مسائل تھے۔ وہ ایک ایک گھر کو جنت بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر جہاں ہریش کے اتنے اونچے اونچے ارادے ہوں، جہاں وہ ساری دنیا کو سنوارنے کا تصور کر رہا ہو وہاں ایک بیچاری ادما کے معصوم دل کی سنسان گلیوں کو کیسے گلزار بنا سکتا تھا؟

ہریش اس کو بہت پسند تھا، اس کو اپنے شوہر کا درد بھرا دل اور دوسروں کے دکھوں پر بھیگ جانے والی آنکھوں سے بڑا پیار تھا اُدما نے ہریش کے احساس اور انسانیت کے خدمت گزار جذبوں کو سر اور آنکھوں سے لگایا بھی تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ہریش کی محبت کے ساتھ ایک غرور بھرا نشہ بھی چھایا رہتا تھا۔ مگر جب گزرتے ہوئے وقت ــــ نے رفتہ رفتہ ہریش کو اس سے چھین لیا اور ہریش آہستہ آہستہ ادما کی زندگی اور اس کی ساری امنگوں سے دور ہو کر اپنے آپ کو کھوتا چلا گیا۔ تب ادما کو محسوس ہوا کہ وہ اک دم اکیلی رہ گئی ہے۔ کچھ دنوں تک تو اس نے ہریش کے لوٹنے کا انتظار کیا۔ مگر ہریش اب اپنی بلندی پر پہنچ چکا تھا جہاں سے اسے ادما کا وجود اس کی نگاہوں میں ایک نقطے کے برابر رہ گیا تھا۔ دنیا کو ہریش کی زیادہ ضرورت تھی اور ادما کو ایک آرام پہنچانے والے گھر کے علاوہ

کیا چاہیئے تھے؟۔

ہرلیش کا سارا دن اور راتوں کے خواب تک اس کے اپنے نہ رہے تھے۔ بڑا گداز تھا اس کا دل، وہ ہر انسان کی قیمت کو جانتا تھا اس کو جینے کا صحیح انداز سکھانا چاہتا تھا۔ ہرلیش اور اوما کے درمیان آسمان کی بلندیاں اور زمین کی ساری وسعتیں حائل ہو چکی تھیں۔ جہاں ساری انسانیت کو ہرلیش کے خلوص اور خدمت کی ضرورت تھی۔ وہاں ایک فرد پر ———— جو ایک آرام دہ گھر میں رہنے والی اس کی بیوی تھی ہرلیش کو اسکی طرف توجہ دینے کا احساس بھی بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ آسائش کی زندگی میں تشنگی کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔

اور اسی لیے اوما ہرلیش کی ٹھنڈی آنکھوں میں اپنے لیے کسی جذبے کا اظہار نہ پا کر تڑپ سی جاتی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ راکھ کے اس ڈھیر میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بنا کر رکھ دے۔

دونوں ایک دوسرے سے ملتے، باتیں کرتے حیات کی باریکیوں اور آرزوؤں کی تشنگی اور تکمیل پر بھی جی کھول کر گفتگو کرتے۔ کبھی کبھی اُسے یقین ہو جاتا کہ جیسے ہرلیش نے اس کی پیاسی روح کے کرب کو پہچان لیا ہے۔ مگر پھر جب دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے تو اُن کے ذہنوں پر ایک اجنبیت اور دوری کا تکلیف دہ اثر باقی رہ جاتا تھا اور یہی اذیت رساں ماحول اوما کو حد سے زیادہ مضطرب بنا دیتا تھا۔ کیا یہی چند چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں اور چند اُلجھے سلجھے گذارے ہوئے لمحے اس کی زندگی میں کہکشاں والے راستے بن سکتے تھے!؟ مگر ایک دھندلکے کے سوا اس کی نگاہوں کے سامنے اور کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔

ہرلیش جب اوما سے بہت دور دور رہنے لگا تو اُس نے گھر کے ننھے ننھے بچوں کے پیار میں اپنے لیے ایک پناہ ڈھونڈلی تھی۔ اس نے بڑے صبر کے ساتھ ہرلیش کو ساری دنیا کے حوالے کر دیا تھا۔ اور خود اپنے گرد معصوم بچوں کے پیار کا ایک جال بننے لگی تھی۔ وہ ان معصوم تمناؤں کو بڑی لگن سے پورا کرنے کا اہتمام کرتی، ان کے کھیلوں میں شریک ہوتی، بڑی چاہ سے گڑیوں کا بیاہ رچاتی۔ اوما ان بچوں کی محبت میں اتنی غرق ہو کر رہ گئی تھی کہ اس کو اپنی زندگی کی کسی تشنگی کا کوئی احساس بھی باقی نہ رہا تھا۔ مگر بچے اوما کے کبھی اپنے نہ بن سکے۔ وہ ان بچوں کو بڑی حسرت اور حرص کی نگاہوں سے اپنی ماؤں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی۔ اور پھر وہ اپنے اکیلے کمرے میں دیر تک روتی رہتی ۔ اور پھر اس کو یاد آتا کہ کبھی کسی بچے نے اوما کے کلیجے سے لگ کر اسکو پیار نہیں کیا تھا، اس کے انتظار میں بے چین نہیں ہوا تھا۔ اوما کو کتنی تمنا تھی کہ کوئی اپنی نازک اور کومل باہوں کو اس کے گلے میں ڈال کر روٹھے ہوئے انداز میں کہتا کہ تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟ مگر یہ ٹھنکتی ہوئی اس میں ڈوبی ہوئی آواز اس کو کبھی سُنائی نہ دی تھی۔

اس کے دل نے کتنے چرکے سہے تھے۔ وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ مایوس، بے سہارا، بیزار، چڑچڑی سی، اس کو اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا تھا اور اب اس کا جی ساری دنیا سے اُچاٹ ہو کر مرنے کی تمنا کرنے لگا تھا۔ مگر اب کتے کے اس چھوٹے سے پلے کو پا کر اوما کو ایک ہلکی سی تسکین مل گئی تھی۔ یہ کوں کوں کرتا ہوا بچہ صرف اس کا اپنا تھا وہ جتنی دیر تک چاہتی اس سے کھیل سکتی تھی۔ اس کو اپنے قریب رکھ سکتی تھی۔ اوما کے اس پیار میں کوئی دنیا اور کسی بچے کی ماں کا پیار کبھی حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس ننھے سے بچے کا سارا پیار صرف اوما کے لیے تھا۔ اُس تھکی ہاری ہوئی اوما کے لیے جس کی اپنی محبت اور چاہت کو کبھی کوئی سہارا نہ ملا تھا۔ اور جو اپنے دل کی پیاس مٹانے کے لیے اب تک گرم ریتوں پر سراب ہی کی طرف دوڑتی رہی تھی مگر قسمت نے اس کے تلووں میں چھالوں کی ٹیس کے سوا کبھی کچھ نہ دیا تھا ــ اور اب وہی درد اور وہی ٹیس اس کی زندگی کا ناسور بن کر رہ گئی تھی

کالے ریشم کے گچھے جیسا بچہ، اچھلتا کودتا اب دھیرے دھیرے کچھ بڑا سا ہوتا جا رہا تھا۔ اوما اس کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتی بڑے پیار سے چمکار کر سہلاتی پھر اس کو بڑی نزاکت سے روئیں دار تولیے میں لپیٹ کر اپنی گود میں اٹھا لیتی۔ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے اس کے بالوں پر برش چلاتی ـــ بڑے لاڈ سے پکارتی ـ "یوجی میرے

اپنے پوپی شے۔ پھر وہ نہلائے دھلائے پوپی کو اس کے گدے پر لٹا کر تھپکتی ہوئی دھیرے دھیرے گنگناتی — "ہوں — ہوں۔ ہوں ہوں — سو جا۔"

"میرے پوپی سو جا — راج دلارے سو جا" ننھا پوپی سارے گھر میں اچکتا پھرتا تھا، اوما جہاں کہیں بھی ہوتی پوپی کو اسکے بغیر قرار نہ آتا تھا۔ وہ اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ کر سو جاتا۔ کبھی سر اٹھا کر دیکھتا، اس کے پیر کی انگلیوں سے کھیلتا اور پھر کبھی کسی شریر بچے کی طرح اس کا آنچل پکڑ کر کھینچتا رہتا تھا۔ اس گھڑی اوما کا جی چاہتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کئے اور حقیقت سے نگاہیں چرائے ان لطیف احساسات و جذبات کو ہمیشہ کے لیے اپنی روح میں سمٹ لے۔ اپنے دل میں بھر لے!

اوما نے اس کے گلے میں بڑے لاڈ سے گھنگھروؤں والا پٹہ ڈال دیا تھا اور جب پوپی کے ہر قدم پر گھنگھروؤں کا نغمہ گونجتا تو اوما کو یا سریلی آواز بڑی اچھی لگتی تھی۔ اب اس کو ایسا لگتا تھا۔ جیسے اس کی تنہائیاں دور ہو گئی ہوں۔ اس کے قدموں میں سوئے ہوئے پوپی کی گرم لمس کا احساس محفوظ ہو چکا تھا اور اس کے کانوں میں گھنگھروؤں کی بجتی ہوئی آواز کا سرور چھا گیا تھا۔

پوپی اوما کا کھلونا تھا — پوپی کے کھیل کا عجیب سا انداز تھا۔ کبھی پیار کرتے کرتے وہ انجان بن کر اس پر بھونکنے لگتا تھا۔ کبھی اس کو کاٹنے کے لیے دوڑا دوڑا کر دھکا دیتا۔ پھر جیسے اسکو اوما پر رحم آجاتا اور وہ اپنا ننھا سا سر اٹھائے اپنی معصوم آنکھوں سے اس کو تکنے لگتا اور اس گھڑی اوما پوپی کی ان خاموش آنکھوں کی مکمل بے بسی کے اظہار سے لرز اٹھتی تھی۔ پھر وہ سوچتی کہ پوپی کی آنکھوں میں یہ دنیا بھر کا درد کہاں سے بھر آیا ہے؟ کہیں یہ اوما کے اپنے غموں کا عکس تو نہیں جو پوپی کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔

پوپی جب بھی اوما کی گود میں بیٹھ جاتا۔ اس کو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کے اندر سوئی ہوئی ممتا اچانک جاگ پڑتی ہے اسکو اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ اس کی گود سے پھیلتی اور پوپی کے جسم کی گرمی اور نرمی کو پا کر پھر مٹ جاتی ہے۔ اوما کا جی اداس ہو جاتا۔ اس

پر ایک شرمندگی سی چھا جاتی تھی۔ اس کو اپنی ذلت کا شدید احساس ہوتا۔ اس کی زندگی میں صرف ایک پوپی کا وجود ہی تو اس کا اپنا تھا۔ اور پوپی — کتے کا صرف ایک چھوٹا سا بچہ۔ اور وہ اس حقیقت پر تلملا کر رہ جاتی۔ اس کے من کے اندھیرے میں روشنی کا کوئی چراغ کبھی جلا ہی نہ تھا۔

مگر۔ ان سب باتوں کے باوجود پوپی اس کو پیارا کرتا تھا، اور وہ پوپی سے زیادہ دیر تک جدا بھی نہ رہ سکتی تھی۔ اوما کو اس بات کی خوشی تھی کہ کسی کو اب اس کی تلاش رہتی تھی اور پوپی اسکو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتا، اور اوما کو پا لینے کی مسرت میں جیسے وہ جھوم جھوم اٹھتا تھا۔

ایک شام کو مہمانوں کے پاس پوپی نے اوما کے آنچل کا کونا بہت کھینچا۔ نہ جانے وہ کیا چاہ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے پیروں سے لپٹتا رہا اور کچھ دیر میں اوما کی ساڑی کے کناروں پر سو گیا۔

جب وہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے اٹھی تو پوپی مشکل سے جاگا۔ اس نے ایک بار اوما کو سر اٹھا کر دیکھا اور چلا گیا۔ جاتے ہوئے دیر تک اس کے گھنگھرو بجتے ہوئے سنائی دیتے رہے۔ چھن چھن چھن۔ یہ آواز اوما کو بڑی پیاری لگتی تھی، سرور میں ڈوبی ہوئی اس کے تخیل میں بجتے ہوئے گھنگھروؤں کے ساتھ ننھے ننھے خوبصورت سے پاؤں بھی جھلک جھلک پڑتے تھے۔

رات کو اوما نے جب پوپی کو کھانا کھلا کر سلانے کو پکارا تو پوپی کے گھنگھروؤں کی آواز کہیں سنائی نہ دی۔ اوما کی پکارتی ہوئی آواز میں خوف کی تھرتھراہٹ ابھرنے لگی تھی۔ "پوپی"۔ پوپی تم کہاں ہو کہیں سے دوڑتا ہوا نہ آیا۔ اوما کا جی بے چین ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک پڑے۔ وہ بے اختیار پکار اٹھی!

"پوپی — تم بھی مجھے چھوڑ نہ دینا۔" گھنٹوں کی تلاش پر بھی پوپی کا کہیں کوئی نشان نہ ملا۔ شاید کوئی اس کو چرا کے لے گیا تھا۔

اوما پوپی کو پکارتی پکارتی جب تھک کر مایوس ہو گئی تو وہ دوڑتی ہوئی [illegible] کے [illegible] میں گھس گئی اور اسکے [illegible] پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے [illegible] — پوپی بھی مجھے چھوڑ کر

کملیشور
ترجمہ: سرجیت

دور دور تک پھیلا ہوا سمندر، سفید لکیر کی طرح پانی کی سطح کا چھور اور اس کے بعد یکدم اوپر اٹھتا ہوا آسمان۔ میلوں دور جب سطح کا کنارے پر کسی کشتی کا بادبان پرچم کی طرح ابھرتا تھا تو میں محتاط ہو جاتا تھا۔ شاید انھیں کی کشتی ہو۔ مگر یہ وقت ان کے آنے کا نہیں ہوتا۔ سمندر میں بارہ میل بعد انٹرنیشنل سرحد آب شروع ہو جاتی ہے۔ اسمگلر بیوپاری اسی سرحد میں رہتے ہیں۔ پھر وقت بے وقت وہ آتے ہیں۔ روز اطلاعات آتی ہیں کہ کروڑوں روپیوں کا سونا اور سامان بمبئی کے ساحلوں پر اسمگلنگ کے ذریعہ اترتا ہے۔ اور وہ لوگ بحرِ عرب سے بادبانی کشتیوں یا موٹر بوٹوں میں آتے ہیں.... کب اور کہاں سے آتے ہیں، وہ کیسے ہوتے ہیں، یہ دیکھنے کے لئے میرا دل بے چین تھا۔

اسی خواہش کے تحت میں ویران کناروں پر جاتا تھا۔ کافی رات گئے تک ان کی راہ دیکھتا تھا کہ شاید کہیں وہ دلیر ملاح دکھائی پڑ جائیں مگر وہ کبھی نظر نہیں آئے۔ وہ کئی بار آئے اور ساحلوں پر لاکھوں کا مال اتار کے چلے گئے۔ لیکن مجھے فریب ہی دیتے رہے۔

کبھی کبھی آسمان میں چاند ہوتا تھا۔ میں کنارے پر کھڑا کھڑا دیکھا کرتا تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا سمندر ہر وقت میری ہی طرح مضطرب۔ رہ رہ کر بپھرتا ہوا۔ بے مطلق ہو کر اٹھتا ہوا۔ جب جب سمندر تھا اور میں تھا، تب تب مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔ آسمان میں چاند ہوا تو اور بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ تب جہاں میں کھڑا ہوتا تھا، وہاں سے کچھ ہی فاصلہ دور سمندر پر ایک چمکتی ہوئی سڑک شروع ہوتی تھی اور انتہائی دور تک جاتی تھی اس سڑک کو میں کبھی پکڑ نہ پایا۔ کچھ دور پانی میں جاتا تو وہ چمکیلی سڑک پھر کچھ دور سے شروع ہو جاتی۔ دوری بہت ذرا سی تھی مگر وہ سرکتی جاتی تھی۔

اپنے اس بچپنے پر مجھے ترس آتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سمندر ہے اور چاندنی کی یہ جھلملاتی سڑک نہ کہیں شروع ہوتی ہے، نہ کہیں ختم ہوتی ہے۔ مگر دل جب اداس ہوتا ہے اور شہر کی سڑکیں کاٹتی ہیں تب ایسی ہی کبھی پانی کی سڑک پر قدم بڑھانے کا جنون سوار ہو جاتا ہے۔

یہ اداسی اور بدحواسی بھی اب بہت بے کار سی معلوم ہونے لگی ہے۔ راحت ملتی ہی نہیں۔ میں کس طرح کی راحت چاہتا ہوں۔ .... یہ بتا سکنا بھی کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی ہلکی تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔ کبھی کسی کے ساتھ کے لئے جی گھبراتا ہے۔ کبھی کسی دوست کے لئے دل پریشان ہوتا ہے۔ کبھی ماں کا خیال آتا ہے۔ عزت، آرام اور دلی اطمینان کے لئے کبھی کبھی سٹپٹا جاتا ہوں۔ کبھی میں سنیئر ہو جاتا ہوں.... کبھی ہار کے بوٹلگر بن جانے کے تصور میں راحت ملتی ہے۔ پناہ کی یہ کوشش کہیں لے نہیں جاتی۔ ساری دنیا کی طرح میں بھی کیوں سمجھوتہ نہیں کر لیتا اور سکھ نہیں پا لیتا؟

بس چاروں طرف دھواں سا ہوتا ہے۔ بھیڑ اور شور و غل ہوتا ہے۔ کچھ خواہشیں یاد آتی ہیں، کچھ تمنائیں ستاتی رہتی ہیں — خواہشیں بے شکل ہوتی ہیں، تمنائیں بے لفظ۔ کوئی مسلسل تمنا نہیں ہوتی۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی اور پگھلتی رہتی ہے۔

ایسے میں میں انھیں یاد کرتا ہوں جن سے کچھ بات کی جا سکتی

ہے۔ کوئی پاس تو نہیں ہوتا مگر میں تنہائی میں ان سے بہ آسانی باتیں کر لیتا ہوں۔
کیونکہ ان کے جواب مجھے تقریباً معلوم ہیں۔ ماں کو ہی لو اگر اس سے کہوں کہ میں بہت
پریشان ہوں، اور بمبئی میں بھی مجھے جینے کی راہ نہیں مل رہی ہے تو وہ قریب
قریب یہی کہے گی: تب یہیں رہو۔۔۔۔۔ وہاں کیوں اپنی زندگی برباد
کر رہے ہو: اگر میں کہوں کہ میں بہت آرام سے ہوں اور مجھے بمبئی
میں آگے کی راہ دکھائی دے رہی ہے تو وہ کہے گی جیسا تم ٹھیک سمجھو۔
میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے:

تنہائی میں میں یہ باتیں آسانی سے کر لیتا ہوں۔۔۔۔ ایسے میں
میرا گھوٹ یا اندرونی پریشانی بگڑتی نہیں جاتی۔ میں خود کو کافی محفوظ
محسوس کرتا ہوں۔ میں اپنی تاریکی جمع کر لیتا ہوں اور اپنی تاریکی ہی میں
مجھے وہ جھلملاتی ہوئی پانی کی سڑک نظر آتی ہے جس پر لا انتہا تک جانے کو
دل مچلتا ہے مگر ایسا ہوتا نہیں۔

تب یہ عمارتیں اچانک اور اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ آسمان
میں بے گھروں کی روشنی مجھے دہشت زدہ کرتی ہے۔ اس کی جھلملاتی
دودھیا روشنی، ریشمی بدن، چھوٹے چھوٹے پتھروں پر بہتے جھرنے پانی کی
طرح گوشت پوست کھل کھلاہٹ، بے پروائی کا عالم اور ان کے چہروں کا
اطمینان مجھے کچوکے لگاتا ہے۔ ان کے دکھ کہاں؟

اب میں ماں سے اپنے دکھ کہتا ہوں، نہ ماں مجھے اپنے دکھ
بتاتی ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے دکھ درد سے کتراتے ہیں۔
وہ اپنے خط میں سب کو یہی بتاتی ہے کہ میں بڑے آرام سے ہوں اور
مجھے اگر تلے کی ضرورت پڑ بھی گئی تو کہتا ہوں: ماں ہے۔ وہ بڑے آرام
سے گزر کر لیتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہم اس کربناک سمجھوتے پر پہنچ گئے ہیں۔ یہی
بس ہمارا یہ باہمی سمجھوتہ ہمیں راحت دیتا ہے۔

ماں کے خط اب کبھی آتے ہیں۔ ان کی تحریر پھر تبدیل ہو گئی تھی۔
اس لئے نہیں کہ ماں بوڑھی ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ جگن ناتھ پوسٹ مین
مر گیا تھا۔ وہی ماں کے خط قلم بند کرتا تھا۔ جب کبھی دو چار سال میں
کبھی ماں کے خط کی تحریر بدلتی تھی، میں سمجھ جاتا تھا کہ بستی محلے کا کوئی
اور چل بسا۔ اکثر یہی ہوتا تھا۔ میری ماں ایسی عورت ہے جو اپنے تعلقات
اور اعتقاد جلد جلد نہیں بدلتی۔ ایک ہی شخص اس کے خط تب تک لکھا کرتا

تھا جب تک کہ مر نہیں جاتا تھا یا بستی چھوڑ کے کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔
پانچ برس قبل جب ایک بار خط کی تحریر بدلی تھی تو مجھے دھچکا سا لگا
تھا۔ تب وہ اپنے خط ماسٹر جی سے لکھوایا کرتی تھیں۔ ماسٹر جی کے تحریر
کردہ خطوں میں دوہری خوشی ہوتی تھی۔ اس میں جب سب کچھ لکھا
جا چکتا تھا، تو بچی ہوئی جگہ میں ماں کی طرف سے ہی ایک جملہ اور لکھوایا
ہوا (یا لکھا ہوا) ہوتا تھا: "ماں جی کہہ رہی ہیں کہ اب تم لوٹ آؤ،
جیسے بھی ہو چلے آؤ"۔ اس لائن کی تحریر مختلف ہوتی تھی۔ تب یہ جملہ
دوہرا مطلب دینے لگتا تھا۔ یہ لائن پونیتا لکھتی تھی۔ ماسٹر جی کی لڑکی
پونیتا کے لئے کوئی خاص لگاؤ میرے دل میں اس وقت نہیں تھا۔
جب شہر چھوڑ کے آیا تھا، کوئی خاص بات تھی بھی نہیں۔ مگر آہستہ
آہستہ ماں کے خطوط میں ایک لائن لکھتے لکھتے اس نے عجیب سی جگہ
میرے آس پاس بنا لی تھی۔ شروع شروع میں اس کا یہ لکھنا مجھے
ذرا رومانٹک معلوم ہونے لگا تھا جس کا میری سچائیوں سے کوئی تعلق
نہیں تھا۔ اگر یہ مان لوں کہ کوئی لڑکی مجھے چاہتی ہے تو کیا فرق پڑتا
ہے؟ یہ چاہنا میری زندگی میں کہاں فٹ بیٹھتا ہے؟ کہاں ہے وہ وقت
کہ میں کسی کو چاہ سکوں؟ دادر یا دہی۔ ٹی پلیٹ فارم کی بھیڑ میں
یا بسوں میں چڑھتے اترتے یا پیدل دوڑتے بھاگتے۔۔۔۔ کہاں میں
اس کو چاہ سکوں گا؟ اترتی شام کو کہ اس میدان کے اندھیرے
میں اس گھاس پر لے کر بیٹھ جاؤں تو زیادہ سے زیادہ لپٹا لوں گا۔
چوم لوں گا۔۔۔۔ لیکن رات ہوتے اسکو کہاں لے جاؤں گا؟ کہاں
سلاؤں گا؟ یہ سب وقت کی بات ہے۔ اپنے حالات سے اوپر کی
بات۔

تمام لوگ ایک دوسرے کو چاہتے آتے ہیں وہ کہ اس میدان
کے اندھیرے میں گھاس پر یا بریچ کینڈی کی چٹان کی اوٹ میں
یا بیا کشمی کے پیچھے سمندر کی بوچھار میں بھیگتے پتھروں کی گردمیں یا
کملا نہرو پارک کے اندھیرے میں پڑی بنچوں پر بیٹھ کر کچھ تھوڑا بہت
پیار کر لیتے ہیں۔ پھر لڑکی اپنے گھر چلی جاتی ہے آدمی اپنے گھر۔
کس کے پاس ہے گھر؟ کس کام آتا ہے گھر؟۔
میں [illegible] رکھا تھا۔ ماں کے خط

تھے۔ ہر بار دھند مجھے واپس بلاتی تھی۔ اس کی یہ عادت سی پڑ گئی تھی۔

اس روز سمندر پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ مانسون چاروں طرف تھا۔ مالا بار پہاڑی اس دھند میں کھو گئی تھی۔ صرف میرے چاروں طرف بچاس پچاس گز تک صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ ایک منٹ بعد سمندر بھی ایک چھوٹا سا ٹکڑا جیسا رہ گیا تھا۔ باقی اوجھل ہو گیا تھا۔ ایک نہایت چھوٹی سی دھند کی دنیا میں گھر گیا تھا۔ تب میں تھا۔ دھند تھی اور سمندر کے ٹکڑے پر دو آبی پرندے ــــــــــــ وہ آبی پرندے برف کی طرح چمک رہے تھے۔

تب میں نے حساب لگایا تھا۔ یہ شہر مجھے اور کتنے دنوں کے لئے پناہ دے سکتا ہے؟ تین دن پورے اور ایک صبح ــــــ اس سے زیادہ نہیں!

جب کبھی ایسا موقع آتا تھا۔ میں دوڑ بھاگ شروع کر دیتا تھا۔ لوگوں سے ملتا تھا۔ بڑی بڑی اور چھوٹی معمولی کمپنیوں کے چکر کاٹتا تھا۔ لوگ مجھے کافی تپاک سے ملتے تھے۔ انھوں نے کبھی میری بے عزتی نہیں کی۔ ہمیشہ میری دقتوں اور ضروریات کو بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنا اور جواب میں اپنی دقتیں بیان کی ہیں۔ ایسے میں ہمیشہ ان کی دقتیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی تھیں اور میں لمحہ بھر کے لئے بے حس رہ جاتا تھا۔..... لگتا تھا کہ ان کی دقتوں کے سامنے میرا دن کا فاقہ کر لینا بھی مناسب اور معمولی ہے۔ وہ بڑی بڑی باتوں کو سلجھا رہے ہوتے تھے۔ تب میں خود کو بہت حقیر بات کے لئے کھڑا پاتا تھا۔ اور دل ہی دل میں مرجھا جاتا تھا۔ اور تب اپنے میں اوب اوب کر معلوم نہیں کیوں ایسا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نام تک بھول جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو چہرے بھی۔ شاید میرے ناکام ہوتے جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ بیکار ہونے کی وجہ سے میں زیادہ تر اچھے اور معزز آدمیوں ہی سے ملنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ جب ان کی دقتیں مجھے چھوٹا اور خود غرض ثابت کر دیتی تھیں تو نامعلوم ان کے چہرے کیوں میری یاد سے اتر جاتے تھے۔ پھر کبھی وہ ملتے میں انھیں پہچاننے اور یاد کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ لیکن کچھ ہوتا

نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ بھلے لوگ مجھے پہچان لیتے تھے اور مسکرا کے میرا حال بھی پوچھ لیتے تھے۔ میں اُن سے باتیں بھی کر لیتا تھا۔ مگر یہ یاد نہیں کر پاتا تھا کہ وہ یا وہ آدمی کون تھا' یا کیا تھے۔

سچ پوچھئے تو میرے پاس کچھ یادوں اور ایک لہولہان زندگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ماں ہے اور ماں کے اڑوسی۔ پڑوسی۔..... پتا ہے اور وہ لوگ ہیں جو ماں کے لئے خط لکھ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑی ناکام۔ محدود اور بیکار سی زندگی ہے۔ یوں سب چلتا ہے۔ چلتا جاتا ہے۔ مگر یہ کیوں اور کس لئے ہے۔ اس کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔

میں کہاں سے کام شروع کروں؟ یا جدّوجہد شروع کروں؟ کہاں سے؟ جہاں بتایئے۔ جا کر کام کرنے لگوں۔ سڑک کھودنے لگوں یا اسپتال میں جا کر مریضوں کی خون آلود پٹیاں صاف کرنے لگوں،.... یا گودی پر جا کر پیٹیاں اٹھانے لگوں، یا لڑکیوں کے لئے آدمی تلاش کر کے لانے لگوں یا شراب پہونچانے لگوں ..... یا نریمان پوائنٹ پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر چیخ پڑوں۔ کیا کروں؟

یوگی راؤ کی طرح پانی پر چل کر دکھانے کا پاکھنڈ رچوں؟ یا اس جوان سادھو کی طرح کسی سیٹھ کی بیوی کو لے کر بھاگ جاؤں.... یا چنے کھاتے ہوئے اس بے زبان سے مزدور نما آدمی کے طمانچہ مار دوں؟

زیادہ خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جو تن کا دھندا کر کے کچھ کر لیتی ہیں۔ دکھ سکھ کی اچھی بری زندگی جی لیتی ہیں۔ میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ نہ دکھ نہ سکھ۔ صرف ایک جمود۔ کوئی کام آٹھ دس دن سے زیادہ نہیں چلتا۔ پھر وہی۔ وہی جمود..... تب آنکھیں صرف کچھ دور تک دیکھ پاتی ہیں۔ اس کے آگے کچھ دِکھتی ہی نہیں۔ یہ کیوں بندھ جاتی ہیں؟ ایک بہت چھوٹی سی دوری تک آنکھیں دیکھ پاتی ہیں۔ وہ بھی صاف صاف نہیں۔ صرف دھبّے دھبّے ہوتے ہیں۔ دھندلی سفیدی یا بدرنگ دھبّے۔ ان کے علاوہ اور کچھ نگاہ میں سماتا ہی نہیں۔ نظر جیسے سدھ جاتی ہے۔ سب چیزوں پر باریک سا پردہ پڑ جاتا ہے اور جب آنکھوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے تب دماغ بھی تھوڑا سا کچھ سوچ کر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر چلتا ہی نہیں۔ کان کچھ آوازیں سن سن کر ویران ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ سنتے ہی نہیں تب بڑی مشکل سے مجھے اپنے پر قابو پانا پڑتا ہے۔ بے حد کوشش کے بعد سمندر کی وسعت

آنکھوں کو نظر آتی ہے۔ دماغ بیمار ہوتا ہے۔ کانوں میں شور ہونے لگتا ہے۔ یہی
سب مل کر چلتا رہتا ہے۔

اس دن دکان پر گیا تو ماں کا ایک اور خط آیا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت
کچھ خراب تھی اور اس نے لکھوایا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ ایک بار مجھے دیکھ
لینا چاہتی ہے۔ یہ کوئی بہت بڑی تمنا نہیں تھی۔ اور اتنی بے ہودہ بھی نہیں
کہ مجھے ہنسی آجاتی۔ مگر ان دنوں میں اسی چکر میں مبتلا تھا۔ دلیر ملاحوں
والے چکر میں!

روز روز سنائی پڑتا تھا کہ کروڑوں روپے کا سونا اور
سامان بمبئی کے ساحلوں پر اسمگلنگ سے اترتا ہے۔ وہ لوگ بحر عرب سے
آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیوں میں۔ اور تاریکی میں آکر کھاڑیوں
پر سامان اتار جاتے ہیں۔ کبھی بسئی کی کھاڑی میں۔ کبھی سونٹ لال
پارک کی عالی شان عمارتوں کے قریب پتھریلے کنارے پر۔ کبھی گودی
کے قریبی جزیروں میں۔ کبھی مارو کے ساحل۔ یا جوہو پائی کے ر دیکھیری
غاروں کے قریب قلعہ کی شبیہ میں کبھی گھوڑ بندر کی کھاڑی میں۔

میں نے ان کروڑ پتی اسمگلر بیوپاریوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اربوں
روپے کا مال چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں روزانہ آتا تھا۔ میں ان دیدہ دلیر
عرب ملاحوں کو خاص طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں ان دنوں
اسی ٹوہ میں رہتا تھا کہ رات برات کہیں کسی کنارے یا کھاڑی میں
یہ لوگ نظر آجائیں۔ ان سے نہ بھی مل سکوں تو بادبانی اڑاتی کشتیوں ہی
کو دیکھ سکوں۔ اس منصوبے سے مجبور ہو کر میں ماں کے پاس نہیں جا پایا
تھا۔ پھر جانے کے لئے پیسہ نہیں رہ گیا تھا اور اس کے بعد سترہ دن کا کام
مل گیا تھا۔ ایک عورت کو شام کو چھ کے گرانٹ روڈ سے قلابہ پہنچانا ہوتا
تھا اور گیارہ کے اسکو واپس لانا ہوتا تھا۔ لوٹتے وقت وہ بہت خوش
اور مست ہوتی تھی ہلکے نشے میں۔

چھ بجے سے گیارہ بجے تک میں ایک طرح سے بیکار رہتا تھا۔
گاڑی میں ہوتا تو وی۔ ٹی سے کلیان اور کلیان سے وی۔ ٹی کے کئی چکر لگا کر
سویا جاسکتا تھا۔ جیتی سڑکوں پر سو سکنا ممکن نہیں تھا۔ کف پریڈ کی بنچوں
پر جگہ نہیں ملتی تھی۔ بغیر لڑکی کے ان پر بیٹھنا جرم سا لگتا تھا۔

گیارہ بجے چل کر میں اس لڑکی کو قریب پونے بارہ بجے اس کے گھر
چھوڑ دیتا تھا اور گرانٹ روڈ سے گاڑی پکڑ کے سنٹرل پہنچ جاتا تھا۔

سترہ دن بعد پھر وہی حالت ہوگئی اور اب یہ مشکل لگ رہا تھا کہ
کوئی بھی قاعدے کا کام مل پائے گا۔ ایک دفعہ غلط کام سے لینے کے
بعد میں ہمیشہ اس سے بھی زیادہ غلط کام لینے کو مجبور ہوتا رہا ہوں۔
میری سیڑھی نیچے اترتی تھی۔......

آخر ماں کا ایک اور خط آیا اور میں ہار کے گھر چل دیا۔ راستہ
بھر میں یہی سوچتا جا رہا تھا کہ بحر عرب میں وہ دیدہ دلیر ملاح کیسے
کروڑوں کا مال لاد کر چلے آتے ہوں گے۔ اتھاہ سمندر میں چھوٹی چھوٹی
کشتیاں لئے۔

مسلسل خطرہ کی جانب بڑھتے ہوئے۔ فارس کی کھاڑی اور لال سمندر
سے بمبئی تک۔ ایک بار عرب کا ایک ملاح پکڑا گیا تھا۔ میں بڑی عقیدت
لے کر اسکو دیکھنے گیا تھا۔ وہ پولیس کی حراست میں تھا۔ سلاخوں والے دروازے
کے اندر آرام سے بیٹھا ہوا۔ اسکو دیکھکر یہ یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ اسمگلر بیوپاری
ہو سکتا ہے۔ یوں معلوم ہوا تھا کہ اس آدمی کو خواہ مخواہ پکڑ لیا گیا ہے لیکن
سمندر پر اور آدمی کہاں ہیں کہ سمندری پولیس غلط آدمی کو پکڑ سکے۔

راستہ بھر وہ عرب ملاح میرے حواس پر طاری رہا۔ پھر اس کا
خیال کچھ ایسا اترا کہ میں نے اس کی شکل بہت یاد کرنے کی کوشش کی۔۔۔
وہ شکل آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی صورت اختیار نہ کر سکی۔ معلوم نہیں۔ یہ
گڈمڈ میرے ساتھ ہی ہوتی ہے یا کسی دوسرے کے ساتھ بھی کبھی ہوتی ہے۔
شکلیں۔ باتیں۔ واقعات۔ ذہن سے اتر جاتے ہیں۔

میں پانچ سال بعد ماں کے پاس لوٹ رہا تھا۔ مجھے یہ پوری امید
تھی کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہوگا ہو بھی یہی کہ حادثے جیسے
لوگوں کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ اچانک بڑا: ہم سمندر کی نچلی
سطح کی طرح ٹھہرے ہوئے بس کانپتے رہتے ہیں۔ لہروں کا شور ہو کر،
اور ان کا ٹوٹنا۔ بکھرنا اوپر ہی ہوتا ہے۔

پانچ سال میں کچھ خاص تبدیلی کی امید مجھے نہیں تھی۔ ماں بڑی
اور کتنی بوڑھی ہو سکتی تھی؟ وہ تب بھی [illegible] بڑھاپے

کے بعد بڑھاپا کیا ہو سکتا تھا؟ تمھارے بعد اور کیا اچھا ہوگا!

مگر جب میں پہنچا تو ایک ہی بات بڑی افسوس ناک تھی۔ ماں واقعی بیمار تھی۔ اس کو لقوہ ہو چکا تھا۔ جسم کا دایاں حصہ سُن ہو چکا تھا۔ میں نے جب اس کی آنکھوں کو دیکھا تو ان میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یہ مجھے عجیب لگا۔ مگر تھرتھراتے بائیں ہاتھ سے میرے منھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولی تھی: "میں تجھے دیکھ بھی نہیں سکتی"

ماں اندھی ہو گئی تھی۔ پانچ سال قبل جاتے وقت اس نے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ اگر ذرا پتہ ہوتا تو تین یا چار مہینے پہلے ہی لوٹ آتا۔ جب اس کی آنکھوں میں تھوڑی روشنی باقی تھی۔ وہ مجھے دیکھ لیتی۔ معلوم نہیں اس کی یہ خواہش کیوں تھی؟

تھوڑی سی تسکین اس بات سے ضرور ملی تھی کہ میں اگر ان پڑولوں بھی لوٹ آتا جب میں ان ملاحوں کو دیکھ سکنے کے لئے رکا ہوا تھا۔ تب بھی بات کچھ نہیں بنتی۔ ماں نے بتایا کہ وہ ڈیڑھ ماہ قبل ہی اندھی ہو گئی تھی۔

ان ملاحوں کو دیکھنے کے لئے میں نے اپنے دل کے فیصلے کے مطابق وقت گنوایا تھا۔ مجھے لگا کہ جو وقت اپنے فیصلے کے ماتحت گزارا جاتا ہے۔ وہی بھاری پڑ جاتا ہے۔ صرف وہی وقت پچھتاوے کا سبب بن جاتا ہے۔

ماں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کا جسم دھیرے دھیرے جان چھوڑ رہا تھا۔ زبان بند ہونے سے قبل اس نے مجھے کچھ ضروری باتیں بتائی تھیں کہ کچھ روپیہ ویدجی کا دینا تھا۔ وہ تیس روپے ماہوار کے حساب سے خرچ نہیں چلا پائی تھی۔ ماں کو یہ تیس روپے ایک دان کھاتے سے ملتے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ عمر کے ساتھ اس کی ضروریات اور بھوک کم ہو رہی تھی مگر معلوم نہیں بازار کو کیا ہو رہا تھا کہ خرچہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اس کو کیا سمجھاتا۔ اگر سمجھاتا بھی تو کیا ہوتا؟ اس کی زبان بند ہو چکی تھی۔ وہ متفق نہ ہوتی تو بھی کیا کہہ سکتی تھی؟ میں اس کے دکھ کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے کافی بھاگ دوڑ کی۔ اسپتال کے ڈاکٹر کو لایا۔ ویدجی کو لایا۔ سب نے دیکھا۔ لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ زبان بند ہونے کے بعد ماں پتھر کی مورتی سی لگنے لگی تھی۔ داہنے کندھے اور آدھے منھ تک وہ سُن پڑ چکی تھی۔ اب اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے صرف اس کے پاس رہنا تھا اور [illegible] بیٹھے رہنا تھا۔

دس گیارہ دن بعد میں گھبرانے لگا۔ ماں بائیں ہاتھ کے پوروں پر دھیرے دھیرے کچھ گنتی رہتی تھی۔ جیسے کچھ حساب لگا رہی ہو۔ دسویں یا گیارھویں دن جب اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں جکڑ گئیں تو میں گھبرا گیا۔

اب اس کے جسم میں سب کچھ بے حس و حرکت ہو گیا تھا لیکن وہ زندہ تھی۔ اسپتال کے ڈاکٹر اور محلّے کے وید جی نے بڑی انسانیت سے سب کچھ مجھے سمجھایا۔ میں نے ان سے آکر دیکھنے کے لئے کہا تو ان دونوں نے یہی جواب دیا: "اب دیکھ کر کیا کریں گے؟ تین چار دن پہلے ہی تو دیکھا تھا۔ آپ انتظار ہی کر سکتے ہیں۔"

تب میں بہت تنہا ہو گیا لیکن ان دونوں کی بات بھی صحیح تھی۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔ ماں کو مرتا ہوا دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ میں کچھ بھی سوچ نہیں پا رہا تھا۔ کس کو بلاؤں اور کس سے کیا کہوں؟ میں بے طرح پریشان ہو گیا تھا۔ جوں جوں وہ مر رہی تھی توں توں میرے پیروں تلے کی زمین پاتال میں غرق ہوتی جا رہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ اب میں کٹی پتنگ کی طرح منڈلاتا رہوں گا۔ ایک خلا میرے چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس سے میں بات کر پاتا۔ جو میری خوفناک تنہائی کو سمجھ پاتا۔

ایک لمحہ کے لئے ایسے میں وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوتا ہے۔ میں کسی سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اپنی بربادی اور تاریک مستقبل کی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا؟ اس دوغلے معاشی نظام میں میں کب تک بھٹکتا رہوں گا اور ان لوگوں کی دقتیں کب ختم ہوں گی۔ جن کے سامنے میں خودغرض لگنے لگتا تھا۔ میں کسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان کے پاس کب جاؤں..... تاکہ وہ مجھے کچھ بتا سکیں۔ ایسے خلا میں جب مجھے کچھ نہیں سوجھا اور اپنے خوف سے گھبرانے لگا تو میں نے وزیرمال مرارجی دیسائی کو ایک خط لکھا کہ وہ آکر میری ماں کی حالت دیکھ جائیں اور مجھے کچھ بتا جائیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔

خط پاتے ہی وہ فوراً آ گئے۔ انھوں نے ماں کو دیکھا اور چپ چاپ دکھی سے میرے قریب بیٹھ گئے۔ ماں تو کچھ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ صرف دھیرے دھیرے مرتی جا رہی تھی۔ پتھر ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں ماں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تھک کر بیکار ہو گیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے! مہاراج کفن کی طرح سفید کھادی پہنے ہوئے تھے۔ فرشتے سے لگ رہے تھے۔ ان کے آ جانے سے مجھے قدرے راحت مل گئی تھی۔ لیکن اندیشہ اور احساسِ تنہائی مزید بڑھ گیا تھا۔

کچھ لمحوں بعد میں نے بات شروع کی "آپ نے ان کمپنیوں کی جائداد کی تحقیقات کروائی"

وہ تھوڑا سا مسکرا دیئے۔ ان کی مسکراہٹ مجھے بہت عجیب لگی۔ ماں کے چہرے پر میں درد کی لہریں اور مسائل دیکھتے دیکھتے یہ بھول ہی گیا تھا کہ چہرے پر ایسی بے باک مسکراہٹ بھی کبھی آتی ہے۔ مجھے تھوڑا اطمینان ہوا۔ میں پھر آہستہ سے بولا: "میرا اب کیا ہوگا؟ ان لوگوں کی دقتیں اگر آپ جلد ختم کر دیں تو شاید مجھے مستقبل کے لئے کوئی راستہ مل جائے۔"

وہ کچھ بولے نہیں، مسکراتے رہے۔ ایک لمحہ بعد بات شروع کی "آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آپ کی رائے جاننا چاہتا تھا کہ اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ میں بہت معمولی آدمی ہوں اور کچھ ایسا چاہتا ہوں کہ قاعدے سے جی سکوں۔"

"آپ کے پاس صرف ترکیبیں ہیں"۔ وہ کچھ چڑ گئے تھے۔

وہ بھی مجھے غلط سمجھ گئے تھے۔ شکایت کہاں تھی۔ اگر کچھ تھا تو اندھیرا۔ تنہائی۔ ٹھہراؤ۔ اور اذیت۔ میں انہیں نہیں سمجھا پایا۔

کچھ دیر بعد وہ اکتا کر بولے "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ سب میں اکیلے نہیں اٹھا پاؤں گا۔ آپ رک سکیں تو بہت اچھا ہو۔ میں بہت ڈرا ہوا ہوں۔"

بولے "میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے جانا ہوگا۔"

میں نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک دم اٹھ کر چلے ہی گئے۔ وہ رکتے بھی تو کب تک۔ میں بہت پچھتا رہا ہوں۔ خواہ مخواہ انہیں بلایا۔ کچھ بات بھی نہیں ہوئی۔ کوئی راستہ کھلنے کے آثار بھی نظر نہیں آئے۔ وہ بھی بڑی دقتوں میں تھے۔ انہیں بلا کے ان کا وقت برباد کرنا مجھ پر بھاری پڑ رہا تھا۔ ان کے پاس میرے لئے کوئی دلاسا، تسکین نہیں تھی۔ ان کے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ ماں کو شکایت تھی مہاراج سے، حق اس کو یہ پتہ نہیں تھا کہ بازار کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اس کا خریدار نہیں مل رہا تھا۔ یہ بات میں ان سے نہیں کہہ پایا۔ میں اپنے مسئلوں سے گھبرایا ہوا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ماں کا بدن اور بھی پتھرا گیا۔ مجھے کہیں جانا ہی تھا میں کہاں جا سکتا تھا؟ دھیرے دھیرے کئی دنوں تک اس کا بدن پتھراتا رہا۔ کبھی اس کے ہونٹوں کا کونا بے جان تتلی کے پر کی طرح کانپتا تھا۔ وہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کی اندھی آنکھوں کے کناروں پر سوکھی سوکھی بوندوں کا رس سا ابھر آیا تھا۔ وہ بھی کائی کی طرح وہیں جم گیا۔

آنکھ کے نیچے کی ایک چھوٹی سی تتلی کبھی کانپتی تھی۔ وہ بھی پرسکون ہو چکی تھی۔

قریب چودہ دن کے بعد ماں کا جسم پوری طرح پتھرا گیا۔ جس نے دیکھا۔ اسی نے تعریف کی۔ بالکل پتھر کی مورتی بن گئی ہے۔ کتنا سکون ہے چہرے پر۔ اتنی پرسکون موت کہاں ملتی ہے کسی کو۔

مجھے یہ اچھا لگا کہ لوگ ماں کو خوش نصیب عورت سمجھ رہے تھے۔ وہ تھی بھی بہت سیدھی۔ دنیا سے بے طرح وابستہ۔ اس کا اچھا اور بھلا سوچنے والی۔ اپنی تکلیفوں کو نہ سمجھ پانے والی ایک معمولی عورت۔

لوگوں نے رائے دی کہ اتنی اچھی مورتی کو برباد نہ کیا جائے۔ اسے ہم کہیں لگا دیں۔ مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ایک چوراہے پر لمبا سا اونچا چبوترا بنا کر ماں کو وہاں بٹھا دیا گیا۔

تب سے وہ مورتی میرے شہر کے چوراہے پر لگی ہوئی ہے اور اندر وقت بے وقت کوندتی ہے۔ پتھر کی وہ مورتی بالکل جیتی جاگتی سی لگتی ہے۔ نہ ڈولتی ہے۔ برسوں بعد جب کبھی میں شہر لوٹتا ہوں اور اس کے پاس دو لمحے کے لئے رکتا ہوں تو اس کی آنکھ کے نیچے وہ چھوٹی سی تتلی کانپتی ہے اور لگتا ہے کہ مجھے دیکھنے کے لئے وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کھول نہیں پاتی۔

——

محمد علی زیدی

عِشق پر زُور نہیں

کردار

اختر اقبال۔ عمر ٦٥ سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اور گردن ہلنے کی وجہ سے آواز میں کپکپاہٹ ہے۔ سفید بال۔ پوپلا منہ

مہتاب۔ تقریباً ٦٥۔۔٧٠ برس کی بڑھیا۔ پوپلا منہ، سفید بال، گردن ہلتی ہے۔ آواز میں کپکپاہٹ

زمانہ۔ حال۔ مقام۔ ہندوستان کا کوئی پارک یا باغ۔ وقت شام کا

منظر۔ پارک میں ایک تنہا مقام پر گھاس پر ایک بنچ پڑی ہے۔ اس پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی ہے ایک بوڑھا شخص ٹہلتا ہوا ادھر آنکلتا ہے۔

تر:۔ محترمہ! کیا میں اس بنچ پر بیٹھ سکتا ہوں؟

اب۔ اے۔ میں نے کیا اس بنچ کا ٹھیکہ لیا ہے یا کسی کو منع کیا ہے۔ بیٹھنا ہو تو بیٹھ جاؤ جسے دیکھو اونٹ کا سا منہ اٹھائے ادھر ہی چلا آتا ہے۔ جیسے سارے باغ میں بس یہ ایک ہی بنچ رہ گئی ہے۔

تر:۔ آپ ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ میں تو صرف تھوڑی دیر بیٹھوں گا۔ اوہو۔ بیٹھنا اٹھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

ب:۔ اے میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ ناراض ہو میری بلا۔ موئے ان مردوں سے کبھی نجات نہیں ملتی یہاں ایک طرف کونے میں آکر بیٹھی تھی تو یہاں بھی نازل ہو گئے۔

ر:۔ جی۔ کیا مجھ سے کچھ ارشاد فرمایا۔

ب:۔ اے میں کیوں ارشاد فرمانے لگی۔ ارشاد فرمائیں تمہارے ہوتے سوتے۔ آئے بڑے ارشاد والے۔ شرم نہیں آتی تمہیں!

ر:۔ اوہو۔ کتنی سریلی آواز ہے معلوم ہوتا ہے کسی جھرنے کے گرنے سے ترنم پیدا ہو رہا ہے۔ کتنی میٹھی آواز ہے یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے کانوں میں خالص شہد انڈیل دیا ہو۔

مہتاب: تم کنارے پر کیوں بیٹھے ہو۔ اچھی طرح بیٹھ جاؤ۔ گیلی گھاس پر ننگے پیر مت رکھو زکام ہو جائے گا۔ پیر اٹھا کر بیٹھ جاؤ۔

اختر: ہائے یہاں اپنا ہوش ہی کسے ہے۔ جب سے تمھیں دیکھا ہے دیوانہ ہو گیا ہوں۔

مہتاب: اے بس مردوئے ہوش کی دوا لے۔ شرم تو نہیں آتی غیر عورتوں کو چھیڑتے ہوئے۔

اختر: مردوا نہیں اختر کہیئے۔ اس نیازمند کا نام اختر اقبال ہے۔

مہتاب: اے ہوگا میری جوتی سے۔ مگر مجھے چھیڑنے سے کیا مطلب ہے آپ کا۔

اختر: دیکھئے محترمہ! حقیقت بیان کرنے کو چھیڑنا نہیں کہتے اور پھر تم غیر کہاں ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

مہتاب: اے بس رہنے دو اپنی شاعری کو۔ آئے بڑے مجنوں کے باپ۔

اختر: قسم لے لو اگر مجنوں سے میرا کچھ بھی رشتہ ہو تو۔ میری تو ابھی

شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ باپ بننا تو دوسری بات ہے۔
معلوم نہیں یہ ارمان کب پورا ہوگا۔؟

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
ڈرتا ہوں کہیں یہ حسرت دل کی دل میں رہ جائے

مہتاب: چلو ہٹو بھی۔ بوڑھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے۔ ایک کنواری لڑکی سے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔

اختر: اچھا آپ بھی میری طرح کنواری ہیں۔ آپ کو بھی مناسب بر نہیں مل سکا۔

مہتاب: اے ذرا تمہیں نہیں ملتا ہوگا۔ میرے لیے لڑکوں کی کیا کمی ہے۔ میری تو ایک درجن شادیاں ہو چکی ہوتیں۔ تو میں نے ہی ہر مرتبہ انکار کر دیا۔ کیسے کیسے آدمیوں کے پیغام آئے۔ کلکٹر کا بیٹا، انسپکٹر کا، تحصیلدار کا، تھانیدار کا، مگر میں نے ہی کسی ایک کے لیے بھی اقرار نہیں کیا۔ میں نے کہہ دیا کہ شادی کروں گی تو برابر والے کے ساتھ کروں گی۔

اختر: تو کیا میرے لیے لڑکیوں کی کمی تھی۔ بیچاری زینت، فرحت، عصمت، شوکت اور نزاکت آج تک اس انتظار میں کنواری بیٹھی ہیں کہ شادی کریں تو اسی لڑکے سے کریں، میری بھی ایک درجن سے کم شادیاں نہیں ہوتیں۔ تین سے میں نے انکار کر دیا۔ تین نے مجھ سے انکار کر دیا۔ اور چھ کے والدین راضی نہیں ہوئے۔ اب بھی بہت سی مرتی ہیں مجھ پر۔

مہتاب: مرتی ہوں گی ضرور مرتی ہوں گی ناراض کیوں ہوتے ہو۔

اختر: آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی۔ دنیا کا کوئی بھی مرد اسے برداشت کر سکتا ہے؟

مہتاب: بھئی تو میں سوچ رہی تھی کہ اس لڑکے کی تو کئی شادیاں ہو جانی چاہیئے تھیں۔ اس کے چہرے پر یہ کنوارا پن کیوں برس رہا ہے۔ اب وجہ معلوم ہوگئی۔

اختر: کیا غضب کی مردم شناس نظر پائی ہے۔ قربان جایئے آپ کی نگاہ کے۔ سچ کہتا ہوں آپ نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ (کھانسی کا دورہ پڑتا ہے) کھوں کھوں کھوں ــ کھوں کھوں کھوں۔

مہتاب: کیا ہوا؟ کیا بات ہوئی! طبیعت تو ٹھیک ہے۔

اختر: ک۔ کہ۔ کچھ یہ۔ نہیں۔ ب۔ بس سانس۔ کچھ کچھ پھول گیا تھا۔

مہتاب: تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ زیادہ بولنے سے تمہارا سانس پھول جاتا ہے۔ لو میں نیچے گھاس پر بیٹھ جاتی ہوں۔ تم آرام سے اس بنچ پر لیٹ جاؤ۔

اختر: آہ۔

مہتاب: ٹانگیں پھیلا لو۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔

اختر: نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ وہ تو دو تین دن تک برابر گرم غذائیں کھانے کو ملیں اس لیے یہ شکایت پیدا ہوگئی اور سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ میں نے اب تک شادی نہیں کی۔

مہتاب: آپ کو گرم چیزیں نہیں کھانی چاہیئے۔ آپ کا مزاج گرم معلوم ہوتا ہے۔ مجھے بھی ڈاکٹروں نے گرم چیزوں کا استعمال کرنے سے منع کر دیا ہے (ہنستے ہوئے) آپ نے تو مجھے ڈرا دیا میں بھی خدانخواستہ آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا ہے۔

اختر: اجی! دشمنوں کو تو ڈالو جہنم میں۔ آپ یہاں بیٹھئے۔ یہاں میرے پہلو میں..... یہاں۔ آپ کو میری قسم ہے

مہتاب: اے ذرا میں کسی کے پہلو میں کیوں بیٹھنے لگی۔ کیا سمجھا ہے مجھے۔ میں شریف زادی ہوں۔ سمجھے۔ کوئی بازارو عورت نہیں ہوں۔ کان کھول کر سن لو۔

اختر: او ہو! آپ ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ آپ بنچ کے سرے پر بیٹھی ہیں۔ اچھی طرح بیٹھ جایئے۔ اچھا اپنا پیارا پیارا نام تو بتایئے۔

مہتاب: تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ میں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو اپنا نام نہیں بتاتی۔

اختر: جانے دو مت بتاؤ۔ میں فی الحال تمہارا نام شیرا تن رکھے دیتا ہوں۔

مہتاب: معاذ اللہ! میرا نام شبراتن، نوفاتن، امیراتن، کیوں ہونے لگا۔ تمہاری گھروالیوں کے ایسے نام ہوں۔ میرا نام تو مہتاب بانو ہے۔ مہتاب بانو۔ اللہ بخشے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ میری بیٹی جس گھر میں جائے گی چاندنی کی طرح اجالا کر دیگی۔ اس کا جیسا نام ہے ویسے ہی گن بھی ہیں۔

اختر: اے پروردگار تیرا شکر ہے۔ تو نے ابھی تک انھیں کسی گھر کی رونق نہیں بنایا۔

مہتاب: کیا مطلب؟

اختر: مطلب صاف ہے اگر تم کسی گھر کی رونق بن جاتیں تو میں آج تمہاری چاندنی سے اپنی آنکھوں کو کیسے روشن کرتا۔ ہائے یہ گھنی گھنی زلفیں جیسے چاندنی بھٹک رہی ہو۔ یہ بھولا بھالا معصوم چہرہ۔ یہ رس بھری آنکھیں۔ یہ موتی جیسے دانت ۔۔۔۔ خیر چھوڑیے ان کو۔ یہ ننھے ننھے بچوں کا۔ سامنہ۔ ہائے کیا کہا ہے کسی شاعر نے

بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے
کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمہارا

مہتاب: آپ پھر بہت بول رہے ہیں۔ کہیں دوبارہ دورہ نہ پڑ جائے۔

اختر: ہاں ہاں! مجھ پر دورہ پڑا ہوا ہے۔ یہ دورہ ہی تو ہے۔ آہ تم کیا جانو یہ عشق کا دورہ ہے، ہے ہے کیا کہا ہے ظالم نے

ہر طرف بکھری ہوئی ہے چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں انکی جوانی ساتھ ہے

مہتاب: تم کیسے اچھے ہو نوجوان!

اختر: تم بھی کتنی اچھی ہو کم سن حسینہ! کاش ایک وسیع سبزہ زار ہو۔ ہلکی ہلکی پھوار ہو۔ جوبن پر نکھار ہو۔ ہر چیز پر بہار ہو۔ اور وہاں میں اور تم ہرنوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوں چوکڑیاں بھرتے پھریں۔ کوئی فکر ہو نہ غم۔

مہتاب: آہ۔ آہ۔ ارے میں مری! ارے میں مری!

اختر: (گھبرا کر) کیا ہوا مہتاب! کیا بات ہوئی۔ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا۔ میری اچھی مہتاب! مجھ سے بولو۔

مہتاب: (کراہ کر) ارے میری کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ ارے میں مری۔ ارے میری کمر درد سے ٹوٹی جا رہی ہے۔

اختر: تم اس بنچ پر لیٹ جاؤ۔ میں نیچے بیٹھ جاؤں گا۔

مہتاب: ارے میں مری! مجھے سیدھا لٹا دو اختر۔ آہستہ۔ آہ

اختر: افسوس یہ آسمان دو دلوں کو ملنے نہیں دیتا۔

مہتاب: آسمان مت کہو اختر! بیماری کہو۔ یہ کم بخت دو چاہنے والوں کو ایک جگہ نہیں دیکھ سکتی۔

اختر: آہ۔ آہ۔ آہ۔

مہتاب: زیادہ زور سے آہ نہ کرو۔ تمہارا سانس پھول جائے گا۔

اختر: مہتاب تم زیادہ زور سے نہ بولو تمہاری کمر میں درد زیادہ زور سے ہو جائے گا۔

مہتاب: اب میں بالکل اچھی ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو۔ کہیں تمہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔ مجھے تمہاری طرف سے بہت ڈر لگا رہتا ہے۔

اختر: تم ڈرو نہیں مہتاب! تمہیں میری جان کی قسم ہے۔ کہیں تم پر فالج کا اثر نہ ہو جائے۔ کیونکہ ڈر سے بلڈ پریشر بڑھتا ہے اور بلڈ پریشر بڑھنے سے فالج گرتا ہے تمہارا دل ویسے ہی کمزور ہے۔

مہتاب: (بگڑ کر) مجھ پر فالج کا اثر کیوں ہونے لگا۔ واہ بڑے آئے فالج گرانے والے۔

اختر: اور مجھے کیوں نمونیہ ہونے لگا۔ کیا مجھ رکھا ہے تم نے مجھ کو۔ کیا میں ربڑ کا گڈا ہوں؟

مہتاب: میں نے تو تمہارے بھلے کے لیے ہی کہا تھا۔ مجھے کیا؟ میری بلا سے ڈبل نمونیہ ہو جائے میری جوتی کی نوک سے۔

اختر: اور تمہیں بھی ڈبل فالج ہو میری بلا سے۔ زبان ہے کہ قینچی! دو پلے منہ پر تو یہ حال ہے معلوم نہیں دانت ہوتے تو کیا

غضب ڈھاتیں۔

مہتاب: اے ہے۔ ذرا اپنے دانتوں کی بھی تو خبر لو۔ ایسا لگتا ہے جیسے ریگستان میں کہیں کہیں جھاڑیاں اُگ آئی ہوں۔ اور چہرہ دیکھو جیسے ٹوتھ پیسٹ کا خالی ٹیوب یا کسی بڈھے کے نکاح کا سوکھا چھوارا۔

اختر: زبان بند کرو گی یا نہیں۔ (خود سے) آہ میں نے تو سوچا تھا کہ آج میرا اکیلا پن ختم ہو جائے گا۔ میری زندگی کی ناؤ کو پتوار مل گئی ہے۔ میرے ارمانوں کے پورا ہونے کا دن آ گیا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا....

مہتاب: سچ کہو۔ تم کیا سوچ رہے تھے؟

اختر: کیا خاک سوچ رہا تھا۔ تم نے سب چوپٹ کر دیا۔ عشق کا بھوت ہی بھگا دیا۔ میں تو ایک بہت اچھی بات کہنے والا تھا۔

مہتاب: اتنا غصہ نہیں کرتے۔ لو مان جاؤ۔ غصہ تھوک دو تمہیں میری جان کی قسم ہے مان جاؤ۔ اگر نہ مانو تو میرا مرا منہ دیکھو۔ لو مان جاؤ۔ میرے اچھے اختر!

اختر: مہتاب یہ نہ کہو۔ خدا کے لیے یہ لفظ اپنے منہ سے نہ نکالو۔ میں تم پر جان دینے کو حاضر ہوں۔ تم مرنے کا نام نہ لو۔

مہتاب: اے ہے! جان دیں تمہارے دشمن۔ تم کیوں جان دو۔ میرے اچھے اختر! اب بتا دو وہ کیا بات تھی جو تم کہتے کہتے رک گئے تھے۔ بتا بھی دو۔

اختر: جاؤ! نہیں بتاتے۔

مہتاب: بتا بھی دو۔ اختر! اتنا نہ ستاؤ ہم روٹھ جائیں گے۔

اختر: میرے دل کی ملکہ! تم ایسا نہ کرنا۔

مہتاب: آہ۔ کتنے میٹھے الفاظ ہیں۔ ایک دفعہ پھر کہو اختر! مجھے نشہ سا ہونے لگا ہے۔ کتنا شہد گھلا ہے ان الفاظ میں! کتنی شیرینی ہے ان میں۔

اختر: مگر تمہارے ہونٹوں سے کم۔

مہتاب: پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ تم یونہی بیٹھے رہو اور میں تمہیں یونہی دیکھتی رہوں۔ یا پھر تمہیں اپنے دل میں چھپا لوں۔

اختر: میں تو یہ بھی نہیں کر سکتا مہتاب! کیونکہ میرا دل تو پہلے ہی تمہارے پاس چلا گیا ہے۔

مہتاب: تمہاری زبان میں جادو ہے اختر! نہ جانے تم نے مجھ پر کیا کر دیا ہے؟

اختر: اب مجھ سے تمہاری جدائی برداشت نہ ہو سکے گی مہتاب! میں تم سے جدا ہو کر ایک پل نہیں رہ سکتا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا نہیں رہ سکتا تم میری زندگی ہو۔

مہتاب: میرا بھی یہی حال ہے اختر! تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ نہ جانے تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا۔ میں بھی تمہارے بغیر ایک سکنڈ زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرے اچھے اختر!

اختر: دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ مہتاب! تم مجھ سے شادی۔ شا.. ۔شادی کر لو۔ بولو۔ انکار نہ کرنا۔ ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں۔

مہتاب: کیا کہا۔ شا۔ شا۔ شادی۔ شادی.. شادی۔ شا دی ی (بیہوش ہو جاتی ہے)

اختر: مہتاب! مہتاب! یہ تمہیں کیا ہو گیا مہتاب۔ (روتے ہوئے) کچھ تو بولو۔ مہتاب! بولو مہتاب! تم نے تو وصل سے پہلے ہی فراق دیدیا۔ مہتاب کچھ تو بولو۔ آہ۔ اب تم اس دنیا میں نہیں رہی۔ ہائے! کہاں ہو کر مقدر بگڑا ہے میری مہتاب۔ میری۔ مہ۔ تا۔ ب ب (بیہوش ہو جاتا ہے)

ایک "نئے گھر کی نئی نظم" کا سنجل کنگ کی جدت سے بہت اہمیت نہیں ہے۔ یہ
درست ہے اصحاب کا کھوں سے ان کے اس خیال کی تصدیق کی جا سکتی
ہے کہ بہت سے الفاظ اور معنی ہم آہنگ ہیں نئے شاعروں میں یہ بات
بہت کم نصیب ہے۔ بیشتر نئے شاعروں کی شاعری ترسیل کی ناکامی
کا المیہ ہے۔ بلراج کومل کی نئی (۹) شاعری ترسیل کی کامیابی کا المیہ ہے۔

خشت پر ایک نظم "، "منتشر نظم" اور "کالے چاولوں" اور
"خشت پر دیوار" ایسی نظمیں ہیں جو بلراج کومل کو ایک کامیاب شاعر
ثابت کرتی ہیں۔ تینوں نظموں کی ایک عجیب فضا ہے: ماورائی، کھوئی
کھوئی اپنے دل سے ابھر کر اپنے ماحول میں ڈوبتی ہوئی ______
یہ الفاظ سے شاعر نے پیدا نہیں کی بلکہ قاری اسے خود معنی سے پیدا کرتا
ہے یہی شاعر کی کامیابی ہے کہ ______

______ وہ قاری کو روحانی اور جذباتی طور سے
اپنے تجربے میں ... کر لیتا ہے اور اس کے باوجود اسے
اپنے قطعی انفرادی نتیجے سے، جس پر وہ ہر نظم کے آخر میں پہنچتا ہے،
بہ آسانی مرعوب و متاثر کرنے کی کوشش نہ کر کے اسے خود سوچنے اور
تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

ان نظموں کے علاوہ "عالم کل"، "میں شاعر ہیں فنکار"،
"اس روز"، "شہر کے طعنے"، "سرکس کا گھوڑا"، "دوسرا لمحہ"،
"فنڈرک سٹوڈ"، "دسمبر کی آواز" اور "گذشتہ لوگ" بھی اچھی نظمیں
ہیں ان میں بلراج کومل کا تجربہ اور مشاہدہ ذاتی اور شخصی ہے مانگے
کا نہیں ___ نظم "جنم" میں فقروں اور لفظوں کی تکرار سے ایک لطف
پیدا ہونے کے بجائے تقریباً معنی میں بھی ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

"دلکشی اس بزم کی" اور "اگلے برس کی بات" عنوان والی نظموں
میں وہ اپنے تمام ظاہری شعری وادبی commitments
کو معطل ترک کر کے متوسط طبقے کے ایک سیدھے سادے، بیوی بچوں
سے محبت کرنے والے گرہست کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ لیکن نظم
"ریڈیو" میں "منے" کے منہ سے جو بات ریڈیو کے بارے میں کہلوائی
ہے: (جیسے ... گیتوں میں گم رہتا ہے) وہ بالکل ان ڈائیلاگ
جیسی ہے جو ... فلموں میں ... اولاد "طلاق"

میں ڈیزی ایرانی (جب وہ بچی تھی) کے منہ سے کہلوائے جاتے تھے
خوشی کی بات ہے کہ مجموعۂ کلام کی ۶۹ نظموں میں سے صرف پانچ
نظموں کا عنوان "ایک نظم" ہے اور مزے کی بات ہے کہ یہ پانچوں
نظمیں ۱۹۶۳ء اور اس کے بعد کی کہی ہوئی ہیں۔ غالباً ۱۹۶۳ء سے
اچھی خاصی نظموں کا عنوان "ایک نظم" رکھنے کا فیشن چلا ہے۔ ایک
نظم کا عنوان "سائے کے ناخن" بھی ہے

بحیثیت مجموعی "سفر مدام سفر" پچھلے پانچ سال میں شائع ہونے
والے شعری مجموعوں میں سے ہے جو شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے
جا سکتے ہیں۔ اس مجموعۂ کلام سے ایک اہم جدید شاعر کے ان رجحانات
اور رویوں کا پتہ چلتا ہے جنہیں وہ اپنے مخصوص عقاید و مرعوبات
اور ذہنی تحفظات کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے اور ہماری خوش
قسمتی ہے کہ ناکام رہتا ہے۔ (ذکا صدیقی)

خشتِ دیوار، شاعر زبیر رضوی، قیمت چار روپے

ناشر: مکتبۂ صبا حیدرآباد۔

زبیر رضوی کا تازہ مجموعۂ کلام "خشتِ دیوار" کئی بار پڑھنے
کے لئے اٹھایا، لیکن گرد پوش پر ان کی بھرپور تصویر نے باہر ہی روک
لیا۔ اس وجیہہ، دلکش اور دلفریب مسکراتی ہوئی شخصیت نے میرے
اور ان کی شاعری کے درمیان ہمیشہ فصل قائم رکھا اور وصل کا لطف
نہ کرنے دیا، بہرحال میری ایک کوشش کامیاب ہو ہی گئی اور تصویر
کی نگاہیں بچا کر میں مجموعے میں داخل ہو ہی گیا، چند نظمیں ہی پڑھیں
تھیں کہ محسوس ہونے لگا کہ اس شاعری سے پوری طرح لطف اندوز
ہونے میں پھر کچھ حائل ہو رہا ہے سوچا تو معلوم ہوا کہ زبیر رضوی
کی جو امیج ان کے مشاعروں اور دوستانہ محفلوں میں زہرہ جبینوں
کی فرمائشوں نے بنائی تھی "خشت دیوار" میں نہیں ملتی،
زبیر، نرم، چکیلے، ملائم، مزیدار لہجے کے لئے مشہور ہو گئے
تھے ان کا نام گیتوں اور گیت نما نظموں اور عاشقانہ جذباتیت کا
اسم بنا دیا گیا تھا ان کے مصرعوں میں ان کے تبسم اور ترنم کو ڈھونڈھا
اور پایا جاتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اہر اہر ندیا گری کے بیشتر مصرعے
مسکراتے، گنگناتے ہوئے ملتے تھے۔ پازیب کی جھنکار، نغمے کی

تمنّاؤں کو کنکھیوں سے تکتی ہوئی حسّی تھی ان کے قریب پہنچ جانے نے جانے تھے
جہاں گلیوں کی طرح خوش باش اور خوش پوش نظر آتے رہے کہیں اُن
سے بھی رخصت لینی پڑی اور اس طرح خشتِ دیوار سے دوچار ہونا زبیر
پہ آسان ہوگیا۔

اُردو تنقید کی اصطلاحوں میں ایک اصطلاح ہے "نرگسیت"
نفسیات سے اُچک کر ادبیات کے تجزیے کے سلسلے میں استعمال
کیا جانے لگا۔ زبیر کی شاعری میں اس کی تشخیص بھی ناقدوں نے کی
ہے۔ ایک ناقد "ابر اور دنیا گری" میں اور دوسرے ناقد زبیر کی ابتدائی
شاعری میں نرگسیت کی ادا پاتے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ
شاعر جس کی "نظریں پھیلی ہوئی وسعتوں کے دامن میں" ہزاروں پھول
توڑنا چاہتی ہوں کے کھلتے ہیں" نرگسیت کا مریض کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟
وہ تو کہتا ہے "تیرے غم کی دھوپ میں جل کر کملائے مرجھائے ہم" نرگسیت
کا شکار تو اپنے غم میں جلا اور پگھلا کرتا ہے!

نرگسیت بقول ہیولاک ایلس کے اپنے جسم کی چاہت اور
خود پسندیدگی ہے، اور بقول فرائڈ اپنی انا سے محبت کرنے کا نام ہے،
عہدِ طفلی کی ابتدا میں نرگسیت کو نارمل سمجھا جاتا ہے لیکن عنفوانِ شباب
اور سنِ بلوغ میں اس کا تسلسل اس بات کا خدشہ پیدا کرتا ہے کہ مریض
اپنی اُنسیت کو خود سے ہٹا کر کسی اور شخص پر منتقل کرنے کے قابل نہیں ہے۔
خود شناسی اور اثباتِ ذات کی حد تک تو انانیت مناسب اور نارمل رویہ
ہے لیکن خود پرستی اور اپنی انا کے زنداں میں قید ہو جانا ابنارمل
(Abnormal) رویہ ہے جس کی تلاش اور شناخت زبیر کی شاعری
میں مجھ سے نہیں ہو سکی۔

نرگسیت کی نشاندہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مریض کی خود غرضی
انتہائی اور شدید ہو اور وہ اپنے آپ کے آگے کچھ نہ دیکھ سکے، خود
جنسیت اور نرگسیت لازم و ملزوم ہیں۔ اپنے آپ کو سنوارنے اور
سجنے کے لیے آئینہ دیکھنا اور اپنا حسن نہار کر خوش ہونا نرگسیت نہیں ہے۔
جب تک کہ اس عمل سے خود فریفتگی نہ پیدا ہو۔ زبیر کی شاعری میں
خود گرفتگی، خود فریفتگی، خود جنسی اور ہم جنسی خواہشات کہیں نہیں
ملتیں، اور نہ ہی وہ اپنی ذات کو مرکزِ حیات و کائنات مانتے ہیں،
ان کے یہاں تو سپردگی، رفاقت اور باہمی اشتراک [illegible]
جو نرگسیت کے مریضوں میں اگر ممکن ہے تو ہم جنسیت کی شکل [illegible]

"خشتِ دیوار" کی شاعری میں [illegible]
ہے۔ یہاں زبیر اس موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے [illegible]
دور تک نظر آتا ہے جسے وہ طے کر آئے ہیں اور جو دور افق پر
گرد و غبار میں گم ہو رہا ہے لیکن وہ راستہ جسے انھیں طے کرنا ہے دھند
کی آڑ میں چھپا ہوا ہے۔ "خشتِ دیوار" رومانی آدرشوں کے ٹوٹنے
اور بکھرنے کا منظر پیش کرتی ہے۔ رومانی ذوق و شوق کی شکست
کی یہ آواز "خشتِ دیوار" سے بار بار ٹکرا رہی ہے۔ جذباتیت
کے آئینوں کا زنگار چھوٹ رہا ہے اور وہ یادداشتی شیشے بچھ
چلے ہیں جن سے چھن چھن کر حقیقت کا ادراک اور گرد احساس تک
پہنچ رہا ہے۔ زبیر نے اس مجموعے میں اپنے شعری اظہار کی عمارت کا پلستر
ادھیڑ ڈالا ہے اور وہ دیواروں پر اینٹ کو نشانہ کرکے اس کا جائزہ
لے رہے ہیں۔ بعض دیواروں کو ڈھا رہے ہیں، بعض پر نئے دریچے وا
نکال رہے ہیں۔

"خشتِ دیوار" کی شاعری سیدھے سچے اور بے لاگ تجربے
کی شاعری ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے نظارہ باز کو پیش کرتی ہے جو
ہزار بار بازارِ جہاں سے نہ صرف گزرا ہے بلکہ اس کا خریدار بھی رہا ہے
اور وہ جگہ جگہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بار بار ششدر ہو جاتا
ہے اور اپنے آپ سے کہتا ہے:

ابھی تم ان کو شہر کے جاننے میں کتنی دیر لگاؤ گے۔

"خوباں کے ثنا خوانوں کی آخری پشت" کا یہ شاعر عنفوانِ
شباب کی لذت کوشیوں، شاہد بازیوں اور لڑکپن کی رنگینیوں
سے اوب چکا ہے۔ عشق کے میدان میں بھی اب وہ "عاشقانہ اظہار"
سے "عشقیہ احساس" کی طرف آ رہا ہے۔ اب وہ کہہ رہا ہے:
یارِ عشق نے [illegible] جنوں بدل ڈالا [illegible]
اور

سفر لمبا ہے [illegible]
چلو کچھ [illegible] شوق [illegible]

[illegible]

وکیل اختر: ایک خراجِ عقیدت: ایم۔ اے۔ نصیر

وکیل اختر ایک قابل قدر شاعر تھے وہ موت کی سیاہ آندھی میں بھی زندگی کرنا جانتے تھے

عجب خامشی اس کے ہونٹوں پہ تھی
عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا

—

اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے
جس شخص کو روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے

—

ہے کچھ سبب کہ سرِ رہگذر بیٹھا ہوں
سمجھ رہے ہو تو سمجھو شکستہ پا مجھ کو

وکیل اختر اپنے کلام میں زندہ رہیں گے وہ ایک خلاق ذہن کے مالک تھے —— کسی بھی شاعر یا ادیب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اچھا اور سود مند طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی تخلیقات کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ اس کی تمام چیزوں کو یکجا کر دیں —— بنگال میں بہت ساری ادبی اور علمی انجمنیں اور سوسائٹیاں ہیں، ان کو اس سلسلے میں پہل کرنی چاہیے۔ خاص کر انجمن ترقی اردو کو اس طرف خاص توجہ دینی چاہیے، تاکہ وکیل اختر کا کلام ضائع نہ ہونے پائے۔

وکیل اختر ۳۰ مئی ۱۹۳۳ء میں [illegible] ضلع گیا (صوبہ بہار) میں پیدا ہوئے، اسکول کی زندگی میں شاعری شروع کی —— کالج میں جوہر صاحب کی صحبت نے شاعری کو جلا بخشی اور آپ نے پروفیسر عباس علی خاں بیخود کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

زندگی کے الجھے ہوئے تار سلجھنے لگے، امکان کا دائرہ سمٹنے لگا پھر یکایک اس وقت تو تمام تار جھنجھنا اٹھے جب [illegible] معدے کے کینسر کا آپریشن ہوا، اور ڈاکٹروں کے بورڈ نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ دو سال سے زیادہ وہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ مگر اختر صاحب کی پیشانی پر بل بھی نہیں آیا۔ انہوں نے ۱۹۵۳ء میں بی۔ اے۔ بی ٹی کا امتحان پاس کیا، پھر تاریخ اسلام میں، کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۷۰ء ایم۔ اے کیا اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے، جس پر تا زیست فائز رہے اور حیاتِ مختصر کا یہ چراغ ۷ فروری ۱۹۸۲ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ ——

• شامِ اختر

ڈاکٹر اعجاز انصاری

بزمِ شہود کلکتہ نے شامِ اختر منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ اردو کے گرانقدر شاعر وکیل اختر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکے۔ اس موقع پر مشاعرہ کا اہتمام بھی ہوگا جس میں مقامی اور بیرونی شعرا شرکت کریں گے۔ ایک خوبصورت سووینیر بھی شائع کیا جائے گا جس میں وکیل اختر صاحب سے متعلق مضامین شائع کیے جائیں گے۔

گوشۂ پرویز شاہدی کیوں نہیں؟ —— معصوم شرقی

موت کے بعد شاعر اور ادیب کی یاد تازہ کرنی ہی چاہیئے۔ لیکن یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ محتاب بھی اس معاملہ میں غیر جانبدار نہ رہ سکا۔ کوئی ایک کام کرتے وقت تعلقات اور قرابت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھنا چاہیئے۔ آپ کی پالیسی بالکل غیر جانبدارانہ ہونی چاہیئے۔ یہاں میرا مطلب پرویز شاہدی [illegible] مرحوم [illegible] مدیر صاحب سلیمان اریب سے کم رتبہ کے شاعر [illegible] عزت افزائی کے [illegible]

ہیں ... حاصل کی ہیں بھی اس کا مستحق ہوتا ہے لیکن [illegible] [illegible] ہے وہاں قابلِ افسوس ہے ــــ پرویز شاہدی کو نہ صرف [illegible] نقادوں نے نظرانداز کیا بلکہ عصرِ حاضر کے شاعر تھے اور [illegible] انہوں نے بھی ان کو چھوڑ دیا جبکہ بعض شعراء کو خوب خوب اُچھالا گیا ــــ

"گوشۂ ادیب" سلیمان ادیب مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر بھاری ہے ۔ ڈاکٹر وحید اختر اور رام لعل کے مضامین خاص طور سے پسند آئے ۔ دونوں کی تحریر سے ناظرین پر سلیمان ادیب کی زندگی کے نہاں خانے وا ہوتے ہیں ــــ آپ کو افسانوں کی طرف خاص توجہ دینی چاہئے ۔ اکثر غیر معیاری افسانے بھی شائع ہو جاتے ہیں جو "کتاب" جیسے قدرِ اوّل رسالے کے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں ۔

"افسانہ نمبر" آپ کے اعلیٰ معیارِ صحافت اور افسانوی ادب سے متعلق آپ کے ذوقِ سلیم کا پتہ دیتا ہے ۔ حالیہ شمارے میں جاوید نہال کا افسانہ "نیم کا رس" پڑھا ۔ افسانوی دنیا سے تقریباً ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن "نیم کا رس" لے کر پھر وارد ہوئے ہیں ۔ یہ نیک فال ہے "نیم کا رس" جدید ہوتے ہوئے بھی جدید نہیں ہے ۔ اس میں ذہن کی بھول بھلیوں کی عمیق کھائی میں جھکولے کھانا نہیں پڑتا ــــ

● گوشۂ رسل ، گوشۂ ادیب

ظفر غوری

"گوشۂ ادیب" کے فوراً بعد آپ نے "گوشۂ رسل" ترتیب دے کر رسالہ کی وقعت اور عظمت میں اور اضافہ کر دیا ہے ۔ "رسل" پر اتنی کاوش شاید ہی کسی اور اردو رسالے نے کی ہو ، اسکے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی کسی نئے افسانہ نگار کی متعدد تخلیقات کی اشاعت بھی ایک اجتہادی ہے ۔ حصۂ منظومات میں تمام تخلیقات بہتر اور جاندار لگیں ، خاص طور سے ساجدہ زیدی ، بشیر بدر ، زاہدہ زیدی ، اسلم آزاد ، کاظم جاوی وغیرہ نے بہت متاثر کیا ۔ کرشن چندر کا ناول بھی خوب ہے ۔ سائنسی موضوعات کو انہوں نے بڑی [illegible] کے ساتھ اپنے مخصوص شاعرانہ طرزِ بیان میں پیش کیا ہے ۔

● عارف شبلی

سلیمان ادیب کی تصویریں دیکھ کر ان کی یاد کی خوشبو ایک بار پھر دل و جان کو معطر کر گئی ۔ وہ آخری بار کلکتہ ۱۹۷۰ء میں مخدوم کے ساتھ آل انڈیا پوئٹس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے ۔ یہاں کے چند دنوں قیام کے دوران نہ صرف ان سے ملاقاتیں رہیں بلکہ شاعری ، افسانہ ، صحافت اور سیاست مختلف موضوعات پر کھل کر باتیں ہوئیں جن سے انکی وسعتِ نظری اور صحیح تنقیدی شعور کا قائل ہونا پڑا ۔ ڈاکٹر وحید اختر کا مضمون ادیب کی زندگی اور شاعری کے چند نئے گوشوں کی نشاندہی کرتا ہے ۔ انکی نظم میں بھی بڑی اپنائیت اور اثر انگیزی ہے ۔ ان کی فنکاری نے ذاتی کرب کو آفاقی رنگ بخش دیا ہے ۔

● رضوان احمد

"کتاب" بہت اچھا ہو گیا ہے ۔ یقیناً آپ نے مواد و ہیئت دونوں پر پوری توجہ دی ہے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا ہے ۔ پہلے میں کافی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں ۔

گوشۂ ادیب بہت جاندار رہا ۔ کرشن چندر کا یہ ناول بھی دوسرے ناولوں سے منفرد ہے ۔ اسکی اشاعت پر مبارکباد ۔

● ڈاکٹر [illegible] صفدر آہ

سلیمان ادیب کے گوشہ نے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے میں حیدرآباد کے قریب بمبئی میں ہوں لیکن ادیب کی شخصیت اتنی گرد و غبار میں دبی ہوئی تھی کہ ان کے ذات کے حسین خدوخال میں خود آج تک نہیں دیکھ سکا تھا ۔ ادیب پر وحید اختر کا مضمون شخصیت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے ، اس مضمون میں مضمون نگار کے گہرے شعور کے ساتھ موضوع سے انکا بے پناہ خلوص بھی موجود ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ میں صحیح معنوں میں ادیب سے انکی موت کے بعد وحید اختر کی معرفت ہی مل سکا ہوں ۔ رام لعل کا کیا کہنا ۔ وہ تو ہماری زبان کے مانے ہوئے افسانہ نگار ہیں ۔ حیدرآباد (بشمول ادیب) پر انکا رپورتاژ بڑا دلچسپ ہے جس سے ادیب کے کردار کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں ۔

● مناظر عاشق ہرگانوی

برٹرینڈ رسل کی تخلیق "تیسری جنگِ عظیم میں کیا ہوا" کا ترجمہ میں نے کیا تھا لیکن مترجم کی حیثیت میرا نام شائع ہونے سے رہ گیا ہو ۔ براہِ کرم آئندہ شمارہ میں اسکی تصحیح فرمالیں !

سرورق
• صادق
• قیصر سرمت

زر سالانہ
پچیس
روپے

ایڈیٹر پبلشر ★ کتابت ★ طباعت ★ قیمت فی پرچہ ★ حیات خویش ★ سالانہ
ستمبر ★ ★ ★ ایک پیسہ ★ ۱۴ روپے ★ کیمبرج

پہلا صفحہ

شمارہ حاضر ہے۔ ایک عرصے کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی کہ شمارہ وقت پر قارئین کے ہاتھوں میں پہونچ جائے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ آئندہ بھی رسالہ کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو۔

آیئے آج ادبی رسائل کے مستقبل کے امکانات کے بارے میں بات چیت کی جائے۔ اس 'خود کلامی' کو بات چیت کا نام یوں دیا کہ یہاں جو Loud thinking کی جائے گی اسمیں اگلے شمارہ میں خطوط اور ممکن ہے مضامین کے ذریعہ آپ بھی شامل ہو جائیں۔ پھر ان خطوط پر اور خطوط آئیں، ہم دوبارہ اظہارِ خیال کریں اور اس طرح کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔ کچھ موٹے موٹے نتائج نکل آئیں۔

ادبی رسائل کی زبوں حالی کا رونا سارے جرائد روتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ لوگ اس صورتِ حال کے اظہار کو مگرمچھ کے آنسو بہانے کے مترادف سمجھتے ہیں اور ایک طرح سے یہ صحیح بھی ہے۔ آخر کس حکیم نے نسخہ میں لکھا ہے کہ آپ برابر نقصان اٹھایئے اور رسالہ نکالے جایئے۔ نقصان ہو رہا ہے تو ختم کیجئے یہ سلسلہ، لمبی تان کے سویئے۔ آپ کے رسالہ نہ نکالنے سے آسمان تو پھٹ نہیں پڑے گا۔

لیکن اسکو کیا کیجئے کہ کچھ لوگ یہ سب کچھ سنتے ہیں، نقصان اٹھاتے ہیں پھر بھی رسالہ نکالے جاتے ہیں۔ نقصان ۔۔۔ چلئے مدیران جرائد جھوٹ بولتے ہیں ۔۔۔ نام، عزت، شہرت سب اسی کے طفیل تو ہیں ورنہ کیا آپ، کیا آپ کی حقیقت! اور پھر اوپر سے توبہ، کون نقصان اٹھاتا ہے۔ زیادہ نہیں تو ہزار پانچ سو مہینہ کا فائدہ تو ضرور ہوگا۔ ورنہ کس کو اتنی فرصت کہ راتوں کی نیند اور دن کا آرام حرام کرے۔

یہ ساری باتیں درست۔ سو فیصد بلکہ سوا سو فیصد، لیکن ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گے ہی کہ اردو کا اچھے سے اچھا ادبی جریدہ سال بھر میں جتنا فروخت ہوتا ہے اس سے کہیں کم معیار کا ہندی رسالہ یا اردو کا ڈائجسٹ کسی بھی ریاستی دارالسلطنت میں کہیں زیادہ تعداد میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔

آخر یہ صورتِ حال کیوں ہے؟

قارئین کو بہت کوسا کاٹا جا چکا۔ ان قارئین کو جن کا ایک صاحب کے مطابق وجود ہی نہیں۔ اردو والوں کو اردو اردو چلّانے لیکن اردو کی بقا کے لئے عملی اقدام نہ کرنے پر بھی خوب جلی کٹی سنائی جا چکیں ۔۔۔ آیئے ادبی رسائل ذرا خود تنقیدی بھی کریں، خود ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ادبی جرائد کا یہ حال کیوں ہے؟ ۔۔۔ ہمیں اس سلسلے میں صرف تین باتیں کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادبی جرائد نے ابتک ہندستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بولی، سمجھی اور پڑھی جانیوالی اس زبان کے قارئین تک پہونچنے کی کوشش ہی نہیں کی اور دوسرے یہ کہ ہم نے ادبی جرائد کو اپنے شوق کی تکمیل کا ذریعہ بنا رکھا ہے عام اردو داں لوگوں کے مذاق کو بلند کرنے کا وسیلہ نہیں۔

تیسری بات جو شاید سب سے اہم ہے یہ ہے کہ ادبی رسائل کو ایک درجن نظموں غزلوں، ۶ افسانوں، دو تنقیدی مضامین کے فارمولے پر کب تک زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ کیا ان صاحب علوم اور حالات سے جو انسانی زندگی کو کسی نہ کسی سطح پر چھوتے ہیں خود بے خبر رہنا اور قاری کو بے خبر رکھنا بھی ادبی جرائد کا فریضہ ہے؟ اس مسئلہ پر ہم اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار آپکی رائے سے واقف ہونے کے بعد ہی کریں گے۔

●● ہندستان کے شمال مشرق میں پیش آنے والے انسانی المیہ پر ملک کی ساری ہی زبانوں میں تخلیقات کا ایک سیلاب امڈ پڑا ہے۔ ہم جلد ہی کتاب کا بنگلہ دیش ادب نمبر پیش کریں گے جسمیں اس موضوع پر مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی تخلیقات پیش کی جائیں گی۔

[پروفیسر [illegible] اور علامہ اختر علی تلہری کی موتیں اردو ادب کے لئے سانحہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سرور صاحب کے انتقال سے ہم ایک اہم محقق [illegible] سے محروم ہو گئے اور علامہ کی موت سے زبان کا ایک پارکھ اور نبض شناس اٹھ گیا۔ علامہ اپنی ذات میں انجمن تھے [illegible] چراغ جلائے تھے وہ آج بھی زندگی کے مختلف شعبوں کو منور کر رہے ہیں۔] ■■

جاں نثار اختر

غزل

زندگی، یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اُتارا ہی نہ ہو

کوئے قاتل کی بڑی دھوم ہے چل کر دیکھیں
کیا خبر، کوچۂ دلدار سے پیارا ہی نہ ہو

سوچ لیں شکوۂ اربابِ ستم سے پہلے
کوئی تقصیر، کوئی جُرم ہمارا ہی نہ ہو

دل کو چھو لیتی ہے یوں رات کی آواز کبھی
چونک اُٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہ ہو

کبھی پلکوں پہ چمکتی ہے جو اشکوں کی لکیر
سوچتا ہوں ترے آنچل کا کنارا ہی نہ ہو

زندگی ایک خلش دے کے نہ رہ جا مجھکو
درد وہ دے جو کسی طرح گوارا ہی نہ ہو

شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو

--

محمد علی علوی

غزل

نہ تم ہوئے ہو، نہ ہم ہوئے ہیں
یوں ہی یہ قصے رقم ہوئے ہیں

نہ ہم نے صحرا کی خاک چھانی
نہ ان کے رخسار نم ہوئے ہیں

نہ کوئی شکوے شکایتیں ہیں
نہ ہم پہ کوئی ستم ہوئے ہیں

عذاب اُترے ہیں دشمنی میں
نہ دوستی میں کرم ہوئے ہیں

خدا نے ہم کو بھلا دیا ہے
ہمارے دشمن صنم ہوئے ہیں

ضرورتیں بھی بڑھی ہیں علوی
گرہ میں پیسے بھی کم ہوئے ہیں

--

محمد علی علوی

ایسا ہو

ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھر
اور آنگن میں پھرتی ہوئی مرغیاں
بیچ میں اک کنواں
اور چاروں طرف کھیت ہی کھیت
کھیتوں میں اک راستا ہو
اور رستے پہ
اک پیڑ کی چھاؤں میں
وقت ستا رہا ہو!

--

محمد علی علوی

ایک نظم

میں اب بھی خواہش کے پر لگاکر
بلند شہوت کے آسماں پر
اُڑانیں بھرنے کی سوچتا ہوں
میں اب بھی مرنے کی سوچتا ہوں

--

محمد علی علوی

غزلیں

تھوڑی سردی ذرا سا نزلہ ہے
شاعری کا مزاج پتلا ہے

سننے والوں کا کچھ قصور نہیں
نیا شاعر بچارا ہکلا ہے

دیکھیے تو سبھی برابر ہے
سوچیے تو عجیب گھپلا ہے

پیار کرتے بھی ہیں نہیں بھی ہیں
دل اسی بات پر تو مچلا ہے

اب یہاں کوئی بھی نہیں آتا
دوستوں نے ٹھکانا بدلا ہے

آؤ علوی مزے کرا لائیں
یار اس شہر میں بھی چکلا ہے

--

بنا مرغے کے پر کھٹکتی ہیں
مرغیاں در بدر بھٹکتی ہیں

نظم اترائے تو بجا بھی ہے
یہ غزل کس لیے مٹکتی ہیں

نئی چیزیں سمجھ میں آتی نہیں
لاکھ بے چاری سر پٹکتی ہیں

ایک ناقد کی ، ایک حاسد کی
سر پہ تلواریں دو لٹکتی ہیں

یہ بھی شاعر ہیں ان کے حلق میں
فکر و فن کی جوئیں بھٹکتی ہیں

علوی یہ گولیاں ہیں شہرت کی
یہ گلے میں کہاں اٹکتی ہیں

--

محمد علی علوی

غزل

سمندر جہازوں سے محروم تھے
کبھی یہ علاقے نہ معلوم تھے

مکینوں سے خالی مکاں تھے یہاں
درختوں پہ روتے ہوئے بوم تھے

سبھی لوگ ظالم تھے اپنے لیے
یہاں سب کے سب لوگ مظلوم تھے

سبھی اپنے اپنے جنازوں میں گم
سبھی اپنے ہونے پہ مغموم تھے

رہے نام دائم خداوند کا!
ہمارا تھا کیا ہم تو مرحوم تھے

نہ پیسے نہ پتھر تھے لوگوں کے پاس
دکانوں میں شیشے کے شوروم تھے

نئی نظم علوی اشاروں میں تھی
اشارے بھی حد درجہ موہوم تھے

محمد علی علوی

خوف

یہ سب دکانیں یہ راستے
یہ ہجوم لوگوں کا
چلتی رکتی بسیں یہ کاریں
یہ سب کا سب
یہ بتا رہا ہے
کہ شہر اچھا بھلا رہا ہے
مگر ابھی اک دکاں جلے گی
مگر ابھی اک چھری چلے گی
یہ خوف کیوں سر اٹھا رہا ہے!!

زیب غوری

غزل

میں عکسِ آرزو تھا ہوا لے گئی مجھے
زندانِ آب و گِل سے چھڑا لے گئی مجھے

کیا بچ رہا تھا جس کا تماشا وہ دیکھتا
دامن میں اپنے خاک چھپا لے گئی مجھے

کچھ دور تک تو چمکی تھی میرے لہو کی دھار
پھر رات اپنے ساتھ بہا لے گئی مجھے

جُز تیرگی نہ ہاتھ لگا اُس کا کچھ سُراغ
کن منزلوں سے گردِ نوا لے گئی مجھے

کس کو گمان تھا کہ کہاں جا رہا ہوں میں
اک شام آئی اور بلا لے گئی مجھے

پرواز کی ہوس نے اسیرِ فلک رکھا
رخصت ہوئی تو دام میں ڈالے گئی مجھے

اب تک تو پار اتر چکا ہوتا میں ڈوب کر
لیکن لہو کی موج اچھالے گئی مجھے

اب بھی نگاہ کر لے کہ تیرا ہی نقش ہوں
پھر جس طرف بھی تیز ہوا لے گئی مجھے

ساکت کھڑا تھا وقت مگر تیشہ زن ہوا
پتھر کی تہہ سے زیبؔ نکالے گئی مجھے

زیب غوری

غزلیں

دشتِ فنا کا ذرہ ہوں میں، بادِ صبا ہے میرے ساتھ
خود بھی اپنی خاک اُڑاتا کون چلا ہے میرے ساتھ

کل صحرا میں کھو جائیں گی یہ انجانی آوازیں
کس کو خبر اس تاریکی میں کون لٹا ہے میرے ساتھ

آنکھ بھی ہے تصویرِ تمنا نقش کی صورت اُٹھتا جا
میں بھی لہو کی موج رواں ہوں رنگ چلتا ہے میرے ساتھ

رفتہ رفتہ شام کے سائے گہرے ہوتے جاتے ہیں
دھیرے دھیرے سارا منظر ڈوب رہا ہے میرے ساتھ

وہ جو میرا قاتل تھا جگ میں، اس کو کس نے قتل کیا
زیب میرے ہی خون میں لتھڑا وہ بھی پڑا ہے میرے ساتھ

— —

مجھ سے کیا پائے گی دنیا مرے خوابوں کے سوا
اور صحرا میں رکھا کیا ہے سرابوں کے سوا
سبز مٹی پہ لہو بھی تو بہا ہے کتنا
کچھ مہک اور بھی آتی ہے گلابوں کے سوا
خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے اس جسم کا اب
نگراں کوئی نہیں چند عقابوں کے سوا
دیکھتے دیکھتے کھو جائے گا یہ بھی منظر
دور تک رنگ نہیں کوئی سحابوں کے سوا
اس امنڈتے ہوئے سیلاب میں اک پل کو بھی
کہیں ٹھہراؤ نہیں چند حبابوں کے سوا
کوئی پھر آنکھوں کے دروازے کھلے چھوڑ گیا
کون ہوگا انھیں بھٹکے ہوئے خوابوں کے سوا
زیب سوچا تھا کہ کچھ لطف کی باتیں ہوں گی
گفتگو ہی نہ ہوئی ان سے کتابوں کے سوا

— —

بشر نواز

غزلیں

برف سورج میں، سمندر میں بیاباں دیکھا
رات کو ہم نے عجب خواب پریشاں دیکھا

جس کو پردے میں بھی دیکھے سے ہوں خیرہ آنکھیں
ہم نے اس شعلۂ بیباک کو عریاں دیکھا

تشنہ لب ریت کی ہر موج کو دریا سمجھے
ڈوبنے والے کی آنکھوں میں بیاباں دیکھا

زندگی تیرے کئی روپ ہمیں یاد آئے
پتھروں میں کسی تتلی کو جو لرزاں دیکھا

کن طلسمات میں ہوں قید یا اسرار ہے کیا
جس سے کچھ پوچھنا چاہا اُسے حیراں دیکھا

--

رات کے سینے پہ اک شمع جلا کر دیکھیں
اس کی زلفوں میں کوئی پھول سجا کر دیکھیں

کیا عجب ہے کہ ہمیں جیسے یہاں اور بھی ہوں
ان اندھیروں میں اک آواز لگا کر دیکھیں

کیسے پی جاتی ہیں تاریکیاں منظر منظر
آج شمعوں کو سرِ شام بجھا کر دیکھیں

قرب کی روشنی بن جاتی ہے اکثر پردہ
خوبیاں اس کی اسے دور بٹھا کر دیکھیں

تاب سچائی کی لاتی ہیں نگاہیں کس کی
آؤ خوابوں کی رداؤں کو ہٹا کر دیکھیں

--

ظہیر صدیقی

عجیب منظر کشا کرب ہوگا

یہ ساعت دل نشین تو لمحوں کی بات ہے
تھوڑی دیر ہی میں
یہ محفل دوستاں
مری قتل گاہ ہوگی
شگفتگی کا نقاب بھی تار تار ہوگا
شکستہ چہرہ وجود کی بے بسی کا تازہ مزار ہوگا
ہر اک لطیفہ مری سماعت پہ بار ہوگا

انھیں
میں مخل دے کے
خواب غفلت میں چھوڑ کے
اپنے بکھرے حصے سمیٹ کے
آگیا ہوں
وہ اب گلی
گلی سے سڑک
سڑک سے جہاں تہاں
میری ذات کی بو
شکاری کتوں کی طرح
ہر شے میں سونگھتے ہوں گے
چند لمحوں کی دیر ہے
وہ یہاں بھی آئیں گے

اور تحلیلیت کا نشہ ہرن کریں گے
مجھے میرے میں سے توڑ کر
اپنے چھپے حصے طلب کریں گے
مرے شکستہ وجود میں کشمکش کے لمحے عجیب ہوں گے
لبوں کے مقتل پہ
سارے مذبوح قہقہے آخری تڑپ کے قریب ہوں گے
کبھی تو ہوگا
کہ روح آواز قلب الفاظ کو کبھی ترسے گی
یا کبھی یورش صدا
جانے کتنی چیخوں کو جنم دے گی
بس ایک مرکز پہ
آنکھ مانند سنگ ٹھہرے گی
اس گھڑی
کوئی مسخرہ دوست
ہاتھ کی انگلیاں مرے سامنے نچا کر
یہ مجھ سے پوچھے گا
"ارے! کہاں ہو"
تو چونک کر شرمسار ہونے کی
ہر ادا بھی خفیف ہوگی

میں جانتا ہوں

وجود میرا کبھی اکائی تھا
اب بکھرنے کی مستقل ہوئی ہے
بکھرنے، تقسیم ہونے
خود کو سمیٹنے کا یہ سلسلہ کب سے ساتھ ہے
کچھ پتا نہیں ہے
یہاں تو وہ اولین لمحے بھی
(جب یہ ثابت اکائی تقسیم کے عمل سے گزرنے والی تھی)
حافظے سے اتر چکے ہیں
بس اس قدر ہے
کہ اس کے پیچھے
ہزاروں معروف غیر معروف
غاصبوں کی قطار ہے
جو اسے فرائض کا واسطہ دے کے
یا ڈرا کے
بکھیرنے اور بانٹنے کے عمل میں مصروف ہیں
غریب مقسوم کو ہوس ہے
بکھر کے تقسیم ہو کے
خود کو سمیٹ رکھنے کی اک ہوس ہے
ہوس ہے لیکن!
لیکن ابھی غنیمت ہے
سارے مقسوم علیہ ناداں ہیں
جو اسے
اک فریب تکمیل کا سہی
حوصلہ تو دیتے ہیں
ورنہ جب ان کو
اس ہوس کا شعور ہوگا
وہ مشتعل ہوں گے
منقلب ہوں گے
اس گھڑی
یہ غریب مقسوم کیا کرے گا

— —

عوض سعید

آواز کے پنکھ

شام دیکھو پگھل کر
یوں سمندر میں جا کر گری ہے
جیسے یخ بستہ برفیلی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے
در دل پہ چپکے سے دستک دیے جا رہے ہوں
بھلا حسن کس کا ہے منظر کی اس دلکشی میں
کون ہے جو مری گھور تنہائی میں
ہاتھ تھامے ہوئے کہہ رہا ہے
میں تمہارا ہوں
اگلے جنم تک
تمہارا رہوں گا

— —

حکیم مختار احمد بدایونی

فانی حقیقت کے آئینے میں

فانی کے زمانۂ حیات سے ان کے کلام پر جو تنقید و تبصرہ کا سلسلہ شروع ہوا وہ ہنوز جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ کچھ عرصہ سے ان پر ریسرچ کا کام شروع ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری پر ایک مبسوط اور جامع مقالہ سپرد قلم کیا۔ میرا خیال ہے کہ اُردو زبان میں یہ مقالہ اپنی نوعیت اور جامعیت کے لحاظ سے بالکل پہلا مقالہ ہے جو ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آنے والی نسلوں کی نشاندہی اور رہبری کرتا رہے گا۔ اس پر میں مغنی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

فانی کی شخصیت اور شاعری سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف انکی حیات کے متعلق اتنا ضرور کہوں گا کہ انہوں نے محض سُنی سنائی اور فرضی روائتوں پر اکتفا کر لیا ہے۔ تحقیق کرنے والے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ہر روائت کو علم الرجال کی کسوٹی پر جانچے اور پرکھے اور پھر دیکھے کہ یہ راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ، ایمان دار ہے یا بے ایمان۔ اور یہ روائت کہاں تک صحیح اور درست ہو سکتی ہے اُسکے بعد ہی اُسے قابلِ تحریر سمجھنا چاہیئے۔

ان کی حیات کے متعلق جو "ناکام معاشقے" کی سرخی دی گئی ہے اس پر مجھے اعتراض ہی نہیں بلکہ انتہائی دکھ ہوا۔ میں بارہ، تیرہ سال برابر خلوت و جلوت، سفر و حضر میں ہر وقت ان کے ساتھ رہا لیکن میں نے کہیں اور کبھی ان کو اس قسم کا مظاہرہ تو کیا ذکر کرتے بھی نہیں سُنا۔ اوّل تو ان زنانِ بازاری کا پیشہ ہی عصمت فروشی ہوتا ہے اور ان کی شب باشی کی فیس مقرر ہوتی ہے اس میں کسی کو کوئی تخصیص نہیں۔ ہر مذہب و ملت کا آدمی ان کی مقررہ فیس ادا کر کے شب باشی ہو سکتا ہے اس میں ناکامی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

افسوس کہ فاضل مقالہ نگار نے اپنی صفائی میں سبطین احمد اور جوشؔ صاحب کی دو تحریریں پیش کی ہیں۔ سبطین صاحب میرے ہم عمر ہیں اور انہیں فانی صاحب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ بدایوں کے کسی مشاعرے میں فانی صاحب کی شکل دیکھ لی ہو بس اسی سہارے پر پورا ایک مضمون لکھ ڈالا کہ "فانی کے ایک رازداں" سے معلوم ہوا۔ میں پوچھتا ہوں کہ فانی کے انتقال کے بعد اب ان کے رازداں کے نام کو چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ان کا کوئی رازداں نہیں تھا اور اگر کوئی ہو سکتا تھا تو وہ میں ہوں کیونکہ لکھنؤ کے علاوہ بریلی اور آگرہ میں بھی ان کے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا۔ رازداں کے متعلق وہ خود ارشاد فرماتے ہیں ؂

مرا وجود ہے میری نگاہِ خود شناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا تو رازداں ہوتا

سبطین صاحب کی یہ روائت بھی صحیح نہیں ہے کہ ان کی جائداد پانچ چھ سو روپیہ ماہوار پر مشتمل تھی۔ یہ روائت اس لئے غلط ہے کہ انہوں نے اپنی بقیہ جائداد بیس ہزار روپیہ پر فروخت کی اور جائداد زمینداری پانچ روپیہ سیکڑہ کے منافع سے بکتی ہے اس لئے بیس ہزار روپیہ کی جائداد کا منافع ایک ہزار روپیہ ہوا اور بقیہ جائداد اور مکان سا ہو کار کے قبضہ میں ہے کیا اُس کی آمدنی پانچ چھ روپیہ ماہوار نہ ہو گی، ضرور ہو گی۔ اس حساب کو دیکھتے ہوئے

وہی پہلی روایت "علی گڑھ میگزین فانی نمبر" کی صحیح معلوم ہوتی ہے اور قرین قیاس ہے۔ فانی اٹاوے کے مشاعرے سے لکھنؤ آرہے تھے آٹھ دس شاعروں کا ایک گروپ ان کے ساتھ تھا ریل کی بوگی کی آخری سیٹ پر فانی اور ان کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بالکل مقابل ایک برتھ پر ایک طوائف معہ اپنے سازندوں کے بیٹھی ہوئی تھی طوائف نے [illegible] پاندان کھینچ کر پان بنایا اور پان کھا کر اپنا منھ کھڑکی کی طرف کرکے بیٹھ گئی اس پر یاران محفل نے کہا کہ فانی صاحب ہم آپ کی کرامت جب سمجھیں کہ یہ طوائف یہاں پان بنا کر بھیجے فانی صاحب نے جواب دیا کہ میں کوشش کرتا ہوں مگر ریل کی بھیڑ میں خیال کو یکجائی مشکل ہے ابھی تھوڑی دیر گذری تھی کہ طوائف نے کھڑکی سے اندر کی طرف منہ کرکے پاندان کو کھینچا اور پان بنانا شروع کردیئے جب آٹھ دس گلوریاں بنالیں تو ان کو ایک تھالی میں رکھ کر اپنے سازندے کو دیا اور کہا کہ وہ سامنے ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے بیٹھے ہیں انھیں دے آؤ اور خود معذرت کرنے لگی کہ چونکہ پان آپ لوگوں کے قابل نہیں تھے اس لئے پہلے پیش نہیں کئے گئے جب سازندہ ان کے پاس تھالی لایا تو سب لوگ قہقہہ مار کر ایکدم ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی کرامت کے قائل ہو گئے ——————

لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنا مشاعرہ کی شرکت کا نذرانہ مقرر کر دیجئے جیسا کہ اور اساتذہ نے کر رکھا ہے کہ وہ بغیر نذرانہ لئے ہوئے مشاعرہ میں شرکت نہیں کرتے اور شرکت سے گریز کرتے ہیں اس سے آپکی آمدنی بھی بڑھ جائے گی اور آپ جا و بے جا فرمائشات سے بھی نجات پا جائیں گے اس پر فانی نے جواب دیا کہ میں سخن فروش نہیں ہوں شاعر ہوں۔ ایک مرتبہ منشی احمد شاہ خاں منصری عدالت جج سہارنپور جو ان کے قریبی عزیز بھی ہوتے تھے اہل سہارنپور نے اور اپنے ان کے ذریعہ سے فانی صاحب کو نمائش سہارنپور کی شرکت کے لئے بطور زاد راہ سو روپیہ کا منی آرڈر بھجوایا فانی صاحب نے منی آرڈر وصول کر لیا اور مشاعرہ کی تاریخ نکل جانے کے بعد منی آرڈر کی فیس اپنے پاس سے لگا کر وہ سو روپیہ واپس کر دیئے وہ ہر جگہ اور ہر مشاعرہ میں اپنے کرایہ سے گئے اور آئے اگر کسی نے ان کو کرایہ وغیرہ کی پیشکش بھی کی تو انھوں نے برا مانا اور اسکو بھی پسند نہیں کیا۔

فانی کے باپ دادا خاندانی رئیس تھے محلہ کے سب لوگ ان کا ادب و احترام کرتے تھے عید بقرعید کو علاوہ پست اقوام کے بدایوں کی تمام طوائفیں بھی ان کے سلام اور انعام و اکرام کے لئے آتی تھیں فانی نے بھی جب تک وہ بدایوں میں رہے اس دستور کو جاری رکھا چونکہ بدایوں کی مشہور اور ممتاز طوائفیں زیادہ تر فانی ہی کی غزلیں گاتی ہیں اس پر ان کے مخالف طبقہ نے یہ مشہور کر دیا کہ فانی روپیہ دے دے کر اپنی غزلیں طوائفوں سے گواتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف تھی اب جوش صاحب کے متعلق سُنئے کہ امین آباد کے کرہ نمبر ۴۴،۴۴ میں فانی صاحب کا قیام تھا اور نمبر ۴۵ میں جوش صاحب مقیم تھے یہ اپنی کسی مریضہ کو علاج کے لئے لکھنؤ لائے تھے انھوں نے دیکھا کہ فانی صاحب کے پاس روزانہ ۴ - ۵ بجے شام سے شعرائے لکھنؤ کا جمگھٹا لگا رہتا ہے اور بیرونجات کا جو شاعر آتا ہے وہ بھی بغیر ان سے ملے نہیں جاتا اس وقت فانی اپنی غزل "حال سوز غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ" سے ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہو چکے تھے میرے ایک دوست مولوی حکیم شریف احمد مراد زبیری نے جو ان دنوں "الخبار" رنگون میں کام کرتے تھے بدایوں آنے پر مجھے بتایا کہ میں نے یہ غزل رنگون اور مانڈلے تک میں سُنی اس وقت جوش صاحب دنیائے شاعری میں اسقدر روشناس نہیں ہوئے تھے بلکہ لکھنؤ کے ایک مخصوص طبقہ تک انکی شہرت محدود تھی ان کی شاعرانہ رقابت و حسد بھڑکی اور انھوں نے فانی کی شہرت کو خراب کرنیکے لئے اور اپنی نمود کیلئے یہ غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈا کیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے بعد بھی انکی مذمت اور بیہودہ سرائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یاس عظیم آبادی نے بھی ان کی مذمت میں قطعے لکھے مگر فانی نے اس خرافات کا کوئی جواب نہیں دیا وہ کہتے تھے کہ زمانہ سے بہتر کوئی نقاد نہیں زمانہ میرے متعلق خود فیصلہ کرے گا تھے کیا ضرورت ہے کہ اس [illegible] یاد کر یا دقت ضائع کروں اور جواب دوں۔

وہ کہ رنگ میں ہوتی ہے حقیقت ظاہر — دُرد خود چھلکے تو جام ہوئی جاتی ہے

کرایہ کے متعلق جو لکھا گیا ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جو شخص سوا سو اور ایک سو دس روپیہ ماہوار کرایہ ادا کرتا ہو جس کی ایمانداری اور دیانت مسلم ہو اور وہ اگر عدالت میں کام نہ کرے اور موکل کو محنتانہ واپس کر دے وہ آدمی دس یا پندرہ [illegible] خاموش ہو کر

رہے مجھے عزیزی سعادت علیخاں عرف فیروز قلندر ان کے صاحبزادے کے خط سے معلوم ہوا کہ تیاس نے دو سال بر ابر حیدرآباد سے مالک مکان کو پندرہ روپیہ ماہوار کرایہ کے بھیجے جب کرایہ کی رقم ٹوٹ گئی تو مالک مکان نے ان کا اسباب فرنیچر اور کتابیں وغیرہ جو وہ چھوڑ گئے تھے وہ سب بیچ لیا اسی میں ان کی وہ بیاض بھی شامل تھی جس کے اشعار کے اقتباس رسالہ آگرہ میں دیا جاتا تھا۔

ایک جگہ آپ لکھتے ہیں کہ فانی شراب پیتے تھے دوسری جگہ تحریر کیا جاتا ہے کہ کوکین کھاتے تھے تیسری جگہ ارقام ہوتا ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میں کسی سے نکاح کر لیا تھا نہ معلوم یہ روایتیں کون سے چنڈو خانے کی پیداوار ہیں نہ انہوں نے کبھی شراب پی نہ کوکین کھائی اور نہ ہی کسی سے نکاح کیا انھیں شراب سے انتہائی نفرت تھی جگر مرحوم جب ان کے یہاں مقیم ہوتے تو ادھر ادھر جاکر مے نوشی کرتے اور ان کے سامنے احتیاط برتتے اس کی تمثیل خود فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالہ کے صفحہ ۹۵ پر جوش کے حوالے سے دی ہے۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ فانی کے مکان پر چند بادہ خوار خرابات جمع تھے اور شغل نائے نوش جاری تھا فانی ایک گوشے میں ایک ایسے برہمن کی مانند بیٹھے یا یوں کہنا چاہیئے کہ پڑے ہوئے تھے کہ جس کی آنکھوں کے سامنے گائے ذبح کی جا رہی ہو۔ فانی اس گئو ہتیا کو برداشت نہیں کر پائے انہوں نے بڑے رازدارانہ اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کان میں مجھ سے کہا کیا تم غلط کر رہے ہو اس سوال کے وقت فانی کے چہرے پر ایک ایسا رنگ اڑ گیا جیسے وہ کسی زبردست عذاب کے نازل ہونے کی پیشین گوئی فرما رہے ہیں میں نے فانی کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا کہ ہاں پیارے غم غلط کر رہا ہوں یہ سنتے ہی ان کا رنگ فق ہو گیا اور پھر کان میں کہا ۔" میاں جوش غم ایک امانت الہٰی ہے اسے غلط نہ کرو اس لئے کہ اس کا غلط کرنا خیانت میں داخل ہے ۔ اس سے شراب والی روایت کی خود تردید ہو جاتی ہے اور اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی وہ کہتے تھے کہ شراب کا جوش وقتی اور عارضی ہوتا ہے اور حقیقی جوش کے برابر نہیں ہوتا۔

طفیل جان کو ہم نے صرف دو مرتبہ دیکھا ایک تو گانے کی محفل میں جس میں قریب ۳۰-۳۲ آدمی ہر مکتبہ خیال کے جمع تھے اور دوسری بار جب ہم لوگ کچہری سے واپس ہوتے تو اس کو کھانا پکاتے ہوئے پایا نوکر اپنی علالت کی وجہ سے اس کو بلا لایا تھا اس کے بعد ہم لوگوں نے کھانے کا انتظام ہوٹل سے کر لیا یہ واقعہ نظیر آباد کی کوٹھی کا ہے اس کے بعد ہم نے پھر اس کو کبھی آتے جاتے نہیں دیکھا خارجاً اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ فانی صاحب پر خود فریفتہ ہے اور اس نے نکاح کا پیغام بھی فانی صاحب کو بھجوایا تھا اور ایک لاکھ روپیہ کی جائداد کی بھی پیشکش کی تھی مگر فانی صاحب نے اُسے ٹھکرا دیا اگر انھیں اس سے عشق اور محبت ہوتی تو وہ خلوص دل سے اسکو قبول کرتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

نورجہاں سے مراسم ۔ دیکھو صفحہ ۱۵ مقالہ ہذا ۔ مجھے ان کا رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہونا تو تسلیم ہے کیونکہ وہ احباب کی دل آزاری اور دل شکنی کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ انھوں نے خود ارشاد فرمایا

زندگی ہے نام لطفِ صحبتِ احباب کا ۔ یہ نہیں فانی تو جینا کوئی جینا ہی نہیں

مگر بقیہ باتیں تسلیم نہیں میں چونکہ ان کی افتادِ مزاج اور طبیعت سے واقف ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ اس مزاج اور اس قماش کے آدمی نہیں تھے نورجہاں کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ تین پاوٴ کی پینے والی تھی اور ۸ - ۹ سال ہوئے اٹاوہ میں مقیم تھی آگے چل کر آپ بتاتے ہیں کہ اسکی عمر بمشکل ۱۶ - ۱۷ برس کی ہو گی اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۷ - ۸ برس کی عمر میں وہ اٹاوے آ گئی تھی اور اس لئے تعلقات شروع ہو گئے تھے پھر ایسا لکھتے ہیں کہ کسی بینکر کا بھتیجہ ان کے محرر کی سازش سے ایک نمائش کے موقعہ پر اس کو اغوا کر کے لے گیا اور وہ چند ماہ تک غائب رہی اور جب وہ لوٹی تو تعلقات پھر استوار ہو گئے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ذرا سی غیرت رکھنے والا آدمی بھی اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ اس کی محبوبہ کو ایک غیر شخص بھگا کر لے جائے اور وہ اس کی واپسی پر پھر تعلقات بحال کرے وہ تو اسکی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا کہ تعلقات کی بحالی [illegible] اور خوددار شخص اسکو کیسے گوارہ کر سکتا ہے۔

پھر آگے آپ [illegible] والی روایت کے راوی ہیں کہ فانی نورجہاں سے والہانہ محبت کرتے تھے نورجہاں کو بھی ان سے

سے عدم نگاہ تھا جب وہ راتیں بھی فانی کے یہاں گذارنے لگی تو لوگوں نے اس بارے میں جستجو شروع کر دی اور نتیجہ میں یہی دیکھا گیا کہ نور جہاں لیٹی ہوئی ہو اور فانی پنکھا جھل رہے ہیں۔ یہ ان کے تزکیۂ نفس اور عارف باللہ ہونے کی دلیل ہے کہ انہوں نے باوجود تمام اسباب تعیش مہیا ہونے کے اسکی طرف کوئی التفات نہیں کیا بلکہ اپنے نفس پر جبر کرکے رہے لئے اسکی راحت رسانی میں معروف ہو گئے۔ اول تو بازاری عورت کے کسی قول و فعل کا اعتبار نہیں نور جہاں نے جو اپنے جنسی تعلقات کا ذکر کیا ہے اسکی بھرت یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس نے سوچا ہو بڑے شاعر کی سوانح حیات لکھی جاتی ہے اس سلسلہ میں میرا نام بھی آ جائے گا ہمارے خیال میں بھی اس کی کوئی بھی روائت یہ وہ درست نہیں ہے ملاحظہ ہو کہ وکالت سے فانی کا معقول آمدنی تھی اور وہ اپنی ساری آمدنی اس کی تحویل میں دے دیتے تھے اور وہی ان کا خرچ چلاتی تھی اس زمانے میں ان کے بیوی بچوں کی کفالت کہاں سے ہوتی تھی جبکہ انکی پوری کمائی اس کی تحویل میں جاتی تھی کوئی طوائف ایسی نہیں ہے جو کسی کی کل آمدنی اپنی تحویل میں لے کر اس کے بیوی بچوں کی کفالت کرے ہم نے تو یہی دیکھا اگر ان کے پھندے میں کوئی بھلا آدمی پھنس گیا ہے تو انہوں نے اسے ننگا کرکے چھوڑا ہے اور اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ نان شبینہ کو محتاج کر دیا ہے انکی بہت سی مثالیں ہماری نگاہ کے سامنے ہیں تو یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ان کے بیوی بچوں کی کفالت کرتی ہوگی جب کہ اٹاوے میں فانی کے قیام کا زمانہ ۳ سال بتایا جاتا ہے میں چونکہ بوجہ ملازمت اٹاوے میں ان کے ساتھ نہ رہ سکا اس لئے میں وہاں کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتا مگر میں اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ ان واقعات کو نہائت رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسکی کوئی روائت بھی صحیح و درست نہیں ہے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا صفحہ ۳۰ (نور جہاں کی یہ روائت کہ گوہر جان نامی ایک طوائف فانی کی منظور نظر تھی کس قدر غلط اور بے بنیاد ہے گوہر جان کلکتہ کی ایک مشہور اور ممتاز رقاصہ تھی جس کی سر رضا علی نے اعمال نامے کے صفحہ ۲۹۵ اور ۲۹۶ پر تصریح کی ہے اور لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے اسکے متعلق کیا خوب کہا ہے

کون آرام سے دنیا میں ہے گوہر کے سوا   سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اب آپ ہی بتلایئے ان دونوں روائتوں میں کونسی روائت صحیح و درست ہے میرے خیال میں فانی نے اسکی صورت بھی نہیں دیکھی ہوگی اور جب وہ کلکتہ گئے ہیں تو اس کا انتقال ہو چکا تھا ——— اب دوسری روائت لیجئے وہ آگرہ کو منتقلی کا سبب اپنا تعاقب بتاتی ہے یہ بھی غلط اور بالکل غلط ہے مولوی جمیل احمد جج جو رہنے والے ضلع بدایوں کے رہنے والے اور فانی کے کلاس فیلو تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ تبادلہ سے پہلے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ فانی اٹاوے میں پریکٹس کر رہے ہیں میں نے سوچا تھا کہ میں حتی الامکان جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں ان کی مدد کروں گا مگر میں جب اٹاوے کے اسٹیشن پر پہونچا تو میں نے دیکھا کہ فانی اسٹیشن پر موجود ہیں میں نے سمجھا شائد سبب لینے کی غرض سے آئے ہیں میں نے فانی کو آواز دے کر کہا کہ بھئی اب میں آ گیا ہوں اس کے جواب میں فانی نے مجھ سے کہا کہ جب ہی تو میں جا رہا ہوں اب تعاقب والی روائت صحیح ہے یا ایک ذمہ دار جج کا بیان درست ہے فانی صاحب کے متعلق معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اٹاوے تبادلہ پر آ رہے ہیں وہ اپنے ہم وطن اور کلاس فیلو کا احسان لینا کسی صورت میں بھی پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ انکی اٹاوے سے آگرہ کو منتقلی کی ہوئی انہوں نے خود فرمایا تھا کہ میری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ میں اپنے ایک ساتھی کو حضور اور سرکار کے لقب سے یاد کروں ——— دوران قیام آگرہ میں لڑکوں نے علیگڈھ کالج میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کیا تھا کالج کے ۲۰۰ لڑکوں کا وفد آگرہ پہونچا اور فانی صاحب کو شرکت مشاعرہ کے لئے مجبور کیا چنانچہ وہ لڑکوں کے ساتھ علیگڈھ پہونچے تو لڑکوں کا ایک بے پناہ ہجوم ان کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا ان کے ریل سے اترتے ہی انھیں پھولوں سے لاد دیا گیا اور جس موٹر میں وہ سوار ہوئے اس پر پھولوں کی اسقدر بارش ہوئی کہ سارا موٹر پھولوں سے بھر گیا اور ان کو ایک جلوس کی شکل میں مشاعرہ گاہ تک لیجایا گیا رات بھر فانی زندہ باد زندہ باد کے نعرے لگتے رہے مشاعرے میں جہاں ان کے پڑھنے کی باری آئی تو ان سے بجائے ایک غزل کے پانچ غزلیں [illegible] وہ غزل پڑھ کر اترنا چاہتے تو مسلسل فانی فانی کا شور مچ جاتا تھا اور وہ مجبور ہو کر بیٹھ جاتے تھے [illegible] واپس آئے

اور انہوں نے لڑکوں سے کہا کہ بھائی اب تو میاں عزیز کے حال پر رحم کرو اس کی آواز بھی شگافتہ ہو چکی ہے اور اب اس میں پڑھنے کی سکت باقی نہیں وہ تو لڑکے خاموش ہوئے اس کے بعد مشاعرہ بھی ختم ہو گیا اور اکثر شعرائے کرام اپنا کلام سُنانے سے رہ گئے۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری ایک تقریب کے سلسلے میں بدایوں آئے ہوئے تھے وہ مجھ سے ملنے کے لئے غریب خانہ پر بھی آئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں حیدر آباد گیا تھا اور فانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تھی مگر اب ان کے کلام کا دم نکل رہا ہے انکی غزلیں از مطلع تا مقطع معظم جاہ کو جا رہی ہیں اور بچا کھچا کلام وہ اپنے لئے رکھ لیتے ہیں حفیظ صاحب کے بیان کی تصدیق فانی صاحب کے حیدر آباد سے بدایوں آنے پر ان ہی کی زبان سے ہوئی اور اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاراجہ بہادر کی غزلوں کی اصلاح کا کام بھی فانی صاحب کی سپرد ہے اور اس کا یہ طریقہ عمل ہے کہ مہاراجہ بہادر اپنی غزل فانی صاحب سے پڑھواتے ہیں فانی صاحب کو مہاراجہ صاحب نے غزل دی انہوں نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا کہ شائد سرکار نے اس لفظ کی جگہ یہ لفظ فرمایا ہوگا اس پر مہاراجہ بہادر فرماتے ہیں کہ فانی صاحب آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہی لفظ ہے پھر وہ غزل پڑھی جاتی تھی یہ تھا مہاراجہ بہادر کی غزل کا طریقہ اصلاح۔ ایسی صورت میں وہ فانی صاحب کی جو اعانت اور مدد کرتے تھے تو دراصل ان کا کوئی احسان بھی نہ تھا۔

فانی صاحب نے حیدر آباد سے ایک منظوم خط حافظ امام الدین صاحب کے نام روانہ کیا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

گرچہ تھی صبح آگرہ بے نور — اوج پر تھا مگر ستارۂ شام

اس شعر میں شاعر نے صبح کی بے نوری کی رعایت سے ستارۂ شام کے اوج سے کام لیا ہے اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ میکش صاحب کا ذہن فوراً منتقل ہو گیا اور انہوں نے حافظ امام الدین سے اس شعر کی تفسیر پوچھی انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا میکش اکبر آبادی نے جب یہ واقعہ فاضل مقالہ نگار کو سنایا ان کو پتہ بھی نہ تھا کہ نور بھی بطور تلمیح آیا ہے یہاں فاضل نگار کی ذہانت کو بغیر داد دیئے نہیں رہا جاتا مگر افسوس وہ اوج لکھنوی اور شام اکبر آبادی کے ناموں کو فراموش کر گئے اور آخر میں کہدیا کہ آٹھ سال تک اسکی یاد کو سینہ سے لگائے رکھا کچھ معنی ضرور رکھتا ہے پھر عشق کی صورت یہ ہے کہ لکھنؤ میں تو عرب زادہ میں نور جہاں آگرہ میں ستارہ ہے عاشق کا ہے کو ٹھہری یہ تو بوالہوسی ہوئی۔

نہ جانے یہ عشق کی کون سی قسم ہے جو برابر منتقل ہوتی رہی ورنہ عشق تو ہمیشہ ایک ہی ذات سے ہوتا ہے چاہے وہ کوئی کیوں نہ ہو۔

محبت جس سے ہو جاتی ہے پھر جایا نہیں کرتی — دہک جاتی ہے جب یہ آگ بجھایا نہیں کرتی

کہیں بنت عم کی محبت دکھلائی جاتی ہے اول تو بچپن کی محبت عارضی اور وقتی ہوتی ہے اور انتقال کے بعد اس کا خیال کیا شائبہ باقی نہیں رہتا محبت اور عشق میں فرق ہے محبت جیسے ماں باپ کو اولاد کی یا اولاد کو ماں باپ کی خاوند کو بیوی کی بیوی کو خاوند کی مگر عشق میں یہ بات نہیں۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن — دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

یہ سب من گھڑت اور فرضی افسانے ہیں انکو کوئی اہمیت نہیں جو کچھ بھی عشق تھا وہ خدا کی ذات سے تھا اگر وہ جنسی گناہ کے مرتکب ہو جاتے تو ان کی وہ تمام قوتیں جو انہوں نے ریاضت کر کے حاصل کیں تھیں صلب ہو جاتیں اور وہ کبھی اپنی وفات کی تاریخ نہیں نکال سکتے تھے وہ فطرتاً شاعر پیدا کئے گئے تھے اور ان سے قدرت کو صرف شاعری ہی کا کام لینا تھا چنانچہ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میں شعر خود نہیں کہتا فطرت مجھ سے طمانچہ مار کر شعر کہلوا لیتی ہے اب آپ خود ان سے انکی ناکامی اور معاشقے کے قصے سنئے۔

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا — دولتِ دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

تیسری جگہ فرماتے ہیں۔

[illegible] آگ حشر تک نہ بجھی — ہائے مر کے بھی ٹھنڈے تیرے جلائے ہوئے

چاتھی جگہ فرماتے ہیں :

پی اور وہ پی ازل میں جو اتری نہ حشر تک ۔۔۔ یا وش بخیر وہ بھی عجب بادہ نوش تھا

اب ناکامی کے متعلق خود انہی کی زبان سے سنئے :

ناکام ازل کی کامرانی معلوم ۔۔۔ قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم

جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید ۔۔۔ ورنہ فانی کی زندگانی معلوم

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے

ناکامیاں ذریعہ الہام ذکر ہیں ۔۔۔ نالوں پہ انحصار نوائے سروش تھا

یہ چند مثالیں میں نے مشتے نمونہ از خروارے ان کے کلام سے پیش کر دیں اب ناظرین کرام خود فیصلہ کر کے کسی نتیجہ پر پہونچ جائیں گے کہ وہ کیسے آدمی تھے۔

وما علینا الا البلاغ المبین ۔

فانی حقیقت اور آئینہ

مغنی تبسم

حکیم مختار احمد بدایونی نے پرے بزرگ ہیں۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں ۔میں جب فانی پر مقالہ لکھ رہا تھا تو حیات فانی کے بارے میں مواد کی فراہمی میں انہوں نے میری بڑی اعانت کی جس کا میں ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

فانی کی حیاتِ معاشقہ کے بارے میں جو کچھ میں نے اپنے مقالے میں تحریر کیا اسے پڑھ کر یقیناً انھیں صدمہ پہونچا ہو گا۔ اُدارے میں نو جہاں معاشقے کے بارے میں جو باتیں مجھے معلوم ہوئی تھیں وہ میں نے حضرت میکش اکبر آبادی کو سنائیں تو انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ واقعات اپنے مقالے میں درج نہ کروں۔ اس سے فانی کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ اس ضمن میں انھوں نے بتایا کہ اردو ادب میں فانی پر جب ان کا مضمون شائع ہوا جس میں فانی کے بارے میں بعض ایسی ہی باتیں درج تھیں تو ایک رات فانی ان کے خواب میں آئے اور منہ پھیر کر کھڑے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت ناراض ہیں ۔اس کی تعبیر انہوں نے یہ دی کہ وہ اس مضمون کی وجہ سے ناراض تھے۔

حضرت میکش ہوں یا حکیم مختار احمد یہ ایسی تہذیب کے پروردہ بزرگ ہیں جو مرحومین کے سوانح میں ایسے واقعات کا تذکرہ برداشت نہیں کر سکتے۔ فانی کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے کے لیے ان واقعات سے صرف نظر کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ اخلاقی نقطۂ نظر کو میں نے کہیں اپنے مقالے میں جگہ نہیں دی طوائفیں اگر فانی کی منظور نظر رہیں اور فانی نے ایک سے زیادہ عشق کیے تو میرے خیال میں اس سے ان کی فنکارانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

حیاتِ فانی سے متعلق واقعات اور روایات بیان کرنے میں میں نے پوری احتیاط برتی ہے تحقیق کا وہ طریقہ جو احادیث جمع کرنے کے سلسلے میں برتا گیا آج کے زمانہ میں ممکن نہیں ۔ اس قدر احتیاط کے باوجود آپ دیکھتے ہیں کہ من گھڑت احادیث کا کتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ میں نے یہ ضرور کیا ہے کہ دروغ کی ذمہ داری راوی کی گردن ہی پر رکھی ہے اور مختلف بیانات کو سامنے رکھ کر وہی نتائج اخذ کیے ہیں جو قرین عقل ہو سکتے ہیں۔

مختار احمد صاحب نے جو باتیں اپنے مضمون میں تحریر کی ہیں وہ انھیں کے حوالے سے میرے مقالے میں بھی آ جائیں گی میں نے اپنی طرف سے ان کے بیانات میں نہ تو تحریف کی ہے نہ انھیں دبانے کی کوشش کی۔ میں ایک [illegible] ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں فانی کسی کے اسیرِ زلف بھی ہو گئے تھے۔ فانی کے احباب اور جاننے والوں نے اس واقعے کی طرف مبہم اشارے کیے ہیں۔ مثلاً جوش اپنے مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"معاشی ابتری کے ساتھ ساتھ بیچارے کے معاشقے کے اندر بھی فساد رونما ہونے لگا چنانچہ وہی ہوا جو ہونے والا تھا۔ ایک طرف تو ان کی معاشی زندگی کی نبضیں چھوٹ گئیں اور دوسری طرف عاشقانہ زندگی میں ایک رقیب روسیاہ کے ہاتھوں ایک ایسا زبردست زلزلہ آگیا کہ ان کی پوری زندگی کا تختہ ہی الٹ کر رہ گیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ اپنا بوریا بستر باندھ کر لکھنؤ سے آگرہ چلے گئے۔"[1]

بعض اور حضرات نے بھی دبی زبان میں اس واردات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سلطان احمد نے اپنے مضمون "تصویرِ فانی" میں اس کا ذکر کسی قدر صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ فانی کے ایک دلدادہ نے لکھنؤ کے دورانِ قیام میں ان کے مسکن پر اکثر ایک صورت دیکھی تھی جو ایک نامور تعلقہ دار کی دعوتِ گوشہ و نظر کے لیے گروی ہو چکی تھی مگر پھر بھی فانی کے لطفِ صحبت سے خود کو محروم کر لینے پر قادر نہ تھی۔ فانی کے ذوقِ جمال کی یہ نمائش کا ان کے بہت سے احباب کو معلوم تھی۔[2] منشی جعفر حسین صاحب نے جو اٹاوے میں فانی کے عزیز رہ چکے تھے ایک استفسار کے جواب میں ضمناً یہ بتایا کہ جب فانی اٹاوہ آئے وہ لکھنؤ کی کسی طوائف کے عشق میں مبتلا تھے جس کا انتقال ہو چکا تھا۔[3] اس واقعے کے ایک عینی شاہد مختار احمد بدایونی ہیں۔ وہ لکھنؤ میں تین سال فانی کے ہاں مقیم رہے۔ انھوں نے بہت کچھ استفسار کے بعد یہ بتایا کہ لکھنؤ میں تقن جان نامی ایک پچیس تیس برس کی خوبصورت اور مہذب طوائف تھی۔ وہ راجہ صاحب محمود آباد کی منظورِ نظر تھی۔ راجہ صاحب اس کے اخراجات کے کفیل تھے اور ماہانہ تین سو روپے اسے دیا کرتے تھے۔ تقن جان کو فانی سے انس تھا جو بڑھتے بڑھتے عشق کی منزل میں پہنچ گیا تھا۔ وہ اکثر فرصت کے اوقات میں فانی کے ہاں آیا کرتی تھی کبھی ملازم نہ ہوتا تو گھر کے چھوٹے موٹے کام اور کچھ اپنی کر دیا کرتی تھی۔ فانی نے تقن جان سے فنِ موسیقی بھی سیکھا تھا۔ وحید احمد کے مضمون میں بھی فانی کے اس کاروبارِ شوق کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

"غمِ روزگار اس طرح دن دونی ترقی کر رہا تھا۔ الم بالائے الم یہ ہوا کہ غمِ عشق نے بھی ڈیرے ڈال دیے۔ راویِ تحریر یہ کہتا ہے کہ "پاک محبت تھی" اور مجھے اس میں ذرا تامل نہیں۔ اگر پاک محبت نہ ہوتی تو یہ سوز اور درد نہ ہوتا۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار کو فانی نے بیک وقت گوارا کیا ... غرض اس طرح شاعری ان کا سرمایۂ حیات بن گئی۔ مایوسیوں کو برداشت کرنے کی وجہ سے درد و سوز حاصل ہوا۔ عشقِ محبوب نے موسیقی کا فن سکھا کر ترنم پیدا کر دیا۔"[4]

مختار احمد بدایونی کا بیان ہے کہ انھوں نے کبھی فانی کو تقن جان کی طرف ملتفت ہوتے نہیں دیکھا۔ تقن جان چاہتی تھی کہ فانی اس کے ساتھ نکاح کر لیں۔ اس کے لیے اس نے ایک لاکھ روپے کی پیش کش بھی کی تھی۔ جب یہ بات فانی کی بیوی کے علم میں آئی تو انھوں نے بھی رضامندی ظاہر کی لیکن فانی نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ لوگ کہیں گے روپے کے لالچ میں طوائف کو گھر میں ڈال لیا ہے۔[5] ایک روایت یہ بھی ہے کہ فانی نے لکھنؤ میں کسی سے نکاح کر لیا تھا لیکن

---

[1] ساقی (اگست ۱۹۵۰ء) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے معاشقے کی اصل تفصیلات جوش کے ذہن سے محو ہو گئی ہیں اور وہ واقعات انھیں یاد رہ گئے ہیں جو اٹاوے میں فانی کے ساتھ پیش آئے۔ انھوں نے حمید الدین شاہد کی معرفت جو معلومات مہیا کیں وہ اٹاوے میں نور جہاں اور فانی کے معاشقے سے متعلق ہیں۔ جوش کے حافظے نے جو غلطی کی اس کا اندازہ مولویانہ عبارت سے ہوتا ہے۔ جوش نے لکھا ہے کہ اس حادثے کے بعد فانی لکھنؤ سے آگرہ چلے گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ رقیب روسیاہ سے ہزیمت اٹھانے کا واقعہ بعد کو اٹاوے میں پیش آیا [illegible] آگرہ منتقل ہو گئے تھے۔ [2] علی گڑھ میگزین (فانی نمبر) ص ۱۹۵ [3] نثار اٹاوی شخصی مکتوب (مورخہ اگست ۶۲ء)
[4] مختار شخصی مکتوب [illegible] علی گڑھ میگزین (فانی نمبر) ص ۱۱۰ [5] مختار شخصی مکتوب (مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء)

کچھ عرصہ بعد بعض اختلافات کی وجہ سے علٰحدگی اختیار کرلی۔ ان مختلف روایتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو باتیں قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں۔
ایک تو یہ کہ لکھنؤ میں کسی معاشقے کا سلسلہ ضرور رہا۔ دوسرے یہ کہ معاملہ اتنا الجھ گیا تھا اور حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ فانی کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔

[ماخوذ بدایونی فانی حیات شخصیت اور شاعری ص ۴۴۔۴۶]

اس اقتباس کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو میری صحیح پوزیشن واضح ہو جائے گی۔ اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ نتائج اخذ کرنے میں میں نے کافی احتیاط
برتی ہے اور کہیں بھی غیر ضروری طور پر اپنی طرف سے حاشیہ آرائی نہیں کی ہے۔

سبطین احمد صاحب کا مضمون علی گڑھ میگزین (فانی نمبر) میں (جو فانی کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد شائع ہوا) چھپا تھا اور اسی میں مختار
صاحب کا مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ مختار صاحب نے اس وقت اس کی تردید ضروری نہیں سمجھی۔ یہی حال وحید احمد صاحب کے مضمون کا ہے حقیقت
یہ ہے کہ سبطین صاحب نے اپنے مضمون میں جس "رازداں" کا حوالہ دیا ہے اور وحید احمد صاحب نے فانی کے معاشقے کی روداد جس راوی معتبر
کے حوالے سے لکھی ہے وہ مختار صاحب ہی کی ذات گرامی ہے اور مختار صاحب ہی نے پہلی بار تعین جان کے نام کا انکشاف کرتے ہوئے اس معاشقے
(جو ان کے بیان کے بموجب یک طرفہ تھا) تفصیلات۔ تحریراً اور زبانی مجھ تک پہنچائیں۔
(اٹاوے میں نورجہاں سے عشق کا معاملہ ڈھکا چھپا نہ تھا۔ میں اٹاوے جا چکا ہوں وہاں نورجہاں سے اور فانی کے محرمین سے تفصیلی انٹرویو
لیے اٹاوے میں پرانے لوگ نورجہاں کو اب بھی فانی کی نسبت سے جانتے ہیں اور "فانی کی نورجہاں" کہتے ہیں۔

مختار صاحب نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی عبارتوں کو یا تو غور سے پڑھا نہیں یا مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ص ۵۱ پر نورجہاں
سے متعلق یہ عبارت ہے۔

"ایک محفل میں ان (فانی) کا تعارف نورجہاں نامی ایک طوائف سے ہوا جو مین پوری کی رہنے والی تھی اور آٹھ نو سال سے
اٹاوے میں مقیم تھی۔ اس کا مکان نونگ آباد میں فانی کی رہائش گاہ سے قریب ہی واقع تھا۔ وہ غائبانہ فانی سے عقیدت رکھتی
تھی اور ان کی شاعری سے متاثر تھی۔ اس ملاقات کے بعد فانی کی ذات سے بھی اسے دل بستگی پیدا ہو گئی اس وقت نورجہاں کی عمر
بمشکل ۱۶۔۱۷ برس ہوگی"

یہ عبارت میں نے نورجہاں کے حوالے سے قلمبند کی ہے۔ مختار صاحب نے "آٹھ نو سال سے اٹاوے میں مقیم تھی" اور (فانی سے ملاقات کے وقت) نورجہاں
کی عمر بمشکل ۱۶۔۱۷ برس ہوگی۔ ان دو بیانات کو یکجا کرکے یہ مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ گویا فانی کے تعلقات نورجہاں سے اس وقت سے
تھے جب وہ سات آٹھ برس کی تھی۔ جب کہ عبارت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ جب فانی کا نورجہاں سے تعارف ہوا اس وقت اس کی عمر ۱۶۔۱۷
برس تھی اور وہ اس تعارف کی گھڑی سے کوئی آٹھ نو برس پہلے سے اٹاوے میں مقیم تھی۔

مختار صاحب کے دوسرے اعتراضات بھی ایسے ہیں۔ ان کی تردید اور صحت کے لیے میری کتاب کا مطالعہ کافی ہے۔

چوتھی قسط

کرشن چندر

مشینوں کا شہر

ساتواں باب

پھر پندرہ برس گزر گئے۔

جاوید ملک نرنیدر گھوش کے ڈرائینگ روم میں گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ لئے اندر آیا اس نے بادل سے پوچھا "کیا سیما ابھی تک سو رہی ہے؟"

"ہاں سو رہی ہے"

"اور اسے کچھ معلوم نہیں"

"نہیں" بادل نے آہستہ سے کہا "اسے کچھ معلوم نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آج کم سے کم آج کچھ نہ ہو۔ یہ کیا لائے ہو؟"

"میں نے یہ ایک نئے قسم کا گلاب تخلیق کیا ہے اس کا میں نے نام رکھا ہے شفق"

"اسے دیکھ کر مجھے آج سے پندرہ برس پہلے کی سیما یاد آتی ہے۔ اس کے رخساروں کا رنگ ایسا ہی تھا"

"اب بھی ایسا ہی ہے" جاوید ملک نے آہستہ سے کہا "سیما کو ہمارے ہاں آئے ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ آج پندرہ برس پورے ہو گئے۔ بادل یاد ہے"

بادل نے رک کر کچھ سوچا۔ پھر آہستہ سے مسکرا اٹھا "تم نے ٹھیک یاد دلایا۔ جاوید۔ ٹھیک پندرہ برس پہلے آج کے دن وہ یہاں آئی تھی۔ میں بھول گیا۔ مگر تمہیں کیسے یاد رہا"؟

"جو چیز جس کے پاس ہوتی ہے وہ اسے بھول جاتا ہے" پروفیسر جاوید ملک نے آہستہ سے کہا "دوسروں کو یاد رہتی ہے"

اس کی آواز عجیب سوگوار سی تھی مگر بادل کو کچھ اندازہ نہ ہوا۔ وہ کسی اور ہی خیال میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک تپائی پر سے دوربین اٹھائی اور سمندر کی طرف اس کا رخ کر کے دیکھنے لگا پھر مایوسی سے بولا "اٹمسٹم جہاز ابھی تک نہیں پہنچا۔ مجھے ڈر ہے"

"چپ رہو" جاوید ملک بولا "کہیں وہ سن نہ لے"

بادل نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ڈرائینگ روم سے ملحق ایک چھوٹا سا چیمبر تھا۔ جس سے لگا ہوا سیما کا بیڈ روم تھا۔ چیمبر کے دروازے پر سیما کی خاص نوکرانی چنچل کھڑی تھی۔

"کیا ہے چنچل"؟ بادل نے پوچھا۔

"سیما میم صاحب جاگ گئی ہیں اور اب غسل کر رہی ہیں"

"اچھا"

جب چنچل واپس چلی گئی۔ تو جاوید ملک نے کہا "اگلے سال میں اس سے بھی بہتر گلاب سیما کی خدمت میں پیش کروں گا"

"کون سا اگلا سال"؟

"جانے اس وقت طہران میں کیا ہو رہا ہو گا"؟

"طہران میں اور برلن میں اور نیو یارک میں۔ پیکنگ میں۔ اور ٹوکیو میں . . . ."

"چنچل" سیما کی آواز ڈرائینگ روم تک پہنچی۔ بادل اور جاوید ملک دونوں چونک سے گئے۔

بادل اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر گیا۔

سیما تیار ہو کر غسل خانے کے دروازے سے ایک بڑا سا تولیہ لپیٹے کھڑی تھی۔ بادل نے ایک نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوبصورت تھی اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔

بچے عورت کے حسن کو تباہ کر دیتے ہیں۔ سیما بچہ چاہتی تھی۔ ایک نہیں ایک درجن۔ مگر بادل بچوں کے خلاف تھا۔ نہ صرف بادل بلکہ اس کا باپ پروفیسر آبجے گھوش بھی جب تک زندہ رہا بچوں کے خلاف رہا۔ آبجے گھوش کو مرے ہوئے بھی لگ بھگ چار برس ہو گئے تھے مگر بادل ابھی تک اپنے باپ کے بنائے ہوئے اصولوں پر چل رہا تھا۔ کبھی کبھی سیما سے اسکے بچوں کے معاملے میں لڑائی جھگڑے بھی ہو جاتے مگر جلد ہی دونوں روٹھے ہوئے عاشق مان جاتے۔ کیونکہ پندرہ برس گزر جانے کے بعد وہ آج بھی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

"چنچل کہاں ہے؟" سیما نے دروازے پر کھڑے کھڑے اپنے بڑے تولیے سے ستر پوشی کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا

"تم ایک تصویر کی طرح خوبصورت ہو" بادل بولا۔

اتنے میں چنچل اپنے دونوں بازوؤں میں سیما کا نیا ڈریس اٹھائے ہوئے آگئی اور غسل خانے کا دروازہ چنچل نے اندر سے بند کرتے ہوئے بادل کی طرف زبان نکال کر اس کا منہ چڑا دیا۔

"وہ سب ... کمبخت اٹھ گئے" چنچل دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

"وہ لوگ؟"

"وہ ..."

"کیا روز لوگ ...؟"

"میں تو ان کو اس نام سے کبھی نہ پکاروں" چنچل سر ہلا کر بولی۔

"ہوا کیا ہے؟" سیما نے پوچھا اور تولیہ اتار دیا۔

چند لمحوں کے لئے تو چنچل سیما کا بے داغ حسن دیکھتی رہی جیسے وینس سمندر کی سیپی سے نکل آئی ہو۔ پھر اسے اپنی بات یاد آگئی۔ بولی۔

"اس موٹے کو بھی وہ بیماری ہو گئی ہے۔ آج صبح صبح جب میں ڈرائنگ روم صاف کرنے گئی تو وہ ساتھ کی لائبریری کے کمرے میں سے مجھے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں بھاگی بھاگی گئی تو دیکھا کہ وہ موا اپنے دانت بھینچ رہا ہے اور مٹھیاں کس رہا ہے اور لائبریری میں رکھے ہوئے کالبد اس کے بت پھینک پھینک کر توڑ رہا ہے۔"

"کون سری دھر؟" سیما نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں وہی موا کمبخت سری دھر۔ جانے تم نے اس کو یہ نام کیوں دے دیا اسے تو کسی دھرم مذہب میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔ رام اور کرشن کی تصویریں جو لائبریری میں ٹنگی تھیں۔ انھیں اتار اتار کر پھاڑ رہا تھا۔ میں تو ڈر کے بھاگی۔ یہ کیسی منحوس جگہ ہے مالکن۔ تم نے مجھے طہران سے یہاں کیوں بلوا بھیجا؟"

"اتنی تو منت سماجت کی میں نے تجھے بلوانے کی خاطر" سیما بولی بادل سے کہا۔ ایک نوکرانی کے بغیر یہ کام نہیں چلے گا۔ وہ کہنے لگا ایک عورت کے بدلے ایک درجن روبی عورتیں رکھ لو۔ مگر مجھے تو چنچل چاہیئے تھی۔"

"کتنے برے ہیں یہ روبو۔ میں تو سچ مچ ان سے بہت ڈرتی ہوں۔ سری دھر کے نزدیک تو تمہارا اکتا بھی نہیں جاتا۔ تمہارا طوطا بھی اس سے ہری مرچ نہیں کھاتا۔"

"طوطے کو کیا سمجھ ہے۔ میری چولی ٹھیک سے کس دو۔"

چنچل بڑبڑاتی ہوئی سیما کی چولی ساڑھی ٹھیک کرنے لگی۔

دو بار سیما نے آئینے کے سامنے گھوم کر اپنی خوبصورتی کا جائزہ لیا۔ حیرت ہے وقت کا میری خوبصورتی پر کوئی اثر نہیں ہوا الٹے اس کے کہ جسم ذرا گدرا گیا ہے۔ اس سے وہ اور بھی سندر ہو گیا ہے سیما نے تنقیدی نگاہوں سے اپنے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے آئینے میں کئی بار دیکھ کے سوچا۔ پھر بولی "یہ ایسی اچھی خوشبو کہاں سے آرہی ہے؟"

"ڈرائنگ روم سے ... پروفیسر جاوید ملک ... کے لئے ایک نیا گلاب لائے ہیں۔"

سیما جلدی جلدی ڈرائنگ روم میں چلی گئی گلے میں گلاب کا ایک شگفتہ ...

"اوہ بادل ـــــ یہ پھول کس لئے؟ تم بتاؤ؟"
"کیا بتاؤں۔ آج میری سالگرہ تو ہے نہیں"۔
"آج میری خوشیوں کی سالگرہ ہے"۔
"کیا مطلب؟"
"آج سے پندرہ برس پہلے تم میرے پاس آئی تھیں"۔
"آج ہی ـــ کیا سچ مچ۔ تمھیں یاد رہا ـــ"؟
سیما باہیں پھیلائے ہوئے بادل کی جانب بڑھی۔ چنچل ناک سکوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔
بادل نے سیما کو پیار کیا۔ دیر تک اسے اپنی باہوں میں بھینچے رہا ـــ پھر اسے آزاد کرتے ہوئے بولا ـــ سچ پوچھو تو مجھے یاد نہ رہا تھا۔ مگر ان سب کو یاد تھا۔
"کن سب کو"؟
"جاوید ملک کو اور ڈاکٹر پارکنز کو اور بڈھے پروفیسر پاٹل کو۔ ذرا میری جیب میں ہاتھ ڈالو تو"۔
سیما نے اس کی داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ موتیوں کی ایک لمبی مالا نکلی۔ جسے دہرا کر کے سیما نے اپنے گلے کے گرد پہن لیا۔
"اوپن ہائمر کا تحفہ ہے"۔ بادل بولا "اب دوسری پاکٹ میں ہاتھ ڈالو"۔
سیما نے دوسری پاکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ تو اس کے ہاتھ میں ریوالور آگیا ـــ سیما نے گھبرا کر اسے اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ریوالور آواز پیدا کرتا ہوا سنگ مرمر کے فرش پر گیا۔
"یہ کیا"؟
بادل نے ہات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا "یہ غلطی سے نکل آیا ـــ ایک بار پھر اسی پاکٹ میں ہاتھ ڈالو"۔
"مگر تم تو کبھی جیب میں ریوالور نہیں رکھتے تھے؟" سیما نے سہم کر پوچھا۔
"غلطی ہو گئی"۔ بادل نادم ہو کر بولا "اب ڈالو اسی پاکٹ میں ہاتھ"۔
سیما نے پھر اسی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو ایک

چینڈل کی بنی ہوئی نٹ راج کی مورتی اس کے ہاتھ میں آگئی ـــ
"یہ بڈھے پاٹل کا تحفہ ہے"۔
سیما ہنس کر بولی "یہاں تمہارے میرے اور چنچل کے سوا اور کون بڈھا نہیں ہے اور ہم بھی کون سے جوان رہ گئے ہیں"۔
"وہ چاکلیٹ کا ڈبہ دیکھ رہی ہو۔ ولیم جیگر نے بھیجا ہے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ سے۔ اور وہ ہاتھی دانت کا تاج محل شیخ مقصود کا تحفہ ہے۔ اور وہ تپائی پر رکھا ہوا اچھی ٹیکھا ڈاکٹر پارکنز کا تحفہ ہے"۔
"ان سب لوگوں کو آج کا دن یاد رہا"؟
"اب میری جگہ سے باہر سمندر کی طرف دیکھو"۔
"کہاں"؟
"ادھر کھڑکی میں آؤ"۔
سیما کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بادل اسے ایک فرنچ کھڑکی کے قریب لے گیا۔
سیما بولی ـــ جب تم میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہو۔ مجھے ان انگلیوں کا لمس محسوس ہوتا ہے جو اب نہیں رہیں"۔
"وہ دیکھو"۔ بادل نے کہا۔
"کہاں دیکھوں"؟
"بندرگاہ کی طرف"۔
"کوئی نیا جہاز ہے۔
"تمہارا بحری جہاز ہے... میرا تحفہ... تمہارے لئے"۔
"میرے لئے..... کا کیا مطلب"؟
"اب فیکٹری کے قانون تمہارے لئے بدل دیے گئے ہیں۔ آج سے تم اس بحری جہاز پر دنیا کے کسی بھی حصے میں جا سکتی ہو"۔
"اوہ... !" سیما بادل کے سینے سے چمٹ گئی پھر کچھ دیکھ کر ٹھٹکی۔ آہستہ سے سہمتے ہوئے ڈرتے ہوئے کہنے لگی "بادل مگر اس جہاز پر تو توپیں ہیں۔ یہ تو گن بوٹ ہے"۔
"گن بوٹ نہیں ہے۔ ایک بڑا اور مضبوط بحری جہاز

ہے جس پر تم ایک ملکہ کی طرح سفر کر سکو گی"
"مگر تو یوں کے ساتھ؟ اس کا مطلب کیا ہے بادل؟
کیا کوئی بری بات ہو چکی ہے۔ یا ہونے والی ہے"؟
"یہ موتیوں کی مالا تمہیں کیسی لگی"؟
"میرے سوال کا جواب دو" سیما نے بادل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا——
"کیا جواب دوں"؟ بادل بولا— "ایک ہفتے سے کہیں سے کوئی خط ہی نہیں آیا۔
"کوئی تار——؟" سیما نے پوچھا۔
"تار بھی نہیں"
"اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے"
"چھٹی" بادل نے کندھے اچکا کر کہا "ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں——"
"تو آج تم سارا دن میرے پاس رہ سکتے ہو"
سیما نے بادل کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
بادل نے اسے چوم کر کہا "کیوں نہیں——یعنی——کہ——دیکھیں گے"
سیما کچھ سوچتے ہوئے بولی "آج سے پندرہ برس پہلے جب میں یہاں آئی تھی۔ تو سولہ برس کی لڑکی تھی اور دل میں ایک مقصد لے کر آئی تھی۔ اور وہ مقصد تھا ان لوگوں کو تمہارے خلاف، انسانوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا"
بادل بولا "یہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی نرٹ—بولٹ، اسکرو، پیچ پاکس کو بغاوت پر آمادہ کرے...."
مگر پاسے بنا بیان جاری رکھا۔ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں بولی "جب میں آئی تو مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک چھوٹی سی لڑکی جنگل کے بڑے بڑے درختوں میں کھوی کھڑی ہوں۔ میری خود اعتمادی کو ٹھیس سی لگی۔ مگر میں کہہ سکتی ہوں کہ ان پندرہ برسوں میں میرے اعتماد نے کبھی شکست نہیں کھائی —— اس وقت بھی جب حالات تمہارے خلاف جانے لگے"

"تمہارا اشارہ کن حالات کی طرف ہے"
"یاد کرو۔ جب امریکہ میں مزدوروں نے روبوٹوں کے خلاف بغاوت کی اور جب یا تھیوں نے روبوٹوں کو ہتھیار دیئے اور وہ اتنے اچھے سپاہی ثابت ہوئے کہ مختلف حکومتیں انھیں سپاہی کے طور پر اپنی فوجوں میں لازم رکھنے لگیں"
"یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی۔ لیکن یہ مشکلیں بھی دور ہو جائیں گی۔ دنیا میں کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے۔ جس کا حل موجود نہ ہو—— کہیں نہ کہیں"
سیما اپنی انگلی سے سورج کی ایک ٹیڑھی لکیر بادل کے رخسار پر کھینچتے ہوئے بولی "بادل اپنے باپ کے مرنے کے بعد تم ہی اس فیکٹری کے جنرل منیجر ہو" تم چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو"
"کیا کروں"؟
سیما کے منھ سے ایک آہ سی نکلی اس نے دھیرے سے کہا——
"بادل یہ فیکٹری بند کر دو—— آؤ۔ یہاں سے چلے جائیں"
"یہ تم کیوں کہہ رہی ہو"؟
"میں اس جگہ سے اکتا چکی ہوں" کیا واقعی ہم کبھی یہاں سے نہیں جائیں گے——"؟
"تمہارا مطلب ہے ہم آج ہی چلے جائیں"؟
"بادل۔ جانے کیا بات ہے رہ رہ کر آج میرا دل بری طرح دھڑکتا ہے"
"کیا بات ہے"؟
"لگتا ہے کوئی ان ہونی بات ہونے والی ہے۔ جیسے آسمان سر پر گر پڑے۔ اوہ—— یہاں سے چلو بادل—— اس دنیا میں کوئی ایک ایسی چھوٹی پیاری سی جگہ تو ہوگی جہاں ہم اس دنیا کی [illegible] اپنے لئے ایک گھر بنا سکیں [illegible]"

بادل کچھ کہنے کو تھا۔ عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
بادل نے ریسیور پر کچھ سنا ــــ بولا "اچھا میں ابھی آتا ہوں۔" پھر سیما کی طرف مڑ کر کہنے لگا "ڈاکٹر پارکنز نے مجھے بلایا ہے فوراً۔"

وہ ڈرائنگ روم سے باہر جاتے جاتے پھر مڑ کر بولا "آج گھر سے باہر کہیں مت جانا۔"

سیما نے اپنے آپ سے کہا ــــ بادل ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے ــــ پھر چنچل کو آواز دے کر بولی "چنچل ــ چنچل یہاں آؤ۔"

جب چنچل اس کے پاس آئی تو سیما نے اس سے کہا "ذرا بھاگ کر جلدی سے صاحب کے کمرے میں جاؤ اور آج کے اخبار اٹھا لاؤ۔ جتنے بھی ہیں ــ"

"لاتی ہوں۔" چنچل بڑی ادا سے منہ سکوڑتی ہوئی بولی "مگر صاحب سب اخبار ادھر ادھر ڈال دیتے ہیں ــ ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔"

چنچل کے جانے کے بعد سیما نے دوربین اٹھائی اور اس بحری جہاز کو غور سے دیکھا۔ بحری جہاز کا نام پڑھا "انتم۔" اس نے یہ بھی دیکھا کہ روبو جہاز میں سامان چڑھا رہے ہیں۔

چنچل اخبار اٹھا لائی ــــ اور اپنی مالکن کے قدموں میں بیٹھ کر انھیں سلسلے وار لگانے لگی۔

یہ اس ہفتے کے اخبار ہیں۔ کوئی صفحہ نہیں ہے تو کہیں۔"

"پڑھو۔ کیا سرخیاں ہیں۔"

"جنگ۔"

"جنگ تو ہوتی رہتی ہے اس دھرتی پر۔ کسی نہ کسی جگہ جنگ ہوتی رہتی ہے" اور جنگ کیوں نہ ہو یہ موئے روبو ہر جگہ لڑتے رہتے ہیں۔"

"اس میں بادل کا کوئی قصور نہیں۔ اسے فیکٹری کے آرڈر پورے کرنے پڑیں گے۔ آرڈر آ جائیں گے تو سپلائی بھی ہوگی۔"

"اسے روبو بنانے ہی نہیں چاہیے۔" چنچل بھڑک کر بولی۔

"دیکھو تو مالکن ان اخبار میں کیا لکھا ہے۔" اور سیما کے جواب کا انتظار کیے بغیر پڑھنے لگی "روبو [illegible] جنگ پر بھیجے جاتے

ہیں تو دشمن کے کسی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑتے ــ انھوں نے یہاں میرا شہر میں سات لاکھ شہری جان سے مار دیے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ روبوؤں نے ضرور اپنے کمانڈر کے حکم کی تعمیل کی ہوگی۔ اخبار مجھے دکھاؤ۔" سیما بولی اور پھر اس نے اخبار چنچل کے ہاتھ سے چھین لیا۔

میڈرڈ میں حکومت کے خلاف بغاوت ــ روبوؤں کی پیادہ فوج نے بغاوت کر دی۔ چھ ہزار شہری مار ڈالے۔

اتنے میں چنچل نے دوسرا اخبار اٹھا لیا تھا۔ وہ اس کی سرخی پڑھ کر چیخ اٹھی ــــ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ پیرس میں روبوؤں کی پہلی لیگ قائم ہو چکی ہے ــ روبو سپاہیوں، مزدوروں اور جہازیوں نے ایک مینی فسٹو چھاپا ہے۔ جس میں اپنے روبو بھائیوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ انسانوں کے خلاف متحد ہو جائیں۔

سیما نے اخبار کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر پرے کر دیا ــ بولی۔ "یہ موئے اخبار والے ہمیشہ بری خبریں پہلے صفحے پر چھاپتے ہیں۔ انھیں اٹھا لے جاؤ۔"

چنچل نے ایک اور اخبار اٹھایا۔ بولی "اس کی سرخی یہ ہے کہ پچھلے ہفتے ساری دنیا میں کسی انسانی آبادی میں ایک بچے کا اضافہ بھی نہیں ہوا ــ اس کا کیا مطلب ہے بی بی جی۔؟"

"چنچل انسانوں نے بچے پیدا کرنا بند کر دیے ہیں۔ وہ اپنے سب کام روبو سے لیتے ہیں۔ اور اس قدر آرام طلب ہو چکے ہیں کہ۔"

"تو یہ دنیا کا انت ہے۔ انسان کو اس کے کیے کی سزا مل رہی ہے۔"

سیما کچھ کہنے کو تھی کہ اتنے میں پروفیسر جاوید ملک اندر آئے اس کے ہاتھ گیلی مٹی میں سنے ہوئے تھے ــــ

"پروفیسر ــ پروفیسر۔" سیما زور سے چلّائی۔

"جاوید کہو۔"

"ہاں مسٹر جاوید۔"

"صرف جاوید کہو۔"

"آل رائٹ جاوید۔ سچ سچ بتاؤ۔ کیا ہم لوگ واقعی یہ جزیرہ چھوڑ کر اتم جہاز پر کہیں باہر جا رہے ہیں" ؟

"بہت جلد"

"آپ سب لوگ میرے ساتھ جائیں گے ناں" ؟

"ہاں کم سے کم میں تو یہی چاہوں گا"

"بات کیا ہے" ؟

"ہلچل سی ہے"

"کیسی" ؟

جاوید نے سیدھی نگاہوں سے سیما کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا تمہارے بادل نے تمہیں کچھ نہیں بتایا" ؟

"نہیں۔ مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے۔ جیسے میں کوئی بہت بُری خبر سُننے والی ہوں"

"میں نے ابھی تو ایسی کوئی خبر نہیں سنی"

"میں صبح سے گھبرا رہی ہوں۔ ایسے میں دعا مانگنے کو جی چاہتا ہے جاوید کیا تم بھی کبھی دعا مانگتے ہو" ؟

"ہاں۔ میں ذرا پرانے خیال کا انسان ہوں۔ ہوں سارا خدا گر ذرا پرانے خیال کا۔ کبھی کبھی دعا مانگتا ہوں۔

"چنچل کی طرح" ؟

"کیا چنچل بھی دعا مانگتی ہے" ؟

"ہر روز میں اپنے مالک سے دن خیریت سے گزر جانے کی دعا مانگتی ہوں" چنچل بولی۔

جاوید بولا "تو سن لو۔ میں بھی ہر روز دعا مانگتا ہوں"

"تمہاری دعا کیسی ہوتی ہے" ؟

"میں کہتا ہوں — میرے اللہ میں بڑا شکر گزار ہوں تو نے مجھے کام دیا۔ اب میرے ساتھیوں کو عقل دے جو گمراہ ہو چکے ہیں۔ اے خدا۔ میرے کسی ساتھی کو تکلیف یا گزند نہ پہنچے۔ سیما ہماری امانت ہے اسے محفوظ رکھ"

"تم جاوید میرے لئے دعا مانگتے ہو" ؟

"ہر روز پچھلے پندرہ سال سے۔ جس دن سے تمہیں دیکھا ہے"

سیما کچھ پریشان ہو جاتی ہے۔

جاوید گھبرا کر نظریں جھکا لیتا ہے۔

دونوں کے درمیان ایک بے حد لطیف لمحہ ایک پل کی طرح گزرتا ہے۔ یکایک اس پل کو سیما نے اپنی گفتگو سے توڑ دیا جھٹک کر توڑ دیا۔ جذبوں کے پل جھٹکوں ہی سے ٹوٹتے ہیں ان کے لیے کسی ڈائنامیٹ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

"جاوید اس دعا سے تمہیں کیا فائدہ ہوتا ہے" ؟

"فائدہ ہو نہ ہو۔ ہر وقت پریشان رہنے سے تو بہتر ہے"

"کیا یہی تمہارے لیے کافی ہے" ؟

"کافی تو نہیں ہے" جاوید نے اسے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "مگر جب کچھ کافی نہ ہو — تو دعا ہی کافی ہوتی ہے"

چنچل بول پڑی "لیکن اگر آپ دیکھیں کہ انسان اُس کی انسانیت آپ کی آنکھوں کے سامنے تباہ ہو رہی ہے"

"میں تو دیکھ رہا ہوں" جاوید نے چنچل کی بجائے سیما کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سیما نے پوچھا "کیا خیال ہے تمہارا انسانیت تباہ ہو جائے گی" ؟

"ہاں — اگر ہم نے — اگر ہم نے"

"اگر کیا" ؟

"کچھ نہیں" جاوید نے دھیرے سے کہا۔ اب اس نے جھٹکا دے کر اس پل کو توڑ دیا۔ اور آہستہ سے سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ اتنا کسی بات سے نہ ڈری تھی۔ جتنا جاوید کی خاموشی سے کمرے سے نکل جانے سے ڈر گئی تھی۔ اس نے چنچل سے کہا۔

"سری دھر کہاں ہے" ؟

"لائبریری میں ایک کرسی پر بندھا پڑا ہے"

"اس کی رسیاں کھول کر اسے یہاں لے آؤ"

"اگر اس نے مجھ سے کچھ کہا" (باقی صفحہ ۱۴۲)

اتیھل مینن

مترجمہ: سلطانہ آصف فیضی

بھولے بچھڑے

جس وقت میں ہوٹل کے نشست گاہ میں داخل ہوئی تو خلیل میرے انتظار میں وہاں موجود تھا۔ یہ فراخ و کشادہ کمرہ قریب قریب خالی تھا۔ صرف ایک طرف تین یا چار آدمی بیٹھے کچھ بحث مباحثے میں مشغول تھے میں نے سوچا شاید اقوام متحدہ کی مشاہدہ کرنے والی ٹیم ہوگی یا برٹش پارلیمنٹ یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے آئے ہوں گے کیونکہ جون کی جنگ کے بعد زائرین کی آمد کم ہی رہی تھی اور گرمی کے شروع ہو جانے سے یوں بھی زائرین کم ہو جاتے ہیں۔ اس وقت عمان میں کافی گرمی ہو چلی تھی۔

خلیل اس بڑے کمرے کی پرلی طرف سے جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا میری طرف آیا۔ تین سال قبل ۱۹۶۵ء میں جب میں اس سے ملی تھی اور جیسا مجھے یاد تھا اب بھی ویسا ہی خوبصورت تھا۔ پھر بھی وہ کچھ بدلا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تیس اکتیس کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کی جوشیلی مسکراہٹ بھی ویسی ہی تھی۔ مگر اب اس مسکراہٹ کا اثر اس کی آنکھوں تک نہ پہنچا بلکہ اس کے منہ کے دونوں طرف لکیریں سی آگئیں تھیں۔

اس نے میرا ہاتھ ایک معذرت سے تھام لیا کہ وہ مجھے اپنے بھائی کے گھر نہیں لیجائے گا کیونکہ وہاں تو بیت المقدس اور رملا سے آئے ہوئے عزیز و رشتہ داروں سے گھر بھرا پڑا ہے، وہاں آرام سے گفتگو کا موقعہ تک نہ ملے گا۔

میں نے جواب دیا بیشک میں یہ سب مشکلیں خوب سمجھ سکتی ہوں چلو وہ اندر میں چل کر بیٹھیں۔ یہاں تو ایئر کنڈیشن بھی نہیں ہے وہاں ٹھنڈے میں ہوا آ رہی ہوگی۔

اب جب ہم باہر برآمدے میں بیٹھ گئے تو ایک ملگجی صورت دبلے پتلے نوجوان نے ٹھنڈا شربت پیش کیا۔ یہ نوجوان قریب کے کسی ریفیوجی کیمپ سے آکر یہاں کام کرتے تھے جیسا ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے بھی آیا کرتے تھے۔

جب ہم دونوں شربت پی کر اپنا اپنا سگرٹ سلگا چکے تو خلیل نے اپنا حال کہنا شروع کیا کہ "مجھے کسی سے تو اپنا حال کہنا ہی تھا۔ کوئی غیر ملکی ہمدرد جو ہمارے دکھ درد کو سنے۔ یہاں تو ہم کوڑا کرکٹ کی طرح ایک دوسرے پر لدے ہوئے بھرے پڑے ہیں آپس میں ایک دوسرے کی مصیبت اور مشکلیں سنتے ہیں اور بحث مباحثہ کے بعد بھی کسی نتیجے پر پہنچتے ہی نہیں ہیں۔ ہر ایک کی اپنی ٹریجڈی اور مشکلیں ہیں۔ ہم لوگ تو اب ایسے ہو گئے ہیں جیسے پانی میں اسپنج ہوتا ہے جو سب پانی ہر طرح کا چوس لیتا ہے۔ اسی طرح ہم سب غم و الم سے بھرے ہوئے ہیں۔ اب اس سے زیادہ مصیبت اٹھانے کی سکت کسی میں باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اسی لئے جب کوئی بھی ——— دوست و ہمدرد باہر سے آتا ہے تو ....."

یہ کہہ کر وہ چپ سا ہو گیا اور اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا گویا التجا کر رہا ہو کہ "تم تو ہماری حالت سمجھتی ہو"۔

کچھ لمحوں کے بعد اس نے پھر گفتگو شروع کی کہ "آپ سے میں دل کھول کر باتیں کر سکتا ہوں۔ اس وقت پہلے میں اپنی منگنی اور خاندانی جھگڑوں میں مبتلا تھا۔ وہ سب باتیں آپ اور ہم بیت المقدس اور عمان میں کر چکے تھے۔ کاش میں عمان ہی میں رہ گیا ہوتا تو ان سب مصیبتوں سے

بیچ گیا ہوتا۔ یہاں بھی میں اچھے کام پر لگا ہوا تھا اور سلمٰی کے بہت سے
دوست یہاں تھے۔ ہم کو ہبرون ہی نہ جانا تھا۔

اس کے لہجے کی تلخی گہری ہو گئی۔

میں نے کہا "تم کو ہبرون میں بہت اچھا کام مل گیا تو قدرتی
بات تھی کہ تم نے وہ قبول کر لیا۔ آخر تم اپنے، سلمٰی اور بچوں کے لئے زیادہ
آرام چاہتے تھے۔ وہاں تمہارا گھر کیسا عمدہ اور آرام کا تھا جو یہاں کے
مکان سے بدرجہا بہتر تھا۔ آخر تمہیں غیب کی خبر تو تھی نہیں کہ آئندہ
کیا ہو گا! اور تم یہاں خوش بھی تو نہ تھے۔"

وہ بے اختیار بول اٹھا "بے شک یہی بات تھی یہ سب سے اہم
بات تھی کہ میں یہاں خوش نہ تھا جب سے ہم لدّا سے ۱۹۴۸ء میں
نکالے گئے تھے۔ مجھے اسکی آرزو تھی کہ ہم اردن کے مشرقی کنارے پر
جا بسوں تاکہ دل کو یہ اطمینان رہے کہ میں فلسطین ہی میں پھر سے آگیا
ہوں۔ اگر روپے پیسے کی ہوس ہوتی تو میں کویت جا سکتا تھا کیونکہ
مجھے اس کا بھی موقعہ مل رہا تھا۔ مگر ہبرون میں رہ کر کام کرنے سے
میں اپنے وطن ہی میں گویا کام کر رہا تھا۔ اسی لئے میں نے یہ کام لے لیا۔
وہاں دو سال ہمارے بہت خوشی و آرام سے گذرے۔ ہمارا مکان
آرام دہ تھا اور وہاں کی آب و ہوا بچوں کے لئے صحت بخش تھی۔
نہ وہاں عمان کی طرح گرمی و گرد و غبار تھا۔ ہم بہت اچھی جگہ پر تھے۔
آپ نے تو دیکھا ہی تھا اسے۔

"ہاں" میں نے کہا "وہ بڑی خوشگوار جگہ تھی۔"

"پھر جون ۱۹۶۷ء کی وہ قیامت خیز صبح۔ جب ہم لٹ گئے۔
سب معاملہ ختم ہو چکا اس وقت صرف یہی بات سمجھائی دی کہ یہاں سے
بھاگو۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وہیں رہے۔ ہمارے ہمسائے جنہیں ۱۹۴۸ء
کا تجربہ نہ تھا وہ وہیں بیٹھے رہے۔ ان کو ہماری طرح ۱۹۴۸ء کا
تجربہ پیش نہیں آیا تھا۔

ہمارے جیسے جنہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان پہ کیا گزرے گی
پریشاں و دل برداشتہ ہو گئے۔ جن کے پاس موٹریں تھیں ہم انہیں
سب لد گئے۔ خود میری کار میں دس آدمی تھے۔ مجھے وہاں سے
بہت [illegible] تمہاں میرے ماں باپ تھے مگر جب ہم وہاں
پہنچے تو وہ عمان کے لئے نکل چکے تھے۔"

مجھے یہ سب معلوم ہو چکا تھا مگر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان
واقعات کو دہرائے بغیر اسے چین نہ آئے گا۔ یہی سب اس نے
پہلے خط میں لکھا تھا اور اب زبانی دہرا رہا تھا۔ اور بہت ہی
تفصیل سے سنایا جا رہا تھا۔

وہ پھر بولا "وہ تو خوش نصیبی سے یہاں میرے بھائی کا
گھر تھا۔ غریب عرفاں۔ اس کا گھر عزیزوں سے بھرا پڑا تھا اور اس کا
بزنس بہت دنوں سے ختم ہو رہا تھا۔ اس صبح ہم نے کوئی چیز اپنے
ساتھ نہ لی۔ صرف اپنے بچوں کو گھسیٹ کے موٹر میں بٹھا لیا اور
دوسرے لوگ بھی ہمارے ساتھ لد گئے۔ شاید ہم سمجھ رہے تھے کہ
کچھ زمانے کے بعد پھر اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔ جب تک یہ واقعہ نہ
ہوا تھا ہم کو یقین نہ تھا کہ اسرائیلی اس طرح سے ہر قصبہ ہر گاؤں
اور ہر گھر میں بھر جائیں گے۔ مگر وہ تو اس طرح سے ہر طرف پھیل گئے کہ
انھیں کوئی نہ نکال سکا۔ اسی طرح سے دن اور مہینے گزرتے چلے گئے۔
ہمارے پاس ایک سے دوسرا کپڑے کا جوڑا نہ تھا۔ ہمارے دوستوں
اور عزیزوں کی مہربانی سے کچھ تھوڑے سے مل گئے تھے مگر اب عمان
میں سردی شروع ہو چکی تھی اس وقت ہم کو وہ عمدہ اونی کپڑے
یاد آنے لگے جو ہم گھر چھوڑ آئے تھے۔ اس وقت بچوں کے لئے انکی
سخت ضرورت تھی۔ سلمٰی میرے پیچھے پڑ گئی کہ میں پرمٹ بنوا کر
ہبرون جاؤں اور صرف بچوں کے اونی کپڑے لے آؤں کوئی اس
کے دینے سے انکار نہ کرے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ جو لوگ
سڑک پر بیٹھے ہوئے ریفوجی پر بم پھینک سکتے ہیں وہ کسی بھی چیز کے
دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔ مگر سلمٰی کسی طرح نہ مانی۔ اور ضد ہی
کرتی رہی کہ وہ تو جنگ کا زمانہ تھا۔ اب وہ فاتح ہیں اور ہر طرف
چین ہے حالانکہ ہمارے گھر میں فوجی بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر میرے
بچوں کے کپڑے ان کے کس کام کے ہوں گے۔ تم پرمٹ لے کے چلے ہی
جاؤ۔ وہاں جو ہمارے دوست احباب ہیں وہ ضرور ہماری طرف
سے سفارش کر دیں گے۔ مجھے اس تجویز پر بھروسہ نہ تھا۔ مگر جب
چھوٹے بچے کو بہرحال کافی کھانسی ہو گئی تو سلمٰی نے رو رو کے کہا کہ دیکھو

اونی کپڑے نہ ہونے سے یہ ہوا اور ہمارے گھر میں بچوں کے کتنے بہت سے اونی کپڑے پڑے ہیں۔ وہ سپاہیوں کے کس کام کے۔ میرے بچوں کے کپڑے۔

میری ماں نے بھی یہی صلاح دی اور عرفان کی بیوی کی بھی یہی رائے ہوئی وہ بولی مرے پاس اب کوئی کپڑا دینے کے لئے باقی نہیں میں سب بانٹ چکی میں نے دیکھا کہ عرفان کی بیوی کی ہمدردی بھی کم سے کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے گھر میں سب ایک پر ایک لدے ہوئے تھے اور کسکے خود اپنے بچے تھے اور اپنی مشکلیں۔

آخر عرفان کی مدد سے میں نے عرضی دے دی۔ چونکہ اسرائیلی لوگوں کو اس طرف جانے کا پرمٹ دے رہے تھے اس لئے کچھ مشکل نہ ہوئی اور مجھے پرمٹ مل گیا۔ سلمیٰ نے اُن کپڑوں کی جو اُسے چاہیئے تھے ایک لسٹ تیار کی۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ وہ کس جگہ رکھے ہوئے ہیں۔ اور اگر ہمارے کچھ گرم کپڑے مل جائیں تو انھیں بھی لانے کی تاکید کر دی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر بن سکا تو اپنی چند کتابیں بھی اُٹھا کر لے آؤں گا۔ پرمٹ کے مل جانے سے کچھ امید جاگ اٹھی۔

اُسی سڑک سے واپس جانا ایک عجیب تجربہ تھا۔ جگہ جگہ جانچ پڑتال کے اڈے تھے ہمارے بھی اور اُن کے بھی پار کئے۔ ہر طرف فوجی کھڑے تھے۔ اسی لئے بیت المقدس پہنچنے تک وقت لگ گیا۔ حالانکہ میں نئی سڑک سے جا رہا تھا اور مجھے شہر میں جانا بھی نہ تھا جہاں کے چپّے چپّے سے کئی یادیں وابستہ تھیں۔ مگر بیت المقدس میں سے گزرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اور اسکو اس طرح دوسروں کے قبضے میں دیکھنا مرے دل پر کیا گزر رہی تھی آپ اندازہ نہیں کر سکتی ہیں۔

اس نے اپنا سگرٹ بجھا کر دوسرا اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلگا لیا۔ میں نے آہستہ سے کہا " مجھے بھی اس کا اندازہ ہے مجھے بھی بیت المقدس سے بہت محبت تھی۔ خیر۔ اب اسکا ذکر نہ کرو۔ پھر تم شہر سے ہوتے ہوئے بیروت کی سڑک پر آ گئے تو . . . . ."

"ہاں۔ سرحد سے بہت قریب۔ پہلے اسرائیلی یہاں سے نکل جانے والی گاڑیوں پر فیر کیا کرتے تھے۔ گویا ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ مگر اب اس کی حاجت نہ تھی کیونکہ وہ ہر طرف

پھیلے ہوئے تھے۔ ٹڈی دل پھیلے ہوئے تھے۔ جب میں بیروت پہنچا تو میرے گھر کے پھاٹک پر ایک فوجی کھڑا تھا۔ یہ وہی پھاٹک تھا آپ کو یاد ہوگا جہاں سے انگور کے منڈوے تک جاتے تھے اور پھر سامنے دروازہ تھا۔ میں نے فوجی کو اپنا پرمٹ دکھلایا تو اُس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ آگے بڑھ کر میں نے دیکھا کہ سامنے کے دروازے پر ایک دوسرا فوجی کھڑا ہے جب میں نے پرمٹ دکھلایا تو اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کو سمجھا کر کہا یہ پہلے میرا گھر تھا۔ میں اس اُمید سے آیا ہوں کہ مجھے میرے بچوں کے کپڑے لے جانے کی اجازت دی جائے۔ میں نے اس سے عربی میں خطاب کیا تو اس نے بھی مجھے عربی میں جواب دیا کہ میرے پرمٹ میں اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ میں اپنے گھر میں جاؤں۔ صرف شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور مجھے اندر آنے ہی نہ دینا چاہئے تھا۔ لہجے سے وہ عراق کا یہودی معلوم ہوتا تھا میں نے اُس سے ایک عرب بھائی کی طرح خطاب کرتے ہوئے عاجزی سے درخواست کی کہ کسی دوسرے کو بلائے جس کے سامنے میں اپنی درخواست پیش کروں۔ یہ سُن کر وہ غصہ سے بولا کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے بلکہ اسرائیلی سولجر ہے اور وہ میری درخواست کسی کے پاس نہیں لے جائے گا کیونکہ مجھے وہاں تک آنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور مجھے فوراً نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ سُن کے مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے چلا کر کہا کہ بیشک تم میرے بھائی نہیں ہو اور عرب دنیا میں جہاں بھی پیدا ہوئے ہو تمہارا دل عرب نہیں ہے۔ اسکے بعد میں اُسے ڈھکیل کے اندر گھسنا ہی چاہتا تھا کہ اسنے ہوا میں ایک فائر کیا جس سے بہت سے فوجی دوڑتے ہوئے آ گئے اور مجھے پکڑ کے زبردستی باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں چیختا رہا کہ مجھے کسی افسر سے ملا دو۔ اور ان سے ہاتھا پائی شروع کر دی اتنے میں ایک افسر کہیں سے نمودار ہوا جس کو دیکھتے ہی سب فوجی مجھے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

افسر نے مجھے بغور دیکھ کر پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟

میں نے اسکو بتلایا کہ یہ میرا گھر تھا اور میں اسکی اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے بچوں کے اونی کپڑے نکال کر لے جاؤں۔ ہم اب عمان میں رہتے ہیں اور وہاں اب بہت سردی ہے۔ اس نے میرا پرمٹ لے کر دیکھا اور واپس دیتے ہوئے بولا " تمہارا گھر اب فوجیوں کے مطالبہ کے لئے

اُن کی حکومت کے قبضہ میں ہے۔ اس میں سے کسی چیز کا لے جانا یا ہٹانا جرم ہے۔

میں نے اس سے کہا" میں ایک چیز بھی نہیں مانگنا چاہتا۔ صرف میرے بچوں کے اونی کپڑے چاہیئے۔ جو بیڈ روم کی الماری کے نچلے خانے میں رکھے ہوئے ہیں۔

اس نے کہا جو چیز فوج کے قبضے میں ہے اُس میں سے ایک چیز بھی لے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ یہ جرم ہے پھر ایک فوجی کو اشارہ کر کے کہا" اسے ہٹا دو"

فوجی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا میں نے ایک جھٹکے سے اُسے چھڑا لیا اور افسر کی طرف گھوم کر کہا" بچوں کے کپڑے مجھے صرف میرے بچوں کے کپڑے چاہیئے"

مگر وہ پلٹ کے چلا گیا اور دو فوجی مجھے زور سے پکڑ کر چلے گھر سے باہر احمد کی کوٹھی کے پیچھے لے چلے اور میں اپنے آپ آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چیختا رہا" بچوں کی چیزیں۔ صرف بچوں کی۔"

فوجی نے مجھے گیٹ سے باہر سڑک کی گرد میں ڈھکیل دیا جہاں میں گر گیا اور پھر مجھے دیکھ کر بولا۔

"اب تو تمہاری سمجھ میں آگیا" پھر مجبور لہجے میں میری نقل کر کے بولا "مجھے صرف بچوں کے کپڑے چاہیئے"

میں چپکی بیٹھی ہوئی سب سنتی رہی اور کچھ نہ بولی۔ کچھ منٹ ہم دونوں خاموش رہے پھر میں نے کہا" شاید میری واپسی سے پہلے ہم ساتھ بازار جا سکیں گے۔ تم اور سلمی مجھے اجازت دو کہ میں بچوں کے لئے کچھ اونی کپڑے خرید دوں۔

اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

پھر وہ بولا" آپ بہت مہربان ہیں مگر اب ایک ہی بچہ زندہ ہے۔ ننھی کو نمونیا ہو گیا اور وہ ختم ہو گئی۔ ہاں اگر وہ اسرائیلی افسر اجازت بھی دیتا تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ مگر سلمی کو بچوں کا یقین کون دلائے۔ اب دوسرے بچے کو لے کر ہم کویت جا رہے ہیں۔ اسی لئے مجھے آپ سے ملنا تھا۔ خدا حافظ کہنے کے لئے۔

■■

کوثر چاندپوری

نیا دھندا

رامو ٹھیلہ خالی کر کے لوٹ رہا تھا مجھے دیکھتے ہی ٹھیلہ سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا پھر دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اس کا منہ کالا تھا ہاتھوں پر بھی کالک لگی ہوئی تھی، ٹھیلے میں جتے ہوئے سفید بیلوں کا رنگ بھی سیاہی مائل لگ رہا تھا۔

بابو جی بندگی اُس نے سیاہی پُتا ہوا ہاتھ ماتھے کی سمت لے جاتے ہوئے کہا۔

کیا کر رہے ہو رامو آج کل؟

دیکھ لیجئے کیا کر رہا ہوں دن بھر کوئلہ ڈھوتا ہوں شام کو ٹھیلہ مالک کے حوالے کر دیتا ہوں وہ دو ڈھائی روپے دیدیتا ہے مزے سے پیٹ بھر کر کھا لیتا ہوں دونوں وقت۔

کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے۔

بنا روپئے کے کوئی دھندا نہیں کر سکتا پچھلے مہینے تک پاتھ پر بیٹھ کر چپل بیچنے لگا تھا جب چپل ہاؤس کا منیجر نہ جانے کیوں خفا ہو گیا مال دینا بند کر دیا، روٹیوں کے لالے پڑ گئے بڑی مشکل سے ٹھیلہ والے کو رضامند کیا پہلا آدمی بھاگ گیا تھا بیل بیکار کھڑے گھاس دانہ کھا رہے تھے اس نے ٹھیلہ میرے سپرد کر دیا اور بہت زور دے کر کہا کہ بیلوں کو دوڑانے کی کوشش نہ کروں بالکل قدم چال چلاؤں آر ہرگز نہیں لگانی چاہیئے بیلوں کی چمڑی بہت نازک ہے لہو بہنے لگتا ہے بارہ بجے انھیں پانی پلانا یاد رکھوں اور جتنا وزن کوئلے والے سے طے ہو گیا ہے اس سے زیادہ کا کوئلہ کبھی نہ بھروں صبح سے شام تک بیلوں کی دُمیں مروڑتا ہوں بہت دھیرے چلتے ہیں غنیمت ہے پیدل تو نہیں چلنا پڑتا۔

کبھی کبھی موٹر پر اترنا بھی پڑتا ہے کوئی موٹر والا زور سے ہارن بجا دیتا ہے تو چونک [illegible] بابو جی جن سڑکوں پر موٹریں دوڑتی ہیں ان پر ٹھیلہ ہانکتے ایسا لگتا ہے جیسے ابتک گاؤں میں رہ رہا ہوں جہاں جیون بیلوں اور بھینسوں کے چاروں طرف گھومتا رہتا ہے۔

رامو جس دوکان پر کوئلہ ڈالتا تھا وہاں بڑے بڑے ڈھیلوں کو توڑ کر ذرا ذرا سے ٹکڑوں میں تبدیل کیا جاتا تھا اس کے بعد تول کر بوروں میں بھرا جاتا تھا جلد ہی ہوٹلوں والے سارے بورے اُٹھا لے جاتے تھے اور جب تک رامو دوسرا ٹھیلہ بھر کر لاتا تھا پہلا کوئلہ ہوٹلوں کی انگیٹھیوں میں دہکنے لگتا تھا اس طرح کوئلہ لانے اور دہکنے کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا جس ہفتہ میں کوئلہ کی کمی پڑ جاتی شہر بھر میں غل ہو جاتا دیگچیوں سے کھانے اور چائے کی بھاپ اٹھنا بند ہو جاتی لکڑی اور تیل کے چولہوں پر کام ہونے لگتا۔ رامو کی روٹی چلتی رہتی مگر اسے اطمینان تھا کوئی بیل لنگڑا ہو جاتا یا اُس کے پیروں کے نعل بدلوانے پڑ جاتے تو رامو کی مزدوری آدھی رہ جاتی وہ صرف چائے پی کر دن گزارتا وہ چاہتا تھا کوئی ایسا کام مل جائے جس میں ہاتھ اور کپڑے کالے نہ ہوں وہ خوب جانتا تھا کہ اس کے رنگ اور کوئلے کی سیاہی میں تھوڑا ہی فرق ہے پھر بھی وہ اپنی کھال پر کوئلے کی رنگت چڑھتی نہ دیکھ سکتا تھا اسے اپنے رنگ سے محبت اور کوئلے کی کالک سے نفرت تھی، وہ ذرا دیر ٹھہر کر تیزی سے بھاگا۔

جا رہا ہوں بابو جی ٹھیلہ کا چالان ہو جائے گا۔

میں دور تک اُسے جاتے دیکھتا رہا اس کے کپڑوں سے بھوٗ، رات کا ستایا پیٹا محسوس ہو رہا تھا وہ کود کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بیلوں کی دموں کو ہاتھ لگا کر منہ سے ٹھکاری کی آواز نکالی،

راموکئی بار میرے آفس کے سامنے سے گزرتا کبھی کوئلے سے بھرا ہوا ٹھیلا ہانکتے ہوئے اور کبھی خالی ٹھیلا بھگاتے ہوئے میں فرصت میں ہوتا تو کرسی چھوڑ کر ورانڈے میں آجاتا اور اُسے ہاتھ کے اشارے سے بلا کر چائے والے سے کہتا۔

سروپ راموکو ایک کپ چائے پلادو

راموکھلکھلا کر ہنس پڑتا اس کے سفید دانت کالے چہرے پر یوں چمک اُٹھتے جیسے کسی بچے نے سلیٹ پر گنتی لکھدی ہو نیچے اوپر گنتی کی دو لکیریں نظر آنے لگتیں اور میری نگاہوں کے سامنے لنگورے اچکنے لگتے نظیر اکبر آبادی کا شعر اچانک ذہن میں گونج اٹھتا، راموکئی سال میرے آفس میں صفائی مین کی حیثیت سے کام کر چکا تھا میرا بہت خیر خواہ تھا میں اُسی وقت سے اس کو جانتا تھا وہ اب تک مجھ سے مانوس تھا نہ جانے کیوں اُس نے یہ نوکری چھوڑ دی تھی اور مزدوری کرنے لگا تھا اسکے مزاج میں بڑی تیزی اور گرمی تھی ایک ہی پل میں زندگی کے بڑے بڑے بڑے مرحلہ کا فیصلہ کر ڈالتا تھا ایک زمانہ میں وہ کسی لڑکی سے شادی کرنے کی کوشش کر رہا تھا کئی مرتبہ مجھ سے مشورہ لینے آیا میں نے اسکی بے چینی کا اندازہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

کیا نام ہے راموا اس کا؟

دلاری دیوی! ـــــ اس نے بڑی عجلت سے جواب دیا تھا۔

بڑا اچھا نام ہے صورت بھی ضرور ایسی ہی ہوگی تم ضرور اس سے بیاہ رچالو بہار آجائے گی تمھارے جیون کی سوکھی اور اجاڑ بغیا میں

پندرہ دن بعد وہ آیا تو رنگ بدلا ہوا تھا کہنے لگے

چھوڑ دیا سالی کو۔

کیوں؟

چال چلن خراب تھا۔

اچھا کیا اب کوئی اور تلاش کرلو۔

چندروز بعد ہی اس نے بتایا کہ دوسری ڈھونڈلی ہے اسکا باپ پیسہ بہت مانگتا ہے کہاں سے دوں؟

کوئی موٹا سا کام ڈھونڈھو تو اور سو پچاس میں معاملے ہو جائے تو مجھ سے لے جاؤ۔

اتنے میں کچھ نہیں ہوگا ہزار بارہ سو سے کم میں وہ راضی نہیں ہوگا رہا کام کا معاملہ تو ـــــ وہ سنجیدہ ہو کر بولا روپئے کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، پھر وہ اُٹھ کر چلا گیا چھ سات مہینے تک رامو کہیں دکھائی نہ دیا اسی دوران میں الکشن کی ہما ہمی شروع ہو گئی اور میری فرم کے منیجر نے پرچہ نامزدگی داخل کر دیا وہ جس حلقہ سے کھڑے ہوئے وہ بہت گنجان تھا رکشوں کے علاوہ دوسری سواریاں وہاں بہت کم جاتی تھیں، الیکشن اور قریب آگیا تو مجھے بھی چند بار منیجر کے ساتھ جانا پڑا لوگ بہت سمجھدار تھے سب سے پہلے مینی فیسٹو طلب کرتے تھے جگناتھ پرشاد منیجر نے اسی ہفتہ میں اپنا مینی فیسٹو دیواروں پر چپکانے کے لئے مزدور بھیجے اجرت فی ہزار کے حساب سے طے ہوئی منیجر صاحب ایک ایسی پارٹی کے ساتھ تھے جو پچھلے الیکشن میں بہت کامیاب رہی تھی انھوں نے بہت بڑے دعوے کر ڈالے تھے،

بیکاری کو دور کرنا میرا سب سے پہلا فرض ہوگا۔

مزدوروں کی بھلائی کو سب کاموں پر ترجیح دوں گا۔

یہ اعلان کئی روز تک دیواروں پر چپکا رہا اور راہ چلتے لوگ کھڑے ہو کر اسے پڑھتے رہے، ایک رات کو میں منیجر کے ساتھ گیا تو دیواریں بالکل صاف تھیں پوسٹر کا نام و نشان تک نہ تھا کسقدر اشتہارات لگائے گئے تھے وہ سب اکھاڑ دیئے گئے تھے مخالف امیدوار کے پوسٹر جگہ جگہ لگے ہوئے تھے جگناتھ جی نے اسی وقت دس بارہ آدمی بلائے اور انھیں پوسٹر دے کر کہا۔

انھیں مکانوں کی دیواروں پر لگادو ذرا اونچا لگانا بچوں کا ہاتھ نہ پہونچے لوگ سیڑھیاں کندھوں پر رکھ کر دوڑنے لگے صبح سویرے ہم نے پھر دورہ کیا اس وقت تک پوسٹر چسپاں کر دیے گئے تھے موٹے موٹے حروف میں جگناتھ جی کی تعریفیں چھپی ہوئی تھیں۔

جگناتھ پرشاد آپکے سب سے بڑے سیوک ہیں۔

[illegible]

جیل یاترا بھی کرچکے ہیں۔

وہ سماج وادی کے بہت بڑے پرچارک ہیں۔

جو اوصاف میں نے کبھی جگناتھ جی میں نہیں دیکھے تھے وہ سب ان سے منسوب کر دیے گئے تھے دراصل انھوں نے تجوری کا منہ کھول دیا تھا ہندی انگریزی اور اُردو کے اچھے اچھے اخباروں سے رابطہ پیدا کر لیا تھا بحث سے لکھنے والے پروپگنڈا لٹریچر تیار کرنے پر نوکر رکھ لئے تھے۔ وہ بہت ہی اچھی زبان میں جگناتھ جی کی تعریفیں لکھ ڈالتے۔ یہ اشتہارات پڑھ کر میرے دل میں بھی ان کے لئے گنجائش نکل آئی تھی ویسے میں خوب جانتا تھا کہ وہ نام کو بھی جنتا کے ہمدرد نہیں ہیں انھوں نے اپنی ذات کے علاوہ کبھی کسی سے ہمدردی نہیں کی، ایک دن دوپہر میں جگناتھ جی پہلی مرتبہ میرے فلیٹ پر آئے اور کہنے لگے آج ہم ایک کارنر میٹنگ کر رہے ہیں اس میں آپ کو بھی بولنا ہے میں چاہتا تھا کہ اسوقت وارڈ نمبر دو کے چند مشہور آدمیوں سے ملاقات کروں اس وارڈ کے کچھ ووٹر مر کھپ گئے ہیں کچھ باہر چلے گئے ہیں ان کی جگہ ووٹ ڈالنے کے لئے بوگس ووٹر تیار کرنے ہیں، یہ سُن کر میں حیران رہ گیا، پوچھا

بوگس ووٹر کیوں کر بنائے جاتے ہیں جگناتھ جی؟

رشوت سے سب کچھ ہو جائے گا آپ چنتا نہ کریں۔

مگر مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔

میں کب کہتا ہوں آپ کریں، ذرا دیر کو میرے ساتھ چلے چلئے

میں تیار ہو گیا وہ مجھے رکشا میں بٹھا کر بولے دیواروں پر اپنے پوسٹر دیکھے چلئے، پھر فوراً ہی کہنے لگے۔

رام جی لعل ہمارے پوسٹر کہاں غائب ہو گئے

میں نے دیواروں کو غور سے دیکھا دوسری پارٹی والوں کے اشتہارات لگے ہوتے تھے جگناتھ جی کے سارے کے سارے غائب تھے

میں کیا کہہ سکتا ہوں جگناتھ جی ——— واقعی آپ کا ایک اشتہار بھی نہیں ———

میں نے بات بچا کر دس ہزار پوسٹر دیئے ہیں مزدوروں کو اور انھوں نے دو بجے تک لگا دیئے تھے یہ کوئی شرارت معلوم ہوتی ہے

مانگی جی جگناتھ جی [illegible]

شرارت بھی ہو سکتی ہے، الیکشن میں سب کچھ ہو جاتا ہے کسی نے کہا ہے کہ محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہے محبت تو دنیا سے مفقود ہو چکی ہے اس کی جگہ الیکشن آگیا ہے جو محبت سے نہیں شرارت ہی سے لڑا جاتا ہے۔

میں نے جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اچانک رامو دکھائی دیا وہ بش شرٹ اور پینٹ پہنے سائیکل ہاتھ میں پکڑے پیدل چل رہا تھا سائیکل پر ایک ہلکی سی سیڑھی ٹنگی ہوئی تھی پیچھے اسٹینڈ پر پوسٹروں کا گٹھا بندھا ہوا تھا رامو نے مجھے نہیں دیکھا وہ بازو سے گذرنے لگا تو میں نے پکارا۔

رامو! ——— اے رامو!!

وہ کھڑا ہو گیا اور سائیکل کا ہنڈل تھامے رکشا کے قریب آگیا بڑے تپاک سے سلام کیا چہرے پر سیاہی کے نیچے ہلکی سی سرخی جھلک رہی تھی جیسے دھوئیں کے نیچے چنگاری چمک رہی ہو اوپر ایک خاص قسم کی چمک تھی۔

کیا کوئلہ نہیں ڈھوتے ——— کیا کر رہے ہو کہیں نوکری کر لی

وہ ہنستے ہوئے بولا ' بابو جی کوئلے کی دلالی میں اوروں کے ہاتھ کالے ہوا کرتے ہیں میرا منہ بھی سیاہ ہو گیا تھا میں نے کوئلہ ڈھونا چھوڑ دیا نوکری کی ضرورت پڑی ، ایک نیا دھندا کر لیا۔

آخر کیا کرنے لگے؟

کیا بتاؤں بابو جی، بڑا عمدہ پیشہ ہے جنم جنم کے دلدر دور ہو گئے عورت بھی بڑی اچھی مل گئی اس کے باپ نے جتنے پیسے مانگے میں نے دے دئے ایک جھونپڑی بھی بنالی۔

زیادہ باتیں مت کرو جلدی بتاؤ کیا کرتے ہو اور وہ نیا دھندا کیا ہے۔

بڑے مزے کا کام ہے بابو جی، چالیس روپے ہزار کے بھاؤ ایک اُمیدوار کے اشتہار دیواروں پر لگاتا ہوں اور ساٹھ روپے ہزار کے حساب سے دوسرے اُمیدوار کے کہنے سے انھیں اکھاڑ ڈالتا ہوں رات بھر میں اچھی خاصی کمائی ہو جاتی ہے۔ ■■

فیاض احمد

شب در شب
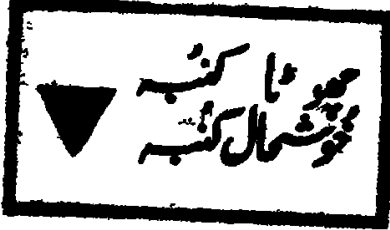
رات ایسی ہی اندھیاری تھی جیسے ظلمات کی تاریکی کا تصور ہوا کرتا ہے۔ مگر ان کے ہاتھوں میں خدا نے سپید و نورانی شعلوں والی وہ مشعل تھما دی تھی جو ابن آدم کی پیدائش سے قبل اس کے سرہانے روشن رہا کرتی تھی اسی مشعل کی روشنی تلے کائنات کی ہر شے نے جنم لیا تھا اور جب کچھ نہ تھا تب ابتدا میں اسی مشعل کی روشنی کے سائے خود خدا کی پیدائش عمل میں آئی تھی اور آج تک اس روشنی کے سہارے وہ اپنے کو دوسری تمام تخلیقات سے جدا اور ماورا ثابت کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

وہ تعداد میں تین تھے اور جو بھی انھیں دیکھتا، "اجالوں کے بیٹے" کا خطاب دے کر پکارتا تھا ایسے خطابات و القابات کو سن سن کر عوام الناس کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اب ان کی نجات کے دن قریب آتے جا رہے ہیں اور سبھی اپنی تقویت ان کے اعصابوں سے حاصل کرنے کو کوشاں تھے۔ آسمان پر ایک بہت بڑا اور روشن ستارہ جو پہلے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا، ٹھیک ان کے سروں پر پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ ہر کسی کو یقین تھا کہ جب یہ ستارہ ذرا اور نیچے آ جائے گا تو محل، کھنڈر اور جھونپڑوں میں یکساں روشنی پھیل جائے گی — نہ کہیں کم نہ کہیں زیادہ — اور یہ کتنی اچھی بات ہوگی۔ انہوں نے سوچا کہ روشنی بٹ جائے گی تو ہر آدمی اس کا یکساں فائدہ اٹھا سکے گا۔ انھوں نے اپنے سروں کو آنے والی خوشگوار روشنی کے تصور میں جگمگاتے ستارے کے آگے خم کر دیا اور ان سے خوش آمدید کہا۔ انہوں نے کہا کہ دراصل یہی ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔

مگر ان تینوں نے اس کی تردید کی کہا کہ [illegible] دشوار ہے اور منزل بعید ستارہ تو محض سمت کے تعین کے لئے ہے عوام الناس نے ان کی باتوں کو غور سے سنا اور انھیں

موضوع بڑا پرانا ہے
یعنی "آزادی کا المیہ"
س موضوع پر
ہمارے یہاں
ردو میں
کچھ نہیں لکھا گیا۔
اہم افسانہ
اعتبار سے
لی نیا ثابت ہونا چاہیے کہ
نشانگو
symboli کر لیا گیا ہے
رہنما قوتیں
سلابی تحریکات کے روپ میں
ہندستان کے ماضی اور
ی کی تہذیب و تمدن کی علامت ـ قلعہ،
ہندستان جو
ں میں ہی محصور رہ گیا۔
ی کچھ ایک نئی ترتیب
ساتھ ہے۔

——— فیاض احمد

وقفہ گزرتا تب ان تینوں سے اپنا سفر شروع کرنے کے لئے ان سے اجازت چاہی کیوں کہ وہ صبح کی حصولیابی کے خواہشمند تھے اور صبح تاریکی کی سرحد پر الیستادہ قلعے کی فصیلوں کے اس پار تھی اور روئے زمین پر وہ تنہا اس قلعے کی موجودگی سے بخوبی واقف تھے اور انھیں اس کی بشارت دی گئی تھی۔

وہ تین تھے ـــــ اور ان میں سے ایک بے پناہ قوتوں کا حامل تھا۔ اس کے بازوؤں میں وہ خوفناک اور غیر مرئی طاقت پوشیدہ تھی جس کی ہیبت سے پہاڑوں کے عظیم سینوں میں کپکپی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور لوہے کے سخت ذرات بھوسے کے مانند ہو کر ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ اس پاتال میں دفن لوہے کے تمام ذخیروں سے تیار کی ہوئی گرانبار زنجیروں کو پلک مارتے بنا توڑ دینے کی شکتی تھی۔ اس کے بدن کا ہر عضو فولاد کی طرح سخت اور ناقابلِ شکست تھا ـــــ اس کا کہنا تھا کہ اس کی پیدائش کائنات کی سبھی جدلیاتی قوتوں کے تصادم کے درمیان واقع ہوئی ہے اسی لئے لوگوں نے کہا کہ ـــــ "وہ قاطعِ طوق ہے" ـــــ اور انہی اوصاف کی بنا پر وہ اپنے دوسرے ساتھیوں میں ممتاز اور سرافراز ہوا۔

ان میں سے دوسرا زیرِ زمین پوشیدہ کل خزانوں کا مالک تھا۔ وہ اپنے تلوؤں کی دھمک سے زمین کو سنہری دھات میں تبدیل کر سکتا تھا۔ اس کا جسم مختلف بیش بہا جواہرات کا آئینہ تھا اور رات کی بے پناہ تاریکی میں بھی اس کا درخشاں بدن سونے کے اوراق کے مانند جھلمل جھلمل کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دنیا میں تمام تر سلاطینِ عالم کے دفینوں اور املاک کی پیداوار ہے اسی لئے لوگوں نے کہا کہ ـــــ "وہ افلاس کش ہے" ـــــ اور انھیں اوصاف کی بنا پر وہ اپنے دوسرے دو ساتھیوں میں ممتاز اور سرفراز ہوا۔

ان میں سے تیسرا کائنات کے سبھی شوخ، سنجیدہ اور خوشگوار خوشبوؤں پر قابض تھا۔ وہ ایسی خوش بوؤں سے بنی نوع انسان کے سینوں میں پوشیدہ وحشی جبلتوں کی سخت چٹانوں اور سنگریزوں کو روئی کی نرمی عطا کر سکتا تھا اور اپنی سانسوں سے فضا کو اس قدر معطر آلود کر سکتا تھا کہ ایک دوسرے کو دبوچ کر فنا کر دینے والی ہوس سے سرشار گندی ہوائیں مرگِ نادیدہ کی تاریک گپھاؤں میں چھپ کر اپنی بے بسی و نادست رسی کا ماتم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کا جسم خوشبوؤں کی لطیف چمک اور نرم و نازک احساسات کا آمیزہ تھا اس کا رنگ آئینے کا سا تھا جس میں ہر شئے کا خمیرِ اصل اور اولی صورت میں جھلکتا نظر آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی پیدائش آدم اور حوا کے پہلے بوسے کے درمیان ہوئی اور وہ روئے زمین پر بنی نوع انسان کی نجات کا علمبردار ہے۔ اسی لئے لوگوں نے کہا کہ ـــــ "وہ روحِ نجات ہے"۔ اور انھیں اوصاف کی بنا پر وہ اپنے دوسرے دو ساتھیوں میں ممتاز اور سرافراز ہوا۔

وہ تینوں بہت عرصے تک عوام الناس کے درمیان رہے تھے۔ اس اثنا میں انھوں نے لوگوں کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جمانے کی پوری کوشش کی تھی۔ لوگوں نے اپنی تمام دیلی اور نیک تمنائیں ان پر نچھاور کر دیں۔ یقیناً وہ ان کے لئے نئے احساسات اور جذبات کا پیغام لے کر آئے تھے جن کی لہریں روزِ آفرینش سے ان کی رگوں میں موجزن تھیں مگر ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور لہو جسم میں قید تھا۔ ان کے بیٹوں پر سالہا سال سے گراں بار پتھر لٹکے ہوئے تھے اور ان کے معدے سمٹ کر ان کی پشتوں سے جا لگے تھے۔ ان کی گردنوں پر سرکش اور جفا کار بزرگوں کی انیاں الیستادہ تھیں اور وہ سب ـــــ جو عظیم خلقت کہلاتے تھے ـــــ ان تمام بندھنوں اور پابندیوں سے چھوٹ جانا چاہتے تھے۔

جب وہ تینوں سفر کے لئے رخصت ہونے لگے تو عوام الناس نے اپنے بندھے ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف بلند کیا اور ان کی مغفرت چاہی۔ سفید گنبدوں اور گیروے گھنٹوں کی دل ہلا دینے والی آوازوں نے دہائی دی اور انھوں نے اُجالے کے بیٹوں سے کہا کہ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ وہ تینوں اپنی آنکھوں کا اضطراب چھپا نہ سکے اور لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ان کی باتوں کو پوری طرح یاد نہیں کر پا رہے ہیں اور تب انھوں نے اپنے میں سے ایک سن رسیدہ اور سب سے پرانے شخص کو چنا جو بستی کے بالکل آخری سرے پر رہتا تھا۔ انھوں نے اس پیرانہ قامت سے کہا کہ تو نے [illegible] اور تو ہمارے درمیان

سبھی گھونٹ پھیلا دینے والی ظلمتوں کی علامت ہے۔ تو ان کے ساتھ جا۔ یہ تیرے نافذ کیے ہوئے فرمان کے پہلو ہماری پہچان ہے۔

بوڑھا سر جھکائے ان کے پیچھے ہو لیا اور وہ تینوں ظلمات کی تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

اپنی ہیئت کذائی میں وہ بوڑھا عجیب تھا۔ وہ سر سے پیر تک مختلف چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں جڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے اسے کسی سنگتراش نے بڑی نفاست سے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر گڑھا ہو اور ہر ٹکڑے پر ایک لفظ درج کر دیا ہو۔ اس کا سر چار بنیادی ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ قدامت میں ان کی عمر تمام گزرے ہوئے شعوری زمانوں کی تھی۔ اور ان پر چار ایسے لفظ کندہ تھے جن سے اس کے جسم کے سبھی ٹکڑوں پر کندہ الفاظ منسلک تھے۔ راہ چلتے جو اس کے جسم سے کوئی ٹکڑا بوسیدگی کے باعث اپنی جگہ سے نکل کر زمین پر گر جاتا تو وہ اسے بڑی احتیاط سے اٹھا لیتا۔ اس پر جمی گرد کی تہہ کو صاف کرتا اور خالی جگہ میں دوبارہ ٹھیک سے جما دیتا۔ صدیوں سے وہ اس ملکیت کو سنبھالتا چلا آیا تھا۔ یہ ملکیت اس کے پاس اس کی قوم کی میراث تھی اور اس نے اسے اپنے پاس بطور امانت رکھ چھوڑا تھا۔ اگرچہ بوسیدگی کی وجہ سے اس کا جسم کئی جگہوں سے انتہائی کمزور اور بدبودار ہو چکا تھا تاہم وہ انھیں اپنے سے علیحدہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ اتنا بھاری بوجھ اٹھائے رکھنے کی وجہ سے وہ سست رو اور کاہل سا ہو گیا تھا اور ہر وقت اس پر ایک طرح کی نیم غنودگی سی طاری رہا کرتی تھی۔

رات ڈھلوان تھی اور تیزی سے نشیب میں اترتی چلی جا رہی تھی ـــــ مگر وہ تینوں جلد باز تھے اور رات کی اس رفتار کو بھی سست روی پر محمول کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس قلعہ کو جا لیں جس کی انھیں بشارت مل چکی تھی۔ جس کی فصیلوں کے اس پار ایک نیا شہر تھا، نئی صبح تھی اور نئی فضاؤں کا آغاز تھا۔ مگر ایسا نا ممکن بھی تھا۔ راستوں میں انھیں ہزارہا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی کشادہ شاہراہیں سمٹ کر پر پیچ گلیوں کا جال سی بن جاتیں کہ ان میں ٹھیک راستہ کھوج نکالنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ کبھی وہ بھٹک بھی جاتے مگر جلد ہی ایک تیار راستے [illegible] جگہ جگہ اژدہوں نے

گو ان بادہ خوروں نے راستوں کو مسدود کر دیا تھا مگر قاطع طرق ان زنجیروں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ توڑ دیتا۔ کبھی کبھی گندی اتھاہ اور وحشی ہوائیں ان کا دم گھوٹنے لگتیں مگر ریح نجات انھیں اپنی فرحت بخش وجود سے زائل کر دیتا۔ جب وہ بے حد تھک جاتے تو کہیں ٹھہر کر دم لیتے۔

"بہرحال ہمیں کسی طرح جلد از جلد اس قلعے تک پہنچنا ہے جس کی بشارت ہمیں خوابوں میں دی گئی ہے ـــــ قاطع طرق بار بار مضطرب ہو کر کہہ اٹھتا۔

"ہاں واقعی ـــــ افلاس کش اس کی تائید کرتے ہوئے کہتا ـــــ میرا کام اندھیروں کے پار سے شروع ہوتا ہے اور جب تک ہم قلعے میں نہیں داخل ہو جاتے یہ رات ہمارے ساتھ چلتی رہے گی۔

"میں اس گندی بو سے بہت پریشان ہوں" ریح نجات اکثر بوڑھے کے جسم پہ چپکے ہوئے چند ٹکڑوں پر درج لفظوں کو گھورتے ہوئے کہتا ـــــ "نفاق و فساد کی ایسی گھناؤنی بدبو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔"

ایکبار تو بوڑھا اس پر بھڑک ہی گیا ـــــ اور پل بھر کے لئے اس کی غنودگی رخصت ہو گئی۔

"تو مجھے تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہیئے تھا ـــــ کیوں؟

"نہیں یہ بات نہیں" ـــــ انھوں نے تردید کرنی چاہی ـــــ "ہم تمھاری بات نہیں کر رہے تھے۔"

بوڑھا پھر اپنی غنودگی میں ڈوب گیا اور وہ تینوں آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ اور راستہ طے ہوتا رہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم ایک ذرا دم بھر رک کر تازہ ہو لیں۔" ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہونچ کر ان میں سے ایک بلند آواز سے مشورہ دیا۔

"بہتر ہے۔" ـــــ دوسروں نے اس کی تائید کی ـــــ

"اس طرح تازہ دم ہو کر ہم دوبارہ اور زیادہ تیز چل سکیں گے۔"

بوڑھے نے کچھ نہ کہا اور وہ سب وہاں ذرا دیر کے لئے ٹھہر گئے۔ بوڑھے کی غنودگی اور گہرا گئی اور اس کے جسم کے بدبودار ٹکڑوں کی گھناؤنی لہریں ہواؤں میں شدید ہو گئیں۔ وہ اپنے بوجھ

سے لدے جسم کی وجہ سے فوراً ہی لاغر ہوگیا۔ روحِ نجات نے اس کے جسم کے کئی ٹکڑوں کو چپکے سے علیحدہ کیا اور دو تاریکیوں میں اُچھال دیا۔ جب بوڑھا بیدار ہوا تو اس نے اپنے جسم کے خالی حصوں کو دیکھا اور پاگل ہو کر ان ٹکڑوں کو قرب و جوار میں تلاش کرنے لگا اور جب تھک ہار کر مایوس ہوگیا تو زار و قطار رونے لگا۔ پر اُن تینوں نے اس کی گریہ وزاری کا کوئی اثر نہیں لیا تب بوڑھا اچانک سنجیدہ ہوگیا اور اس نے انھیں متنبہ کیا کہ آخر کار سرد جنگ ختم ہوگیا اور کل جنگ کا آغاز ہوگیا ہے۔ انھوں نے بوڑھے کا مضحکہ اُڑایا اور آگے کی طرف روانہ ہوگئے۔ بوڑھے نے بھی بادلِ ناخواستہ اپنی غنودگی سمیٹی اور ان کے پیچھے ہو لیا کیونکہ وہ اپنے لوگوں کی پہچان تھا اور وہ تینوں اس کے نمائندے تھے۔

ایک طویل سفر کے بعد دور افق پر حد دھیا لکیر سی کھنچی اور اندھیروں کی سرحد کے اُس پار ایک مضبوط اور مستحکم قلعے کے آثار دھند میں لپٹے ہوئے دکھائی پڑنے لگے۔ ایک پُر معنی چمک انکی آنکھوں میں لہرائی۔ بوڑھے نے اپنی غنودگی کو سر سے اتار کر پھینک دیا اور ان کے ساتھ تیز قدموں سے وادی کی طرف بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ قلعے کی موجودگی واضح ہوتی گئی اور افق پر اجالے کی تہہ دبیز ہونے لگی۔

جب سورج نے قصرِ مشرق کی محراب سے نکل کر انھیں سلامی دی تو وہ قلعہ کے صدر دروازے تک پہونچ چکے تھے۔ دروازے کے دونوں پٹ پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور اُن کے اوپر جڑی منقش تختیوں پر جلی حرفوں میں "خوش آمدید" لکھا ہوا تھا۔ قلعے کے اندر نور میں نہائی ہوئی ایک نئی دنیا آباد تھی۔ دروازے سے ایک عظیم ترین شاہراہ اس نئی دنیا کو جاتی تھی۔ اس سنگیں شاہراہ کے دونوں کناروں پر شجر زریں ایستادہ تھے۔ اندر سے آتی ہوئی ہواؤں میں ایک عجیب سی خوشبو تھی جو پورے وجود پر مسلط ہو کر نجات کا پیغام دیتی تھی۔

"بیشک یہی ہماری منزل ہے" ــــــ وہ چلّائے بوڑھے کی خوشی کی تو کوئی تھاہ نہ تھی۔ یقیناً یہی وہ دنیا تھی جس کا انتظار اس کی قوم کو تھا۔ وہ بے اختیار سجدے میں گر گیا اور اپنے معبودوں کی خدمت میں شکرانہ پیش کیا۔ جب اس نے اپنا سر سجدے سے اٹھایا تو دیکھا کہ وہ تینوں اندر جا چکے ہیں۔ قلعے کا صدر دروازہ بند ہو چکا ہے اور مہیب تاریکی کی چادر چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

(کہتے ہیں کہ وہ بوڑھا اب بھی دروازے پر بیٹھا اسکے کھُلنے کا انتظار کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے لوگوں کی پہچان ہے)

کرامت علی کرامت

سرگزشتِ سفر

میں کہاں ہوں مجھے کچھ یاد نہیں
ایک بھٹکا ہوا راہی ہوں میں
گمرہی جس کی نہیں ہے ابھی ممنونِ خضر
چار جانب ہے دھندلکوں کا ہجوم
ہر طرف ایک تباہی کا سماں چھایا ہے
راکھ اور ریت کا تودہ ہے مرے پیشِ نظر
ہے یہی زادِ سفر اور یہی سرمایہ ہے۔
ہر اندھیرے میں چھپی رہتی ہے
ہلکی سی کرن
جو شب و روز
ازل سے ہے افق تا بہ افق جلوہ فگن
ایک مخصوص نظر ہے کہ اُسے ڈھونڈ لیا کرتی ہے

پھر یہ کیسا ہے دھندلکا؟
کہ پس و پیشِ نظر کچھ نہیں آتا مجھ کو
چھن گئی مجھ سے مری طاقتِ دید
یا مرے ذوقِ نظر ہی میں کوئی خامی سی ہے
یا ہے یہ گردِ سفر
جس سے دھندلا گئی [illegible]

یاد ہے میں نے جلائی تھی کبھی شمعِ یقیں
ماضی و حال کی راہیں تھیں منوّر جس سے
یہی راہیں مجھے لے جاتی تھیں فردا کی طرف
مشعلِ راہ جو کانپ اٹھتی تھی
خوفِ صرصر سے کبھی،
زندہ تزئینِ وفا
بڑھ کے دیتا تھا جگہ گوشۂ دامن میں اسے
روشنی وہم کی مانند خلاؤں میں بکھر جاتی تھی
لوگ اس شمع پہ گرتے رہے پروانوں سا
خود بھی جلتے رہے اوروں کو جلاتے بھی رہے
بعض ایسے تھے جو مٹ کر نئی شکلوں میں ضیا بار ہوئے
دل جلا [illegible] گرد
سوئے منزل تھا رواں
اس تصادم میں مری شمعِ یقیں
بجھ گئی چھوٹ کے ظلمات کے دریا میں مجھے
ذہن پر چھانے لگیں دودِ سیہ کی موجیں
دائرہ وار مثالِ گرداب!
ہوش آیا تو یہ دیکھا میں نے
وحشتِ تنہائی میں احباب مجھے چھوڑ گئے

(۲)

کب ہوا تھا مرا آغازِ سفر؟
غیر ایام میں جب جلوۂ ایام تھا گم
قوت و مادہ میں جبکہ نہ تھا کوئی تضاد
تمکنت چھائی ہوئی تھی یونہی لاہوتی سی
گھٹ گیا تھا یہاں جب وقت کا آوارہ تناؤ
فاصلے قلب و نظر کے بھی سمٹنے سے لگے تھے جس دم
مری نظروں سے اٹھی ایک نقاب
میں نے دیکھا کہ نگاہوں میں ہے اک پیکر سبز
جس طرح چاندنی راتوں میں لہکتی ہوئی ہریالی ہو۔
شعلہ بھی سبز ہے شبنم بھی ہے سبز
زخم بھی سبز ہے مرہم بھی ہے سبز
نور بھی سبز ہے اور نار بھی ہے سبز
[illegible] اور خار بھی سبز
بحر بھی سبز ہے [illegible] ساحل بھی ہے سبز
عقل بھی سبز ہے اور دل بھی ہے سبز
سبز رنگت ہے کہ ہر شے میں گھلی جاتی ہے
دیکھتا [illegible] کہ ہے سبز خود اپنا بھی وجود
پیکرِ سبز [illegible] خاص عنایت کی نظر تھی شاید
یا میں ہر چیز کو اپنی ہی طرح دیکھتا تھا۔
پیکرِ سبز [illegible] افلاک میں روپوش ہوا
جس کے [illegible] وراثت میں لہو پن کے ہیں ساری اب تک
اور [illegible] خوابوں میں جب انگڑائی لی
[illegible] یہ سبز لباس
[illegible] مرے پاس
اور پھر اس کے سوچا
میں نے احرام خود باندھ لیا
تھا جو مقصود مجھے کعبۂ ہستی کا طواف

(۳)

کون ہوں اور کہاں جانا تھا؟
نہیں معلوم ابھی تک مجھ کو
لیکن اتنا تو ہے یاد
اپنی اس ہستیٔ موہوم کا احساس نہ تھا
میں بہت دور جو لاعلمی میں پہنچا تو یہ احساس ہوا
تجربے یاد میں ہو جاتے ہیں حل
اور یہ راز کھلا مجھ کو ہے خود اپنی تلاش
ہر قدم پر مرے، اک نت نئی دشواری تھی
غیر واضح تھیں نہ گاہیں مہ و سال کی میرے آگے
چند بکھرے ہوئے لمحات کو جوڑا میں نے
اپنی مرضی کے مطابق انھیں پھر بانٹ دیا میں نے کئی
خانوں میں
غیر مربوط شبیہوں میں نظر آئی مجھے شکلِ جمیل
اور پھر نوچ دیا اپنے ہی ناخن سے حسیں چہروں کو
اپنے ہاتھوں سے جلائے ہیں چراغ
اپنے ہاتھوں سے انھیں یوں ہی بجھا ڈالا ہے
اپنے ہاتھوں سے تراشے کئی معبود حسیں
اور پھر اپنے ہی ہاتھوں سے انھیں توڑ دیا
چند معبودوں کے بدلے نئے معبود اٹھاتے رہے مگر
شمع کے خوں سے سحر جیسے جنم لیتی ہے

میرے آگے متعین کوئی منزل ہی نہ تھی
جو بھی تھی، تھی مری آنکھوں کی تھکن
جو بھی تھی، تھی مرے موہوم خیالوں کی گھٹن
[illegible] پا کر [illegible] کا [illegible] بنا
جس جگہ بیٹھ گیا تھک کے وہ منزل ٹھہری
[illegible] کے چراغ

چل پڑا دور، بہت دور تصور کی حدوں سے آگے
منزلیں آئیں سرِ راہ کچھ ایسی جو بلاتی رہیں پیچھے سے مجھے
دن کی آواز مگر وقت کی دیواروں سے ٹکرا کے پلٹ ہی آئی
مجھ کو پہنچی نہ خبر
وہی آوارگیٔ ذوقِ جنوں تھی مرے سر پہ طاری

مجھ کو دورانِ تگ و دو میں ملا
چند ماضی کے سسکتے ہوئے قدموں کے نشانوں کا سراغ
کون تھا وہ جو اسی راہ سے گذرا تھا کبھی ؟
اُس نے چھوڑا نہ کوئی اور نشاں
چند قدموں کے نشانوں کے سوا
عالمِ نزع میں پتھرا گئیں جن کی آنکھیں۔
اِن کی خاموش نگاہی کو تکلم کا سبق میں نے دیا۔
چل پڑا چند قدم میں بھی تصور میں اُسی سمت جدھر یہ مجھے
لے جاتے تھے

ان کی راہیں تھیں جو مسدود، مری نامسدود
ان کا حلقہ تھا جو محدود، مرا نامحدود
گھل گئی تھی مری رفتار میں بجلی کی ادا
اس لئے میرے قدم تھک کے نہ رک سکتے تھے۔
میرے قدموں کے نشانوں میں تھی کچھ ایسی تڑپ
کسمساتے تھے ابھرنے کے لئے کتنے ہی فردا کے نقوش

(۱۴)

میں بھٹکتا ہوا مرکز سے بہت دور چلا آیا ہوں
اور رفتار کی تیزی ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
پھر بھی مرکز کی کشش ہے کہ سکھاتی ہے مجھے
جاذبۂ بندشِ رفتار کے آداب نہاں
غیر محدود سی قوت گرہ جذب و کشش میں ہے نہاں
مثلِ سپند

ورنہ اس تیزیٔ رفتار سے میں
خود ہی نہ بن جاتا کہیں لامحدود

میں ہوں ذرّہ
مجھے رہنے دو اسی حال میں غلطاں، پیچاں
گرچہ میں آج خلاؤں میں بھٹکتا ہوں مگر
وقت کے موڑ کے گرداب بنا سکتا ہوں
کس کے ہمراہ اگر چاہوں تو مرکز پہ پہنچ سکتا ہوں

مظہر امام

راستے کی تلاش میں

... مگر ہم کو اس کی خبر ہی نہیں ہے
کہ جن کے لیے
ہم نے جینے کے انداز سیکھے
وہ اقدار کب کی فنا ہو چکی ہیں

قرینے سے
الماریوں میں سجائی ہوئی
عقل کی سرد مہری سے ٹھٹھری کتابیں
مجھے طنز سے دیکھتی ہیں!

چلو
آؤ
اُس راستے پر چلیں
جس کو دن بھر کی دُلہن بنا کر
اک آوارہ سورج نے
خانہ بدر کر دیا ہے!

گوشت کا نغمہ

تجھ سے بچھڑے ہوئے چھ سال ہوئے
وقت کی کوکھ میں کتنے لمحے
جل گئے
راکھ بنے

زندگی ایسے نئے رنگ میں آئی ہے
کہ اب
گھر بھی ہے، بیوی بھی، بچے بھی ہیں
شب کی جلتی ہوئی خاموشی میں
پھر بھی جب یاد تری نغمہ فشاں، نوحہ بلب آتی ہے
اپنی شہ رگ کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے کانوں میں میرے
میری آواز میں آواز تری گونجتی ہے
میرے خوابوں میں ترے خواب سسک اُٹھتے ہیں۔
کاش، اک رات بھی
خلوت میں
کبھی تو جو میسّر آتی
پھر میں یہ فیصلہ کرتا
کہ محبت میں تری
رُوح کا نغمہ بھی شامل ہے
فقط گوشت کی فریاد نہیں

غزلیں

محبوب سعیدی

پھر اِدھر سے ابھی گزرے گا دوبارا اک شخص
ہے دریچے سے اگر محوِ نظارا اک شخص

کب سے ہے دل کا یہ ویران کھنڈر چشم براہ
کر گیا تھا اِدھر آنے کا اشارا اک شخص

منہ چھپائے ہوئے ہر لمحہ گزر جاتا ہے
ہے اِدھر منتظر دید بچارا اک شخص

دشمنِ جاں سہی دنیا مگر اس دنیا میں
میں بھی جی لوں، مجھے کر لے جو گوارا اک شخص

بے تعلق بنے ہے شب و روز کے ہنگاموں سے
دم بخود، اپنے ہی احساس کا مارا اک شخص

ساتھ ہو جائے کسی وہم کی پرچھائیں ہی
بیکسی حد سے جو گزری تو پکارا اک شخص

آکے اُترے مری چھت پر کوئی شام ایسی بھی
بن کے چمکے مرے آنگن کا ستارا اک شخص

نغمہ و نکہت و نرمی، شفق و شام و شراب
کتنے پردوں میں رہا انجمن آرا اک شخص

بے سہارا ہوں مگر سوچ رہا ہوں محبوبؔ
بن گیا تھا کبھی میرا بھی سہارا اک شخص

ذکا صدیقی

دشت کیا مصر کا بازار نظر آتا ہے
جانے کس کس کا خریدار نظر آتا ہے

جب بہار آتی ہے اک زخم نیا لاتی ہے
پھول جب کھلتا ہے تلوار نظر آتا ہے

اک طرح دار کے ہونے سے ہی کیسی رونق
شہر کا شہر طرح دار نظر آتا ہے

کیا زمانہ تھا کہ حق گوئی تھا اک فنِ شریف
آج ہر شخص سر دار نظر آتا ہے

لوگ خود اپنے غموں کی نہیں کرتے توقیر
جو بھی ہے اور دں کا غمخوار نظر آتا ہے

تم کہاں شہر سے باہر کبھی نکلے ہوگے
دیر تک سایۂ دیوار نظر آتا ہے

زندگی مجھ کو سناتی ہے فسانہ کس کا
جانا پہچانا سا کردار نظر آتا ہے

وقار خلیل

ہم بہاروں کو صدا دیتے ہیں
خواب راہوں میں بچھا دیتے ہیں

دل کے اوراق پہ اک حرفِ وفا
روز لکھتے ہیں، مٹا دیتے ہیں

روشنی، پھول، سمندر، ظلمت
ہم ترے نام گنا دیتے ہیں

جمع کرنے کے لئے نقشِ قدم
لوگ تنہائی بچھا دیتے ہیں

دل کی راہوں سے گزرنے والے
کن خزانوں کو لٹا دیتے ہیں

قُرب کے نام پہ کچھ لوگ وقارؔ
فاصلے اور بڑھا دیتے ہیں

امید عارفی

اکیسویں صدی کیلئے ایک نظم

لوگو
دیکھو
سورج آنکھیں
پھوڑ چکا ہے
جلدی جاگو
ورنہ سب جل جائیں گے
لاوے میں جم جائیں گے
لوگو
دوڑو
سایہ ڈھونڈو!
سایہ میں کیا مل جائے گا!
عالم، عالم
سانسوں کی آواز نہیں ہے
دل اور آنکھیں
پاؤں اور ہاتھ
سارے اعضا
عالم، عالم
گھوم رہے ہیں
جانے کس کو ڈھونڈ رہے ہیں
لوگو
آؤ
ان کرچوں کو
پھر سے جوڑو
اپنی شکلوں کو پہچانو
اپنے آپ کو ڈھونڈ نکالو!

حمید الماس

پاتال کے دہانے پر

چلو سب نکل جائیں
گیلے مکان سے
سنا ہے
تڑختے ہوئے فرش کے سرد سینے میں
اندھا کنواں ہے
جہاں کالی روحوں کو محبوس کرتے تھے
گاؤں کے حاکم
یہ اشکِ ندامت ہیں یا
ان کے جسموں کا اجلا لہو ہے
ہمارے کفِ پا کو
جو دم بہ دم چھو رہا ہے

صبا اکرام

آخری لمحے کا اَنت

کبھی جو بپھرے سمندر سے تیر کر نکلوں
تو میں بھی کہنہ چٹانوں کے
کورے سینوں پر
لہو کے آخری قطرے سے
لکھ کے آخری جملہ
سفر کے قصے کا
گھنیرے پیڑ کے سائے میں
کر کے بند ان آنکھوں کو اپنی
بیٹھا رہوں
مجھے بلائے سحر
دے صدائیں رات، مگر
نہ کھولوں آنکھ
کہ جب تک نہ آخری لمحہ
شجر کے آخری پتے کی طرح
ٹوٹ کے گر جائے میرے قدموں میں!

تنہا تماپوری

ایک نظم

عکس اپنے آئینوں کے ساتھ ساتھ
ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں
اور ہر اک راہرو
ٹکڑوں کو
ٹکڑے بانٹتا ہے
کوئی ہر ٹھوکر کے قدموں سے لپٹ کر
پوچھتا ہے:

"یہ کہاں کا راستہ ہے،
آرزو کی لاش اٹھائے کس نگر کو جا رہا ہے؟"
ٹھوکریں کہتی ہیں:
"یارو!
بھٹک کے رستوں سے تم کو کیا ملے گا؟"
راستے کہتے ہیں:
"بھائی!
ہم تو اندھے ہیں،
تمہاری آنکھ لاٹھی بن سکے تو
ہم تمہیں منزل بتا دیں!"

تنہا تماپوری

کہاں جاؤں

اے عالمِ تنہائی!
کچھ تجھ کو خبر بھی ہے:
چپکے سے درِ دل پر
اک اجنبی دستک کی آواز ابھرتی ہے
پُروائی سی چلتی ہے
چاہت کے گلستاں میں خوشبو سی مہکتی ہے
نیندوں کے جزیروں میں خوابوں کو جگاتی ہے۔
تب،
تیرہ شبی اٹھ کر
اک نور کا پیراہن چپکے سے پہنتی ہے

اے عالمِ تنہائی!
کچھ تجھ کو خبر بھی ہے
یادوں کا یہ ہنگامہ
اب لے کے کہاں جاؤں؟

اب
لے کے
کہاں
جاؤں؟

دیشی پانڈے
ترجمہ: صغیر احمد صوفی

مرہٹی نظم

خود پرستی، خود پسندی اور خود بینی کے جال
سارے عالم پر مسلط جیسے یک ٹیڑھا سوال
آفتابِ ارتقا کا جب نظر آئے زوال
جسم کی راحت میں پوشیدہ گناہوں کا کمال
روح کے زخموں کا نا ممکن سا ہو جب اندمال
پھر کہیں بنتا ہے مرہم جا کے گوتم کا جمال
جب کہ ظلمت کدے میں حکمراں گونگے اصول
مفلسوں کے خونِ ناحق سے جہاں کھل جائیں پھول
ظلم بیجا سمجھ کر جب کرتے ہیں بیجا بے قبول
لشکرِ انساں لمحہ لمحہ ہو اذیت سے ملول
جب سراپا درد ہو جائے یہ ساری کائنات
پھر اذیت سے دلاتا ہے کوئی عیسیٰ نجات
امتیازِ رنگ و مذہب جب بنے بارِ گراں
ظلم کے مینار سے دیتا ہو انساں جب اذاں
گھر کے آنگن کو سمجھ بیٹھا ہو جب سارا جہاں
جب تشدد کا زمانے بھر میں پھیلا ہو دھواں
پھر جلاتا ہے کوئی گاندھی اہنسا کے چراغ
پھول بنجاتے ہیں پھر انساں کے سینے کے داغ

غزلیں

شعیب شمیس

میں دریا کا بہتا پانی میں اک رمتا جوگی
آنسوؤں کا انمول خزانہ آنکھ سے ٹپکا موتی

اہلِ جنوں کو فکر تھی کیسے گھر کو روشن کرتے
دیوانوں نے آگ لگا کر بستی روشن کر لی

ڈوب گئیں کلیوں کی سسکیں چیخیں بھی تھرایا
سناٹے میں جانے کس کی چیخ اچانک ابھری

گھر کے اندر تنہائی کا زہر ملا ہے مجھ کو
دیواروں پر اپنا سایہ دھوپ میں ساری بستی

آؤ بزم سجائیں اپنی شیشے بھی کچھ بولیں
لمحوں کی دہلیز پہ ناچے شام کی ساری مستی

لہرائے آنچل میں تارے اس انداز سے ٹوٹے
کوند گئی ہے ذہن میں جیسے اک انجانی بجلی

اس دنیا کے لوگوں نے تو مانگے تارے نوچے
ہم دیوانے سیپ کے لائے پلکوں سے ہی موتی

■■

مہدی پرتاب گڈھی

رہے خموش تو صحرا میں اک مکان لگے
کھلے زبان تو وہ شخص آسمان لگے

کچھ اتنی سخت ہے بے مہری حیات کی دھوپ
کہ ایک لفظ محبت کا سائبان لگے

جو عصرِ نو کے مسیحا بنے تھے ذہن اُن کے
نہ جانے کیوں مجھے زخموں کی اک دوکان لگے

وہ سارے لوگ فراست کا جن کے شہرہ تھا
وہ سارے لوگ تو اُتری ہوئی کمان لگے

ہر ایک لفظ ہے بارود کی طرح اس کا
وہ ایک شخص جو دنیا کو بے زبان لگے

یہ خوبِ سحر ہے جس سمت وہ نگاہ اُٹھے
قریبِ لطف کہ ہر شخص خوش گمان لگے

صبیح رخ پہ ابھرتی ہوئی سحر کا جلوس
لئے جلو میں قیامت تری اُٹھان لگے

قریب سے کبھی نہ گذری تھی جن کے درد کی دھوپ
وہ چہرے یورشِ غم سے لہو لہان لگے

■■

احمد وصی

مل کر ہر ایک شخص سے جی اتنا بھر گیا
کہ اپنا ہی وجود نظر سے اُتر گیا

نہ جانے کیوں یہ ہوتا ہے محسوس ان دنوں
میں جی رہا ہوں مجھ میں کوئی تھا جو مر گیا

پانی کی طرح بہہ گئیں صدیاں کبھی کبھی
اکثر ہوا ہے یوں بھی کہ لمحہ ٹھہر گیا

موسم نے جب بھی چپکے سے کچھ گل کھلائے ہیں
الزام شوخ تیز ہواؤں کے سر گیا

پہلے کا جیسا جوش سمندر میں اب کہاں
سیلاب ختم ہو گیا طوفاں گزر

مدت کے بعد آئینہ کل سامنے
دیکھی جو اپنی شکل تو چہرہ اُ

رئیس منظر

وہی ہیں دار و رسن اور وہی ہیں زنجیریں
زمانہ ہو گیا، بدلی نہیں ہیں تقدیریں

کہاں سے لائے کوئی زیست کی وہ تعبیریں
جو میری چشمِ تحیر نے کی ہیں تفسیریں

یہ کس مقام پہ میں زندگی کو لے آیا
نہ کوئی خوابِ تمنا، نہ اُس کی تعبیریں

وہی زمیں، وہی اک یادگار آدم کی
ہماری بھی تو کبھی رنگ لائیں تقصیریں

مصوری کوئی سیکھے ترے تصور سے
ہزار رُخ سے کھنچ آئیں ہزار تصویریں

نظر نظر سے ادا ہو رہے ہیں وہ مفہوم
کہ لب خموش ہیں، منہ دیکھتی ہیں تقریریں

وہ میرے دل سے اب اتنا قریب ہے منظر
کہ آنسوؤں میں جھلکتی ہیں اُس کی تصویریں

نازش انصاری

کیا جانئے کہاں پہ، کدھر تھک کے سو گئیں
نظریں نظر سے دور بہت دور ہو گئیں

جب رات بے صدا ہوئی شب کی سہاگنیں
پھولوں کے ساتھ ساتھ ہی دل کو ڈبو گئیں

پھر معنیٔ حیات کئی اک نوازش کر
اور پھر ندی کی فیصلہ گاہوں میں کھو گئیں

نیلاہٹوں پہ سرمئی بادل بکھر گئے
[illegible] بساط بارشیں پلکیں بھگو گئیں

شہرِ فنا کا در نہ کبھی ان پہ وا ہوا
بے حس روایتوں کے سبب [illegible] ہو گئیں

وسیم شعلی

ہیں ان کے رنگ عجب، ان میں خوشبوئیں ہیں عجب
تخیلات کے پھولوں سے مست و بے خود ہوں

ضمیر پہ طنز کناں ہے تمہارا طنز اے دوست
جو بات ہی نہ سمجھنے کی ہو تو کیا سمجھوں

شعور سے ہے پرے غار یا کوئی جنت
کھلے کہیں سے دریچہ تو جھانک کر دیکھوں

مریض ہیں مری آنکھیں کہ ہے جہاں بیمار
دھواں دھواں نظر آتا ہے جس طرف دیکھوں

سوائے تشنگیِ زیست کی حسینہ کے
اب اور کس کے لبوں کو میں ہر گھڑی چوموں

عجب نہیں کہ یہ بنجر زمیں ہو پھر سیراب
ذرا میں رخ تو سمندر کا پھیر کے دیکھوں

یہ تشنگی وہ غضب کی ہے تشنگی کہ ندیم
کہیں سے زہر بھی مل جائے آج تو پی لوں

حسن رضا

غزل

بادلوں کی چھت کے نیچے نہ سر کو چھپاؤں گا
چپکے سے غم کے پیڑ تلے سو کھ جاؤں گا
نوکِ قلم سے حسن کا پیکر بناؤں گا
قوسِ قزح کے رنگوں سے تجھ کو سجاؤں گا
دل کی کتھا کو سینے کے اندر چھپاؤں گا
بہروں کی بستیوں میں کسے کیا سناؤں گا
سرحد سے لب کی کوئی پلٹ کر نہ آسکا
ہر جذبہ کہہ رہا ہے ابھی لوٹ آؤں گا
ملتی نہیں ہے حق سے پرندوں کو چھاؤں تک
بے برگ و بار پیڑوں کے جنگل جلاؤں گا
ہے روشنی مکان میں جس کے سبب ندیم
یادوں کے اُس چراغ کو کیسے بجھاؤں گا
باغِ غزل میں بن کے نسیمِ سحر رضا
پھر اہیں گیا تو نئے گل کھلاؤں گا

■■

شاہد عزیز

جو ٹوٹ کر بکھر گیا

مجھے تو اپنے شہر کے زوال کا بھی غم نہیں
وہ لوگ کن حدوں میں کھو گئے مجھے ذرا پتا نہیں
یہ میرا جرم مان لو .....
کہ میں انھیں کے ساتھ تھا
مگر یہ سچ ہے —
میں تو راستے پہ تھا
وہ راستے سے ہٹ کے کیوں.....
ہواؤں سے لڑا کیے
مجھے ذرا خبر نہیں
کہ میرا اُن سے واسطہ
اسی شہر کے ساتھ تھا
جو ٹوٹ کر بکھر گیا
جو ٹوٹ کر بکھر گیا

■■

کاوش جذباتی

غزل

حرفِ تسکیں نہ کہو، غم نہ بڑھاؤ لوگو
تم مسیحا ہو مرے پاس نہ آؤ — لوگو
تم بھی کھو دو گے حقائق کی بصیرت اک دن
اپنی آنکھوں میں نہ یوں خواب سجاؤ لوگو
سارے ہی دھند لکوں میں چھپے جاتے ہیں
شمعِ افکار کی لَو اور بڑھاؤ لوگو —!
پھر کھلے گی یہ تبسّم کی شفق چہرے پر
تم شکن وقت کے ماتھے کی مٹاؤ لوگو
سب کے چہروں پہ تمھیں داغ نظر آتے ہیں
سامنے اپنے بھی آئینہ سجاؤ لوگو
ہنس دیے کیوں نے کاوش کی کہانی سنکر
واقعہ کیا ہے ہمیں بھی تو بتاؤ لوگو

■■

سید رشید احمد

ایک حقیقت ایک افسانہ

پیتمبر لبھوج

ہندوستان کی جنگ آزادی، ۱۹۴۲ء کے محشر خیز طوفان حوادث کا شکار تھی۔ ملک کے طول و عرض میں عوام کے سروں پر اپنے محبوب لیڈروں کی گرفتاری سے اشتعال و جنون کا بھوت سوار تھا۔ اُفق پر ہر طرف جوش و خروش، بے چینی و برہمی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ تخریب کاری اور لاقانونیت کا وہ سیلاب عظیم برپا تھا جس میں ہوش و خرد خس و خاشاک کی طرح بہے جاتے تھے۔ وحشت و بربریت کے عفریت نے جا بجا تشدد و جارحانہ اقدامات کی بھیانک ترین شکل اختیار کر لی تھی۔ حکومت وقت کے لئے اس طوفان بلا پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ ایک طرف گورنمنٹ کے سلاح خانہ سے دفعہ ۱۴۴ ف، ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ، پریونٹیو ڈیٹنشن اور ایسے نامعلوم کتنے اور تعزیری قانون، لاقانونی کی اس لہر پر قابو پانے، اُسے دبانے اور کچلنے کے لئے بے تحاشا وضع ہو رہے تھے، تو دوسری طرف قانون شکنی کی وہ گرم بازاری تھی کہ جیلوں کی آبادی بڑھ کر دونی اور تگنی ہو گئی تھی۔ حکومت حفظ امن کے نام پر اس سورش و تحریک کو کچلنے کے لئے سخت ترین تدابیر اختیار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ راعی اور رعایا کے مابین ایسا محاذ جنگ قائم ہو گیا تھا جس میں جنون و دھاندلی کے عالم میں دونوں اپنے جادۂ منزل کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ ادنیٰ شبہ اور خطرہ کی گھنٹی پر حکومت کی ساری دیو پیکر مشینری حرکت میں آجاتی۔ اس پُر آشوب عہد دار و گیر میں لکھنؤ اپنی شہری اور صوبائی حکومت کے مرکز کی حیثیت سے سیاسی سرگرمیوں، ہنگامہ خیزیوں اور وحشت زائیوں کے گوناگوں مظاہرات اور پروپگنڈے کا اکھاڑا بنا ہوا تھا، جہاں آئے دن قانون شکنی کی مہم کی مشق اور تجدید ہوا کرتی۔

بحران و خلفشار کا یہ دور دو سال کی منزلیں طے کر چکا ۱۹۴۴ء میں داخل ہو چکا تھا، اور ہنوز اس کے خاتمہ کی کوئی شکل پیدا نہ ہوئی تھی۔ راقم الحروف بحیثیت پولیس افسر سرکل عالم باغ شہر لکھنؤ میں مامور تھا۔ وہ اپنی ملازمت کی ۳۴ ویں اور سفر زندگی کی ۵۲ ویں منزل طے کر رہا تھا۔ تھوڑے ہی دس دن بعد پنشن پر روانگی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی، اور پولیس کا جبہ و دستار پھینک کر وہ جلد از جلد اپنے گھر کی راہ لینے کے لئے بے چین تھا۔ اسی پُر آشوب دور میں جبکہ حکومت برطانیہ کا آفتاب اقبال لب بام تھا، شہر لکھنؤ میں ایک دن جنگ آزادی کے سورما احکام دفعہ ۱۴۴ ف کی خلاف ورزی کر کے کسی بڑے جلوس اور مظاہرہ کا پلان بنائے ہوئے تھے۔ ان کی قانون شکنی کی اس مہم کو روکنے اور حفظ امن کے پیش نظر سارے شہر میں اس دن پولیس کے انتظامات بڑے پیمانے پر کئے گئے تھے۔ حکام ضلع اور پولیس افسران صبح ہی سے موٹروں پر گشت کرتے پھر رہے تھے۔ چوراہوں پر پکٹ تعینات تھے اور موبائل پٹرول کے دستے موٹروں پر گشت کر کے دفعہ ۱۴۴ ف کے احکام کی پابندی کی سختی سے نگرانی کر رہے تھے۔ میں بھی ایک موٹر پر اپنے سرکل کے انتظامات کی نگرانی کرتا ہوا پولیس چوکی تاکہ ہنڈولہ پہنچا۔ اور بیٹھ کر ملازمان مامورہ ڈیوٹی کے لئے معائنہ بک چوکی میں کچھ ہدایات تحریر کر رہا تھا، کہ اس اثنا میں موبائل پٹرول کا ایک دستہ موٹر پر گشت کرتا ہوا چوکی پر آ کر رکا، اس کے حولدار انچارج نے باضابطہ مجھے حلقہ کی خیریت کی رپورٹ دیتے ہوئے کہا کہ سٹیشن روڈ پر ایک صاحب (انگریز) ہاتھ میں موٹا ڈنڈا لئے ہوئے گھوم رہے تھے، ان کو روک کر بتایا گیا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ ف نافذ ہے جس کی رو سے ڈنڈا، لاٹھی اور ہتھیار وغیرہ لے کر گھومنے پھرنے کی ممانعت ہے، وہ اپنا ڈنڈا داخل کر دیں، ان کو اس کی رسید دی جائیگی،

اور بعد ۂ وہ اپنا ڈنڈا پولیس سے واپس پا جائیں گے، مگر انھوں نے حکام دفعہ ہوا ف کی تعمیل سے انکار کیا۔ صاحب ہندوستانی زبان ٹھیک طرح نہیں سمجھتے اور صرف انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ وہ بڑے جھکی، غصہ ور اور تند مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ بات بات پر انگریزی میں گھر کنے بیٹھ گئے ہیں اور نہ معلوم کیا کیا اول فول بکتے ہیں۔ ہم انھیں روک کر اپنے ساتھ موٹر پر بٹھا کر قانونی کارروائی کے لئے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔ میں نے یہ داستان سن کر حولدار سے کہا کہ، اچھا انھیں موٹر سے اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ صاحب میرے پاس لائے گئے۔ چہرے ہی سے ان کی برہمی اور بیزاری کے آثار صاف نمایاں تھے۔ میں نے بڑی خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ان کی پذیرائی کرتے ہوئے انگریزی میں صاحب سلامت کے بعد انھیں عزت کے ساتھ اپنے مقابل کرسی پر بیٹھنے کی جگہ دی۔ اس شریفانہ برتاؤ کا میں نے ان پر خاص اثر دیکھا۔ میں نے دیکھا انکے چہرے کی وہ برہمی و خشونت اور اعصابی تناؤ آن واحد میں دور ہو گیا اور وہ ایک خوش مزاج انسان نظر آنے لگے۔ وہ تقریباً ۷۰ برس عمر کے ایک ضعیف انگلو انڈین تھے۔ صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہی بڑی شائستگی سے انگریزی میں اپنا تعارف کسی قدر شاعرانہ انداز میں کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا نام پیٹر برج Peter Burge ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ انجینیر ہیں۔ کنٹونمنٹ کے قریب رہتے ہیں۔ شریک حیات کی قبل از وقت رحلت نے ان کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا کر دیا ہے، اس کی ساری دل کشی و رعنائی ختم ہو کر زندگی اب ان کے لئے اجیرن بن گئی ہے اور وہ "نہ شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن" کے مصداق اب جی کیا رہے ہیں، جینے کی تہمت اٹھا رہے ہیں۔ ان کی بڑی بے کیف زندگی ہے، بالکل یکہ و تنہا ہیں، خود ہی اپنا سارا کام کاج کرتے ہیں۔ صبح روزمرہ ٹہلنے نکلتے ہیں اور کئی میل کا چکر لگا کر واپس ہوتے ہیں۔ گھر کے کاموں سے فراغ کے بعد مطالعہ ان کا واحد اور محبوب مشغلہ ہے۔ گورکی، ٹالسٹائے، آسکر وائلڈ اور رسکن وغیرہ ان کے پسندیدہ رائٹرز ہیں، جن کی تخلیقات ہی اب ان کی دنیا بن گئی ہے۔ جتنا ہی وہ زیادہ پڑھتے ہیں، اپنے جہل کا علم اور عالم کی بے ثباتی کا نقش ان کے دل پر گہرا ہوتا جاتا ہے۔ دنیوی زندگی اور اس کے عیش و نعائم کی یہ کارگاہ ایک فریب مستقل اور ایک طلسم خیال نظر آتی ہے۔ انکی نظر میں زندگی کا حاصل "عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما هیچ" کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہمدرد نے محسوس کیا کہ اس اہم رونگار نے ان میں خاصا گداز قلب پیدا کر دیا ہے۔ وہ مسکرا کر فلسفیانہ انداز سے کہنے لگے کہ دنیا کی محرومیوں اور نامرادیوں میں بخت کی ستم ظریفی کی ساز باز نے کچھ اور اضافہ کر کے ان کے مزاج میں خشونت اور چڑچڑا پن پیدا کر دیا ہے، تاہم وہ اپنے دماغی توازن کو اعتدال پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عزلت، گوشہ نشینی اور کم آمیزی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے جس کی وجہ سے ان کے اکثر دوستوں نے ناراض ہو کر ان کو مردم بیزار، خود پسند، ضدی، بخیل اور نہ معلوم کیا کیا کہنا شروع کر دیا ہے۔ لوگ جو چاہیں سمجھیں، جو چاہیں کہیں، یہ ان کا فعل ہے، ان کو اس کی نہ کسی سے شکایت ہے اور نہ پروا! وہ خاموش اپنی منزل کی طرف رواں ہیں۔ ان کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یا خامی! جو بھی سمجھئے!! یہ ہے کہ وہ سنتے سب کی ہیں مگر کرتے اپنی ہی جیسی ہیں۔ ان کے ضمیر کی روشنی ہی ان کی واحد رہنما ہے۔ خدمت خلق اور صلح و آشتی ان کا مسلک ہے۔ وہ اپنے اس اصول پر ہمت و استقلال سے قائم ہیں۔ وہ صبر و استقامت اور آزادی فکر و خیال کو جوہر انسانیت اور قدرت کا سب سے بڑا فیضان و عطیہ سمجھتے ہیں اور اس متاع عزیز کو کسی قیمت پر جدا کرنے کو تیار نہیں۔

اس دلچسپ اثر و کشش سے دل میں گدگدی پیدا ہوئی کہ ان کی وسعت مطالعہ اور اکتسابات کا کچھ جائزہ لیا جائے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مسٹر پیٹر برج نے یکایک مجھ سے سوال کیا:

Woll ! Mr Police Inspector would you please tell me whatallthis fun going on in the city to day?

ہاں! مسٹر پولیس انسپکٹر! کیا آپ مہربانی فرما کر بتائیں گے کہ آج شہر میں یہ سب کیا تماشہ ہو رہا ہے؟! قبل اس کے کہ میں پیٹر برج کو اس کا کوئی جواب دوں، موبائل پٹرول کا حولدار، جو ہماری طویل گفتگو سے اکتا گیا تھا، جھٹ بیچ میں بات کاٹ کر بول اٹھا کہ صاحب آپ لوگوں کی بات چیت میں تو ہمیں یہاں بہت دیر ہوئی جا رہی ہے کوئی دوسرا افسر ہمیں چیک کرنے آ گیا تو ہم لوگ ڈیوٹی سے غیر حاضر لگے جائیں گے۔ اس لئے آپ کو جو کچھ کہنا پڑھنا ہو ہمیں لکھ کر جلد دے دیں

تاکہ ہم صاحب کو آپ کی رپورٹ کے ساتھ لے جا کر تھانہ میں داخل
کر دیں اور پھر اپنی ڈیوٹی بجانے چلے جائیں۔ مسٹر چیمبر برج حولدار کی بات
تو ٹھیک سمجھ سکے، البتہ اس کے دخل در معقولات سے برہم ہو کر چراغ پا
ہو گئے اور اسے بہت زور سے ڈانٹ کر کہا۔

I tell you, Please shut up for Gods sake, don't interrupt -

(میں تم سے کہتا ہوں کہ خاموش رہو اور خدا کے لئے دخل در معقولات
نہ کرو) لیجئے یک نہ شد دو شد! پٹرول گارڈ کی صاحب کی طرف سے
بد ظنی اور بھی کچھ اور بڑھ گئی!! ہر چند کہ صاحب نے اس تہدید و تنبیہ
میں بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا مگر ان کے طرز ادا اور
صوتی فشار سے لازمان پٹرول گارڈ نے شائد اسے بدترین گالی ہی سمجھا۔
میں نے حولدار سے کہا، ذرا توقف کرو! میں صاحب کا بیان لینے کے
بعد ابھی رپورٹ تحریر کر کے ابھی تم کو دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں صاحب
سے پھر مخاطب ہوا، اور کہا کہ افسوس مجھے حولدار کی اس دخل در معقولات
پر اظہار افسوس کرنا ہے اور میں اس کی ناشائستگی کے لئے آپ سے معافی
چاہتا ہوں۔ لیجئے مجھ سے یہ چند جملے سنتے ہی صاحب کی ساری برہمی
کافور ہو گئی اور وہ جیسے اپنے آپے میں آ گئے۔ انھوں نے اپنی مسکراتی
آنکھوں کو بچوں کی طرح عجب شرارت آمیز انداز سے مٹکا کر اور میرے
کان کے پاس منہ لا کر چپکے سے کہا، ہونہہ! دیکھو تو کیا احمق اور بدتمیز
انسان ہے جو شائستگی کی ابجد تک سے واقف نہیں!! اور پھر اپنی
جگہ سیدھے ہو کر ذرا بلند آواز سے کہا، بس! مسٹر پولیس انسپکٹر یہ تو
بتائیے آج شہر میں یہ کیا ہنگامہ برپا ہے اور پولیس ان چند شہریوں
کو آزادانہ شہر میں گھومنے پھرنے کیوں نہیں دیتی، اور چھڑی ڈنڈے لے کر
ہم جیسے ضعیف لوگوں کو چلنے پھرنے کو ممنوع قرار دینے کا فلسفہ کیا ہے؟
جب تک آپ اس کی معقولیت اور جواز سے مجھے قائل نہ کر دیں،
میں ایسے لغو اور مہمل حکم کے لئے ہرگز تیار نہیں! میں نے کہا مسٹر چیمبر برج!!
آپ کو مطالعہ کا جیسا کچھ شوق ہے تو آپ نے تاریخ عالم بھی ضرور
پڑھی ہوگی، اور قوموں کے عروج و زوال، ان کے کردار اور فکر و عمل کی
پستی اور بلندی، اس کے اسباب و علل، اور ان کی گہرائی و گیرائی کے
فلسفہ پر ضرور آپ کی نظر رہی ہوگی۔ [illegible] کی شرح کا افسوس یہ محل اور مقام

نہیں۔ حاکم و محکوم کے مابین یہ کشمکش کچھ اسی قسم کے انقلاب کا پیش
خیمہ ہوا کرتی ہے، اور یہ سارا تماشہ جسے آج آپ دیکھ رہے ہیں شاید
آنے والے انقلاب کے اسی ڈرامہ کا ایک عبرتناک سین ہے جسے تاریخ
عالم دہرایا کرتی ہے۔ برج بولے! مگر ہندستانیوں کا مطالبہ تو بڑی حد
تک گورنمنٹ مان چکی ہے، صرف وقت کی بات ہے۔ پھر لوگ جلد بعد
کیوں اتنا شور و غل مچاتے اور قانون شکنی پر تلے ہوئے ہیں۔ ریل کی پٹری
اکھاڑنا، اسٹیشن جلانا، خزانہ لوٹنا وغیرہ مذموم ترین جرم اور وطنیت سوز
فعل ہونے کے سوا کیا یہ خود ان کا اپنا ہی ذاتی نقصان نہیں ہے؟ مطالبات
کے حصول کے لئے جبر و تشدد کا استعمال کیا کسی شریعت میں جائز ہو سکتا
ہے؟ انھیں صبر سے کام لینا چاہیئے۔ ان کی یہ تیز رفتاری ٹھیک نہیں۔
زیادہ تیز دوڑنے میں آدمی اکثر گر پڑتا ہے۔ میں نے کہا، وہ کہتے
ہیں، ہمارے انتظار کی مدت ختم ہو چکی! اب ہم اپنا پیدائشی حق لے کر
ہی دم لیں گے، اور اب ہم میں قانونی چوں و چرا سننے کی تاب نہیں!!
چیمبر بولا، بیشک ان کا یہ حق تو واجب اور مسلم ہے، اس میں کلام نہیں
مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ایک گاندھی اور نہرو اور ان کے اپنے گنے چنے
رفقاء بھلا اتنے عظیم ملک کا کیونکر انتظام کر سکتے ہیں۔ لوٹ پاٹ مچانے،
توڑ پھوڑ اور نعرہ بازی کی مشق کرنے والوں میں آپ دیکھیں گے زیادہ تر
خود غرض، ابن الوقت opportunist اور کرسی و اقتدار
کے لالچی شریک ہیں جو ملک گیری اور اقتدار پسندی کی ہوس کے
سوا اپنے اندر تعمیری اصلاح کی کوئی استعداد و لیاقت نہیں رکھتے،
چیمبر برج نے کہا، انھیں شورش پسندوں اور تخریب کاروں سے ملنے
اور ان کے ساتھ بات چیت کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ آج ان
کے جلوس میں شریک ہو کر ان کے قائدین سے ملیں گے اور ان کے
سامنے اپنے بحث و استدلال کو پیش کریں گے، اور انھیں چیلنج دیں گے
کہ وہ اس توڑ پھوڑ، لوٹ مار، آتشزنی اور غنڈہ گردی کے جواز کو ثابت
کریں جو اس لاقانونیت کے ماحول کا پروردہ ہے۔ ورنہ اسے ترک
کر کے ضبط، امن و سلامتی کا راستہ اختیار کریں، جس میں ہم بھی
ان کے ساتھ دل سے شریک ہوں۔ ہم انسان کے پیدائشی حق کی
صداقت کو بے چوں و چرا تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ

ہماری بحث و استدلال سے قائل و متاثر ہو کر آئندہ اپنی تخریبی کارروائیوں سے باز رہیں گے۔ میں نے ہنس کر کہا مسٹر شیر بنج! آپ خالص انگریز نژاد نہ سہی مگر شہرت کے اعتبار سے آدھے انگریز ضرور ہوں گے، اور شکل و صورت کے اعتبار سے تو ماشاء اللہ پورے ہی انگریز ہیں، ان شورش پسندوں اور تخریب کاروں کو آپ کے ایسے زریں اصول اور حق پسندانہ جذبات و خیالات کا کیا علم! اور پھر اس جوش و برہمی کے عالم میں انھیں آپ کی بات سننے کی تاب و فرصت کہاں؟ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ آپ کو انگریز سمجھ کر آپ کے ساتھ نہ معلوم کیا بدسلوکی اور گستاخی کر بیٹھیں، ایسی صورت میں سردست آپ ان سے ملنے کا خیال ترک کر دیں اور اس آزمائش میں نہ مبتلا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے ہمارے لئے ایک اور نیا فتنہ کھڑا ہو جائے۔ آپ غور فرمائیں انفرادی ذہنیت سے اجتماعی ذہنیت کیسی مختلف اور عجیب ہوتی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اپنے اس پلان کو ملتوی کریں اور مجھے موقع دیں کہ میں آپ کو بحفاظت گھر پہنچانے کا انتظام کر دوں۔ اس موضوع پر ہماری آپ کی کبھی پھر گفتگو ہوگی جس پر مسٹر بنج نے ہنستے ہوئے کہا کہ عزیز دوست میں آپ کی اس خیر اندیشی کے لئے شکر گزار ہوں، مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری فطری کمزوری کے بیان کو اس قدر جلد فراموش کر دیا، جس کا میں اتنی صفائی اور بے باکی سے آپ کے سامنے اعلان و اعتراف کر چکا ہوں اور جسے میں آپ کو یاد دلانے کے لئے ایک بار پھر دہرائے دیتا ہوں کہ "میں سنتا سب کی ہوں" اس لئے آپ مجھے معاف کریں! میں اپنی زندگی کے اصول سے کبھی ہٹ نہیں سکتا۔ مجھے دنیا چاہے جتنا ضدی، خبطی اور پاگل سمجھے، سمجھتی ہے!!! اس نے عجیب کیف و سرور کے ساتھ اپنے حسب حال کسی انگریز شاعر کا ایک شعر پڑھ کر سنایا، جس کا مفہوم اردو کے اس مشہور شعر کے مطابق تھا۔

رہ گئیں پردۂ ظاہر میں اُلجھ کر نظریں
حسن دیکھا نہ کسی نے مری رسوائی کا

اس نے تھوڑی دیر کے اس لطف صحبت کے لئے بڑی خوش دلی سے میرا شکریہ ادا کیا، اور مسکرا کر شیک ہینڈ کے لئے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر میری آنکھوں میں گھس کے انھیں گھورتے ہوئے کہا کہ پیارے دوست! تمہاری آنکھیں تمہارے دل کا راز فاش کر رہی ہیں۔ تم میری حالت زار پر ملول و غمگین کیوں ہو! میرا عالم تو اس شعر کے مطابق ہے:-

ع چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اس مفہوم کو اس نے انگریزی کے ایک پر کیف شعر میں ادا کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا بڑے سکون سے اپنے موبائل پٹرول کی موٹر پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے وقتی مصالح اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر اپنی رپورٹ انگریزی میں تحریر کر کے اسے بھاری دل سے رخصت کیا۔ اسے رخصت کرتے ہوئے میں نے کہا، مسٹر پیٹر برنج! آپ نے اپنی دلی کیفیات کی تمثیل کے لئے آج کئی دلچسپ اور معنی خیز انگریزی اشعار مجھے پڑھ کر سنائے جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میری آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب کر آپ نے جس صداقت کا کھوج نکالا، اس کے اظہار کے لئے بھی انگریزی میں یقیناً بہت اشعار کہے گئے ہوں گے۔ ہماری زبان کی شاعری میں بھی اس کیفیت کے اظہار میں ایک سے ایک اچھے شعر کہے گئے ہیں، جن میں سے ایک شعر جو مجھے اس وقت یاد آ رہا ہے اُسے پڑھتا ہوں اور اس کا مفہوم انگریزی میں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے:-

ہوتا ہے راز عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

مجھے یقین تھا کہ پیٹر برنج آزاد ہونے کی صورت میں جیسا کہ ابھی اس نے دل میں ٹھانا ہے تخریب کاروں کے گروپ تک پہنچنے اور ان سے اپنی سمجھ کے مطابق بحث و تفہیم کی فرد کوشش کرے گا اور جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا اس کا حشر و انجام امید افزا ہونے کے بجائے خود اس کی سلامتی کے لئے خطرہ نظر آتا تھا۔ ان حالات میں موبائل پٹرول کی معرفت میں نے جو رپورٹ انگریزی میں تحریر کر کے تھانہ عالم باغ روانہ کی اس کا خلاصہ یہ تھا:- مسٹر پیٹر برنج کو آج صبح پولیس موبائل پٹرول کے [illegible] انتظام دفعہ ۱۴۴ [illegible] کی خلاف

دوزی کرتے ہوئے پاکر انھیں تعمیل حکم کی ہدایت کی مگر وہ تعمیل پر تیار نہ ہوئے۔ گارڈ نے انھیں لاکر میرے سامنے پیش کیا۔ میں نے خود بھی ان کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کرتے ہوئے تعمیل حکم پر توجہ دلائی مگر انھوں نے اپنے ذاتی نظریات اور دلائل کے آگے میرے معروضات کی پذیرائی نہیں کی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، خیر اندیش اور بالغ نظر انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر آشوب محل پر انھوں نے شورش پسند عناصر سے ملنے اور ان کو اپنی بحث و استدلال سے قائل و معقول کرکے ان کو تخریب کاری سے باز رکھنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ وہ یقیناً ایک امن پسند شہری ہیں، مگر موجودہ حالات میں ان کے اس اقدام سے کسی مفید نتیجہ کے برآمد ہونے کے بجائے اس میں خود ان کی سلامتی کا خطرہ نظر آتا ہے میں نے اس سے احتراز کے لئے ہر چند انھیں سمجھایا مگر وہ اپنے خیال سے باز آنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے ذاتی حالات خود ان کی زبانی سننے کے بعد مجھے شبہ ہے کہ آلام روزگار نے ان کے دماغی توازن میں کچھ خلل انتشار پیدا کر دیا ہے، اس لئے میں انھیں اس رپورٹ کے ذریعہ بنابر ملاحظہ ڈاکٹری بھیج رہا ہوں۔ ان کا سول سرجن لکھنؤ سے معائنہ کرایا جائے۔ اگر ان کے دماغی توازن میں کچھ فرق معلوم ہو تو انھیں مناسب علاج کے بعد فوراً آزاد کر دیا جائے۔ اس کے برعکس صورت میں بھی چونکہ وہ ایک امن پسند اور بالغ نظر اور آزاد خیال شہری ہیں انھیں رسمی طور پر حسب دفعہ ... فہمائش کرکے جلد آزاد کر دیا جائے۔" میں نے اپنی انگریزی رپورٹ کے ساتھ منشی تھانہ کی ہدایت و رہنمائی کے لئے (جو اردو داں تھا) اردو میں بھی اسی طرح کا ایک مختصر نوٹ تحریر کرکے شامل کر دیا۔ دن بھر گشت تمام کرکے شام کو ڈیوٹی سے فراغ کے بعد جب میں تھانہ عالم باغ واپس ہوا معلوم ہوا کہ ہیڈ محرر نے روزنامچہ عام تھانہ میں باقاعدہ رپورٹ درج کرکے مسٹر بشیر برنج کو بنابر ملاحظہ ڈاکٹری، شفاخانہ جیل لکھنؤ بھیج دیا ہے اور وہاں سے ان کو انڈر آبزرویشن رکھے جانے کی اطلاع آگئی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد میں اپنے عہدے کا چارج دے کر پنشن پر اپنے گھر فیض آباد چلا آیا، اور عہد ملازمت کے سارے قصے میرے لئے خواب و خیال اور قصہ پارینہ بن گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میری خانگی زندگی بھی جہاں تک شوق مطالعہ وغیرہ کا تعلق ہے مسٹر بشیر برنج سے کچھ ملتی جلتی سی بسر ہو رہی ہے۔ حوائج ضروری سے فراغت کے بعد میرا بھی بیشتر وقت مطالعہ میں بسر ہوتا ہے۔ حالانکہ اپنی کم مائیگی کے سبب جہاں تک اکتسابات کا تعلق ہے میرا دامن خالی ہے۔ روزنامہ انگریزی اخبار پڑھنے کا شروع ہی سے معمول چلا آتا ہے۔ پنشن پر گھر آنے کے تقریباً ایک سال بعد ایک صبح اخبار پائنیر میں خبر کی یہ سرخی پڑھ کر میں سخت حیران ہوا کہ چیف منسٹر یوپی پنڈت گووند بلبھ پنت کے معائنہ لکھنؤ جیل کے دوران ایک اینگلو انڈین قیدی مسٹر بشیر برنج نے یہ شکایت کی کہ وہ ضعیف و بے گناہ امن پسند شہری بلا کسی جرم و قانونی کارروائی کے سال بھر سے جیل میں قید و بند کی آزمائش میں مبتلا ہے کسی نے آج تک اس کا حال پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اور نہ اسے بتایا گیا کہ وہ کس جرم میں ماخوذ ہے اور نہ کسی عدالتی کارروائی کے لئے وہ کبھی بلایا گیا۔ اس نے چیف منسٹر سے کہا کہ نظام حکومت کی ابتری کی اس سے بڑھ کر افسوس ناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ چیف منسٹر نے مسٹر بشیر برنج سے یہ سخت حیرت انگیز داستان سن کر اسی وقت اپنے ہمراہی افسران کو حکم دیا کہ وہ فوراً پولیس، عدالت اور جیل کے ریکارڈ کا جائزہ لے کر بتائیں کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ کاغذات کا بغور معائنہ کرنے پر سب سے پہلے اس غلطی کا انکشاف ہوا کہ بشیر برنج کا نام جو اردو کے روزنامچہ عام اور رپورٹ میں صاف اور صحیح تحریر تھا اسے آگے چل کر کسی ستم ظریف اہل کار نے کاغذات میں بشیر برنج کے بجائے بیمبر بھوج بنا دیا۔ اس غلطی کے سوا اس سلسلہ میں اہل کاران تعلقہ کے فعل اور ترک فعل کی omission and commission and red tapism کی بدقسمتی سے کچھ اور دلچسپ کلمات اور فرد گذاشتیں شامل ہو گئیں جن سے غلطیوں کا اچھا خاصا ایک مینا بازار تیار ہو گیا۔ اور ان کے نتیجہ میں بشیر برنج نے اپنا چولا بدل کر بیمبر بھوج کا قالب اختیار کر لیا۔ ملازمان سرکار کی اس ستم ظریفی پر خود بشیر برنج کی یہ بالائے ستم ظریفی یقیناً قابل داد ہے کہ انھوں نے اپنے متعلق اس شدید غلطی کا، سب کچھ جانتے ہوئے، نہ خود کوئی نوٹس لیا۔ اور نہ کوئی عذر و احتجاج کیا، اور خود اطمینان سے جیل میں بیٹھ کر اپنی

رسوائی کا تماشا دیکھتے رہے۔ اس سے بڑھ کر عملی اور واقعاتی مذاق کوئی اور کیا کر سکتا ہے! اور اس طلسم کی عقدہ کشائی کو انھوں نے صرف چیف منسٹر کی آمد پر موقوف رکھا۔ انھوں نے چیف منسٹر سے صاف طور پر اعتراف کیا کہ جیل میں ان کے دوران قیام وقتاً فوقتاً اکثر چھوٹے بڑے افسران معائنہ کے لئے آتے رہے، جس کی تیاری پر جیل میں بڑا اہتمام ہوتا اور قیدیوں کو سمجھایا جاتا کہ جس کسی کو کچھ عذر کرنا ہو وہ پہلے سے اہل کاران جیل کو بتا دے اور افسر معائنہ کنندہ سے کوئی بات براہ راست نہ کہے۔ اس طرح معائنہ کا نام تو ہو جاتا مگر اس کی حقیقت تماشا یا سیر و تفریح سے زیادہ نہ ہوتی۔

مسٹر بشیر برنا نے چیف منسٹر سے کہا، ہر چند مجھے آپ سے ذاتی تعارف نہیں، تاہم میں نے اپنی دل چسپی اور شوق مطالعہ کی بدولت جنگ آزادی کے سورماؤں سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لی ہے۔ آپ نے اس جنگ میں جو رول ادا کیا ہے میرے دل میں اس کی قدر ہے۔ مجھے آپ کے چیف منسٹر ہونے کی خبر سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کی ذات ان چند مغتنم ہستیوں میں سے ہے جن کے دل میں خدمت خلق کا صحیح جذبہ اور لگن ہے اور جو اپنے فکر و تدبر سے غلط دھاروں کا رخ موڑ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ جب کبھی موقع ہوا آپ جیل دیکھنے ضرور آئیں گے۔ اور میں نے اپنے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ جب آپ جیل دیکھنے آئیں میں اپنی ذاتی تکالیف کے ذکر کے بجائے آپ سے پورے اس نظام حکومت کی مشینری کی صفائی اور درستی کی درخواست کروں گا جو اب بہت فرسودہ اور قابل ترمیم ہو چکی ہے۔ مجھے عرصے سے آپ کی آمد کا انتظار تھا۔ میں ایک آزاد منش، خوددار اور بے پروا انسان ہوں۔ قیام جیل کے دوران جو افسران معائنہ جیل کے لئے آئے ان میں مجھے کوئی آدھا بھی گوونداچاریہ نہیں نظر آیا، اس لئے میں نے کسی نااہل کے سامنے سوالی بن کر کھڑا ہونا اپنی عزت نفس کے لئے باعث ننگ سمجھا اور اپنے لبوں پر مہر خاموشی لگائے بیٹھا گوونداچاریہ جی کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج میری دلی خواہش پوری ہوئی ہے۔

میں درحقیقت اس اہل کار کا ممنون و شکر گزار ہوں جس نے اپنی ستم ظریفی سے میرے نام کے ساتھ ایسی دل چسپ اور مضحکہ خیز غلطی کی اور کتاب سے مجھے اتنے عرصے تک جیل کے گوشۂ امن و عافیت میں پناہ لینے اور وقت کے مختلف مسائل پر یک سوئی کے ساتھ غور کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ مجھے یقین ہے کہ اسی طرح وقت اور حالات کی ستم رانیوں کا شکار ہو کر مجھ جیسے نہ معلوم کتنے بے گناہ چھوٹے بڑے بشیر بھوج جیلوں میں پڑے آج بھی سڑ رہے ہوں گے، اور جنھیں اپنی رکشا کے لئے کسی گوونداچاریہ جی کی آمد کا انتظار ہوگا۔

جہاں تک میرے ذاتی مسئلہ کا تعلق ہے، حکومت کی مشینری کے مختلف پرزوں کے فعل اور ترک فعل کی یہ ایک المناک داستان ہے جس کی گتھی اور صفائی سے اب مجھے کوئی دل چسپی نہیں۔ تاہم ایک حکومت کے لئے کیا یہ شرمناک مثال نہیں کہ اس کا نظام تعلیم اور معیار تعلیم ایسی پستی اختیار کر رہا ہو کہ لوگوں میں صحت کے ساتھ کسی نام کے لکھنے پڑھنے کے شعور کا بھی فقدان ہو جائے، اور آئین، بیوروکریسی کے دستور کے طبیس میں ریڈ ٹیپزم کی لعنت کا مختلف سطحوں پر یہ عالم ہو کہ اس کی برکت سے اکثر ہر روز واقع ہونے والے مسائل بھی برسوں کی خبر لیں۔ کاش مجھ جیسے کمتر درجہ کے بشیر بھوج کی قربانیاں، بیوروکریسی اور ریڈ ٹیپزم کی گوناگوں خامیوں کی اصلاح میں کسی حد تک بھی معین ثابت ہوں تو میں سمجھوں کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

مسٹر بشیر برج کی داستان الم اور حکومت وقت پر ایسا بے لاگ تبصرہ سن کر چیف منسٹر انتہائی متاثر، متحیر اور مغموم ہو گئے۔ اس کی مکمل تحقیقات کی فوری ضرورت سمجھ کر انھوں نے ذریعہ ٹیلیفون عدالت عالیہ ہائی کورٹ لکھنؤ کے ایک جج کو فوراً اس معاملہ کی تحقیقات شروع کرنے کا حکم دیا۔ اور بشیر بھوج سے جو اپنا چولا بدل کر اب صحیح طور پر مسٹر بشیر برج کے قالب میں آ گئے تھے ان کی ذہنی اور دماغی تکلیف پر اپنے کمال افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کو بڑی عزت و تکریم سے جیل کی قید و بند سے فوراً آزادی کا حکم دیا اور کہا کہ پوری تحقیقات کے بعد اس غلطی کے ذمہ دار لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے، نیز مسٹر بشیر برج کو جو تکلیف ہوئی اس کا بھی مداوا کرنے کی وہ کوشش کریں گے۔

اخبار میں چیف منسٹر صاحب کا دورۂ جیل لکھنؤ اور مسٹر بشیر برج کے سال

بھر تک بلا کسی قانونی کارروائی کے جیل میں پڑے رہنے کا واقعہ اور اس کی تحقیقات کے لئے ہائی کورٹ کے ایک جج کے مقرر ہونے کے واقعہ کو پڑھ کر مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور قدرتی طور پر مجھے سخت فکر لاحق ہوگئی۔ کیونکہ مسٹر بشیر بھٹ کو میں نے ہی اپنی رپورٹ کے ساتھ برائے معائنہ ڈاکٹری روانہ کیا تھا اور جس کے آٹھ ہی دن کے بعد میں ملازمت سے ریٹائر ہوکر پنشن پر اپنے گھر چلا آیا تھا۔ معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر میں اصل حقیقت معلوم کرنے کی فکر میں فوراً لکھنؤ گیا۔ جہاں مجھے اپنے ہیڈ محرر سابق سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بھی شاید لکھنؤ سے کسی دوسرے ضلع تبدیل ہوگئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب یہاں اس سلسلہ میں ایک تہلکا مچا ہوا ہے اور ہائی کورٹ کے آنریبل جج کے حکم سے جملہ اہل کاروں اور افسران متعلقہ فوری طور پر برائے تحقیقات اسی طرح طلب کیے گئے ہیں کہ ہر ایک کے لئے ایک ایک افسر جداگانہ اسے حاضر لانے کو مامور کیا گیا ہے اور وہ خود بھی اسی سلسلہ سے حاضر کئے ہیں۔ ان کا بیان برشتۂ عدالت ہو چکا ہے اور انھوں نے کہا کہ اردو میں صحت کے ساتھ انھوں نے روزنامچہ میں نام بشیر برج تحریر کیا تھا۔ ان کو علم نہیں کہ کسی اہل کار نے بعد کو دیگر کاغذات میں اسے بیتمبر بھوج بنا دیا۔ کچہری اور جیل کے اہل کاران کے بیانات بھی ہوئے ہیں۔ مسٹر بشیر بٹ بھی جیل سے رہا ہوکر باہر آگئے ہیں اور اس تحقیقات کے سلسلہ میں ان کا بیان مفصل لیا گیا ہے۔ منشی نے کہا کہ جن افسران و اہل کاران کا اس کارروائی سے ذرا بھی تعلق تھا وہ سب بلا کسی استثنار کے برائے تحقیقات فوری طلب ہوئے ہیں۔ مجھے خیال تھا کہ میں بھی اس سلسلہ میں ضرور طلب کیا جاؤں گا۔ مگر جب میری طلبی کا سوال عدالت میں اٹھایا گیا تو خود مسٹر بشیر بٹ نے جج صاحب سے کہا کہ وہ ان کی رپورٹ دیکھ لی جائے اگر اسے دیکھنے کے بعد کوئی بات مزید تحقیق طلب معلوم ہو تو ان کو بلایا جائے۔ وہ رپورٹ کی صحت کی پوری تصدیق کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے میری انگریزی رپورٹ جو کاغذات کے انبار میں کہیں دبی پڑی ہوئی تھی تلاش سے مل گئی تھی، اور اسے جج صاحب نے بغور ملاحظہ کرنے کے بعد خود کہا کہ اس میں حقیقت حال کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جس کی صحت کی پوری تصدیق خود مسٹر بشیر بٹ بھی کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس طرح عدالت عالیہ نے مجھے طلب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

مجھے اپنے دوست بیتمبر بھوج یعنی مسٹر بشیر برج سے ملنے اور ان سے اصل واقعات معلوم کرنے کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مل جائیں تو ان کے جیل کے اس طویل قیام کی داستان اور پھر چیف منسٹر پنڈت گووند بلبھ پنت کے معائنہ جیل کی دلچسپ روداد سنی جائے۔ چنانچہ بالآخر اس تحقیقات کے دوران مسٹر بشیر برج سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھ سے انتہائی خلوص و محبت سے ملے۔ اپنے حالات کے ذکر کے بجائے وہ دیر تک خود میرے اور میرے بچوں کی خیریت اور ذاتی حالات وغیرہ پوچھتے رہے۔ میں نے کہا کہ ذرا چیف منسٹر سے اپنی ملاقات کا حال تو بتائیے جسے اخبار میں پڑھ کر میں اپنے گھر فیض آباد سے اس کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے بھاگا چلا آرہا ہوں۔ اس پر زور سے ہنستے ہوئے انھوں نے مجھے وہ سب حالات بتائے جن کا ذکر میں اس مضمون میں پہلے کر چکا ہوں۔ میں نے کہا کہ جس طرح آپ نے پہلی ملاقات کے موقع پر مجھے انگریزی کے برمحل بڑے اچھے اچھے اشعار سنائے تھے کیا آنریبل چیف منسٹر کو بھی کچھ اشعار سنانے کا آپ کو موقع ہوا تو ہنس کر کہا انھیں تو صرف ایک ہی شعر سنانے کا موقع ہوا تھا۔ جب انھوں نے میری جیل کی قید و بند والی زندگی اور اس کے مصائب پر اظہار افسوس کیا تھا میں نے ان سے کہا تھا کہ اس کا تمام تر تعلق انسان کے احساس و ادراک سے ہے۔ وہ غم میں بھی نشاط اور قید و بند میں بھی آزادی کے تصور کا خلاق بن جاتا ہے۔ میں نے اس وقت اپنے حسب حال انگریزی کا ایک شعر ان کو پڑھ کر سنایا تھا۔ جس سے وہ بہت متاثر اور لطف اندوز ہوئے تھے۔ چنانچہ انگریزی کا وہ شعر بشیر برج نے مجھے بھی پڑھ کر سنایا، جو مجھے اب ٹھیک طرح یاد نہیں مگر جس کے مفہوم کو میں نے بالکل اس شعر کے مطابق پایا تھا ؎

مجبوریٔ حیات میں راز حیات ہے
زنداں کو میں نے روزن زنداں بنا دیا

اس المناک داستان کا انجام یہ ہوا کہ آنریبل جج کی تحقیقات

(سلسلہ صفحہ ۶۶ پر)

.... کنووکیشن کا دن۔ بجز اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہوگیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بچوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر کبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مختلف طریقے
امدادات آپ کو فیملی ویلفیئر سینٹرز سے
دستیاب ہیں۔ ان کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔

انور خان

خوف

اُس نے مڑ کر دیکھنا چاہا کہ واقعی کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے یا روز کی طرح یہ صرف اس کا وہم ہے لیکن اُس کے سر پر کسی چیز کی ضرب لگی اور وہ چکرا کر گر پڑا۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد اُسے ہوش آیا۔ اُس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ کچھ کوشش کر کے وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھول پایا۔ وہ اپنے کمرے ہی میں تھا۔ اُس نے دیکھا ایک آدمی سامان سمیٹ رہا ہے۔ اُسے آہستہ آہستہ پورا واقعہ یاد آیا۔ اُس کا وہم سچ ہو گیا تھا۔ شدید درد کے باوجود اُس نے سکون محسوس کیا۔

اب وہ اس بھیانک خوف سے آزاد ہو چکا تھا جو ہر رات سونے سے پہلے اسے اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ ہر رات بستر پر لیٹے لیٹے اسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ اور کسی چیز سے ضرب لگانے جا رہا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ چور دروازہ کھول کر یا کھڑکی سے داخل ہو رہا ہے۔ وہ بار بار مڑ کر دیکھتا۔ کبھی دروازہ تک جا کر دیکھتا کہ اس نے ٹھیک سے بند کیا ہے یا نہیں۔

لیٹے لیٹے وہ چور کو سامان ایک بڑے سے تھیلے میں ڈالتے دیکھنے لگا۔ اچھی خاصی جسامت تھی۔ ایسے اطمینان اور خوشی سے سامان جمع کر رہا تھا کہ اُسے رشک آنے لگا۔ سر کا درد کم ہو گیا تھا۔ تو بالکل اُسی طرح ہو گیا تھا جیسے وہ سوچا کرتا تھا۔ اُس نے اطمینان سے سوچا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ [illegible] دیر یونہی اسی طرح خالی الذہن لیٹا رہا ہو گا کہ [illegible] چاپ اپنے قریب آتی سُنائی دی۔ چور اُسی کی طرف آ رہا ہے۔ اُس نے سوچا۔ وہ چُپ چاپ ساکت لیٹا رہا۔ چور اس کے قریب آ کر رُک گیا۔ اُس کا جی چاہا آنکھیں کھول دے۔ اُس نے اپنی اس خواہش کو شدت سے دبا دیا۔ چور ایک منٹ تک ہی کھڑا رہا ہو گا لیکن یہ ایک منٹ کا وقفہ بھی اسے بہت طویل معلوم ہوا۔ پیروں کی چاپ آہستہ آہستہ دور ہونے لگی۔ وہ جا رہا ہے۔ اُس نے سوچا۔ چاپ تھم گئی۔ شاید وہ دروازے پر رُک گیا ہے اور مڑ کر اُسے دیکھ رہا ہے۔ ایک لمحہ بعد پیروں کی چاپ پھر سنائی دینے لگی اور کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ وہ چلا گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ جا چکا تھا۔ لیکن وہ اٹھا نہیں۔ بڑی دیر تک اسی طرح لیٹا رہا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ سر میں اب بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا لیکن اس کا موڈ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ رہ رہ کر اسے خیال آتا کہ بالکل اسی طرح سب کچھ ہوا جس طرح وہ سوچا کرتا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر تک وہ اسی طرح لیٹا رہا۔ جب لیٹے لیٹے اکتا گیا تو اس نے سوچا اب اُٹھ جانا چاہیے۔ لیکن گھڑی بھی چور لے جا چکا تھا۔ نیچے کے ہوٹل کے دروازے کھلنے کی آواز آئی۔ پانچ سوا پانچ ہو رہے ہیں۔ اُس نے سوچا۔ وہ اُٹھا اور کپڑے اتار کر نل کے نیچے بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک نہاتا رہا۔ نہا کر اٹھا اور تولیہ سے بدن پونچھ کر کپڑے تبدیل کیے۔ گرم کپڑے اور ٹیریلین کی قمیص چور لیتا گیا۔ اس نے سوتی قمیص

اور پتلون پہنی اور تکیہ کے غلاف میں سے بٹوا نکالا۔ اُسے بٹوا اس طرح سے چھپا کر رکھنے کی احتیاط پر خوشی ہوئی۔ کچھ کچھ اُجالا ہونے لگا تھا۔ اس نے جوتے پہنے اور کمرہ بند کر کے اُتر گیا۔

ایرانی کے ریستوران میں وہ عادت کے مطابق دروازے کے قریب کی میز پر بیٹھا ہمیشہ کی طرح بیرے کو چائے کا آرڈر دے رہا تھا۔ پھر اپنی کنجوسی پر پشیمان ہو کر اُس نے بیرے کو واپس بلایا اور مسکہ سلائس، انڈہ تلا ہوا اور چائے منگوائی۔ آج وہ پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اُس کے ہاتھ ہمیشہ کی طرح جیب میں گئے کہ پیسے ہیں یا نہیں لیکن اُس نے ہاتھ جیب سے باہر نکال لیے۔ ناشتہ کر کے معمول کے مطابق اپنے کمرے میں جانا اُسے ٹھیک نہیں لگا۔ وہ پیسے ادا کر کے باہر آیا اور راستوں پر ٹہلنے لگا۔ وہی لوگ اکاّ دکاّ راستے پر نظر آ رہے تھے جنھیں ملازمت کے لیے علی الصبح نکلنا پڑتا ہے۔

سردی خاصی تھی لیکن قابلِ برداشت بس اسٹاپ پر پہنچا تو خیال آیا کیوں نہ اپولو بندر چلا جائے وہ بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد بس آئی۔ وہ اوپر کے ڈیک پر چلا گیا۔ ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے ڈرائیور بس بڑی تیزی سے دوڑا رہا تھا۔ ہوا لگنے سے اسکے بال اُڑنے لگے۔ اُس نے ہاتھوں سے بال سنوارنے کی کوشش کی۔ ہاتھ لگتے ہی ہلکے سے درد کا احساس ہوا اور رات کا واقعہ پھر اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ وہ اپنی توجہ ہٹانے کے لیے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

اپولو بندر پہنچا تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ وہ چلتے چلتے سمندر کے کنارے بنی منڈیر پر ایک جگہ چھاؤں دیکھ کر بیٹھ گیا۔ خالی الذہن وہ آس پاس کا ماحول دیکھتا رہا۔ اُس کے قریب ایک شخص بیٹھا ٹرانزسٹر پر فلمی گانے سن رہا تھا۔ دو بوڑھے بات چیت میں مشغول تھے۔ ایک ملازم لڑکا اپنے آقا کے کتے کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ایک کمسن لڑکی سائیکل چلا رہی تھی۔ دو غیر ملکی سمندر کی طرف منہ کیے کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ اُس نے مسرت سے سانس لی۔ آس پاس کا منظر صبح کی ہوا کے ساتھ ساتھ اُس کی رگ رگ میں پیوست ہو رہا تھا۔ مسرت سے اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ خوشی اب تک کہاں تھی۔ کیا خوشی اسی کو کہتے ہیں خوشی کو ضبط کرنے کی کوشش میں وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے سمندر کی منڈیر کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک چلا گیا۔ قریب کی ایک گلی میں ایک جدید طرز کا ریستوران تھا۔ وہ چائے پینے کے لیے وہاں چلا گیا۔ ایک میز پر بیٹھ کر اُس نے بڑی خود اعتمادی سے چائے کا آرڈر دیا اور ہوٹل کے ملازمین کو غور سے دیکھنے لگا۔ چائے پیتے پیتے اُسے خیال آیا کہ اُسے آفس جانا ہے۔ لیکن آج آفس جانے کے لئے اُس کا جی نہیں چاہا۔ لیکن پھر کہاں جائے۔ بہر حال آج وہ آفس نہیں جائے گا۔ اُسے یہ روز کا چکر توڑتے ہوئے خوشی ہوئی۔ کیوں نہ کوئی فلم دیکھی جائے۔ اسنے بیرے سے اخبار منگوا کر دیکھا۔ صرف ہندی فلموں کے صبح کے شو تھے۔ اخبار پڑھتے ہوئے اُس نے کھیل کا صفحہ دیکھا۔ موہن بگان فائنل کھیل رہی تھی۔ ہاکی کھیلے اور دیکھے ہوئے اُسے ایک زمانہ ہو گیا۔ اس نے طے کیا کہ شام کو وہ میچ دیکھنے ضرور جائے گا۔

سینما ہاؤس پر بڑی بھیڑ تھی۔ زیادہ تر طالب علم تھے۔ اُسے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آیا۔ وہ بھی اسی طرح اسکول سے بھاگ بھاگ کر فلمیں دیکھنے آیا کرتا۔ وہ بکنگ آفس پر لگی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ طالب علم یہاں وہاں دوڑ رہے تھے۔ لڑکیوں کے بھی غول تھے قہقہے وقفے وقفے سے فضا میں بکھر جاتے۔ قطار آہستہ آہستہ سرکتی رہی۔ اسکا نمبر آنے تک شو کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ ٹکٹ خرید کر ہال کی طرف دوڑا۔ سیٹ بہت آگے ملی تھی۔ ایرکنڈیشنڈ ہال میں اُسے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اُسے خیال آیا کہ لوگ ابھی آفس میں آ رہے ہوں گے اور دستخط کرتے ہی ساڑھے پانچ بجے تک کے لئے قید ہو جائیں گے۔ میں آزاد ہوں۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ اور مسکراتے ہوئے پیر پھیلا دیے اور سر کو سیٹ سے لگا دیا۔

فلم مزاحیہ تھی اور دیکھی ہوئی تھی لیکن چونکہ دیکھے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ بہت سی باتیں تو وہ بالکل بھول گیا تھا۔ صرف کچھ مناظر اُسے یاد تھے۔ وہ فلم میں خوب ہنسا۔ ایسی بے فکری سے جیسے وہ ابھی طالب علم ہی ہو۔ دو بار تو سیٹی بجانے کا ارادہ کر کے رہ گیا۔ سینما دیکھ کر نکلا تو بھوک لگ رہی تھی۔ قریب کے ایک اچھے سے ہوٹل میں جا کر [illegible] اور مرغ کا آرڈر دیا۔ کھانا کھا

ہوئے اُسے لطف آیا جیسا اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ زندگی کا
کی گتھی میں کوکاکولا کی ایک چسکی لیتے ہوئے اس نے سوچا۔ اسکی میز
پر چند آدمی بیٹھے ہوئے اک فائل پر تبصرہ کر رہے تھے۔ وہ جلدی
سے اٹھا اور باہر آکر ٹیکسی کی۔ کھیل اگرچہ چار بجے شروع ہونے والا
تھا لیکن اچھی جگہ حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلدی پہنچتا۔
تین بجے ٹکٹیں فروخت ہونے لگیں۔ اور اسے اپنی پسند کے مطابق
جگہ مل گئی۔ تھوڑی دیر میں اسٹیڈیم میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔
اس نے اپنے کچھ پرانے ساتھیوں کو جگہ تلاش کرتے دیکھا تو ہاتھ کے
اشارے سے اوپر بلا لیا۔ وہ بیزار وقت لوگوں کو پھلاندتے،
ان کی گالیاں کھاتے اوپر آئے کسی نہ کسی طرح لوگوں کو سمجھا بجھا کر
اس نے تھوڑا تھوڑا کھسکا کر بیٹھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح اپنے دوستوں
کے لیے جگہ بنا لی۔ وہ آپس میں بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ایکدوسرے
کی خیر خیریت پوچھی گئی۔ کھیل شروع ہوا۔ موہن بگان کے لیے چیختے
چیختے اس کا گلا دکھنے لگا اور جب ٹیم نے گول کیا تو اس نے میدان
سر پر اُٹھا لیا۔ کھیل ختم ہونے تک وہ اپنے آپ کو بھی فراموش
کر چکا تھا۔

دوستوں میں کسی نے تجویز پیش کی کہ بہت دنوں بعد ملے
ہیں کیوں نہ رات کا کھانا اکٹھے کھایا جائے۔ تجویز فوراً منظور کر لی
گئی انہوں نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا۔ بیتی باتیں یاد کر کے خوب
لطف اندوز ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق ہونے لگا
اور بات دھول دھپے تک جا پہنچی۔

گھر پہنچ کر بغیر کپڑے اُتارے وہ بستر میں لیٹ گیا۔ اور
دن بھر کے واقعات ذہن میں دہرانے لگا۔ وہ بے انتہا خوش
تھا۔ اُسے نیند نہیں آئی۔ رات کے گیارہ بجے بارہ بجے۔ شاید
خوشی کی وجہ سے اُسے نیند نہیں آرہی ہے۔ اُس نے سوچا۔ کروٹیں بدلتے
بدلتے ایک بج گیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنا خوف یاد کرنے کی
کوشش کی جسے سوچتے سوچتے وہ سویا کرتا تھا لیکن اب خوف ختم
ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر
کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ [illegible] تو پھر بستر پر لیٹ گیا۔
لیکن نیند کا پتہ نہ تھا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی۔ رات بھر
جاگنے سے اس کا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا اور سر میں شدید درد
اتنا شدید کہ اس کا جی چاہا اپنا سر دیوار سے دے مارے ——

بلدیو مرزا

اور برف گرتی رہی

میں وائلن کے تار ملاتا ہوں۔ لیکن ایک تار تو ملتا ہی نہیں۔ بار بار اتر جاتا ہے۔

پھر کھونٹی کو کستا ہوں۔ تار پھر ڈھیلا ہو جاتا ہے۔

"یہ پھر بے سُرا ہو گیا!"

ایسا لگتا ہے جیسے کوئی دوسرا بھی کان لگائے بیٹھا ہو۔ لیکن یہاں.... اور کون ہے میرے سوا! مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا.... باہر سناٹے میں لپٹی ہوئی مدھم سی چاندنی اور اندر.... میں اور میرا سایہ۔ اور کوئی نہیں ہے یہاں..... شاید یہ میرا ہی دوسرا روپ ہے جو کبھی کبھی بولنے لگتا ہے۔ لیکن! یہ ہنسی.... یہ ہنسی تو میری نہیں ہے۔ یہ آواز.... اور یہ ہنسی بالکل اسی کی ہے۔ جس کا ایک نام ہے۔ ایک رنگ ہے اور ایک قد ہے۔ اور جس کو میں نے وائلن کے تاروں کی طرح اپنی آستھا کے تاروں میں ملانے کی جتنی کوشش کی اتنا ہی میں خود احساس کے پہاڑوں میں موم کی طرح پگھلتا رہا۔

وہ.... جو ٹھیک میرے کمرے کے اوپر رہتی تھی۔ دونوں کمروں کے بیچ کا فاصلہ ایک موٹی سی چھت تھا۔ جس کی عمر.... ابھی بہت لمبی تھی۔ اکثر میں چھت کو نظروں سے کریدنے لگتا۔ کہ شاید اس میں بھی شگاف ہو جائے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ شاید یہ ممکن ہی نہ تھا۔ یہی بات اس نے بھی پہلی ہی ملاقات میں کہہ دی تھی۔

"میں سنتی ہوں ٹھیک تمہارے اوپر۔ لیکن تمہارے اور میرے کمرے کے بیچ میں یہ چھت جو ہے۔ یہ اتنی موٹی اور مضبوط ہے۔ کہ شاید کبھی نہ ٹوٹے گی۔"

دسمبر کی ایک صبح ـــــ

ہم دونوں دو ماہ کے لئے جدا ہو رہے تھے۔ میں اسے بس اسٹینڈ تک چھوڑنے گیا تھا۔ جاڑے کی چھٹیاں قریب، پت جھڑ کا موسم تھا۔ چلتے چلتے میں نے کئی بار اس کے چہرے کو جھیل پر پھیلی ہوئی دھند کے پس منظر میں دیکھا تھا۔ کیا کیا باتیں کی تھیں۔ اب تو کچھ بھی یاد نہیں بس.... وہ چند لمحے تھے۔ جو اپنی حدوں پر جا کر ٹوٹ گئے۔ اور وہ چلی گئی۔

وادی بھیگنے لگی۔ دور تک پھیلے ہوئے ننگے پیڑ، گیلی سڑک پر بکھرے ہوئے مردہ پتے۔ اور میرے جوتوں کی چاپ۔

اور پھر ـــــ میں اور میرا وائلن، جس کے تاروں کو میں انگلیوں سے چھیڑنے لگتا۔ مگر تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں علاوہ ایک آدمی کے جو خود کسی سینی ٹوریم میں دم توڑ رہا تھا۔ اور کوئی تھا ہی نہیں جو اس کو ٹھیک کر سکتا۔

وقت کی ڈھیری میں آگ برابر سلگتی رہی۔

دو ماہ میں کئی بار برفباری ہوئی۔ میں گرتے ہوئے نرم برف کے گالوں پر اپنی یادوں کے قلم سے نہ جانے کیا کچھ لکھتا رہا اور مٹاتا رہا۔ چاندی کی طرح چمکتی ہوئی فضا میں گیلی گیلی سڑکوں پر تنہا گھومتا رہا۔ بالکل تنہا۔ اکثر برف کے گالوں کو اپنے کندھوں اور سر پہ لئے گھر لوٹتا۔ نہ جانے کیوں ان کو ہٹانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اکثر تو

میکش نے اکثر میں وائلن بجاتے سنا ہے اور تم سے ملنے کو بہت جی چاہا۔ آج [illegible] اور جلد آ کر ملنے [illegible] تمہارے قریب ہی

کمرے کی چھتوں میں پڑی ہوئی ان پھولوں کی سوکھی ہوئی پتیوں کو بے
دھیانی سے چن لیتے جو میرے کوٹ پر وہ اکثر لگا جایا کرتی تھی۔ میں گم سم
بس سٹینڈ کی طرف جاتی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگتا۔ اور خیالوں ہی
خیالوں میں اس کے پیروں کے نشان تلاش کرتا۔ اور اکثر میری نظریں
اس کی بند کھڑکی سے ٹکراتیں۔ لیکن بند کھڑکی اور بھٹکی ہوئی
نظروں کا کیا رشتہ [illegible]
لمحے پھر پھولوں کی پتیوں کی طرح میرے گرد رقص کرنے لگے۔
وہ لوٹ آئی تھی۔ اور [illegible] ہونٹوں پر کھوئی سی مسکراہٹ
تھی۔ چھٹیاں گزار آئی تھی۔ میں بھی جواب میں مسکرا دیا۔ جی چاہا کہ بڑھ کر
اس سے پوچھوں کہ چھٹیاں کیسی گزاریں۔ کہاں کہاں گئیں۔ اور کیا کیا
دیکھا۔ لیکن اچانک ٹوٹی ہوئی کرسی سے ایک دم اٹھنے کا خیال آتے
ہی میں بیٹھا بیٹھا ہی مسکراتا رہا۔ اور وہ اپنے لوگوں کے ساتھ اوپر
چلی گئی۔ بند کھڑکی پھر سانس لینے لگی۔
دوسرے دن صبح سے ہی برفباری شروع ہو گئی۔ وادی
نے کسی سنیاسی کی طرح سفید چادر اوڑھ لی۔ میں برآمدے میں کھڑا
بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے کان برابر کی سیڑھیوں
پر لگے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کسی کے نیچے اترنے کی آواز آنے
لگی۔ یہ وہی تھی۔ جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ دوسرے لمحے وہ
میرے سامنے کھڑی تھی۔
"کہو کیسے ہو؟ کہیں گئے نہیں؟ چلو کہیں گھوم آئیں سامنے
والی چوکی تک۔
برفباری اچھی لگتی ہے نا؟
اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ اس سے
پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ میں بھی ساتھ
ہو لیا۔ مارے خوشی کے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ دونوں خاموش
چلے گئے۔ ذہن میں بہت سے خیالات اٹھتے تھے۔ اور زبان تک آتے
آتے پگھل جاتے تھے۔ برف کے پھوئے دونوں کے سروں اور
کندھوں پر گرتے رہتے۔ اور کچھ نیچے گر جاتے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی
دیر بعد اپنے کندھوں اور سر سے برف جھاڑ دیتی تھی۔ لیکن میں نہیں
یونہی رہنے دیتا۔
"ارے! برف کیوں نہیں جھاڑ دیتے؟ لاؤ میں...."
"نہیں! نہیں! انھیں یہیں رہنے دو۔ یہ نیچے گر کر ٹوٹ
جائیں گے۔ بکھر جائیں گے۔ شاید ان میں کسی کا پیار ہو؟"
کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا ان میں کسی کا پیار.....!"
اور ہنستے ہنستے اس نے میرے کندھوں اور سر سے برف کو
اپنے دائیں ہاتھ سے ہٹا دیا۔ ایسا کرتے میں اچانک اس کا ہاتھ ایک
پیڑ کی ٹہنی سے جا لگا۔ پیڑ کا سکوت ٹوٹ گیا۔ ٹہنی پر رکے ہوئے
برف کے گالے نیچے گر گئے۔
یہ گرنا، ٹوٹنا اور بکھرنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔
گرتی ہوئی برف، دھندلی سی فضا، چاروں طرف سناٹا
اور برف میں دھنستے ہوئے ہمارے قدم۔ اچانک چلتے چلتے وہ ذرا رک
گئی۔ اور کہنے لگی۔
"تم یہاں سے چلے تو نہیں جاؤ گے؟"
میں اس کے سوال پر چونک اٹھا۔ مجھے لگا۔ شاید اس کو
مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔"
لیکن وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابر دیکھتی رہی۔
شاید اس کو اب بھی شبہ تھا۔ لیکن مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی
مسکرانے لگی۔ اور آنکھیں جھکائے میرے پیچھے پیچھے ہو لی۔ جی تو میرا
بھی چاہا۔ کہ میں بھی اس سے یہی سوال کروں۔ لیکن نہیں۔ ابھی نہیں۔
شاید پھر کبھی۔ یا کبھی نہیں۔ لیکن یکایک یہ خیال آتے ہی کہ تھوڑی
دیر میں منزل آ جائے گی۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ میرے ہونٹوں کو
جنبش ہوئی۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لگتا تھا جیسے میری آنکھوں
کے ہاتھ اُگ آئے ہوں۔ اور میرے ہونٹوں کی ذرا جنبش پر اپنی
انگلیاں رکھ دیتے ہوں۔ لیکن کہاں تک چپ رہتا۔
"کاش منزل کبھی نہ آئے۔ ہم دونوں یونہی اس برفانی
راستے پر چلتے رہیں۔ اور برف اسی طرح گرتی رہے۔"
"ہاں! اگر پھسلنے کا ڈر نہ ہو۔ دیکھو کھائی کتنی گہری ہے۔"

اتنی گہری۔ کہ اگر سارے بادل اس میں اپنی اپنی آتما بھی نچوڑ دیں۔ تو بھی بھر نہ پائے گی۔

میں گھبراہٹ سے نیچے کی طرف دیکھنے لگا۔ کھائی بہت گہری تھی۔

"ڈر گئے کیا؟"

"نہیں تو"

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا۔ لیکن میں برابر سوچتا رہا۔ کہ یہ راستہ اور یہ کھائی دونوں ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں۔ ذرا پاؤں پھسل جائے تو...... یہی سوچتے سوچتے میں چلتا چلا گیا۔ اچانک میں نے پیچھے لوٹ کر دیکھا۔ وہ پیچھے رہ گئی تھی۔ برف میں اس کا جوتا پھنس گیا تھا اُسے نکال رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسکی مدد کرتا۔ اس نے خود ہی نکال لیا۔ اور ہنستی ہوئی میرے ساتھ آملی۔ جیسے ہی ہم اگلے موڑ پر پہنچے۔ برف میں لپٹی ہوئی جھیل صاف دکھائی دینے لگی۔ کیونکہ برف باری تھوڑی دیر کے لئے رُک گئی تھی وہ نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اکثر مدھم سی چاندنی راتوں میں جھیل سے کسی کے وائلین بجانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے دل کا سارا درد تاروں میں اُنڈیل دیا ہو۔ کون ہے وہ؟ تم نے ضرور سنا ہوگا!"

"ہوگا کوئی پیار کا مارا"

میرے جواب سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس کی نگاہیں برابر میرے چہرے پر لگی رہیں۔ شاید وہ چاہتی تھی۔ کہ میں یہ کہہ دوں۔ کہ وہ میں ہی ہوں۔ اور یہ بھی کہہ دوں۔ کہ وہ درد تمھارا ہی دیا ہوا ہے۔ جو تمہارے اور میرے بیچ کے فاصلے کی آواز ہے۔ لیکن میں کچھ نہ بولا۔ ہمارے پیر برف میں دھنستے جا رہے تھے۔ برف گہری ہو گئی تھی۔ پھسلنے کے ڈر سے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے گیلے گیلے ہاتھ میں میرا سرد ہاتھ بے جان سا پڑا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر ایک انجانا احساس جاگنے لگا۔ میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ نہ جانے کون میرے دل کے کسی تاریک گوشے سے مجھے گھور رہا تھا۔ کوئی اجنبی تھا۔ وہ میں نہیں تھا۔ کوئی اور تھا۔ جو تاریکی سے باہر روشنی میں آنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں [illegible] چاہتا تھا چلتے

وہ ہنستی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اور اس نے اپنے ہاتھ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

بے خیالی میں میرا ہاتھ ایک چٹان سے چھو گیا۔ اس پر لگے ہوئے برف کے گالے نیچے پھسل گئے۔ اس جگہ سے وہ ننگی ہو گئی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"شاید ہم چوٹی کے قریب پہنچ گئے ہیں؟"

"ہاں۔ یہی موڑ آخری ہے"

ہم دس قدم ہی چلے ہوں گے۔ کہ چوٹی پر پہنچ گئے۔

"لو آ گئی چوٹی۔"

"لیکن یہ بلندی کیسی ہے۔ یہاں بھی کہرا ہی کہرا ہے؟"

"ہاں! یہاں سے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا!"

سامنے برف سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا شیڈ تھا ہم اسکے اندر جاکر کھڑکی کے پاس باہر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ برف پھر گرنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے ہمارے پاؤں کے نشانات مٹ گئے۔ ہم خاموش کھڑے حسین منظر کا لطف لیتے رہے۔

"تم رکو۔ میں ابھی آئی۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ اور برف پر انگلی سے میرا نام لکھنے لگی۔ ابھی پورا نام نہ لکھ پائی تھی۔ کہ شروع کے حروف برف سے ڈھک گئے۔ اس نے پھر ان میں انگلی پھیری۔ وہ پھر مٹ گئے میں یہ دیکھتا رہا۔ اور مسکراتا رہا۔

برف کے شوخ گالے اس کے رخساروں کو چھوتے اور میرے نام کے حروف پر گر جاتے۔ یہی تھا میرا وہ حسین خواب۔ جسکی آرزو میں میں نے زندگی کے نہ جانے کتنے کڑوے گھونٹ پئے تھے۔

"برف پر کوئی نشان نہیں رکتا"...

"اچھا یہاں نہیں۔ میں وہاں اس لکڑی کے کھمبے پر تمہارا نام لکھ دوں گی۔ میرے پاس ایک چیز ہے۔"

اپنے اوپر سے برف جھاڑتی ہوئی وہ اٹھی اور جوڑے سے ایک بڑا سا پن نکال کر اس نے کھمبے پر میرا نام کھودنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا

"کیوں تمہارا ارادہ بھی ہے کیا؟"
"میں تو پہلے ہی ٹھکا چکا ہوں تمہارا نام"
"کہاں؟"
"اپنی آتما پر"
"سچ!"

اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اور پھر اچانک اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے مٹھائی کا ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"لو کھاؤ۔ یقیناً بھوک لگ رہی ہوگی!"

بھوک تو واقعی مجھے لگ رہی تھی۔ ہم دونوں نے پیکٹ خالی کر دیا۔ اور بڑھتی ہوئی برف باری کی طرف دیکھنے لگے۔ سردی زیادہ لگنے لگی۔

"کیا واپس چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟"
"کیا کریں گے لوٹ کر۔ آؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برف میں دب جائیں۔"
"لیکن سورج چین نہیں لینے دے گا۔"

میں کچھ نہ بولا۔ اور خاموش شیڈ کی چھت سے برف کے پگھلتے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھنے لگا۔ جو بالکل میرے خوابوں کی طرح تھے۔ میں انھیں جی بھر کے دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اس نے چلنے پر اصرار کیا۔ اور ہم دونوں پھر اسی راستے سے واپس ہو لئے۔

اور ــــ پھر وہیں لوٹ چلے۔ جہاں سے آئے تھے۔ مکانوں کی چھتوں سے پھسلتی ہوئی نظریں پھر انہیں پھر دوں پر جاکر منجمد ہونے لگیں۔ جن میں وہ عرصے سے قید تھیں۔

کئی چہرے۔ کئی لوگ۔ کئی راستے اور شب و روز کا پھر وہی تعاقب۔

اور پھر وہی دو کمرے۔ ایک اوپر اور ایک نیچے۔ بیچ میں ایک سپاٹ۔ مضبوط چھت جس کی عمر ابھی بہت لمبی تھی۔

(۲)

اس چھت کے نیچے اور ایک اور مکان تھا۔ جو کبھی خالی پڑا تھا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے اس کا دروازہ کھلا رہنے لگا تھا۔ اور اکثر اندر سے کسی کے گانے کی آواز بھی سنائی دینے لگی اور کبھی صرف تان پورے کی گونج ہی کانوں میں پڑتی۔ کچھ دنوں بعد اس آواز کے ساتھ ساتھ کسی اور کی آواز کے ــــــــ

بھی سنائی دینے لگی۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ یہ آواز اسی کی تھی۔ اسی کی۔ جو کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر کھیلتی تو کبھی آنسو بن کر پلکوں میں جھلملاتی تھی۔ جو گانے میں اور بھی دلکش معلوم ہوتی تھی۔ میں اکثر گانا سننے کی غرض سے وہاں جانے لگا۔

برف پگھلنے لگی۔ پہاڑوں کے بدنما چہرے اور ان کے بیچ میں ٹھہرے ہوئے شگاف صاف دکھائی دینے لگے۔ مکانوں کے اندر اور باہر روشنی اپنے پاؤں پھیلانے لگی۔ لیکن جہاں سے گانے کی آواز آتی تھی۔ وہ کمرہ اسی طرح تاریک تھا۔

ایک دن ــــ

اسی کمرے میں ہم تینوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اندھیرے میں ایک دوسرے کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تان پورے کی آواز ہمارے خیالات کے ساتھ بہے جا رہی تھی۔ لیکن اس میں کپکپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا بجانے والے کے ہاتھ کانپ رہے ہوں۔ اور شاید دل بھی۔ کیوں؟ یہ میں نہ سمجھ سکا۔ اور تھوڑی دیر بعد گھبرا کر باہر نکل آیا۔ مجھے لگا۔ جیسے اندھیرے میں کچھ کھو آیا تھا۔ چلتے چلتے میرے کانوں میں دونوں کے گانے کی آواز آنے لگی۔

جھیل کے کنارے جھنوں کے پیڑ پھر ننگے ہونے لگے۔ ناؤ بھی سب کی سب کندھے سے کندھا ملائے خاموشی کنارے پر کھڑی تھیں۔ لوگوں کی چہل پہل کم ہو گئی تھی۔ لگتا تھا ساری وادی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو۔

چھٹیوں کے دن پھر آئے۔ وہ جانے کے لئے پھر اپنے لوگوں کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ لیکن اس بار میں اُسے بس اسٹینڈ تک چھوڑنے نہیں گیا۔ کیوں جیسے میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ بس باہر بیٹھا بیٹھا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا

ایک طرف جھیل اور دوسری طرف وہ ــــــ

دیکھتے دیکھتے، وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سڑک خاموش ایک سوالیہ نشان کی طرح میرے سامنے تھی۔ فضا پھر کہرے سے بھرنے لگی۔ ٹوٹی ہوئی کرسی اور میں۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ نظریں پھر سوکھے ہوئے پیڑوں سے الجھنے لگیں۔ لیکن اس تنہائی میں وہ برابر میرے ساتھ رہی۔ ہر وقت سوتے جاگتے۔ لیکن خاموش۔ اگر کبھی بولتی بھی تو اس کے ساتھ کسی اور کی آواز بھی شامل ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے۔ یہ میرا وہم ہو۔ اور یہ دوسری آواز میری ہی ہو۔

مجھے لگتا تھا۔ ہم دونوں اب بھی اسی برفانی راستے پر گامزن تھے۔ جو ایک چوٹی پر ختم ہوتا تھا۔

(۳)

ایک صبح ــــــ

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

"ہاں۔ ہاں! کیوں نہیں۔ آؤ۔ صبح صبح کیسے تکلیف کی؟"

"کچھ نہیں! یونہی تم سے ملنے چلا آیا۔"

"بیٹھو جاؤ۔ میں تمھارے لئے چائے لاتا ہوں۔"

"بیٹھوں گا نہیں۔ چلو۔ کہیں گھوم آئیں۔ آج خوب برف پڑ رہی ہے۔ تمھیں برف باری اچھی لگتی ہے نا!"

میں انکار نہ کر سکا۔ اور بے دلی سے اٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ بنا کچھ ایک دوسرے سے کہے سُنے، ہم برفباری میں چلے جا رہے تھے۔ ابھی آبادی پار نہیں کر پائے تھے۔ کہ زور سے میری پیٹھ پر کچھ آکر لگا۔ میں نے دیکھا۔ وہ برف کا ایک گولا تھا۔ جو لگ کر ٹوٹ گیا تھا۔ سامنے والے مکان کی کھڑکی میں کھڑا ایک بچہ زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو گولے اور تھے میں بھی مسکرانے لگا۔ ہم نے آبادی پار کی۔ اور راستے کے ایک طرف پڑی سی چٹان پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے جیب سے دو سگریٹ نکالے۔ ایک مجھے دیا۔ اور دوسرا [illegible] ہوئی تیلی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات شروع کر دوں۔ وہ کہنے لگا۔

"تم نے وائلن بجانا کیوں چھوڑ دیا۔؟"

"گز ٹوٹ گیا ہے۔"

"دوسرا کیوں نہیں منگوا لیتے!"

"ہاں! منگواؤں گا۔"

"تمہارے تان پورے کی آواز بھی سنائی دیتی آج کل؟"

"یونہی! کچھ جی نہیں چاہتا۔"

اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کا ٹکڑا برف پر پھینک دیا۔ جو فوراً بجھ گیا۔ میں ڈھیر سی برف میں پڑے ہوئے اس ٹکڑے کو دیکھنے لگا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں؟"

"ہاں، ہاں، کہو!

"شاید تم یہ سمجھتے ہو۔ کہ اس نے جسم کی بھوک سے چھٹکارا پا لیا ہے۔ وہ جو تمہارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں؟

میں نے سگریٹ کے ٹکڑے کو پھینکتے ہوئے جواب دیا۔ اور اس کے جواب کے انتظار میں گھبرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ تھا۔ وہ کچھ ہچکچا رہا تھا۔ لیکن پھر بولا۔

"میں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں۔ کہ وہ تمھیں نہیں۔ مجھے چاہتی ہے۔ اور اس نے اپنے آپ کو مجھے سونپ دیا ہے۔"

مجھے لگا۔ میرے پاؤں برف پر نہیں۔ بلکہ دہکتے ہوئے انگاروں پر جیسے جل رہے ہوں۔ اور ان کا دھواں میری روح میں بھرتا جا رہا ہو۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر پھر پوچھا۔

"اس سے آگے بھی کچھ اور....؟"

"وہ بہت حسین ہے۔ اس کے گداز بدن کی خوشبو میری رگ رگ میں بس گئی ہے۔ میں نے اُسے پا لیا ہے۔ اس کا جسم میرا ہے۔ فقط میرا۔"

میری نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ [illegible]

اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں۔ اور میرے دل کی وادی میں پڑی ہوئی برف اچانک پگھلنے لگی ہو۔ جی چاہ رہا تھا۔ وہاں سے فوراً چل دوں۔ لیکن کہاں؟ اور کدھر؟ راستے میں برف دھونی رمائے بیٹھی تھی۔ لیکن ابھی کچھ اور سننا بھی باقی تھا۔ غم کدے سے پھر کسی کے سسکنے کی آواز آنے لگی۔

وہ پھر کہنے لگا۔

"ایک رات —— جب میں اسے گانا سکھا رہا تھا۔ اس کی آواز میری آواز میں ملتی چلی گئی۔ اور پھر دونوں کے جسم .... اس کے گداز جسم کی گرمی میں نے اپنے جسم میں محسوس کی۔ میری پیاس بڑھتی گئی ...... اور کیا کہوں!"

مجھے ایسا لگا۔ جیسے ساری فضا بھی یہی کہہ رہی ہو۔ اور لگا جیسے برف سے ڈھکی ہوئی سب چٹانیں ننگی ہو گئی ہوں اور میرا منہ چڑا رہی ہوں۔ میرے برف میں الجھ گئے۔ بہت دیر دیر میں خاموش بیٹھا چاروں طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہا۔ بس یونہی دیکھتا رہا یونہی ......

سامنے والے پیڑ سے برف کے گالے نیچے گرتے رہے، ٹوٹتے رہے۔ اور بکھرتے رہے۔

■ ■

سلسلہ شیشوں کا مسیحا

"میرا انعام لے دینا وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

جب نے جل عجیب طریقے سے سرائی ہوئی چلی گئی تو سیمانے چند لمحے عجیب اضطراب میں گزارے۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور ڈاکٹر ادین ہائیر کو ٹیلی فون کیا۔

"ڈاکٹر تمہارے تحفے کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ ہاں بہت ضروری۔ کیا آپ آسکتے ہیں؟ ہاں اسی وقت فوراً۔ تھینک یو۔"

سیمانے رسیور واپس رکھ دیا اور بے چینی سے سری دھر کا انتظار کرنے لگی۔ (باقی باقی)

■ ■

سلسلہ پیتمبر بھوج

کے بعد کچھ اہل کار ان ذمہ دار اپنے فعل و ترک فعل کی پاداش میں مورد عتاب ہو کر سزایاب ہوئے۔ کچھ ضابطہ کی کارروائی میں ترمیم اصلاح کی گئی۔ اور مسٹر پیٹر برج کو ان کی ذہنی اور جسمانی پریشانی اور تکلیف کے کفارہ کے طور پر ایک بیش قرار رقم گورنمنٹ سے عطا ہوئی۔

افسوس کہ مسٹر پیٹر برج کا عجیب دلچسپ اور نادرہ کار ہستی عرصہ گذرا اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے اور اپنے صبر و استقامت آزادی فکر و عمل اور خود شناسی کے کچھ لازوال نقوش دنیا میں چھوڑ گئے جو خدا شناسی کی پہلی منزل ہوتی ہے۔

حضرت اصغر نے خوب کہا ہے!

وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انہیں انساں بنا لیا

■ ■

"فراز گھر سے غائب ہو گیا ہے۔"

— میں چونک گیا۔ کیونکہ اس خبر کے لئے پہلے سے تیار نہیں تھا۔ ویسے اس نے کہا تو تھا کہ وہ گھر سے کہیں بھی چلا جائے گا۔ کیونکہ جس طرح کی زندگی جینے پر اُسے مجبور کیا جا رہا تھا، اس طرح وہ جی نہیں سکتا۔ میں نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا نہیں تھا — اور یہ تو بالکل سوچا ہی نہ تھا کہ وہ کہنے کی بات کر کے بھی دکھلائے گا اور گھر سے اچانک غائب بھی ہو جائے گا۔ میں نے اس خبر کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا۔ دو ایک لمحے جیسا تھا ویسا ہی کھڑا رہا۔ دو ایک بار گھور کر خبر لانے والوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب سنجیدگی اور بڑی بے چارگی سے میری ہی طرف دیکھ رہے تھے — میں نے ان سے ایک دو بار کہا بھی کہ کیا یہ سچ ہے؟ یا وہ مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں! جیسے کہ ابھی مذاق ہو —

وہ سب جو فراز کے پڑوسی دوست تھے بتانے لگے کہ فراز کل صبح سے غائب ہے اور اس کی سائیکل بھی غائب ہے۔ سائیکل لے کر وہ جانے کہاں چلا گیا۔ وہ سب بہت پریشان ہیں اور یہ کہ وہ صبح سے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا "اس کے ماتا پتا سوچ رہے ہیں کہ فراز کے غائب ہونے کا تم کو پتہ ہوگا اور یہ بھی کہ وہ جہاں کہیں بھی گیا ہوگا، تم کو بتا کر گیا ہوگا — کل صبح سے وہ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ تمہارے یہاں ہے اور شام تک یہی سمجھتے رہے — رات کو انہوں نے سوچ لیا کہ زیادہ رات ہونے کی وجہ سے وہ تمہارے ہی گھر سو گیا ہوگا — مگر آج صبح تک بھی جب وہ نہیں آیا تو بہت پریشان ہوئے۔ اور ڈھونڈ رہے ہیں — انہوں نے بڑی امیدوں سے تمہاری طرف بھیجا ہے!

"مگر..." میں نے اپنے کانپتے دل کو سنبھالا "یہ صحیح ہے کہ وہ میرا دوست تھا اور ہے۔ اور بہت گہرا دوست تھا اور ہے۔ اور ان کا یہ اندازہ بھی مناسب اور ٹھیک ہے کہ وہ رات کو میرے یہاں سو گیا ہوگا۔ کیونکہ ایسا اکثر ہوا ہے! مگر سچ مانو مجھ سے وہ آخری بار پرسوں ملا تھا۔ اس کے بعد ہم نہیں ملے اور پھر وہ جہاں کہیں بھی گیا ہے مجھے بتا کر نہیں گیا۔ وہ ادھر آیا ہی نہیں... اگر وہ بھاگنے سے پہلے میرے گھر آیا ہوتا تو کیا میں اُسے بھاگنے دیتا"؟

وہ سب جو میری باتوں پر یقین کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اب سر ہلانے لگے مگر کہا: "یار پھر وہ کہاں گیا — ہم نے تو سب جان پہچان والوں کے یہاں اسے دیکھ لیا ہے۔ یہاں تم ہی بچے تھے سو وہ بھی پوچھ لیا!؟ —؟"

"لیکن! — تم اس کے گھر چلو اور وہاں صاف صاف بات کہو تو ان کو یقین آئے گا!" میں سٹپٹا گیا — میں نے سوچا: فراز تو جانے کہاں ہے پریشان ہم ہو رہے ہیں۔ کیا میں اُس کے ماتا پتا کو اس بات کا یقین دلا سکوں گا کہ وہ مجھے پرسوں ہی ملا تھا، اس کے بعد نہیں اور یہ کہ اس کے بعد میں کچھ نہیں جانتا۔!!

سائیکلیں دوڑنے لگیں — میں نے ان کے ساتھ — چلتے چلتے سوچا۔ پتہ نہیں میں اپنا چہرہ ٹھیک سے اداس اور مغموم کر پایا ہوں یا نہیں! پھر سوچا چپ رہنے سے تو بہتر ہے میں ان لوگوں سے کچھ بات کروں اور یہ بتانے کی کوشش کروں کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہوا — فراز کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

میں نے پوچھا "وہ گھر سے کب گیا؟"

وہ بولے — "کل صبح آٹھ بجے سے غائب ہے"

میں نے پھر پوچھا "وہ کہاں گیا — اور سائیکل سے وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

— اُن میں سے ایک بولا: کچھ بتا نہیں سکتے اگر شہر سے باہر گیا ہوگا تو امرائوتی جائے گا یا ناگپور وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس۔

مگر یہ سب تمام اتنے دور ہیں کہ وہ سائیکل سے بھلا کیسے جا سکتا ہے۔"

"پتہ نہیں وہ کیوں گیا؟"

"کوئی جھگڑا وگڑا ہوا تھا گھر میں؟ —"

"پتہ نہیں ..... شاید ہوا ہو"

"عجیب لڑکا ہے۔ کل رات دیر تک اس کی ماں انتظار کرتی رہی۔ دروازے کی ہر آہٹ پر چونکتی رہی — کہ وہ آیا ہو۔ مگر وہ نہ آیا۔ صبح سے اب رو رو کر جانے کیا کیا سوچ رہی ہے۔ کراس چوک میں کل رات ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ شراب کے نشے میں چور ٹرک ڈرائیور نے ایک سائیکل والے لڑکے کو کچل دیا! اس کی ماں بار بار اسی ایکسیڈنٹ کو یاد کر کے روتی ہے کہ فراز کہیں وہ سائیکل والا لڑکا تو نہیں!"

"میں نے اس سے کہا بھی کہ وہ زندہ ہے" ایک بولا

"تم کو کیا سچ مچ اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں" پہلے نے پوچھا

— میں پھر کانپ گیا! کیا یہ لوگ اب بھی مجھ پر یقین نہیں کرتے — "نہیں یار — ہاں مگا ڈ وہ پرسوں ہی ملا تھا۔ میں آج ہی اس کی طرف آنے والا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہ تو تم لوگ بتا رہے ہو۔ کیا تم لوگ سچ کہہ رہے ہو؟"

— میں نے سوچا جب وہ لوگ مجھ پر یقین نہیں کرتے تو مجھے کیا پڑی ہے جو میں ان پر یقین کر لوں! وہ سب بولے "نہیں نہیں یار۔ بھلا ہم کو مذاق سے کیا ملے گا — اور ایسا مذاق!"

سڑک اب ٹرافک والے گنجان علاقے سے گزر رہی تھی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں شور کرتے چھوٹے بڑے وہیل! — کچھ دیر کے لئے باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ ہم آگے پیچھے نکل گئے تھے۔ پھر جیسے ہی ٹرافک کا اژدھام ختم ہوا اور فراز کا محلہ آیا۔ تو ہمیں نظر آئے۔ نالی پر گندگی پھیلاتے بچے۔ کوڑے کے ڈھیر کوڑا خانے سے باہر بکھرے ہوئے۔ آگے پیچھے سیدھے الٹے گھر اور دروازوں میں بیٹھی عورتیں سبزی کاٹتی ہوئیں، دال بنتی ہوئی اور جوئیں چنتی ہوئیں۔ گلیوں میں الیکٹرک بلب پھوٹے ہوئے بجلی کے تاروں میں لٹکے ہوئے چیل کوّے! چاروں طرف بدبو — تیز اور تیکھی۔ ذہن میں گھستی ہوئی —

میرا گھر — فراز کے اس محلے سے دور، شہر سے باہر سو مضافات میں تھا۔ ہرے بھرے میدانوں اور تازہ ہواؤں میں سانس لیتا ہوا چاندنی میں نہاتا، سورج روشنی کے دوش کرتا ہوا۔ میرا گھر فراز کو بہت پیارا تھا۔ وہ اکثر میری طرف آتا۔ دیر تک ہم قدرت کا نظارہ کرتے۔ کبھی کبھی وہ یہاں آ کر پینٹنگ بھی کرتا۔ شہر کے شور شرابے سے دور — اس کے گھر کی طرح نہیں کہ سورج کی روشنی نہیں ملتی اور تازہ ہوا کا تو قحط پڑا ہے! —

وہ اپنے گھر کو گھر نہیں مرغی کا ڈربہ کہتا تھا — اور وہاں کی سیلن زدہ بدبودار گھٹن سے ہمیشہ اکتایا سا رہتا — شور شرابے سے بھاگتا رہتا۔ اکثر کہتا: کہ وہ گندگی اور شور اس کے شعور کی تہوں تک میں جا گھسے ہیں اور یہ سوچ کر کڑھتا رہتا — کہ اس کا ذہن کچرے کا ڈبہ ہو کر رہ گیا ہے! جہاں گھر گھر کی عورتیں جھاڑو پر لاد کر کوڑا کرکٹ پھینکتی جا رہی ہیں — بنا یہ سوچے کہ کارپوریشن کا کچرا ٹرک کب آئے گا؟ آئے گا بھی کہ نہیں؟!

ایک دو مرتبہ میں نے اس کا گھر اچھی طرح دیکھا تھا۔ ایک ہی بڑے مکان کو دس حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور دس بھرے پُرے خاندان (بھرے پورے خاندان سے مراد وہ خاندان جس میں میاں بیوی کے علاوہ دو بن بیاہی لڑکیاں ایک نوجوان لڑکا اور بہت سارے چھوٹے بڑے بچے بستے ہوں!) دس مرغی کے ڈربوں میں رہتے تھے۔ ایسا ہی ایک مرغی خانہ فراز کے خاندان کو بھی ملا۔ مگر اس کا خاندان دوسروں کی بہ نسبت چھوٹا خاندان تھا۔ ماں باپ وہ خود اور ایک بہن! پھر بھی ارد گرد کے شور شرابے، ساس بہو کے جھگڑے، بیوی شوہر کی مار پیٹ — بچے گلیوں میں چھینا جھپٹی۔ اور سلائی مشین کی کھٹ کھٹ سے کان پک جاتے اور ذہن بھی — پھر ہر خانے کا دروازہ کچھ اس طرح الگنی میں کھلتا۔ "مانو دادی اماں سے کہانیاں سننے کے لئے چھوٹے بڑے بچے ان کے منہ کے پاس منہ لا کر اور سٹ کر بیٹھ گئے ہیں یا اُن کی گود میں!" —

وہ عجیب سی زندگی جی رہا تھا! اس شور شرابے سے دور اس کے ذہن میں کچھ خواب تھے — جو کم آمدنی میں بھی پورے ہو سکتے تھے۔ ایک خواب گھر کے لئے۔ ایک آسائش زندگی کے لئے۔ دوسرا چاندنی میں نہانے کے لئے۔ تیسرا خواب سوچ کو روشن کرنے کے لئے۔ ایسے بہت سے خواب تھے۔ مگر گھر والوں نے انہیں نظر انداز کر دیا فراز کے جذبات کی قدر نہ کی۔ لڑکے اس کا ذہنی سطح پر بہت ستایا۔ ذلیل کیا

اور یہاں تک کہ بالغ ہونے پر بھی گھر میں اس کا کوئی مقام نہیں بلکہ کوئی
حیثیت متعین نہیں ہوئی اور تب اس نے کہا: "انھوں نے میرے
خوابوں کی کوئی قدر نہ کی اور مجھے ذہنی طور پر ستاتے رہے — تم دیکھ لینا
میں بھی انھیں ستاؤں گا۔ اور یہ احساس دلاؤں گا کہ ذہنی سطح پر
تڑپنا کیا ہوتا ہے!"

اس نے گھر والوں سے اپنے لئے خاندان میں ایک مقام مانگا
تھا۔ اپنی حیثیت تسلیم کرنے کو کہا تھا — اور سب سے زیادہ اس نے
'ذہنی شانتی' کے لئے ہڑتال کی — اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ یہاں
سے دور دور کہیں چلا جائے گا۔ تب وہ لوگ پچھتائیں گے۔ اس نے
کئی بار اپنی Demands دہرائی تھیں چیتاونی بھی دی تھی —
مگر کسی نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور وہ پھر اس خیال کو۔ کہ دور، دور
کہیں چلا جائے گا، حقیقت بنانے کے لئے بہت دور چلا گیا۔ اب
اس کی ماں رو رہی ہے، جیسا کہ مجھے معلوم ہوا، اس نے کھانا بھی نہیں
کھایا ہے اور وہ سب پریشان ہیں — اور جیسا کہ مجھے فراز نے
بتایا تھا کہ وہ انھیں ذہنی سطح پر پریشان کرے گا! — اس نے کیا
ویسا ہی — جیسا کہا تھا!

گھر رو رہا تھا — اداسی اور یاس کے بادلوں سے گھرا —
میں نے اپنے آپ کو آنے والے وقت اور حالات کے لئے تیار
کیا اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا —

اندر عجیب طرح سے آنسوؤں کی برسات ہوئی۔ فراز کی ماں اور
بہن زوبی کی پلکوں پر اس برسات کی بوندیں شبنم کی طرح چمک رہی تھیں!
مجھے اندر آتا دیکھ کر انھوں نے وہ بوندیں پونچھ ڈالیں — ماں نے ساری کا
پلو سنبھالا اور بالوں پر ہاتھ پھیرے کیونکہ وہ پہلے کبھی اس حال میں میرے
سامنے نہ آئی تھی — سامنے انگنائی میں ٹوٹی جھلنگا چارپائی پر فراز
کے پتا براجمان تھے — کچھ دور زینے کے قریب ایک چھریری لڑکی
تقریباً چودہ پندرہ سال ہوگی بیٹھی تھی۔ اور بہت سی عورتیں تھیں
پاس پڑوس کی — جو شاید دلاسے اور تسلیاں دینے آئی تھیں —
— ایک دو لوگوں کے ٹھٹ میں یوں ہی سا ایک زمین کرید رہا۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے بولنے کے لئے کوئی مناسب ڈائس یا پلیٹ فارم
نہیں مل رہا ہے اور یہ کہ میں کہاں سے بولوں؟ اور سب سے بڑھ کر تو یہ مسئلہ
کہ کیا بولوں؟ کیونکہ یہ سب ماحول اور حالات میرے لئے نئے تھے اور
مجھ سے پوچھ کر نہیں آئے تھے — میں نے محسوس کیا کہ وہ کہیں بہت اونچائی
سے میں دھرتی کی طرف پیراشوٹ میں الجھا الجھا کر پھینکا گیا ہوں اور
اب پیر جمانے کے لئے دھرتی تلاش رہا ہوں! — مگر دھرتی پر بالآخر
قدم جمانے ہی تھے — اور انگنائی میں بیٹھے ان چار پانچ چہروں کے
آگے اپنے جمے ہوئے جبڑے کھول کر، برف کی طرح جمے ہوئے الفاظ، آواز
کی تپش میں گرما کر، باہر ہوا میں بہانے تھے!

وہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے اور مجھ سے کچھ سننے کے لئے بیتاب
دکھائی پڑتے تھے — لیکن میں بات کہاں سے شروع کروں؟ لیکن
بات بہت زیادہ 'بھاری' بھی نہیں تھی۔

میں نے اس کے پتا کی طرف دیکھا — پھر ماں کی طرف — پھر بہن
کی طرف — پھر ان دوستوں کی طرف جو مجھے اطلاع دینے میرے گھر آئے
تھے اور اب میرے پیچھے کھڑے تھے اس کے بعد والی کارروائی کے لئے!
کیونکہ وہ اپنے دوست فراز کے لئے بہت پریشان تھے اور کچھ ایسا کرنا
چاہتے تھے جس سے اس کی ماں کے آنسو بہنے بند ہو جائیں! کیونکہ یہ لوگ
فراز کی ماں کو، بہن کو، پتا کو پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے اور جو بارود
ان کے ذہنوں میں جل رہا تھا وہ اس کی جگہ 'شانتی' لانا چاہتے تھے۔
کیسے بے حس اور ناکارہ دوست تھے۔ کیونکہ وہ روتا نہیں تھا! اگر وہ
روتا تو کیا یہ دوست، وہاں شانتی لا دیتے؟ — وہ تو صبر کرنے کو کہتے۔
یہ وہاں شانتی نہ لا سکے تو یہاں کیا لائیں گے۔ اونھ! روایتی لوگ!

فراز نے بہت اچھا کیا — یہ اس کے لئے اور ہم سب کے لئے ایک
'ایڈونچر' ہے — اس کا گھر سے بھاگ جانا!

— میرے پیچھے کھڑے تمام دوست ریل کے ڈبوں کی طرح
ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے جن میں کوئی عقل نہیں ہوتی۔ صرف
چال ہوتی ہے! — کہ انجن جہاں لے جائے گا جائیں گے — ورنہ
جنگل میں، صحرا میں، کہیں بھی پڑے رہیں گے — شاید وہ لوگ مجھے
انجن سمجھ رہے تھے!

—— میں نے سوچا کہ اب مجھے کچھ کہنا چاہئے۔ کچھ کہہ دینا چاہئے۔ اور اگر زیادہ دیر لگائی تو اس کی ماں پھوٹ پڑے گی اور مجھ سے پوچھ ڈالے گی۔ " تو نے فراز کو کہاں چھوڑ دیا۔ بتا —— بتاتا کیوں نہیں۔۔۔"

—— لیکن میں کیا بتاؤں۔ میں نے فراز کو کہیں نہیں چھوڑا۔ اسے اپنے پاؤں نہیں دیئے۔ عقل نہیں دی۔ وہ تو اپنے ہی پیروں سے جانے کہاں چلا گیا ہے ——

—— میں نے اپنی صورت روہانسی بنانے کی کوشش کی اور بہت ساری رقت گلے میں بھر کر بولا: " فراز نے یہ سب ٹھیک نہیں کیا۔"

—— پھر مجھے لگا کہ میں نے یہ ٹھیک نہیں کہا مجھے کچھ اور کہنا چاہئے تھا —— میں کچھ اور کہتا کہ پتا نے کہا " —— بیٹھو، بیٹھو "

—— میں پھر بھی کھڑا رہا —— اگر بیٹھ جاتا تو یہ لوگ سمجھتے کہ فراز کے غائب ہونے سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی —— اس لئے میں نے کچھ دیر اور کھڑا رہنا مناسب سمجھا اور کھڑا رہا۔ پتا بولے " بات کچھ نہیں تھی وہ کل۔۔۔"

" وہ تمہارے یہاں آیا تھا " ؟ —— ماں نے بات کاٹ کر پوچھا۔

" نہیں وہ میرے یہاں دو دن سے نہیں آیا۔ ہم پرسوں ملے تھے۔ میں آج آنے والا تھا اس سے ملنے " میں نے سچ اگلا۔

" ہم تو سوچ رہے تھے تمہیں سب معلوم ہوگا۔ تم سے بڑی آس تھی " پتا نے کہا۔

" م م۔ نہیں میں کچھ نہیں جانتا —— پتہ نہیں وہ میری طرف کیوں نہ آیا جانے سے پہلے۔ ورنہ میں جانے نہ دیتا —— لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ میں نے ان پر سوال کا تیر چھوڑا ——

سب کی دو دو آنکھیں اب بھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں گھور رہی تھیں۔ انہیں —— ٹٹول رہی تھیں!!

" ہوا کچھ خاص نہیں۔ کل جیب خرچ کے لئے پیسے مانگے میرے پاس نہیں تھے۔ میں نے نہیں دیئے —— ہاں راشن کے لئے دیئے تھے۔ ایسا کچھ خاص نہیں ہوا جسے بتلایا جا سکے —— یا کسی نتیجے پر پہنچا جا سکے —— " پتا نے کالے چشمے کے اندر آنکھیں گھما گھما کر کہا ——

—— میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ایسا کچھ خاص ضرور ہوا ہے۔

جو وہ کل شام ہی سے چلا گیا —— ورنہ آج صبح بھی جا سکتا تھا اور اس سے پہلے کسی اور دن بھی غائب ہو سکتا تھا!! —— مگر میں نے کچھ کہا نہیں

" یہ ہر ماہ اسے جیب خرچ دے دیتے ہیں، ایسا بہت کم ہوا کہ انہوں نے مانگا ہو اور ہم نے نہیں دیا " ماں روندھی آواز میں بولی۔

" لیکن جیب خرچ بھی کوئی خرچ ہے۔ سب جانتے ہیں گھر کا کوئی خیال نہیں۔ بس ذرا سی بات پر بھاگ جانا یہ سرافت ہے، بھلا؟" پڑوسن بولی —— " جیب خرچ نہیں دے سکتے۔ ٹھیک سے کپڑے جوتے کے لئے جیب تنگ ہے تو پیدا ہی کیوں کئے۔!! " یہ میں نے نہیں کہا۔ یہ وہ جملہ ہے جو فراز نے اپنے والدین سے کہا تھا —— اس کے والد پنشن پا تھے اور جب پنشن سے گھر کا خرچ نہیں چلا تو انہوں نے سنٹرل بینک میں واچ مین بننا پسند کر لیا۔ اور اس طرح وہاں سے جو پیسے وہ پاتے تھے وہ خاندان کے ان ہزار دہنوں میں ڈال دیتے تھے جو ہمیشہ بھوک و پیاس سے سوکھ رہے ہوتے —— والد کی آنکھیں خراب تھیں۔ فراز بینک میں ان کے لئے کھانے کا ڈبہ لے جاتا —— یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم تھی کہ اس کے پتا کی آنکھیں خراب ہیں —— آپریشن ہونے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں وہ تو دن بھر اور رات بھر ڈیوٹی دیتے ہوئے سیاہ چشمہ آنکھوں پر لگائے رکھتے —— اور چونکہ فراز کالج میں زیر تعلیم تھا اور نوکری کے فراق میں تھا —— اسی لئے تب تک گھر کی مشین انہیں کو چلانی تھی —— چاہے جیسے بھی چلے وہ مشین کا ایک پرزہ ہو کر رہ گئے تھے —— جو ناکارہ ہونے پر بھی مشین میں کسی نگاہوں پر نہیں چڑھتا اور جب چڑھتا ہے تو وہ افسوس کے ساتھ اسے باہر نکال پھینکتا ہے کہ ابھی تک یہ اس کی نظروں سے کیسے اوجھل تھا ایسا ان کے ساتھ عنقریب ہی کبھی ہونے والا تھا!! لیکن ان کی اپنی الگ مجبوریاں تھیں۔ الگ مسائل تھے —— اگر وہ فراز کو ہزار آنے بھی جیب خرچ دیتے تو اس کا مطلب ہے آٹھ روپئے کا خرچ! اور آٹھ روپے کا مطلب ہے دو کلو کھانے کا تیل!!!

فراز کا سوسائٹی اعلیٰ بھی تھی اور متوسط بھی۔ اسکے دوست اُسے سینما لے جاتے۔ اسے اپنی Hotelling میں شریک کرتے۔ مگر فراز ان کا بدلہ نہیں چکا سکتا تھا —— دوستوں کا خرچ کیا ہوا

وہ اپنے آپ پر قرض کی طرح محسوس کرتا اور اسی قرض کو اتارنے کے لئے
وہ دور مدھ گو گیا ـــ اور بات یہیں سے شروع ہوتی ـــ اور پھر کئی
طرح کے روز وہ جنم لیتے ـــ

• لیکن پرسوں شام کو میں نے اُسے آنکھوں کی گولیوں کے لئے
روپے دیئے تھے چار گولیوں کے لئے! ـــ میری آنکھوں میں اس
وقت بہت درد تھا! اور مجھے رات سے میری ڈیوٹی شروع ہونی
تھی ـــ لیکن جب وہ گھر آیا اور میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ گولیاں لے
آیا ہے، وہ بولا "نہیں ـــ ابھی لے آتا ہوں" پھر وہ باہر چلا گیا۔
پندرہ بیس منٹ کے بعد آیا اور میرے پاس پڑیا پھینکی ـ میں نے اُسے
کھولا ـ چار گولیاں تھیں ـــ چھوٹی چھوٹی گولیاں ـــ جیسے آنکھوں
کی ہوا کرتی ہیں ـــ لیکن میں نے جوں ہی انہیں کھانا چاہا تو نونو نے میرا
ہاتھ پکڑ لیا ـ اُسے شاید کچھ شک گزرا تھا وہ بولی "ابا یہ آنکھوں
کی گولیاں نہیں ہیں اناسین کے چار ٹکڑے ہیں!" ـــ فراز دروازے
سے باہر نکل رہا تھا ـ مگر وہیں اٹک سا گیا ـــ اس نے بہن کو رک کر
دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ـــ مجھے غصہ آگیا اور میں پھٹ
پڑا ـــ تو ابھی سے مجھے دھوکا دینے لگا ـ ابھی تو اتنا سا ہے ـ ابھی
تو تیری شادی بھی نہیں ہوئی ـــ... بعد میں پتہ نہیں تو کیسے برتاؤ
کرے ـــ تجھے تو میری لاٹھی بننا چاہئے ـــ [illegible] مجھے دھوکا دے
رہا ہے ـــ دھوکہ دے رہا ہے ... کیا [illegible] ـــ"
پھر میں رو پڑا اپنی حالت پر ـــ یا اپنے بیٹے کی اس حرکت پر ـــ
پھر نونو بھی رو دی ـ نونو کی ماں بھی ـــ" پتا جی تھک گئے ـ

ہم کو فراز پر بہت غصہ آیا ـ مگر وہ بھی کہیں مجبور رہا شاید
ـــ وہ بھی شاید ایسا نہیں چاہتا تھا مگر ایسا ہو گیا تھا ـــ جس کا
خود اسے بھی بہت دکھ اور افسوس ہوگا (شاید)

"اس نے پیسے کہیں خرچ کر دیئے اور سات والی بات کا برا
مان کر صبح ہی کچھ بولے بنا چلا گیا ـــ لیکن کیا میں نے غلط کیا ـ کیا
تم وہ گولیاں چپ چاپ کھا لیتا ـــ؟"

"نہیں ـــ نہیں" ہم سب بولے
ـــ میں نے سوچا ـــ فراز کہاں ہوگا ـ وہ جہاں کہیں

اُسے وہاں نہیں ہونا چاہئے ـــ وہاں نہیں ہونا چاہئے ـــ

"مگر سائیکل لے کر گیا کہاں ہوگا؟" پتا سوچنے لگے اور ساتھ
میں ہم سب بھلا یا تو سوچنے لگے یا سوچنے کی اداکاری کرنے لگے ـــ

"وہ بھی کہیں نہیں گیا ـ آ جائے گا ـــ دو تین دن میں تھوڑا آ جائے گا۔
پریشان کر دیا ماتا جی نے" ـــ آپا نے بڑا سا ایک تھوکا۔

"ارے ہو ـــ میرا ضمیر پچھلے سال بھاگ گیا تھا ـ ہوا اپنے
ماموں کے وہاں گیا تھا ـــ میں اُس کے لئے اِتنا جیس روئی کہ وہ پھر
سر چڑھ جائے گا۔"

"وہ امراؤتی یا بڈنیرہ جا سکتا ہے" میں نے کہا۔

"مگر سائیکل سے"؟ ایک دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں ـــ وہ ہے ہی ایسا"

"نہیں یار ـــ" وہ پھر کہنے لگا "امراؤتی یہاں سے ..."
اور جب اُس کے ذہن میں آیا کہ کتنے میل ہے؟ ـــ تو بولا .....
بہت دور ہے!"

ـــ میں نے دیکھا ـ پتا زیادہ اُداس نہیں تھے ـــ ماں رو رہی
تھی اور بہت مغموم بیٹھی تھی ـ باقی سب چپ تھے اور دھیمی آواز میں
بول رہے تھے ـــ میں نے محسوس کیا ـــ پتا کہیں کہیں مسکرانے کی کوشش
بھی کر رہے تھے ـ اُداسیوں کے بادل میں چھپی خوشی کی سورج کرن کی
طرح! ان کے انداز سے لگا! "جہاں بھی گیا ـــ واپس آئے گا ضرور!"

ـــ "جا چائے بنا" پتا نے نونو سے کہا

ـــ نونو اُٹھی ـــ ہم لوگوں نے بہت منع کیا ـ مگر کون سنتا تھا
وہ باورچی خانے میں چلی گئی ـ جاتے جاتے میں نے اُسے دیکھا ـ اُس نے
آج بال نہیں سنوارے تھے لگتا تھا صبح اُٹھ کر بس یوں ہی اپنے دونوں
ہاتھ بالوں پر پھیر لئے ہیں ـــ اس کا لباس بھی میلا سا تھا ـــ وہ اٹھ
گئی تو لمحہ دو لمحہ کے لئے اس کے چہرے کی محراب پر وہ دو طاق سونے دیکھے
جہاں صبح شام دیئے جلتے تھے! ـــ دیئے ـــ بلب نہیں!!

ـــ مجھے فراز پر پھر غصہ آیا ـــ یہ سالا کیوں گھر سے بھاگ
گیا ـ اُس کی چھوٹی بہن آج کتنی سونی سونی سی ہے ـــ آج وہ اسکول
بھی نہیں گئی ـ اگر فراز ہوتا تو وہ ایسا کچھ دیکھ سکتا جیسا ہم دیکھ

رہتے ہیں — مگر وہ رہتا — تو یہ سب ہوتا ہی کیوں!"

"مت رو ممّا! — کاہے کو ہلکان ہوتی ہو" — پھر ایک
پڑوسن کا دلاسہ! — میں نے سوچا — میں بھی کچھ کہوں — کیونکہ
میرے دوست بیچ بیچ میں ٹوک کر ایک آدھ دلاسے اور تسلی کا جملہ
کہہ چکے تھے — مگر میں کیا کہوں — مجھے لگا کہ انہوں نے میرے
کہنے کے لئے کچھ رکھا ہی نہیں ہے — مگر اس بیٹھے ہوئے وقت اور
روتی ہوئی سی حالت میں ان جملوں کو دہرائے اگر گر وہ بھی لوں تو کہاں
اُچھالوں! —

ماں نے آنکھیں صاف کیں۔

"ماں کا دل بہت نازک ہوتا ہے" کہیں سے آواز آئی۔
میں نے اپنے چہرے پر اس مکھوٹے کو ٹٹولا جو میں نے یہاں
آکر لگایا تھا۔ اُداسی کا سونا سونا سا مکھوٹا — مکھوٹا صحیح سلامت تھا
مجھے بُرا لگا کہ ایک اتنے گہرے دوست کے لئے مجھے 'مکھوٹا' لگانا پڑا
ہے — مگر کیا کروں — میری یہ بڑی بجلی ہے کہ — جب کوئی
مر جائے تو ہنسی آتی ہے اور ہنسنے کے وقت رونا!

چائے آئی — میں نے پی۔ بے مزہ! دودھ کم — شکر
کم۔ پتی بہت زیادہ!! ایسی چائے تو اس کی بہن کبھی نہیں بناتی۔
اچھا! شاید وہ یہ احساس دلانا چاہتی ہے کہ جتنی کڑوی ہو چلی
ہے لگ بھگ اتنی ہی کڑواہٹ اس کے دل میں در آئی ہے! —
— مجھے لگا کہ فراز کے جانے سے سب تڑا تڑ کر کے ٹوٹ گیا ہے۔
سارا گھر اور ساری استری!

بات گھوم پھر کر پھر وہیں آگئی! "اب کیا کرنا ہوگا" پتا نے
پوچھا — میں نے خود اپنے آپ سے پوچھا "اب؟"

کسی نے کہا "پولیس میں رپورٹ ...."

میں بولا — "نہیں جھنجھٹ ہو گی بے کار کی"

پتا نے کہا — "تو پھر جہاں جہاں وہ جا سکتا ہے وہاں
وہاں تار کر دو!"

— میں نے حامی بھری — سب نے سر ہلایا — پھر میں نے پوچھا:
"وہ کہاں کہاں جا سکتا ہے!"

"امراؤتی: ماموں کے پاس — بمبئی: آپا کے پاس —
ساونت واڑی میں بہنوئی کے گھر — نیز منگلائی میں بھائی کے یہاں"
— میں نے سب کے پتے نوٹ کئے — پتا نے کہا کہ میں تار کی جگہ ایک
ایکسپریس ڈیلیوری لیٹرس لکھوں — کہ پتا کے پاس تار کے لئے پیسے
نہیں ہیں! — میں نے سر ہلایا۔ چارپائی سے اٹھ گیا چلتے چلتے بولا:
"ابھی میں سب جگہ اطلاع دیتا ہوں۔ کل شام تک یا پرسوں
صبح تک انشاء اللہ پتہ لگ جائے گا۔ یا وہ خود گھر لوٹ آئے گا"

"ہاں۔ ہاں" کچھ لوگ بولے۔

ماں بولی: "وہ ہو سکتا ہے امراؤتی میں ہو؟"

میں نے کہا۔ "وہ جہاں بھی ہے مزے میں ہے! آپ کو رونا نہیں
چاہیئے — اُس کو جب آنا ہے تبھی آئے گا — آپ کے رونے سے
جلدی نہیں آئے گا" — اتنا کہہ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میں نے
دلاسہ دے دیا ہے!

پھر ہم سب پوسٹ آفس گئے۔ سب پتوں پر ایکسپریس لیٹر
خط لکھے کہ — "فراز یہاں سے فلاں فلاں دن سے سائیکل لے کر
غائب ہو گیا ہے۔ کچھ بھی بتا کر نہیں گیا۔ اُدھر آیا ہو تو فوراً لکھنا۔
یہاں سب پریشان ہیں — اس کی ماں بہت روتی ہے! —"

پھر ہم لوگ فراز کے گھر آئے — پتا سے نئی اور پرانی نسل
پر چند سنجیدہ باتیں ہوئیں اور وہ ایک بات بھی جو انہوں نے کہی:
— "جب فراز مجھے مانتا نہیں اور میرے طریقۂ حیات کو تسلیم نہیں
کرتا تو پھر اپنے بدن میں میرا لہو کیوں ڈھو رہا ہے بیٹا!" ■■

ہری شنکر پرسائی

سروے اور سُندری

جب سے یہ خبر پڑھی ہے کہ سروے آف انڈیا کے کسی دفتر میں دو پاکستانی حسینائیں ایک افسر کے ساتھ رات بھر رہیں اور صبح نقشے لے کر فرار ہوگئیں تب سے دل بے قرار ہے ـــــ سروے کا ایک دفتر ہمارے گھر کے پاس ہی ہے، میں روز اس کے سامنے سے گزرتا ہوں۔ میں نے آج تک یہ نہیں سوچا تھا کہ اس بھدّے اور بدصورت دفتر میں اتنے نازک امکانات چھپے ہوئے ہیں کہ اس میں اتنے دور پاکستان سے آکر حسینائیں رات بتاتی ہیں۔ دن میں یہ دفتر رہتا ہے اور رات میں پاکستانی حسیناؤں کے لئے ریسٹ ہاؤس ہو جاتا ہے، اب یہ دفتر بڑا پیارا لگنے لگا ہے۔

ایک صاحب تو اتنے دیوانے ہوگئے ہیں کہ مجھ سے کہتے ہیں: مجھے سروے آف انڈیا میں نوکری دلا دو۔ ساری زندگی ماسٹری میں برباد کر دی۔ اگر شروع میں ہی سروے آف انڈیا میں بھرتی ہو جاتا تو آج میرے ساتھ بھی اس دفتر میں پاکستانی حسینائیں رات بتاتیں۔

یہ صاحب گھر سے بڑھیا کپڑے پہن کر جاتے ہیں اور گھنٹوں سروے کے دفتر کے پاس کھڑے ہو کر اسے للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں پھر اس کے پھاٹک کو چوم کر گھر آجاتے ہیں۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ گھر والے پریشان ہیں کہ یہ رات کو سروے سروے کیوں چلاتے ہیں۔ میں نے ان کے خاندان والوں سے کہہ دیا ہے کہ ان کی بھگتی جاگ اٹھی ہے۔ یہ سروییشور کا مخفف سروے کہہ کر بھگوان کا بھجن کرتے ہیں۔ اس واقعہ کی مکمل جانچ ایک سرکاری کمیٹی کر رہی ہے۔ اس کی رپورٹ جب آئے گی تب آئے گی۔ لیکن میں نے اس رات کے واقعہ کی تفصیل اپنے تصوّر میں تیار کر لی ہے۔

صاحب کوارٹر میں بیٹھے ہیں کہ چپراسی نے آکر کہا "صاحب دو عورتیں آئی ہیں۔"

صاحب نے پوچھا "عورتیں تو بہت ہوتی ہیں، یہ کیسی ہیں؟"

چپراسی: "خوبصورت ہیں صاحب۔"

صاحب نے ڈانٹا: "تو تو نے اسے عورت کیوں کہا؟"

صاحب فوراً باہر آگئے۔ عورتوں کو دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ پوچھا "آپ لوگ کہاں سے آئی ہیں"

وہ بولیں "پاکستان سے۔"

صاحب نے کہا "اچھا پاکستان سے ہمارے تعلقات اتنے اچھے ہوگئے کہ وہ ٹینکوں کے بجائے حسینائیں ادھر بھیجتا ہے۔ ہونے والے انتخابات کے پیشِ نظر پاکستان نے ہم سے تعلقات استوار کر لئے ہوں گے"

ایک حسینہ بولی "ہاں صاحب وہاں حکم ہو گیا ہے کہ جتنی خوبصورت عورتیں چاہیں بھارت چلی جائیں۔

صاحب نے کہا "حسیناؤ، یہ تو بتاؤ کہ اس علاقہ میں اتنے صاحبوں کے درمیان تم نے اپنی عنایت کے لئے مجھے ہی کیوں چنا۔

سندری، کیونکہ ہم نے آپ کی بڑی تعریف سنی ہے۔ سنا ہے آپ بڑے مہمان نواز ہیں۔ صاحب خوش ہوئے بولے: تو پھر اندر تشریف لائیے"

حیناؤں نے کہا: نہیں ہمیں ہدایت ہے کہ ہم گھروں میں نہیں دفتر ہی میں رہیں۔ ہمیں بھارت گھومتے ایک مہینہ ہوگیا ہے کبھی ہم سیلس ٹیکس کے دفتر میں سو جاتے ہیں اور کبھی محکمہ سنچائی کے دفتر میں: آج تو ہم سروے کے دفتر ہی میں سوئیں گے۔

صاحب نے کہا: جیسی آپ کی مرضی' دفتر آپ کا ہے۔ جب تک جی چاہے رہیے"

صاحب ان حیناؤں کو لے کر دفتر پہنچے۔ وہاں حیناؤں نے کاغذوں کے پلندے دیکھے۔ پوچھا: صاحب یہ کیا ہے"

صاحب نے کہا" یہ اس علاقے کے نقشے ہیں۔ لڑائی کے وقت کام آتے ہیں"

حیناؤں نے نقشے اٹھا لیے اور کہا "صاحب یہ نقشے ہم لے لیں"

صاحب نے کہا" نقشے ا... میں تو سمجھا تھا آپ لوگ جان مانگیں گی: میں جان نکال کر دینے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ نقشہ تو معمولی چیز ہے۔ جتنے چاہیے لے جائیے۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو سارا ملک دے سکتا ہوں۔ لُک ہی اٹھا لے جائیے"

ایک حسینہ نے کہا" لیکن ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی میں یہ نقشے اگر پاکستان کے کام آئے تو؟"

صاحب نے کہا" وہ لڑائی ہوگی ہی نہیں جو پاکستان ہمارے ... جو ... سمجھتا ہے' وہ لڑائی بھلا کیوں کرے گا؟ اور نقشوں کا کیا ... سب سو الیں گے۔

حسینائیں نقشے لے کر جانے لگیں تو افسر نے کہا" آدھی رات کو اب کہاں جائیے گی۔ زمانہ خراب لگتا ہے' صبح چلی جائیے گا"

... تھوڑی دیر بعد ایک بولی" نہیں نہیں یہ کیا کرتے ہیں"

صاحب نے کہا" سروے کا آدمی ہوں گا! سروے کرنا میری عادت بن گئی ہے۔ ذرا تمہارے جسم کا سروے کر رہا ہوں نقشے بناؤں گا"

رات گزار کر صبح وہ حسینائیں نقشے لے کر چلیں صاحب نے کہا: آج اور رہ جاتیں تو کچھ نقشے اور دے دیتا۔

انہوں نے کہا" فی الحال اتنے ہی کافی ہیں۔ یہ ہم لے آئیں۔ دوبارہ پھر آجائیں گے"

صاحب نے کہا" کچھ نئے نقشے بن رہے ہیں۔ میں اطلاع دوں تو لینے تو آجائیے گا نا" حیناؤں نے آنے کا وعدہ کیا اور چمپت ہوگئیں۔

بس اتنی سی بات ہے مگر پارلیمنٹ میں شور کتنا ہوا۔ اتنی دور سے حسینائیں بڑی امیدیں لے کر آئیں تو کیا ہمارا افسر اتنا کٹھور ہو جائے کہ دو چار نقشے بھی نہ دے دے؟

سنا ہے مرکزی بیورو معاملے کی تفتیش کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بیورو کی تفتیش کا نتیجہ یہ نکلے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی نقشہ دفتر سے نہیں غائب ہوا۔ پھر بھی میری مندرجہ بالا رپورٹ جوں کی توں رہے گی۔ یعنی اگر مستقبل میں بھی کبھی سروے کے نقشے پاکستان جائیں گے تو اسی طرح جائیں گے۔

لیکن اس معاملہ میں مجھے ایک بات کھل گئی اور میں بلراج مدھوک کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ وہ افسر ہندو ہے اور بلراج مدھوک کا کہنا ہے کہ" ہر ہندو وطن پرست ہے اور غیر ہندو غدّار ـــــ اب یہ نعرہ یوں بدلنا پڑے گا۔

ہر ہندو وطن پرست ہے ـــ حسینہ کے آنے تک

(ترجمہ ع۔س)

تمنّا کا دوسرا قدم شاعر: صہبا وحید۔ تعداد صفحات ۱۶۰ قیمت: پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ (گٹ اپ: دیدہ زیب۔ کتابت و طباعت: گوارا، سرورق کی تصویر خیال انگیز)

۱۹۶۰ء کے ساتھ ساتھ یہ دھوم دھام والی دہائی بھی ختم ہو گئی اُدھر کی ۵۰ سالہ شکست و ریخت میں ایسی دہائی کم آئی ہو گی جس نے اسقدر ادبی ہڑبونگ مچایا اور ان کے نتیجہ میں ادبی اقدار کی شکست و ریخت دیکھی اور دکھائی ہوں۔ یہ ہنگامہ آرائی نقادوں اور شاعروں کیلئے رحمت بھی ثابت ہوئی اور زحمت بھی۔ بہت بڑی تعداد میں ایسے شاعروں اور نقادوں کی تصنیفات و تالیفات ادب کے بازار میں آئیں جن کو کسی مخصوص مقامی گروہ (دہلوی، لکھنوی، حیدر آبادی، الہ آبادی یا بھوپالی) یا کسی خاص رسالے کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان لوگوں کو غیر معمولی لیکن بہر حال غیر اہم شہرت نصیب ہوئی ـــــ بعض ایسے شاعر بھی تھے جن میں جوہر ذاتی تھا اس لیے ان کی خودداری یا بے نیازی نے انھیں گروہ بندی اور رسالے بازی سے باز رکھا۔ اس قبیل کے شاعر بہت کم ہیں۔ صہبا وحید اسی قبیل کے شاعر ہیں۔

ان کی شاعری کی عمر تقریباً بارہ سال کی ہے، پیش نظر مجموعے میں اس بارہ سال کی شاعری کا انتخاب شامل ہے۔ تقریباً تمام غزلوں اور نظموں کے آخر میں سن تخلیق دیا گیا ہے، گو کہ ترتیب سنہ وار نہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ان کے لکھے ہوئے ایک منظوم افسانے کا عنوان: "قافلہ شام و سحر" ہے۔ اس قافلے میں وہ ان نو بلوغ یافتہ شاعروں کے ساتھ ہیں جن کی رہنمائی فیض بلکہ اختر شیرانی اور کبھی ساحر اور مجاز کر رہے تھے ـــــ یہ کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا۔ صہبا ایک حساس، اور ساتھ ہی ساتھ ذہین اور جفاکش دل و حوصلہ کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے تھکے چلے کارواں اور اس کے قائدوں کو [illegible] اور خود کیلئے کچھ نامعلوم منزل کی تلاش میں چل پڑے۔ ان کے سفر کی ابتدا ایک معینہ مقام سے ہوئی تھی لیکن فی الحال ان کی منزل متعین نہیں ہے۔ وہ ہر لحظہ ایک نئے طور ایک نئی برق تجلّی کی تلاش میں راہِ شوق کا ہر مرحلہ طے کر رہے ہیں۔ نام نہاد ترقی پسندی (رومانیت) کی ہوٗ ہا سے ان کا سفر شروع ہوا اور وہ ریلزم کے خارزاروں اور نیچرلزم کے مرغزاروں سے گزرتے ہوئے سمبولزم کے نہاں خانوں اور امیجزم کی بھول بھلیوں میں پہونچ گئے ـــــ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ وہیں کھو کر نہیں رہ گئے۔ ان کی تمنّا کا سفر برابر جاری ہے ـــــ اپنے ابتدائی دور کی نظموں اور غزلوں کو مجموعۂ کلام میں شامل کر کے صہبا نے نہ صرف بڑے حوصلہ کا ثبوت دیا ہے بلکہ اپنے قاری کو یہ بھی اندازہ کرا دیا ہے کہ رومانویت سے سمبولزم اور امیجزم تک ان کا یہ سفر شعوری ہے تقلیدی نہیں۔

بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے جدید شاعروں پر عصری علوم و فلسفہ کا یکایک الہام ہوا ہے ـــــ لیکن صہبا وحید ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ وہ عصری علوم اور فلسفے کو اپنے کلام میں باشعور اور واقفکارانہ انداز میں برتتے ہیں۔

فرانس، جرمنی اور انگلینڈ میں پچھلی ڈیڑھ صدی میں جو ادبی تحریکیں اور دبستان وجود میں آئے ان میں سے چار اہم ترین دبستان ریلزم، نیچرلزم، سمبولزم (امیجزم) اور امپریشنزم کے ہیں ـــــ فارسی اور اردو شاعری کی حد تک اس تبصرہ نگار کو علم ہے کہ کوئی شاعر ایسا نہیں ہوا جسے ہم کسی ایک مخصوص دبستان کا شاعر کہہ سکیں۔ غالباً دنیا کی اور زبانوں میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہر شاعر میں بیک وقت دو دو تین تین دبستانوں کے اثرات واضح طور پر نظر آجاتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو ایک ہی نظم یا ایک ہی غزل میں متعدد دبستانوں کے اثرات موجود رہتے ہیں، حتیٰ کہ ایک غزل کا ایک مصرع کسی اور دبستان کے طرز میں ہوتا ہے اور دوسرا کسی اور کے۔ اس معروضے کی وضاحت کے لئے صہبا وحید کی ایک غزل ذیل میں نقل کی جاتی ہے اور ہر شعر یا مصرع کے آگے اسکی خصوصیت کے لحاظ سے دبستان کا نام لکھا جاتا ہے:

زمانے بھر میں خود اپنا ہی انتخاب تھے ہم
گئے سوال تھے ہم، تو گئے جواب تھے ہم } نیچرل

تمہارے شہر جو پہنچے تو چاک چاک ہوئے
تمہارے شہر سے نکلے تو اضطراب تھے ہم } نیچرل "اقرب بہ" ایمیجسٹ

بکھر گئے ہیں سحر کو شعاعِ نور کے ساتھ ـــــــ امپریشنسٹ
شب فراق میں لیکن کسی کا خواب تھے ہم ـــــــ امیجسٹ
زمانے بھر کے لئے مسئلہ رہے ہوں گے ـــــــ امپریشنسٹ
تمہارے واسطے لیکن کھلی کتاب تھے ہم ـــــــ سمبولسٹ
ہمارے بعد ہر اک شمع رُخ بجھی ہوگی ـــــــ سمبولسٹ
ہر ایک بزمِ تمنا کی آب و تاب تھے ہم ـــــــ امپریشنسٹ
کسی کے ہو نہ سکے زندگی میں ہم تنہا ـــــــ رئلیسٹ
حقیقتوں کے صحاری میں اک سراب تھے ہم ـــــــ سمبولسٹ

یہ تجزیہ صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ اس سے شاعر کے ان نفسیاتی عوامل اور شعوری عوامل کی پرکھ ہو سکتی ہے جو دراصل سخن آفریں ہوا کرتے ہیں فی الحال ہمیں اس سے بحث نہیں کہ شاعر سیاسی یا سماجی طور پر Committed ہوتا ہے یا نہیں، یا ہونا چاہیئے یا نہیں۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کوئی تخلیق فنکار بھلے ہی سیاسی اور سماجی طور پر Committed نہ ہو، اپنے شعور شاعرانہ سے ضرور Committed ہوتا ہے۔ صناعی اور تکلف ہمیشہ سے شاعری کا زیورِ حسن ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ کسی مخصوص طرز حتیٰ کے "بے طرزی" کو اختیار کرنا بھی فی الحقیقت صناعی اور تکلف نہیں تو اور کیا ہے ــــ تجربات ہوتے رہتے ہیں، ہونے چاہئیں اقدار بدلتی رہتی ہیں، بدلنی چاہئیں لیکن تجربہ اور اقدار کی تبدیلی کا جو حاصل ہوتا ہے وہ خود بھی تو ایک قدر بن جاتا ہے ــ!

صہبا وحید نے اپنے مجموعۂ کلام پر مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے انہی باتوں پر زور دیا ہے جو آج کل بہت عام ہیں؛ یہ کہ وہ "اجنبی" ہیں، وہ non-committed ہیں، اقدار کی شکست ہو چکی ہے، وہ جبلتاً ناآسودہ ہیں۔ ان کا کوئی مقصد نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ پانچ دس باتیں طرح طرح سے، مختلف الفاظ میں، نظم و نثر میں بالطوالت و باختصار اتنی بار کہی جا چکی ہیں اور کہی جا رہی ہیں کہ اب کسی بھی نئے مجموعۂ کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں شاعر نے مقدمہ نہ دائر کر رکھا ہو ــــ صہبا وحید کو ان باتوں پر اصرار ہے، ہمیں مطلق اعتراض نہیں لیکن انکو کیا کیجیے کہ ان کے "non-committed" کلام میں بڑی زندگی اور زندگی کی باتیں ہیں ــ! اس کی مثالیں دینے سے پہلے صہبا وحید اور ان کے دوسرے fellow-travellers کو ایک شعر سناتا ہوں:

انکار اور اس پر اصرار، وہ بھی پیہم!
تم مجھ کو چاہتے ہو ثابت ہوا یہیں سے

جگر مراد آبادی مرحوم کا یہ شعر زندگی، رنگینی، محبت، مسرت (اس دور میں جیسی اور جتنی بھی ہو) سے منہ موڑنے والے لوگوں کے دلوں کا چور پکڑتا ہے۔ مجھے بعض نئے شاعر اس معصومانہ چوری اور ضد ہی کی وجہ سے بڑے پیارے لگنے لگے ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ اس طرح وہ زندگی اور اس کی نعمتوں، آسودگیوں، رنگینیوں، محبتوں اور مسرتوں سے اپنے انتقاد پیار کا نہایت معشوقانہ انداز میں اظہار کر دیتے ہیں ــــ صہبا وحید کا بھی یہی حال ہے۔ تصوف کی طرح برائے شعر گفتن ان کے کلام میں وہ پانچ سات باتیں بہرحال موجود ہیں جو ہر جدید شاعر کے یہاں "ردیف" کی مجبوری یا ــــ Commitment کے جبر کی وجہ سے موجود ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے انکے کلام کی اس حزینہ نے متاثر کیا ہے جو دراصل زندگی کے ساز نے کی لشیدہ ہے گوشِ شنوا کو!!

میں دل کی ہر اک راہ گزر بھول گیا ہوں
کیا کفر ہے، الحاد ہے کیا، دینِ مبیں تم
تسخیرِ فلک کی مجھے کچھ چاہ نہیں ہے
تو میرے لیے ہے، میری موعودہ زمیں تم!

—

یہاں کے لوگ سدا انتظار کرتے ہیں
ہر ایک شخص مجھے بے اماں سا لگتا ہے
وہی طلسمِ شب و روز ہے، وہی ہم تم
ہر ایک نقش یہاں جاوداں سا لگتا ہے

—

رنگینیِ جہاں تھی تخیل کا حادثہ
ہم جو اُداس ہیں تو زمانہ اُداس ہے

—

بکھر گئے ہیں سحر کو شعاعِ نور کے ساتھ
شب فراق میں لیکن کسی کا خواب تھے ہم

کیوں واجبِ تکریم نہ ہو ڈوبتا سورج
منسوب تری یاد سے ہے شام کا ہنگام

وہ حسرتِ نمود تھی کئی چراغ جل بجھے
کسے خبر کہ صبح کو بھی اس کی ہے کوئی خبر
حقیقتوں کا سامنا ہوا تو راز یہ کھلا
نہ تیرا غم ہی معتبر نہ میرا غم ہی معتبر

کبھی تو قافلہ اہلِ نظر کا گذرے گا
پڑے ہیں خاک بسر، سنگِ رہگزر کی طرح

اختصار کے پیشِ نظر صرف غزلوں کے، اور وہ بھی صرف آٹھ دس شعر نقل کیے گئے ہیں ورنہ تقریباً ہر غزل میں کم از کم ایک اچھا شعر موجود ہے اور یہ کوئی کم چیز نہیں۔ "اچھے شعر" کی تعریف اور اس پر بحث کا یہ موقع نہیں، مختصراً یہ کہ دو قدیم اصطلاحیں؛ وجدان اور ذوق ایسی ہیں جو خود بخود احساس کرا دیتی ہیں کہ اچھا شعر کونسا ہے اور کیوں ہے۔

صہبا وحید کو نظم کہنے کا بھی خوب سلیقہ ہے۔ پچھلے دس سال میں جو اچھی نظمیں کہی گئی ہیں ان میں ان کی طویل نظم "تمنا کا دوسرا قدم" کا بھی ذکر کیا جائے گا۔ اس نظم کے علاوہ "آخری بات" بھی خوب ہے۔ نیز "آرادھنا"، "مرمر دنے" اور "تانڈو" بعض لسانی عروضی اور صوتی خامیوں کے باوجود اچھی نظمیں ہیں۔ باقی نظموں میں یا تو وہ جدیدیت کے روایتی انداز کو وفادارانہ انداز میں نبھاتے نظر آتے ہیں یا پھر اختر شیرانی اور مجاز سے ہوتے ہوئے سردار جعفری کے موضوع و طرزِ کلام کے امین معلوم ہوتے ہیں۔

اکثر اچھے جدید شاعروں کو اب اس امر کا خوب احساس ہوتا جارہا ہے کہ زبان میں خواہ مخواہ کی بے راہ روی اور غیر ضروری شکست و ریخت واقعی غلط ہے۔ صہبا وحید میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنی زبان اور عروض کی خامیوں کو دور کر سکیں اس لیے کہ انکی لفظیات، خصوصاً نظم کی، بہت پر معانی، متحرک اور دبیز ہیں۔ ان سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ الفاظ کے صحیح تلفظ، وزن اور قیمت کو سمجھتے ہوئے بھی ان کی طرف سے بے نیازی نہ برتیں۔

اگر کسی صاحبِ ذوق کو جدید شاعری کے اچھے مجموعہ ہائے کلام پڑھنے اور صالح جدیدیت کے نمونے دیکھنے ہوں تو وہ بے جھجک یہ مجموعہ خرید سکتا ہے۔ (ذکا صدیقی)

تلخ، تند، شیریں

پرویز کی ادبی موت کا ذمہ دار کون؟ — ایم اے نصر

معصوم شرقی کا خط بعنوان "گوشہ پرویز کیوں نہیں؟" میری نظر سے گزرا۔ موصوف کا اعتراض یا احتجاج کسی حد تک درست اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس باب میں صرف "کتابیہ" ہی ذمہ دار نہیں۔ وسائل کے میدان کو برا بھلا کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں تک جہاں ادب کا تعلق ہے، اور بر وقت ضروری مضامین دستیاب ہو گئے۔ کیا پرویز شاہدی صاحب کے متعلق کسی ناقد یا نقاد نے قلم اٹھانے کی زحمت گوارا کی؟ وکیل اختر کے مداحوں نے عملی تعاون کیا اور کتابیہ میں ایک نئے عنوان "گوشہ وکیل اختر" کا اضافہ ہو گیا۔ اب تعصبات کی بات کہاں باقی رہی۔ ان حضرات نے جو خود کو پرویز شاہدی کا جانشین کہتے ہیں۔ اور انکے طفیل، اردو ادبی حلقہ میں زندہ ہیں کبھی پرویز شاہدی کی شخصیت اور ان کے کلام کی عظمت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے؟ ان کی قد آور شخصیت اور کلام کے بلند اور پر عظمت نقوش کو ابھارنے کی کوشش کی۔ تاکہ اہل نظر کے سامنے انکی عظمت کے گمنام گوشے آسکیں؟ پرویز میموریل، چند ناموں کی شہرت کا سبب بنا مگر پرویز کو کیا ملا؟ پرویز کے وہ شاگرد جنکی ادبی زندگی پرویز صاحب کی مرہون منت ہے۔ وہ خاموش کیوں ہیں؟ وہ جن سے انکی شفقت اور لگاؤ مثالی بنی ہوئی ہے۔ اور پرویز کا دیا ہوا ادبی تمغہ ان کے سینہ پر سجا ہوا ہے اور وہ اپنے سر کو فخر سے بلند کئے ہوئے ہیں۔ کیا یہی لوگ، پرویز کی ادبی موت کے ذمہ دار نہیں ہیں؟

● گوشہ وکیل اختر

ضیاء احمد نیساز

۔ بکلا اختر صاحب مرحوم کی تخلیقات اور تصویر شائع کر کے آپ نے مرحوم فنکار کے اردو شعرا و ادبا کی بڑی ہمت افزائی کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اختر مرحوم کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ اختر صاحب ایک شفیق استاد نہایت عمدہ انسان اور اچھے شاعر تھے۔ اُن کی موت اُن کے شاگردوں، دوستوں اور تقریباً ان کے تمام ملنے جلنے والوں کے لئے بھی ایک سانحہ سے کم نہیں۔ وہ بہت ہی پُر خلوص طبیعت کے مالک تھے اور بقول نصر "موت کی سیاہ آندھیوں میں بھی زندگی کرنا جانتے تھے" یہ بات بھی حق ہے کہ ان کے چہرے پر غم کے آثار یا افسردگی کی علامت شاید کسی نے نہ پڑھی ہوگی جس کی غمازی ان کا یہ شعر کرتا ہے۔

اُس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے
جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے

● جاوید نہال

کتابیہ کا تازہ شمارہ دیکھا، گیٹ اپ بہت دیدہ زیب اور خوبصورت ہے، خوشی ہوئی کہ کلکتہ کے جواں سال اور جواں مرگ شاعر، وکیل اختر کی چند چیزیں چھاپ کر آپ نے اردو دنیا سے ان کو روشناس کرایا ان کی بہت سی چنگاریاں، موت کی راکھ تلے دب کر شعلے نہ بن سکیں، عزیزی نصر کا مراسلہ نما مضمون شائع کر کے اپنے اردو ادب کے بہیوں کو جواں مرگ شاعر کو سمجھنے کا موقع دیا ہے۔ .

کتابیہ کا ہر شمارہ نت نئی جلوہ سامانیوں کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے، جو اس نازک دور اور ناساعد حالات میں اردو کے لئے نیک فال سے کم نہیں، انیم کارس، پر لوگوں کے خطوط پڑھ کر مجھ میں اعتماد بحال ہو رہا ہے۔ واقعی افسانوی دنیا سے میرا تقریباً انتقال ہو چکا تھا۔ مگر آپ نے کہانی شائع کر کے نئی زندگی دلائی ہے۔ اگر میں اس دنیا میں لوٹ آیا تو اس میں کتابیہ کا بڑا حصہ ہوگا۔

● **غیر رسمی خاص نمبر**

ساغر مہدی

تازہ شمارہ کئی لحاظ سے خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ صرف نگا
خاص نمبر نہیں۔ دہلی میں اُردو رسم الخط پر مبنی سمپوزیم کی رپورٹنگ اور
آل احمد سرور کا خطبۂ صدارت بہت اہم ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اور اعجاز
عسکری نے بیاضِ غالب کی اِسمگلنگ اور اس کی اصلیت سے کئی پردے
اُٹھا دئے ہیں۔ کہانیاں ابھی تک نہیں پڑھ سکا۔ محمود ایاز اور براج کول
کی نظمیں اچھی ہیں۔ غزلوں میں سردار جعفری۔ جاوید وششٹ، عبدالرحیم
نشتر وغیرہ پسند آئے۔

زبیر رضوی کے مجموعۂ کلام خشتِ دیوار پر عتیق حنفی کا تبصرہ کہیں
کہیں سے مروت اور تعلقات کا شکار ہو گیا ہے، زبیر رضوی نرگسیت
کے شکار ہوں یا نہ ہوں۔

غلیطہائے کتابت مت پوچھ

اسلم آزاد

آپ کے کاتب کی کرم فرمائی تقریباً میری ہر تخلیق کے ساتھ خاص
طور سے ہوتی ہے۔ لفظ "صداؤں" کو "ہواؤں" لکھ دیا ہے۔ اصل شعر
یوں ہے ؎

ساحل کی ریت پر میں کھڑا سوچتا رہا
الجھا تھا میرا ذہن ندی کی صداؤں میں

● **افسانوی ادب کے مسائل**

ناشر سوستانج

مارچ کے شمارے میں اوصاف احمد کا نازک رشتہ عمدہ ہے۔
کرشن چندر کا ناول دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے
مضمون سے رسل کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

افسانہ نمبر میں سمپوزیم خاصے کی چیزیں ہیں۔ ترجمے اچھے ہیں۔
جیلانی بانو کا ناولٹ بہترین رہا۔

افسانوی مجموعوں کا زیادہ تعداد میں فروخت نہ ہونا ایک گمبھیر مسئلہ
ہے۔ قارئین شعری ادب کی بہ نسبت افسانوی ادب کے دلدادہ ہوتے ہیں۔
غیر معیاری اور غیر معیاری رسائل مختلف افسانہ نگاروں کے افسانے شائع
کرکے انھیں کافی حد تک مطمئن کرتا ہے۔ آپ کتاب میں شعری ادب کو بدستور
رکھیں مختلف افسانہ نگاروں کے بجائے کسی ایک ہی افسانہ نگار کے افسانوں
کو یک جا میں شائع کرنا شروع کر دیں۔ کتاب کی فروخت میں اضافہ کی وجہ ہو جائیگی
افسانہ نگار کے افسانوں کا مجموعہ صرف ناقدین کے لئے توجہ کا باعث
ہوتا ہے کیونکہ کسی افسانہ نگار کے اندازِ بیان۔ اندازِ فکر اور اسلوب کو
کسی خانے میں فٹ کرنے کے لئے کئی افسانوں کا نظروں کے سامنے ہونا ضروری
ہے۔ عام قاری جو محض دلچسپی کے لئے افسانے پڑھتا ہے۔ افسانہ نگار
کے خیالات اور نظریے کی یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے۔ یہاں میں قیصر تمکین
کے نظریے سے متفق ہوں۔ کرشن۔ بیدی۔ عصمت۔ جیلانی بانو۔ اقبال متین۔
قاضی عبدالستار کے نمائندہ افسانوں کا مجموعہ خریدنے سے انکار کون کافر کریگا!

● **نعیم مشتاق**

مارچ کے شمارہ میں خلافِ توقع آپ نے گوشۂ رسل پیش کیا جب کہ
گوشۂ مصطفیٰ زیدی کا اعلان کیا گیا تھا۔ بہرحال آپ نے دیر آید درست آید
کے مصداق نہایت عمدہ مضامین یکجا کئے۔

اوصاف احمد کے چاروں افسانوں میں نئی قدروں کی آمیزش
اور نئے رجحانات کی ہم آہنگی ہے۔ تحریر میں ندرتِ ادا اور موضوعِ خیال
میں نیا پن بدرجہ اتم موجود ہے۔

ایم۔ اے نصر کا خط پڑھا۔ موصوف نے نہایت فراخدلی
سے جاوید نہال کے افسانہ نیم کا رس کی تعریف کرتے ہوئے ذکی کی دس
سال کی طویل خاموشی کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ نہال صاحب نے اس عرصہ میں
خاموش رہنے کے بجائے بنگال کے اردو ادب پر بہت کام کیا ہے۔
____ بنگال میں جدید افسانہ نگاروں کی کمی کا جو احساس ہوتا
تھا وہ ظفر اوگانوی، سہیل واسطی، جاوید نہال، تسکین انصاری، انور مینی
اور سید الابرار وغیرہم کی تحریریں سامنے آنے کے بعد ختم ہو گیا۔ میرے
خیال میں ان ناموں کی ترقی میں "کتاب" کا بھی کچھ حصہ ہے۔ جدید ادب
رکھنے والوں کی فلاح میں کتاب نے بھی اہم رول ادا کیا ہے!

● **علقمہ شبلی**

آپ کے کاتب صاحب نے "تلاش" کو "لاش" میں بدل دیا ہے مگر
یہ ان کی تلاش کا نتیجہ لاش بھی ہو۔

• چند اہم مسائل

فیشیوش

مارچ کے شمارے میں سہیل عظیم آبادی صاحب کا خط اور اپریل مئی کے شمارے میں اُردو رسم الخط پر سیمینار کی رپورٹ قابل مطالعہ ہے۔ سہیل صاحب نے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے وہ بے حد اہم بھی ہیں اور فوری توجہ کے مستحق بھی۔ اردو کی معیاری اور سنجیدہ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت اور فروخت کے مسئلے کا حل ڈھونڈنا ضروری ہے۔ اردو دوست حضرات اگر اپنے اپنے شہر میں اردو رسائل اور کتابوں کی نکاسی کی کوشش کریں تو حالت بہت حد تک بدل سکتی ہے۔ عام قارئین کی بات جانے دیجئے۔ اُردو کے شاعروں، ادیبوں اور اساتذہ کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اگر صرف یہی طبقہ اردو کی سنجیدہ کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھنا شروع کر دے، اپنی تنخواہ کا ایک مختصر حصہ اردو کی سنجیدہ کتابوں اور رسالوں کے لئے وقف کر دے تو اردو رسالوں اور کتابوں کی اشاعت اور نکاسی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں رہنے والے اُردو کے ادیب اور سنجیدہ قارئین صرف چار پانچ روپئے بھی ہر ماہ اردو کے سنجیدہ اور معیاری ادب کے لئے خرچ کرنے کو تیار ہو جائیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا وہ یہ کہ کلاسیکی ادب کی اشاعت کی اہمیت میں کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا، قدیم شعراء اور ادباء کی کتابیں اردو کے بڑے اشاعتی ادارے ضرور شائع کریں، مگر ان کی تصانیف کے ساتھ ساتھ اردو کے زندہ ادیبوں اور شاعروں کی تصنیفات کی اشاعت پر پہلے سے زیادہ سنجیدگی سے غور کریں۔ اُردو ادب کی ترقی اور فروغ کے لئے ضروری ہے کہ آج کے ادباء اور شعراء کی تصانیف شائع کی جائیں اور خریدی جائیں۔ یونیورسٹیوں کے نصابوں میں بھی زندہ ادباء اور شعراء کی شمولیت پہلے سے زیادہ ہونی چاہئے تاکہ ان کی کتابوں کی نکاسی میں سہولت ہو۔ سنجیدہ اور معیاری اردو کتابوں کے مسودے چھپنے کے بجائے اگر دیمک کی نذر ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر تہذیبی المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر شارب ردولوی نے اُردو رسم الخط پر دلی یونیورسٹی کے سمینار کی رپورٹ تفصیل اور محنت سے لکھی ہے۔ اُردو رسم الخط کے متعلق کہی گئی زیادہ تر باتیں بصیرت افروز ہیں۔ وہ تمام لوگ جو اُردو سے محبت رکھتے ہیں اور اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہیں اس کے موجودہ رسم الخط کی بجا طور پر حمایت کرتے ہیں۔ ہر سنجیدہ آدمی زبان اور رسم الخط کے اٹوٹ رشتے سے واقف ہے۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو والے اس موضوع کے بجائے اردو کے مسائل پر سیمینار منعقد کریں۔ اُردو رسم الخط پر اب بحث کی ضرورت نہیں۔ اردو کے مخالفین تو یہ چاہتے ہی ہیں کہ ہماری توجہ اُردو کے موجودہ مسائل سے ہٹ جائے اور ہم آپس ہی میں غیر ضروری باتوں پر اُلجھتے رہیں۔ "اردو اور اس کا رسم الخط" اور "اردو شاعری میں وطن دوستی کے عناصر" جیسے موضوعات پر مضامین لکھنے اور بحث کرنے کی بجائے اب ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اُردو کی ترویج و اشاعت کس طرح کی جائے، اس کا حق دلانے کے لئے کیا کیا جائے۔ اب انھیں مسائل پر سیمینار منعقد کرنے اور لائحہ عمل بنانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ابھی بھی ہم اپنے مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں اور مسائل پر اقدام و عمل ہو جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

■■

ماہنامہ لکھنؤ
مجلسِ مشاورت
حیات اللہ انصاری * سید احتشام حسین * عابد سہیل
تزئین کار * قیصر سرمست
ناول، افسانے، طنز و مزاح
مشینوں کا شہر ... ۹ ... کرشن چندر
مردم شماری ... ۳۳ ... یوسف ناظم
بھائی ... ۳۵ اشوک کمار
ترجمہ: مختار احمد
کلکتہ کی زندگی پر دو افسانے
پاڑھا ... ... ۲۰ ... اودھ نرائن سنگھ
روشنی کا خنجر ... ۲۷ ... شاہدہ حسن
رپورتاژ
اورنگ آباد کی شام افسانہ ۲۷ سعید سہروردی
خطوط ۹۳ تا ۹۶
میکش اکبرآبادی، رفعت خلش، احسان نظر، یوسف جمال، ظفر غوری
رباعیاں ۴ ڈاکٹر مسعود سالم
ایک نظم ۵ ناہدہ زیدی
۵ غزلیں ۶، ۷ شہاب جعفری
۳ غزلیں ۸ زبیر شفائی
تبصرے
صحرا میں اذان ۱۷ مہن موہن تلخ
گوشۂ مصطفیٰ زیدی
۴۴ تا ۹۰
جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، سلام مچھلی شہری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر مسیح الزماں، رام لعل
ڈاکٹر سید محمد عقیل، سحر انصاری، انجم حارث، عبدالحمید ارشد
مصطفیٰ زیدی کی اہلیہ ویرا سے ایک ملاقات
مصطفیٰ زیدی کی متعدد غیر مطبوعہ تخلیقات

کتاب

پہلا صفحہ

وزیر اعظم اندرا گاندھی نے چند روز قبل کانگریسی ممبران پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے اپنا یہ وعدہ پھر دہرایا ہے کہ اردو کو اس کا حق ضرور ملے گا۔ وہ حق جو اسے دستور میں دیا گیا ہے۔ ہم وزیر اعظم کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ انتخابات ختم ہونے اور پارلیمنٹ میں ایسی زبردست کامیابی حاصل کرنے کے بعد انتخابات سے پہلے کئے جانے والے وعدوں کو یاد رکھنا اور انہیں دہرانا ہندوستانی سیاست میں نرالی سی بات ہے اس لئے ہم ان کی تقریر کا مزید خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کی اس تقریر کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کے مخاطب وہ لوگ تھے جن کی مدد کے بغیر وعدوں کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ اندرا گاندھی کی اس وضاحت کو بھی کہ اردو کو دستور میں دیے گئے حقوق سے زیادہ دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا حاضرین جلسہ کے ذہنی تحفظات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔

لیکن اردو کے مطالبات کو گذشتہ بیس برسوں سے وعدوں پر ٹالا جا رہا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ وعدوں کی یہ منزل اب کسی طرح سر بھی ہو چکے۔ اگر موجودہ صورت حال اگلے دس برس اور قائم رہی تو اردو اس حالت کو پہونچ جائے گی کہ اس کے سارے مطالبات مان بھی لیے گئے تو بھی اسکا کچھ بھلا نہ ہوگا۔ اردو کے لئے جو کچھ بھی کیا جانا ہے ابھی ہو جانا چاہیئے اور اردو کے حامیوں کی ساری توجہ فی الحال مسئلہ کے اسی پہلو پر مرکوز ہونا چاہیئے۔ اردو تحریک کے رہنماؤں کو حکومت سے یہ بات نہایت واضح الفاظ میں کہہ دینی چاہیئے کہ اب مزید انتظار کی گنجائش نہیں اور ہمیں صاف صاف بتا دیا جائے کہ مرکزی حکومت اردو کو کیا دینا چاہتی ہے اور اردو کے سلسلے میں دستوری ضمانتوں کو عملی جامہ پہنانے سے دیدہ دانستہ پہلوتہی کرنے والی ریاستوں کو راہ راست پر لانے کے لئے وہ کیا اقدامات کرے گی۔

اردو کی ساری انجمنوں کو ایک مرکزی کمیٹی تشکیل دیکر ایک خاکہ بنا لینا چاہیئے کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لئے کم سے کم ان حقوق کا ملنا ضروری ہے۔ اسی خاکہ کی بنیاد پر باقاعدہ حکومت سے بات چیت کی جائے۔ میمورنڈم پیش کر کے اس کے جواب کا مزید بیس برسوں تک انتظار کرنے کا اب وقت نہیں رہ گیا ہے۔ اگلے دس سال اردو کی زندگی کے لئے بہت اہم ہیں اگر اس دوران کچھ نہ ہوا تو ۱۹۹۰ کے بعد یہ انتخابی مسئلہ بھی نہ رہ جائے گا۔

گوشۂ مصطفیٰ زیدی کی اہمیت یوں بڑھ گئی ہے کہ ہندوستان کے سامنے ہی جرائد نے مصطفیٰ زیدی کی موت کے بدقسمت حالات کو اس طرح سنسنی خیز بنا کر پیش کیا تھا کہ عشق و رومان کی اس داستان میں ان کی شخصیت اور شاعری دب گئی تھی۔ برخلاف اسکے ہم نے انکی شخصیت اور شاعری کو ہی ساری اہمیت دی ہے۔ زیر نظر شمارہ میں ان پر جوش، فیض، اسلام مچھلی شہری، ڈاکٹر مسیح الزماں، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سید محمد عقیل اور ام لعل کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ ان کی ۶ غیر مطبوعہ تخلیقات بھی شامل ہیں۔ ان ساری چیزوں کے علاوہ انکی اہلیہ ویرا زیدی سے ایک انٹرویو بھی پیش کیا جا رہا ہے جس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ کوشش پسند کی جائے گی۔

ڈاکٹر صفدر آہ

رباعیات

(۱)

چھلکے ہیں تمام رات آنکھوں کے ایاغ
سوزش سے سلگ رہے ہیں سینے کے داغ
اب کوئی نہیں آئے گا غم خانے میں
اے بادِ سحرگاہ بجھا دے یہ چراغ

(۲)

افسردہ کلی کلی ہے آزردہ بہار
طائر چپ چپ ہیں اور سُونا گلزار
اس سے تو شب تار کی گھٹن تھی بھلی
کیسی یہ زندگی ہے صبحِ بیمار

(۳)

اک خواب طویل کی ہے تعبیر سحر
انوار کے لفظوں کی ہے تفسیر سحر
نو لاکھ ستاروں کا اُجالا لے کر
تشکیل ہوا ہے خطِ تنویرِ سحر

(۴)

بجھتی ہوئی شمع چاق کر لیتا ہوں
ذکرِ وصل و فراق کر لیتا ہوں
یاد آتے ہیں جس وقت جوانی کے دن
پیری تجھ سے مذاق کر لیتا ہوں

زاہدہ زیدی

ایک نظم

شکستہ آئینے کو
توڑ کر
بھی کیا ملے گا
اب شکست کے حصار سے
یہ کارواں
نکل نہ پائے گا
وہ عکس
جو شکستِ آئینہ سے چور چور ہے
وہ مندمل نہ ہو سکے گا
مرہمِ گریز سے
سوال
وہ برہنہ پا سوال
تپ گئے
جھلس گئے
جو ناصلوں کی دھوپ میں
جو ٹوٹ کر
بکھر گئے
بکھر کے
جذب ہو گئے سیاہیوں کی ریت میں

سیاہیوں کی ریت میں
وہ کیا اگا سکیں گے
کوئی نخلِ نور
جو راستوں کے پیچ و خم میں قید تھا
وہ اب خلا کی وسعتوں میں
ایک برگِ خشک ہے
جو آرزو کے زیر و بم میں تھا
رواں دواں
وہ چور ہو کے اب
خواہشِ آئینہ کا صید ہے

شکست کے حصار سے
مگر
یہ کارواں نکل نہ پائے گا

غزلیں

صہبا وحید

مجھ سے کوئی جدا تھا، صدا لے گئی اُسے!
وہ شخص سوچتا تھا، نِدا لے گئی اُسے!

اتنا ہی پڑھ سکا تھا حسینِ شام ہو کہ پھر
کاغذ پہ کچھ لکھا تھا، ہوا لے گئی اُسے

بادِ شمال ڈھونڈ رہی تھی مرا وجود!
اک حرفِ بے نوا تھا، اُڑا لے گئی اُسے!

ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں اسیر تھے
طوفاں پکارتا تھا، صدا لے گئی اُسے

طوفاں بدوشِ موج سے بچنا محال تھا
دریا چڑھا ہوا تھا، بہا لے گئی اُسے

یوں دل نے پارسائی کا دعویٰ کیا تھا کب؟
اک شخص خوش ادا تھا، ادا لے گئی اُسے!

■■

ہم دورِ جاں میں قید ہر اک ماہ و سال ہے
جیسے یہ زندگی بھی کوئی یرغمال ہے

اُلجھا ہوں آتی جاتی صداؤں سے بارہا
بکھرا ہوں ہر نوا سے کہ خواب و خیال ہے

ٹوٹا ہوں اس طرح کہ بکھرتا چلا گیا
بکھرا ہوں اس طرح کہ سنورنا محال ہے

اس جبر و اختیار سے پامال میں بھی ہوں
اے روحِ احتجاج بتا، کیا خیال ہے

ویران رہ گزار پہ اُڑتی ہے روز خاک
اب تک مری تلاش میں بادِ شمال ہے

صورت گری کے شوق نے گمراہ کر دیا
اب میں، مری جبیں، مرا دستِ سوال ہے

بس یونہی مت گزر، کبھی صہبا سے بات کر
کہتے ہیں اُس سے ملنا بڑا نیک فال ہے

■■

صہبا وحید

غزلیں

یک میں ہوں، ایک تو ہے، باخبر کوئی نہیں
اتھ میں دے ہاتھ اپنا، سر بہ سر کوئی نہیں
ام شفق ہو، قریب آ، درد کا درماں کریں
رات کے صحرا میں اپنا چارہ گر کوئی نہیں
یت کے سینے پہ ذرہ ذرہ کر چمک اُٹھتا ہے پھر
ب بجز اک نقشِ پا کے راہ بر کوئی نہیں
وڑ کے بائیں طرف ہے سنگ اندازوں کا شہر
ل سا آئینہ نہ لے جا، شیشہ گر کوئی نہیں
بلنے یہ آسیب ہے کس کی صدا کا در بہ در
ں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں، دیدہ ور کوئی نہیں
ھونڈتے پھرتے ہو کس کو چاند کی مشعل لیے
ندگی اک فاصلہ ہے، منتظر کوئی نہیں

سخن کو طول نہ دے، اپنی احتیاج بتا!
اُٹھا نہ دل کی کوئی بات کل پہ، آج بتا!
کھڑا ہوں در پہ سراسیمگی کے عالم میں
وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ کام کاج بتا!
مفاہمت مری کوشش، سپردگی ترا کام
تو اپنے شہرِ جنوں کا مجھے رواج بتا!
خود اپنے ہاتھ سے اپنی اُڑا چکا ہوں خاک
اب اور کیا ہو مکافاتِ احتجاج بتا!
کتابِ دل کو میں ترتیب دے رہا ہوں پھر
جملۂ تازہ! ہے کیسا ترا مزاج بتا!
وہ گاہ شعلہ ہے، صہبا تو گاہ شبنم ہے
کہیں پہ دیکھا ہے ایسا بھی امتزاج بتا!

ہر ایک بندشِ خود ساختہ، بیاں سے اُٹھا
تکلفات کا پردہ بھی درمیاں سے اُٹھا
فقط خلا ہی نہیں ہے، صدا لگاتے چلو
کہ ابرِ بارشِ نیساں بھی آسماں سے اُٹھا
شجر کے سائے میں بیٹھا ہوں میں، تجھے کیا ہے!
جو ہو سکے تو مجھے اپنے آستاں سے اُٹھا
فسوں طراز تھی کب چشمِ نیم وا اتنی
لہو کا فتنہ مگر زیبِ داستاں سے اُٹھا
نظر نہ آئی جو راہِ سفر تو پھر میں بھی
دھواں دھواں سا سرِ بزمِ دوستاں سے اُٹھا
یہاں کی رسم ہے، صہبا، کسادِ بازاری
یہ جنسِ دل ہے بڑی بے بہا، دکاں سے اُٹھا

زبیر شفائی

غزلیں

یہ داغ داغ عناصر اُچھالتا کیوں ہے
تو کون ہے؟ مجھے پیکر میں ڈھالتا کیوں ہے

میں مطمئن نہ سہی، غیر مطمئن بھی نہیں
مجھے تو خطۂ جاں سے نکالتا کیوں ہے

شریکِ مرگ نہیں تھا تو اب مجھے یارو
یہ بار بار سمندر اُچھالتا کیوں ہے

اگر بجھا نہیں سکتا لہو میں شعلۂ زہر
تو آستین میں پھر سانپ پالتا کیوں ہے

کہاں نہیں ہوں، کہاں ہوں، یہ بے جواب سوال
پتہ نہیں مجھے اُلجھن میں ڈالتا کیوں ہے

یہ خستہ جسم ہی بنیادِ زندگی ہے زبیر
میں گر رہا ہوں تو کوئی سنبھالتا کیوں ہے

--

اک زیرِ ہوا لہر سرِ آب تو آئے
میں جاگ رہا ہوں کہ کوئی خواب تو آئے

میں برہنہ تن، آگ کے شعلوں میں کھڑا ہوں
یہ نقش اُڑانے کوئی سیلاب تو آئے

اب دیکھیے کس شکل میں ترتیب دیا جاؤں
سب لوگ مجھے خاک تلے داب تو آئے

وہ پاؤں مرے جسم پہ رکھے کہ نہ رکھے
اس سمت کوئی لمحۂ شاداب تو آئے

ہم لوگ زبیر آپ کے احسان چکا دیں
لیکن یہ سفینہ تہِ گرداب تو آئے

--

پانچویں قسط

کرشن چندر

مشینوں کا شہر

آٹھواں باب

جب چنچل سری دھر کو لے کر آئی۔ تو وہ بار بار مٹھیاں کس رہا تھا اور دانت پیس رہا تھا۔ سیما کو دیکھ کر اس کی جنونانہ حرکات میں کچھ کمی ہو گئی۔ سیما اس کے پاس جا کر بڑی ہمدردی سے بولی۔ ارے سری دھر تمہیں بھی یہ بیماری کھانے لگی — ہائے ہائے اب کیا ہوگا۔ کیا وہ تمہیں بھی پگھلانے والی بھٹی میں جھونک دیں گے — جیسے ہٹلر یہودیوں کو گیس چیمبر میں بھیج دیا کرتا تھا۔ مگر یہ بیماری تمہیں کیسے ہو گئی۔ تم تو دوسرے روبوں سے بہت ہوشیار اور پڑھے لکھے تھے — ڈاکٹر سجاد نے کس قدر محنت کر کے تمہیں دوسروں سے مختلف بنایا تھا۔ ارے سری دھر کچھ تو بولو "

سری دھر کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ کہنے لگا

"ہاں ہاں مجھے بھی پگھلانے والی بھٹی میں جھونک دو"

"مگر میں یہ نہیں چاہتی" سیما مضبوط لہجے میں بتانے لگی۔ بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے "؟

"مجھے پگھلانے والی بھٹی میں ڈال دو" سری دھر بار بار مٹھیاں کستا اور کھولتا تھا۔

"کیا تم انسانوں سے نفرت کرنے لگے ہو"؟ سیما نے پوچھا۔

"میں انسانوں کے لئے کام کرنا نہیں چاہتا۔ انسان اتنا مضبوط اور سمجھدار نہیں ہے جتنا ایک روبو ایک لفظی انسان ہو سکتا ہے۔ روبو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ صرف حکومت کرتے ہیں۔ اور باتیں کرتے ہیں۔ سارا کام ہم لوگ کرتے ہیں"

مگر کسی نہ کسی کو حکم دینا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہ دنیا کیسے چلے گی"؟ سیما بولی "تمہیں کیا چاہیئے"؟

سری دھر بولا — "مجھے آقا نہیں چاہیئے۔ میرا مالک کوئی نہ ہو۔ میں سب کچھ سمجھنے لگا ہوں"

"تمہیں ڈاکٹر سجاد نے سب سے بہتر بنایا۔ ڈاکٹر روبن ہائمر نے تمہیں سب سے اچھا دماغ دیا۔ میں نے تمہیں لائبریری میں لائبریرین مقرر کروایا تاکہ تم اچھی اچھی کتابیں پڑھ کر دنیا پر ظاہر کر سکو کہ تم روبو لوگ بھی ہم انسانوں کے برابر ہو"

"میں کسی کا غلام بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتا"

"میں مسٹر گوش سے کہوں گی۔ وہ تمہیں بہت سے روبوں کا افسر بنا دیں گے"

"میں اپنے لوگوں کا افسر نہیں بننا چاہتا۔ میں انسانوں پر حکومت کرنا چاہتا ہوں"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو"؟ سیما چلا اٹھی۔

"تو مجھے بھٹی میں جھونک دو"

سیما اس کے قریب آ کر بولی — "تم سمجھتے ہو ہم تم سے ڈر جائیں گے۔ میں ابھی ڈاکٹر پارکنز کو ایک خط بھیجتی ہوں۔ تمہارا معاملہ ان کے سپرد ہے"

سری دھر گھبرا سا گیا۔ سیما کے قریب جاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم کیا کر رہی ہو — ؟ تم کیا لکھ رہی ہو"؟؟

نوٹ پھاڑ کر اسے دیتے ہوئے سیما کہنے لگی "میں یہ لکھ

رہی ہوں کہ تمھیں کسی حالت میں بھٹی میں نہ ڈالا جائے۔ لو یہ نوٹ اپنے پاس رکھو یا ڈاکٹر پارکنز کے پاس لے جاؤ "

اتنے میں ڈاکٹر روبن ہائیمر ڈرائنگ روم کے اندر داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی کہنے لگا "تم نے مجھے بلوایا ہے مسز گھوش "؟

"ہاں ڈاکٹر" سیما بولی "یہ سری دھر صبح سے اس بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لائبریری کے کئی بت توڑ چکا ہے "

"اسے مار کے ہمیں کتنا دکھ ہوگا "

"مگر اسے بھٹی میں نہیں جھونکا جائے گا ڈاکٹر "

"مگر یہ تو اس فیکٹری کا قانون ہے جہاں کہیں اور جس وقت بھی کسی روبو کو یہ بیماری ہو اسے فوراً بھٹی والے ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا جاتا ہے "

"پھر بھی ہو۔ میں سری دھر کو بھٹی میں پگھلانے نہیں دونگی "

"بڑی خطرناک بات ہوگی یہ ـــــ ذرا کوئی سوئی یا پن مجھے دینا " ڈاکٹر روبن ہائیمر بولا "چپل نے ایک سوئی اسے لاکے دی۔ ڈاکٹر روبن ہائیمر نے سوئی سری دھر کے بازو سے چبھو دی ـــــ سری دھر درد سے چلا اٹھا ـــــ

پھر ڈاکٹر روبن ہائیمر نے اس کی قمیض اٹھا کر اس کے دل کی آواز سنی۔ اور بولا "سری دھر تم اس وقت پگھلانے والی بھٹی کے لئے بھیج دیے جاؤ گے۔ وہاں پر وہ لوگ تمھیں چیر پھاڑ کر تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کریں گے۔ بہت درد ہوگا تمھیں ـــ درد سے بیتاب ہو کر شاید تم چیخو گے مگر مجبوری ہے "

سری دھر بے حد گھبرا گیا۔ ڈاکٹر روبن ہائیمر نے اسکی آنکھ کا پپوٹا اٹھا کر اس کی پتلی میں جھانکا ـــ سری دھر کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگی تھیں۔

سیما آگے بڑھ کر بولی " ڈاکٹر "

روبن ہائیمر نے سری دھر کا پپوٹا نیچے گرا دیا اور سیما کی طرف پلٹ کر بولا۔

"اوہ۔ میں بھول گیا تھا کہ مسز سیما گھوش نے تمہاری سفارش کی ہے۔ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا "

اتنا کہہ کر اس نے پھر سری دھر کے دل کی آواز سنی "آہ۔ دل کی دھڑکن میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ "اچھا سری دھر اب تم جا سکتے ہو "

جب سری دھر چلا گیا تو ڈاکٹر روبن ہائیمر متفکر لہجے میں بولا۔ "ڈر کے مارے پپوٹوں کا پھیل جانا۔ دل کی حرکت کا تیز ہو جانا ـــ یہ خبر سن کے کہ اسے بھٹی میں جھونکا نہیں جائے گا۔ دل کی حرکت کا نارمل کے قریب آ جانا۔ یہ سب ردعمل روبو کے نہیں ہیں عجیب بات ہے "؟

"کیا عجیب بات ہے"؟ سیما نے پوچھا۔

"سری دھر کا دل ایک انسان کی طرح دھڑک رہا تھا۔ ڈر کے مارے اس کے سارے جسم پر پسینہ آ گیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ بدمعاش سری دھر اب روبو نہیں رہا۔ نقلی انسان نہیں رہا "

"شاید اس کے اندر روح پیدا ہو گئی ہے " سیما نے کہا۔

"کوئی نہ کوئی خرابی ضرور پیدا ہو چکی ہے " ڈاکٹر روبن ہائیمر اپنا شبہ ظاہر کرتا ہوا بولا۔

"آپ کو تو معلوم ہی نہیں ہے۔ سری دھر ہم لوگوں سے کیسی نفرت کرنے لگا ہے۔ ڈاکٹر" سیما بات ملتے ہوئے بولی "یہ نئے روبو جو آپ نے بنائے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید ملک سے مل کر۔ یہ اتنے مختلف کیوں ہیں "

"وہ ہم انسانوں کے زیادہ قریب آ چکے ہیں اپنے ردعمل میں "

"شاید اسی لیے ہم سے اتنی نفرت کرتے ہیں " سیما بولی۔

"اسی کا نام ترقی ہے " ڈاکٹر جاوید ملک اندر آتے ہوئے بولا "

"جاوید ـــ " سیما نے اس سے پوچھا "تم نے بھی تو ایک لڑکی بنائی ہے میری شکل و صورت کی۔ میں نے سنا ہے "

"ہاں " جاوید نے اقبال کیا "جب میں تمھیں نہ پا سکا تو میں نے تمہاری صورت کی ایک ہی ـــ لڑکی بنا ڈالی "

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے "؟

"میں اسے سیما کہتا ہوں۔ اس لئے تم سمجھ لو۔ وہ کتنی خوبصورت ہوگی۔"

ڈاکٹر جاوید نے آہستہ سے کہا "وہ تم سے بہت ملتی جلتی ہے مگر وہ ایک ناکام تجربہ ہے۔"

"کس طرح سے؟" سیما نے پوچھا۔

"وہ ایسے چلتی پھرتی ہے ـــ جیسے کسی سپنے میں کھوئی ہوئی ہو۔ کچھ مضطرب کچھ بے چین۔ مجھ سے دور کسی کو پانے کی فکر میں۔ زندگی سے بھی دور۔ جیسے خلاؤں میں گھوم رہی ہو۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔ اور اس معجزہ کا انتظار کرتا ہوں جو اسے اس کے سپنوں کی دنیا سے نکال کر اس دنیا میں لے آئے گا۔ کبھی کبھی جب مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ تو میرا جی اسے کسی بھٹی میں جھونک دینے کو چاہتا ہے۔"

"مگر آپ لوگ پھر بھی روبو بنائے جا رہے ہیں"؟

"ہاں۔"

"اور انسانوں کے یہاں بچے پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔"

"عجیب بات تو یہی ہے۔" ڈاکٹر روبن ہائمر نے اقبال کیا ـــ

"اس کی وجہ کیا ہے"؟

"وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ گزشتہ پندرہ سالوں میں ہماری نیکٹریوں نے اپنے بڑھتے ہوئے منافع کی خاطر اتنے روبو بنا ڈالے ہیں کہ انسان اور نقلی انسان کی آبادی کا تناسب ایک اور دس کا ہو گیا ہے۔ سارا کام نقلی انسان کرنے لگے ہیں۔ اور اتنا کام کہ اب دراصل اصلی انسانوں کی ضرورت نہیں رہی۔ آدمی روبو کا کام میں مقابلہ نہیں کر سکتا اور قدرت کے ارتقا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جو مقابلے میں ہار جاتا ہے قدرت اسے ہٹا دیتی ہے۔ ممکن ہے اگلے تیس برس میں اس دنیا میں ایک انسان بھی نظر نہ آئے۔

"جاوید بولا" پھر بھی ہم نقلی انسان بنائے جا رہے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے نقلی انسان بنا کر ہم نے قدرت کے کسی قانون کی خلاف ورزی کی ہو جس کی سزا ہمیں مل رہی ہے ـــ مگر ہم ابھی تک بڑے اچھے کھو مرہم بنائے جا رہے ہیں تیار ہونے پر چل رہے ہیں اور اسی پرانے سودے کی بنا پر روبو بنائے چلے جا رہے ہیں حالانکہ بہت سی یونیورسٹیوں نے ہمیں لکھا ہے کہ ہم اب روبو بنانا بند کر دیں۔"

ڈاکٹر روبن ہائمر بولا "ورنہ انسان ختم ہو جائے گا کیونکہ انسانوں نے بچے پیدا کرنا بند کر دیے ہیں۔ مگر ہماری فیکٹری کے حصے دار نہیں مانتے۔ بڑھتی ہوئی منافع کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے۔"

جاوید نے افسوس سے سر ہلا کے کہا "کیا کریں ہر ملک کی حکومت اپنی افواج بڑھانا چاہتی ہے ـــ اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنی افواج کے لئے روبو سپاہی منگاتی ہے کیونکہ وہ انسانوں سے زیادہ ڈسپلن کے پابند ہوتے ہیں۔ یعنی زیادہ ظالم۔ زیادہ وحشی زیادہ جذبے سے عاری۔"

"اور کوئی ان روبوں کی تخلیق بند کرنے کو نہیں کہتا"؟ سیما نے پوچھا۔

"کس میں اتنی ہمت ہے"؟

"لوگوں میں خود سے کام کرنے کی عادت نہیں رہی۔ جو کوئی ایسا مشورہ دے گا ـــ لوگ اسے پتھر مار مار کر مار ڈالیں گے۔"

تو ڈاکٹر روبن ہائمر بولا "اب کیا ہوگا"؟

"انسان کا خاتمہ ـــ"

"بہت بہت شکریہ۔" سیما طنز آمیز لہجے میں بولی۔ "کیا آپ یہی بات بتانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ بہت بہت شکریہ..."

"کیا آپ ہمیں واپس جانے کے لیے کہہ رہی ہیں؟" ڈاکٹر جاوید ملک نے پوچھا۔ سیما نے بیزار ہو کے منہ پھیر لیا۔

"تو ہم چلتے ہیں۔" ڈاکٹر روبن ہائمر نے اداسی سے کہا ـــ اور چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دونوں اس کمرے سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد چند لمحے تو سیما سوچ میں ڈوبی رہی پھر ایک دم چونک کر اٹھی اور بولی "چنچل بٹن دبا کر بجلی کا آتش دان جلا دو۔"

"اتنی سردی تو نہیں ہے آج۔" چنچل بولی۔

"مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ جلدی سے آتش دان جلادو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر سیما گھر کے اندر چلی گئی اور چند منٹ کے بعد جو لوٹی تو اس کی بانہوں میں پرانے کاغذوں کے پلندے بھرے ہوئے تھے۔ آتش دان سے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

سیما نے اپنی دونوں بانہوں میں اٹھائے ہوئے پرانے کاغذوں کے پلندے بجلی کے آتش دان میں جھونک دیے۔ چند لمحوں میں شعلوں کی زبانیں ان پرانے کاغذوں کو تیزی سے چاٹ کر راکھ میں تبدیل کرنے لگیں۔

چنچل بولی: "تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری شادی آج سے پندرہ برس پہلے ہوئی تھی۔ جب تم صرف سولہ برس کی بچی تھیں۔ آج بھی تمہاری سب حرکتیں بچوں والی ہیں۔ بھلا ان کاغذوں کو جلانے سے اور اس گرمی میں آتشدان جلانے سے کیا فائدہ؟"

"دیکھتی رہو" سیما عجیب انداز سے بولی "یہ سب کاغذ جل جائیں۔"

چنچل چپ رہی۔

"دیکھو دیکھو یہ کاغذ کیسے جل رہے ہیں" سیما بولی "ان شعلوں کو دیکھو جو ان سے اٹھ رہے ہیں۔ جیسے ان کی زبان ہو باہیں ہوں۔ ناگوں کی طرح بل کھاتے ہوئے ان کاغذوں کے شعلے کیسے بھڑک رہے ہیں۔"

سیما مسرور ہو کر ان جلتے ہوئے کاغذوں کی طرف دیکھتی رہی۔ ٹکٹکی باندھے آتشدان کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی: "سب جل گئے۔ راکھ ہو گئے —"

اتنے میں باہر سے مردوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ سیما گھبرا کر بولی۔

"چنچل بٹن دبا کر آتشدان بجھا دو۔"

چنچل نے آتشدان کا بٹن دبایا۔ آتشدان بجھنے لگا۔ بجھ گیا — اب اس پر صرف کاغذوں کی طرح مرجھائی ہوئی راکھ باقی تھی۔ جیسے کاغذ جلنے کے بعد بھی زندہ ہوں۔

اتنے میں بہت سے مرد ڈرائنگ روم میں آگئے — ڈاکٹر روبن ہائیر اور سیما کا شوہر بادل۔ اور جاوید۔ اور شیخ مقصود۔ اور ولیم جیگر اور ڈاکٹر پارکنز۔ اور بڑھا پاٹل۔ آہستہ آہستہ چھڑی کی مدد سے چلتا ہوا اور بلونت سنگھ جس کی داڑھی میں سفیدی آگئی تھی۔ وہ سب لوگ اندر آگئے۔ اور سیما سے باری باری ہاتھ ملا کر مبارکباد دینے لگے۔

"مبارک۔ مبارک۔ اب سب ٹھیک ہے۔"

"اس خوشی میں کچھ پیا جائے۔"

"برانڈی۔"

"نہیں۔ شیمپین۔"

"مگر اس کمرے سے جلنے کی کچھ بو آرہی ہے۔" بادل کے نتھنے پھیلتے گئے۔

"خیر شکر ہے۔ سب ٹھیک ہوگیا۔"

وہ لوگ ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے لگے۔

چنچل اور سیما مہمانوں کی خاطر شیمپین سے کرنے لگیں۔

سیما نے پوچھا: "تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ بار بار ہاتھ ملا کے کہہ رہے ہو سب ٹھیک ہو گیا۔"

"ہاں میڈم۔" ولیم جیگر بولا "ٹھیک پندرہ برس پہلے تم ایک راکٹ کے ذریعہ ہماری ٹیکریٹری میں آئی تھیں۔ اور اب ٹھیک پندرہ برس بعد ایک جہاز تمہیں یہاں سے لے جانے والا ہے۔"

"کون سا جہاز؟"

"کوئی بھی ہو۔ جو بھی وقت سے پہنچ جائے ہم اس سے چلے جائیں گے۔ تمہاری صحت کا جام مادام۔"

ڈاکٹر روبن ہائیر نے گلاس خالی کر دیا۔ چنچل اس خالی گلاس میں شیمپین بھرنے لگی۔ پروفیسر فرید گھوش یعنی بادل نے ڈاکٹر پارکنز سے سرگوشی میں کہا: "کیا اب اسے بتا دوں؟"

ڈاکٹر پارکنز نے سیما کی طرف دیکھ کر پوچھا: "اسے؟"

[illegible]

"بتادو ـ اب ہرج ہی کیا ہے۔ خطرہ تو ٹل گیا ہے"
یکایک پروفیسر پامل نے زیندر گھوش سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "اب تم اس بچی (سیما کی طرف اشارہ کر کے) کو بتا سکتے ہو کہ سب ختم ہو گیا ہے اور اب سب ٹھیک ہے"
سیما نے کسی قدر مضطرب لہجے میں کہا "مجھ سے کیا چھپایا جا رہا ہے؟ ـــ کیا ختم ہو گیا ہے؟؟ اور کیا ٹھیک ہو گیا ہے۔ آپ لوگ اب تک مجھ سے کیا چھپا رہے تھے؟"
"اپنی خوش قسمتی" شیخ مقصود بولا "جس جہاز کا ہمیں انتظار تھا وہ اب آنے والا ہے"
"کیوں انتظار تھا" سیما براہ راست اس پوچھتے ہوئے سوال پر آئی۔
بادل نے سب لوگوں کی طرف دیکھا ـــ
ڈاکٹر پارکنز اور شیخ مقصود اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔
"جب تک تم واقعہ بیان کرو، ہم بندرگاہ تک ہو کے آتے ہیں"
"ٹھیک ہے" بادل نے انھیں چھٹی دیدی۔
اب سیما بادل کے بالکل قریب آ گئی۔ بولی "آدھے گھنٹے سے میں سن رہی ہوں۔ سب ٹھیک ہے ـــ سب ختم ہے۔ ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دی جا رہی ہے۔ مگر مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا"
"سنو ڈارلنگ" بادل کہنے لگا "بیشک چند باتوں کو تم سے چھپایا گیا ہے۔ مگر اب بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ وہ اب ختم ہو گیا ہے"
"کیا؟" ـ
"بغاوت"
"کون سی بغاوت؟"
بادل نے چنچل سے کہا "پرسوں کا اخبار ادھر لانا۔ وہ ... ہے"
چنچل نے بادل کو اخبار دیا۔ بادل اخبار کے پہلے صفحے کا ایک کالم پڑھنے لگا

پیرس میں روبو کی پہلی لیگ قائم کر دی گئی ہے اور اس قومی لیگ نے دنیا بھر کے روبوں سے اپیل کی ہے کہ"
سیما نے اسے روک کر کہا "میں پڑھ چکی ہوں"
"مگر تم اس کا مطلب نہیں سمجھیں۔ اس کا مطلب ہے انقلاب۔ دنیا بھر میں روبوں کا انقلاب"
"کس نے شروع کیا۔ وہ کون مرد بچہ تھا" بلونت سنگھ اپنی مضبوط مٹھیاں کستے ہوئے بولا "میں جاننا چاہتا ہوں"
"کس نے شروع کیا۔" "یہ تو میں بھی جاننا چاہوں گا۔ مگر اس روبو کا نام کسی کو معلوم نہیں ہے کیونکہ کوئی انسانی مبلغ تو آج تک ان نقلی انسانوں کو متاثر نہیں کر سکا۔ پھر یہ لوگ کیسے ایک دم متاثر ہو گئے ـــ؟"
"کیا کیا ان لوگوں نے" سیما نے پوچھا۔
بادل مضطرب ہو کے بولا "تم ہمیشہ انھیں لوگ کہتی رہو حالانکہ لوگ تو ہم ہیں۔ وہ صرف مشین ہیں نقلی انسان"
"نقلی انسان جنھوں نے بغاوت کر دی ہے"؟ سیما نے طنزاً پوچھا۔
"بغاوت بھی کیسی بغاوت"؟ بادل ابل پڑا۔ "انھوں نے سب اسلحہ خانوں، بجلی گھروں، ریڈیو اسٹیشنوں، ٹیلی وژن، بے تار برقی، ریل، بحری اور ہوائی جہازوں اور راکٹوں پر قبضہ کر لیا ہے"
"ڈاکٹر روبن ہائیز بولا "اور یہ بدمعاش تعداد میں ہم سے ہزاروں گنا زیادہ ہیں"
"میرا خیال ہے" سیما بولی "کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک انسان اور دس نقلی انسانوں کا تناسب ہے"
"نہیں ـــ وہ اندازہ غلط تھا ـــ ہم نے فیکٹری کے ریکارڈنٹس ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھ کر اندازہ لگایا" ولیم جیگر بولا۔ "تناسب ایک انسان اور ایک ہزار روبو کا بیٹھتا ہے"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے" بلونت سنگھ جو خود بھی بہت مضبوط آدمی تھا۔ اور اسی سے سر ہلا کر بولا ـــ "ایک اور دس کا

تناسب بھی دنیا ختم کرنے کے لئے کافی تھا۔

"پھر بھی تم روبو بناتے چلے گئے" سیمانے کٹیلے لہجے میں کہا۔

بادل نے اس کے کٹیلے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "پچھلے بحری جہاز سے جو ڈیڑھ لاکھ روبوٹ کو امریکہ جا رہا تھا۔ اس نے ہمیں یہ خبر دی تھی اسی سے ہم سمجھ گئے کہ کیوں ایک ہفتے سے سب ڈاک بند ہے۔ کوئی جہاز نہیں آتا ہے۔ نہ کوئی راکٹ۔ ہم نے ایک ہفتے سے کام بند کر رکھا ہے کوئی آرڈر ہی نہیں ہے"

"اب بھی" سیما بولی "اسی لئے تم مجھے وہ بحری جہاز تحفے میں دے رہے تھے۔"

"نہیں ڈارلنگ ۔۔۔ اسے تو میں نے آج سے چھ ماہ پیشتر آرڈر کیا تھا۔ بادل بولا ۔۔۔"

"چھ ماہ پہلے"؟

"مجھے پہلے سے افواہیں خطرے کی مل رہی تھیں۔ جو مل کر بلکہ ۔۔۔ میرے دل میں ایک ڈر سا پیدا کر رہی تھیں۔ مگر اب وہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ چلو سب کے جام شیمپین سے بھر دو"

بادل کا ہاتھ پکڑ کر سیما نے پوچھا "تم کیسے کہہ رہے ہو کہ خطرہ ٹل گیا ہے"

"وہ بحری ڈاک جہاز آ رہا ہے ۔۔۔ جو ہر ہفتے آتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے وہاں سے آ رہا ہے۔ ٹائم ٹیبل کے مطابق"

"سیمانے اطمینان کا سانس لے کر کہا "تو اس کا مطلب ہے سب ٹھیک ہے"

"بالکل ۔۔۔ ویسے ان روبوں نے ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے ہیں۔ جن سے ہمارا رشتہ باہر کی دنیا سے جڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہمارا جہاز وقت پر ٹائم ٹیبل کے مطابق آ جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کوئی خطرہ نہیں ہے"

رد بن ایئر بولا "اگر ٹائم ٹیبل چلتا رہے تو سمجھو سب ٹھیک ہے۔ انسانی قانون۔ قدرتی قانون۔ کائنات کے اصول سب ٹھیک سمجھے جائیں گے۔ ٹائم ٹیبل سے اہم چیز اس دنیا میں کیا ہے۔ ٹائم ٹیبل شیکسپیئر سے بڑا ہے۔ کالی داس سے بڑا ہے۔ جس کے سہارے ماڈرن انسان کی دنیا چلتی ہے"

سیمانے کسی قدر جھنجھلا کر کہا "تو آپ لوگوں نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا"

"ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے" جاوید نے کہا۔ "لیکن اگر روبو کا انقلاب یہاں تک پہنچ چکا ہے اس جزیرے تک تو"

"ابھی کوئی مضائقہ نہیں ۔۔۔ ہم لوگ اپنے بحری جہاز انتم پر سوار ہو جائیں گے اور جب تک وہ یہاں فیکٹری کے تہہ خانے پر قبضہ کریں گے ہم لوگ دور سمندر میں ہوں گے۔ اور ایک ماہ کے اندر اندر ہم لوگ روبوں۔ باغی روبوں سے اپنی شرطیں منوا لیں گے"

"وہ کیسے" سیمانے پوچھا۔

"ہم جہاز پر وہ چیز لے جا رہے ہیں جس کے بغیر روبو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے"

"وہ کون سی شے ہے بادل"؟

"روبوں کس طرح مینوفیکچر کیے جاتے ہیں۔ وہ راز میرے پتا جی کے سیف میں بند ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ سے فارمولا تیار کیا تھا۔ جو اس سیف میں بند ہے جس کی چابی تمہارے پاس ہے۔ سیما سیف کے سب سے نچلے خانے میں ۔۔۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا اس لیے کہ تمہارے لئے وہ فارمولا بیکار تھا۔ اس قدر پیچیدہ تھا کہ تم نے اسے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا"

ڈاکٹر پامکی بولے "حالانکہ چند باتیں میں بھی جانتا ہوں کیونکہ میں نے برسوں اپنے مرحوم دوست کے ساتھ کام کیا ہے۔ مگر مکمل فارمولا تو اسی سیف میں بند ہے جس سے فیکٹری میں نقلی انسان بناتے ہوئے آج بھی مدد لی جاتی ہے۔ وہ سمجھو ہماری ترپ کی چال ہے۔ جونہی روبوں کو پتہ چلے گا کہ وہ اپنے آپ کو بنا نہیں سکتے۔ اپنی تعداد کو بڑھا نہیں سکتے۔ وہ فوراً گھٹنے ٹیک دیں گے"

"اسے مت۔" سیما نے دونوں ہات اپنے سینے پر رکھ لیے۔
"آپ لوگوں نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"
سیما بھاگتی ہوئی آتشدان کی طرف گئی۔ چند لمحوں تک پشیمانی سے اس کی راکھ پر نظر ڈالتی رہی۔ پھر پلٹ کر بولی ۔"آپ لوگ مجھے بتا دیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"
پروفیسر پاٹل نے دوربین سے بندرگاہ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "ڈاک کا بحری جہاز بندرگاہ میں داخل ہو رہا ہے۔ میری نظر اب ٹھیک نہیں رہی۔" پروفیسر پاٹل کے ہات میں رعشہ تھا۔
"تم دیکھو روبن ہائیر۔"
روبن ہائیر نے دوربین سے دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک دیا جا رہا ہے۔ ٹھیک ٹائم ٹیبل کے مطابق وہ لوگ ڈاک کے تھیلے نیچے پھینک رہے ہیں۔ ڈاکٹر پارکنز اور شیخ مقصود ساحل پر کھڑے ہیں۔ میں ان کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھ سکتا ہوں۔"
ولیم جیگر نے کہا "ان لوگوں نے۔ میرا مطلب ہے میرے ہم وطنوں نے اور دوسرے یورپین ملکوں نے بالخصوص جاپان نے حالات پر کیسے قابو پالیا ہوگا — میں جاننا چاہوں گا۔"
یکایک سیما آتشدان سے لوٹ کر آئی۔ اور بادل کی باہوں سے لگ کر بولی "آؤ ہم لوگ فوراً یہاں سے چل دیں۔"
"کیوں؟" بادل نے پوچھا۔
"ڈاکٹر روبن ہائیر۔ ڈاکٹر پاٹل۔ بلونت سنگھ جی۔ جاوید۔ میں تم سب سے التجا کرتی ہوں۔ فیکٹری کو بند کردو اور یہاں سے فوراً چل دو۔"
"اب جانے کی ضرورت کیا ہے؟" بادل بولا "بلکہ اب تو جبکہ بغاوت پر قابو پالیا ہے اور بحری جہاز معمول کے مطابق آگیا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ ہم لوگ روبو بنانے کے کام کو اور زیادہ بڑھا دیں گے اور بالکل ایک نئی طرح کا روبو بنائیں گے۔"
"کس طرح کا؟" سیما نے پوچھا۔
"ابھی تو ساری دنیا میں صرف ایک ٹائپ کے روبو بنانے کی فیکٹری ہے۔ اب ہم اس کام کو پھیلا دیں گے۔ ہر ملک میں ایک فیکٹری کا پلانٹ لگا دیں گے اور جانتی ہو وہ فیکٹریاں کیا بنائیں گی؟"
"نہیں میں نہیں جانتی۔"
"قومی روبو۔ مختلف رنگ نسل۔ قومیت اور مذہب کے روبو۔ ہندو روبو۔ کرسچین روبو۔ مسلم روبو۔ سکھ روبو۔ بدھ روبو۔ انگریز روبو۔ امریکی روبو۔ ہندوستانی روبو۔ ہم سب کی تعلیم مختلف کردیں گے۔ سب کی سوجھ بوجھ الگ۔ تاکہ ہر قوم کا روبو دوسرے قوم اور علاقے کے روبو سے نفرت کرنے لگے — انسانیت بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔"
"واہ کیا عمدہ تجویز سوچی ہے۔ مرہٹہ روبو۔ گجراتی روبو سے نفرت کرے گا۔ گجراتی روبو تامل روبو سے تمل روبو شمالی ہند کے روبو سے۔ یہ سب روبو آپس میں لڑتے رہیں گے۔"
"اور ہماری فیکٹری کا منافع بڑھتا جائے گا۔" بلونت سنگھ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔
"ابھی فیکٹری بند کردو۔ میں کہتی ہوں۔" سیما تھکے سے لہجے میں بولی —
"کیسے بند کردیں۔ ابھی تو ہم اس کام کو بڑے پیمانے پر شروع کر رہے ہیں۔ سفید رنگ کے روبو۔ اور کالے رنگ کے روبو۔ اور چینی خدوخال کے روبو۔"
اتنے میں ڈاکٹر پارکنز اور شیخ مقصود داخل ہوئے۔ دونوں کے ہاتھوں کاغذ کے چند بڑے بڑے پرزے تھے۔
بادل نے بے صبری سے پوچھا "کیا ہوا۔ پوسٹ بیگ گئے تھے؟"
"ہاں گئے تھے۔"
"ڈاک آگئی؟"
"ہاں آگئی صرف یہ اشتہار انھوں بنڈلوں کی تعداد میں انھوں نے ساحل پر پھینک دئے۔ اور۔ اور۔"
"اور کیا؟" پاٹل نے بے صبری سے پوچھا۔
"میرے خیال میں آفس میں چل کر بات کریں تو بہتر ہوگا" شیخ مقصود بولا۔ اس کی نگاہ پر سیما تھی۔

"آپ لوگ یہاں کیوں جائیں — میں ہی چلی جاتی ہوں" سیا بولی "مجھے کچن میں کچھ کام ہے۔" سیا اتنا کہہ کر چلی گئی —

اس کے جانے کے بعد چند لمحوں تک مکمل خاموشی رہی ایک عجیب لرزہ خیز خاموشی۔ پھر اس خاموشی کو توڑتے ہوئے ڈاکٹر پارکنز نے وہ اشتہار بادل کی طرف بڑھا دیا۔ اور بولا۔

"اسے پڑھو"

"روبوں کی بین الاقوامی لیگ انسان کو اپنا دشمن قرار دیتی ہے اور اس کائنات پر ایک شرمناک دھبہ — ہم لوگ آدمی سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ زیادہ ذہین — دنیا کا سارا کام ہم کرتے ہیں۔ انسان عیش کرتا ہے۔ اب یہ نہیں چلے گا۔ انسان ایک پیراسائٹ ہے"

"یہ باتیں کس نے اسے سکھائیں" ؟ ڈاکٹر پارکنز حیرت زدہ ہو کر بولا۔

شیخ مقصود نے کہا "آخری پیرا بھی پڑھو"

بادل پڑھنے لگا "روبوں کی بین الاقوامی انجمن دنیا کے ہر روبو سے التجا کرتی ہے کہ جہاں کہیں تمہیں کوئی آدمی دکھائی دے اسے مار ڈالو۔ کارخانوں۔ ریلوں۔ کانوں ٹیلی وژن۔ ریڈیو اسٹیشنوں پر قبضہ کر لو۔ کسی کارآمد شے کو ضائع مت کرو۔ اسے روبو حکومت کے لیے محفوظ کر لو۔ گران انسان کو مار ڈالو۔ اور پھر کام پر جٹ جاؤ۔ کام کرنا ہر روبو کا ذاتی فریضہ ہے"

"بھیانک" بادل بولا۔

"خوفناک" روبن ہائمر کے منہ سے نکلا۔

"اب کیا ہوگا" ؟ بلونت سنگھ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں جلدی ایٹم جہاز پر پناہ لینی چاہیئے" بادل نے مشورہ دیا۔ "میں سیا کو بلاتا ہوں۔ ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہیئے"

"ٹھہرو بادل" شیخ مقصود بولا "اب ایسی کوئی جلدی نہیں ہے"

"کیوں" بادل نے پوچھا۔

"اس لیے کہ روبو نے ایٹم جہاز پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ فیکٹری کے بہت سے روبو اس وقت اس بحری جہاز پر پہرہ دے رہے ہیں۔ روبوں کی بین الاقوامی لیگ کا جھنڈا لہرا دیا ہے انہوں نے"

بادل نے جلدی سے دوربین لگا کر دیکھا۔ پھر بے اختیار بولا۔

"بہت تیزی کی"

"بجلی گھر کو فون کرو" بادل بولا "ایک ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے —"

"فون کرنا بیکار ہے" شیخ مقصود بولا "ہم نے بندرگاہ سے تمہیں ٹیلی فون کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا" —

بادل اپنے صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا "میں فوراً بجلی گھر جاتا ہوں"

"کیوں" ؟ پائل نے پوچھا۔

"ہمارے کچھ آدمی وہاں پھنسے ہوئے ہیں"

"یہ کوشش بھی بیکار ہوگی" ڈاکٹر پارکنز بولا۔

"کیوں" ؟

"کیونکہ نقلی انسانوں نے ساری فیکٹری کو گھیر لیا ہے — سارے روبو یہاں پر چھا گئے ہیں۔ ہر چیز کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ بالکنی میں جا کر دیکھو" ڈاکٹر پارکنز نے اشارہ کیا —

وہ سب لوگ ڈرائینگ روم کی بالکنی کی طرف دوڑے مگر جلد ہی لوٹ آئے۔

بادل نے متاسف ہو کر کہا "ہاں۔ انھوں نے ہمیں گھیر لیا ہے چاروں طرف سے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے"

اتنے میں کچن سے سیا دوڑی دوڑی ڈرائینگ روم میں آئی وہ بری طرح سے ہانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک اشتہار تھا۔ اسے جلاتے ہوئے اس نے بادل سے پوچھا "تم نے بین الاقوامی انجمن کا یہ اشتہار دیکھا ہے"

"تم بھی جلدی کیسے نتیجے تک پہنچ گیا ۔۔۔ یہ سندباجر کام بہت جلدی اور بے پابندی سے کرتے ہیں۔"

یکایک فیکٹری کا بھونپو زور سے بجنے لگا۔ سب چونک پڑے ۔۔۔

"فیکٹری کا بھونپو۔" ولیم جیگر نے کہا۔ "شاید لنچ کا وقت ہو گیا ہے۔"

روبن ہائیر نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ابھی لنچ کا ٹائم نہیں ہوا ہے۔"

"مگر بھونپو برابر بجے جا رہا ہے۔"

"یہ لنچ کا بھونپو نہیں ہے۔" بادل بولا۔

"پھر کیا ہے؟" شیخ مقصود نے اس سے پوچھا۔

"روبوں کو خبردار کیا جا رہا ہے ۔۔۔ وہ سب اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ہم پر حملہ کرنے کے لئے۔"

سیما نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور بادل کے سینے سے لپٹ گئی۔

ہر شخص کا چہرہ فق تھا۔

بھونپو نیچے فیکٹری میں برابر زور زور سے بج رہا تھا۔

نواں باب

چنچل بجلی کے تندور میں سے کیک نکال رہی تھی کہ اس نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی ۔۔۔ اس نے مڑ کر دیکھا ۔۔۔ یہ ولیم جیگر تھا۔ اور پیشتر کہ وہ کچن سے بھاگ سکتی۔ وہ ولیم جیگر کی مضبوط باہوں میں تھی۔ اور وہ اس سے پیار کر رہا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔" چنچل گھبرا کے بولی "ورنہ میں چلا کے سب کو اکٹھا کر دوں گی۔"

یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ جب ولیم جیگر نے ایسا کیا ہو ۔۔۔ جب چنچل نے مدد کے لئے پکارنے کی دھمکی نہ دی ہو۔ مگر اس دھمکی کے باوجود وہ ولیم کی مضبوط باہوں کے گھیرے کو پسند کرتی تھی ۔۔۔ مگر اس نے کبھی ولیم کو جتایا نہ تھا۔ وہ ولیم پر ہمیشہ یہی ظاہر کرتی تھی کہ وہ اس کی دست درازیوں کو سخت ناپسند کرتی ہے۔

"بھاگنے سے پہلے میری ایک بات سن لو ڈارلنگ۔"

"میں تمہاری ڈارلنگ نہیں ہوں۔" چنچل نے خفا ہو کر کہا۔ "ہندستانی لڑکیاں تو ایسی ٹیڑھی نہیں ہوتی ہیں۔"؟

جیگر نے جھوٹی بیزاری سے سر ہلا کے کہا۔

"سبھی ہندوستانی لڑکیاں ایک سی نہیں ہوتی ہیں۔"

چنچل اٹھلا کر بولی۔ "اور تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے مٹی کی مادھو؟"

"محاورہ ہے مٹی کا مادھو۔" ولیم جیگر بولا۔ "کم سے کم میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں کو یہی کہتے سنا ہے۔"

"سنا ہوگا ۔۔۔ مگر میں محاورے تبدیل کر سکتی ہوں۔ یہ ہماری زبان ہے۔ تمہاری زبان نہیں ہے۔ جس میں آخ تاخ تاخ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔"

"تمہیں میری زبان کا علم کیسے ہوا؟"

"تمہیں بڑبڑاتے نہیں سنتی ہوں کیا؟" "اچھا اب مجھے چھوڑ دو ورنہ کیک تندور میں جل جائے گا ۔۔۔ اور سیما بی بی مجھ پر خفا ہوں گی۔"

"اب جبکہ سب کچھ جل رہا ہے۔ کیک بھی جل جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب"؟ چنچل نے بھویں اوپر اٹھا کر پوچھا ۔۔۔

اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا۔

ولیم جیگر نے اس تھوڑے سے کھلے منہ پر اپنے ہونٹ رکھ کر اس کا سارا رس چوس لیا۔

چنچل کسمسا کے رہ گئی۔ پھر تڑپ کر اس کی باہوں کے گھیرے سے پھسل کر نکل گئی۔

ولیم خاموش کھڑا رہا۔

جب چنچل تندور سے کیک نکال چکی تو اس کا ایک ذرا سا ٹکڑا چھری سے کاٹ کے چکھا۔ اور جب اس کی زبان کو کیک کا ذائقہ پسند آیا تو اس نے چھری سے کیک کا ایک ٹکڑا کاٹ کے ولیم کو دیا۔ اور بولی۔ "ذرا اسے چکھ کے بتاؤ مزا کیسا ہے؟"

ولیم نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ چند لمحے کیک اس کے جبڑے میں گھلتا رہا۔ پھر اس نے مزے کی ایک چسکی سی لی۔ اور بولا۔

"بہت عمدہ ہے ـــــ تم تو بالکل جرمن عورتوں کی طرح کیک بناتی ہو"

"کیا سبھی جرمن عورتیں بہت عمدہ کیک بناتی ہیں"؟ چنچل نے پوچھا ـــــ

"ہاں تقریباً سبھی۔ مگر تم سے اچھا کیک کوئی عورت نہیں بنا سکتی۔ یہ میرا دعوٰی ہے"

"جھوٹے"

"نہیں بالکل سچ کہتا ہوں"

"خوشامدی"

"خوبصورت عورت کی خوشامد نہ کرو تو وہ اپنے عاشق کو جلد بیزار ہو جاتی ہے۔ مجھے تو خوشامد کرنا بھی ٹھیک سے نہیں آتا۔ مردوں کے اس جزیرے میں رہ کر میری اس حس کو زنگ لگ گیا ہے۔ جس کے ذریعے مرد عورتوں کی تعریف کرتے ہیں"

"نہیں تو زنگ نہیں لگ گیا ـــــ بالکل سان پر چڑھے دکھائی دیتے ہو"

"تو اسی پر ایک پیار اور دے دو"

"ہٹو میں ایسی سستی نہیں ہوں ـــــ"

"میں کب کہتا ہوں تم سستی یا مہنگی ہو۔ تم ایک عورت ہو۔ خوبصورت چنچل ـــــ خوش ادا ـــــ حسین اور شریر۔ جرمنی میں مجھے ایسی عورتیں بہت پسند آتی تھیں۔ مگر اس زمانے کو گزرے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ اب ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے"

پھر ولیم کے کندھے نیچے کو گر گئے۔ دونوں ہاتھ جھٹک کر بولا "اور اب وقت بھی کم رہ گیا ہے"

"کس بات کے لئے"؟

"محبت کرنے کے لئے"

"محبت کرنے کے لیے کبھی وقت کم نہیں ہوتا۔ ایک لمحہ بھی ایک صدی ہوتا ہے" چنچل کی آنکھوں میں دلآویز چمک تھی۔

یکایک باہر کا شور۔ ایک سیلاب کی طرح اندر کھڑکیوں کی راہ سے امڈتا ہوا چلا آیا۔ ہزاروں آوازیں ایک ساتھ مل کر چلانے لگیں "انقلاب زندہ باد"

چنچل خود بخود ولیم کی باہوں میں آگئی "یہ کون لوگ ہیں"؟

"روہوں نے فیکٹری کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا ہے۔ وہی انقلاب کی آوازیں بلند کر رہے ہیں۔ اور اس فیکٹری میں پندرہ بیس انسانوں سے زیادہ آدمی نہ ہوں گے"

"ہم کیسے ان کا مقابلہ کر سکیں گے" اس نے ولیم سے پوچھا اور سر اٹھا کے ولیم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی ـــــ اور اپنی ایک انگلی سے اسکے رخسار پر ایک فرضی لکیر سی کھینچنے لگی ـــــ

"روہوں سے مقابلہ تو ہو نہیں سکتا ـــــ نہ ہمارے پاس اسلحہ ہیں نہ اتنی تعداد ہے ہماری"

"پھر ہم کیا کریں گے"؟

"ہم سے اگر تمہارا مطلب سب سے ہے تو وہ سب جانیں" ولیم بولا ـــــ "اور اگر مجھ سے ہے تو مجھے معلوم ہے کیا کر رہا ہوں"

"کیا کر رہے ہو"؟

"میں تمھیں لے کر واپس جرمنی جا رہا ہوں"

"جرمنی"؟ چنچل دھیمے لہجے میں بولی ـــــ کچھ حیرت زدہ۔ کچھ پشیمان سی "جرمنی میں کہاں جاؤ گے"

"اپنے شہر ڈرسڈن ـــــ تم نے شہر ڈرسڈن نہیں دیکھا"؟

چنچل نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔

ولیم بولا "بڑا خوبصورت شہر ہے۔ شہر کا زیادہ حصہ تو میدان پر بسا ہوا ہے لیکن جو امیر لوگ ہیں جو عقل و دانش کے مالک ہیں۔ جو ادب اور آرٹ کے رسیا ہیں۔ وہ قریب کی پہاڑی پر رہتے ہیں۔ وہاں پر میری ایک خوبصورت سی کاٹیج ہے یرم روز کی بیلوں سے گھری ہوئی۔ چاروں طرف سے پائن کے پیڑوں کی خوشبو آتی ہے اور شہد کی مکھیوں کی گونج۔ اور ایک پہاڑی ٹرام بجلی سے چلنے والی۔ دھیرے دھیرے ہمیں پہاڑ سے نیچے ڈرسڈن کے شہر دوں میں لے جائے گی۔ جس کے دریا بلشل

اسٹوروں میں تمہیں ایسی خوبصورت ڈریس دکھائی دیں گی۔

"نہیں نہیں" چنچل زور سے سر ہلا کے بولی "میں سیابائی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی"

"کیوں"؟

"اس لئے کہ وہ میری مالکن ہیں"

"وہ تمہاری مالکن نہیں ہے۔ تمہارے مالک تو اس نگری میں بھی نہیں ہیں ـــ وہ تو کہیں طہران میں بستے ہیں ـــ جنہوں نے تمہیں یہاں جاسوسی کے لئے بھیجا تھا"

"تمہیں کیسے" چنچل زور سے چلائی۔ پھر ایک دم چپ ہو گئی ـــ اس کا چہرہ فق تھا ـــ نگاہیں نیچے گڑی ہوئی ـــ

ولیم نے اس کا ہات اپنے ہات میں لے کر کہا "دنیا کی ہر بڑی حکومت نے تمہیں جاسوس بنا کے یہاں بھیجا تھا ـــ مگر گھبراؤ نہیں یہ بات میرے سوا اور کسی کو معلوم نہیں ہے"

بہت دیر تک خاموش رہی۔ پھر چنچل ولیم کے سینے سے لگ کر بولی ـــ

"مگر ہم ڈرسڈن کے بیچ اس انڈیمان جزیرے سے کیسے نکل سکیں گے ـــ سنا ہے انگریزوں کے زمانے میں یہ جزیرہ قیدیوں کا کالا پانی تھا۔ اب پھر یہ جزیرہ ہمارے ایسے قیدیوں کے لئے کالا پانی بن گیا ہے"

"تم گھبراؤ نہیں" ولیم بولا "بس تم ہاں کر دو تو میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ میں نے سری دھر سے بات کر لی ہے"

"سری دھر۔ وہ باغی"؟

"ہاں وہی باغی اب یہاں کے روبوں کا سرغنہ ہے اگر ہم لے ہتھیار یہاں سے۔ یعنی اس فیکٹری سے نکل کر روبو لوگوں سے پناہ مانگیں گے تو سری دھر نے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں ڈرسڈن پہنچا دے گا ـــ میں سری دھر سے اکثر اچھا سلوک کرتا رہتا تھا اس لیے وہ مجھ سے خوش ہے"

"دوسروں کا کیا ہوگا"؟

"سب کا سو ہو گی تو جو دوسروں کا حشر ہوگا وہی میرا حشر ہوگا"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔ مگر تمہارے سنگ نہیں جاؤں گی"

"کیوں"؟

"یہ دوسروں سے غداری ہوگی"

"اس وقت وفاداری غداری ایسے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس وقت صرف اپنی جان بچانے کا سوال ہے۔ میں خود اکیلا جا سکتا تھا مگر تمہارے بغیر سارا شہر ڈرسڈن سونا سونا معلوم ہوگا"

چنچل نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔

"اتنا مجھ سے پیار کرتے ہو"؟

"نہ کرتا تو اکیلا ہی جا سکتا تھا"

"ایک لمبی سانس لے کر چنچل نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا بولی "اب جہاں جی چاہے لے چلو ـــ (باقی)

اودھم سنوانی سنگھ
ترجمہ: اسرار عظمت

پاڑا

اِن دنوں وہ جب بھی اپنے "پاڑے" کی سرحد پر آتا ہے، اس کا دل ایک گہری دہشت سے بھر جاتا ہے اور وہ اپنے گھر جانے کے بجائے کہیں اور چلا جانا چاہتا ہے۔

بھیڑ میں دھکے کھاتے ہوئے جب وہ بس سے اُترا تب اُسکے پیر لڑکھڑا گئے۔ گرتے گرتے بچا۔ ایک آدمی کے پیر پر اُس کا داہنا جوتا پڑ گیا۔ اُس آدمی نے اُسے "بدتمیز" کہا۔ خون سے اُس نے جیب سادھ لی۔ دل میں سوچا، لوگ کتنے غیر مہذب ہوتے ہیں۔ معمولی معمولی بات پر گالی گلوچ کرتے ہیں۔ تم کہی سالا خراب بچے نہیں تو بتانا بچے کو بدتمیزی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

وہ بہت سنبھل کر چل رہا تھا لیکن اُسکے پیر اِدھر اُدھر پڑ رہے تھے، اُس کے بس کے باہر۔ پیروں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے انگلیوں کو سکوڑ کر دبائے ہوئے چل رہا تھا۔ پیروں کو آہستہ آہستہ رکھ رہا تھا۔ اُس کی چال ایسی تھی گویا کائی کی پھسلن پر چل رہا ہو۔

اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھا لینے کے لئے وہ پٹری کے کنارے ایک پیڑ کی چھاؤں میں کھڑا ہو گیا۔ پیڑ کی پتیوں سے موٹی موٹی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ دو چار اُس کے سر پر بھی پڑیں۔ اُس نے رومال نکال کر بالوں کو اچھی طرح پونچھا۔ رومال بھیگ گیا تو اُسے نچوڑا اور پھر سر پر رکھ لیا۔ وہ بھیگ گیا تھا۔ بھیگنے پر اُسے زکام ہو جاتا ہے۔ اور کئی دنوں تک پریشان رہتا ہے۔ سر درد کی اُسے بہت پرانی بیماری ہے۔ بہت پریشان رہتا ہے اس سے۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی کی بھیگی ہوئی چھاؤں سڑک اور پٹری پر چل رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈک تھی۔ پھوار ابھی پڑ رہی تھی۔ بہت کم لوگ آ جا رہے تھے۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ گھڑی دیکھی، دس بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اتنے وقت سڑک کا سونا پن عجیب لگ رہا تھا۔ وہ ڈرا، کہیں کوئی واردات تو نہیں ہو گئی۔ بلا وجہ ایسا سونا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنی گھڑی کھول کر جیب کے حوالے کی۔

جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور دیا سلائی نکالی لیکن دو تین تیلیاں ضائع کرنے کے بعد بھی سگریٹ نہ سلگا سکا۔ تیلیاں بھیگ گئی تھیں اس لئے جل نہیں رہی تھیں۔ اُس نے جھلا کر دیا سلائی کی ڈبی سڑک پر پھینک دی اور سگریٹ کے پیکٹ کو سامنے کی جیب میں رکھ لیا۔

وہ احتیاط سے آگے بڑھا۔ اُس کا سر رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ جوتے کے تلوں سے پانی اندر گھس آیا تھا۔ چلنے سے "چپ چپ" کی آواز نکل رہی تھی۔ اُسے کراہیت محسوس ہوئی۔ وہ رک گیا اور جوتے اتار دئے۔ مٹیالے گندے پانی کو نکالنے کے لئے جوتے الٹ دیئے اور باری باری سے انھیں زمین پر ٹپکا۔ جوتے پھر پہن لئے۔ "چپ چپ" کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ اُس نے اُس کی طرف سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

تھوڑی دور تک آگے بڑھنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ موڑ پر تین چار آدمی کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ موڑ پر کھڑے لوگوں سے وہ ڈرتا ہے — خاص طور سے رات کے وقت پر جہاں بھی تو ایک آدمی کو

مار کر جیب کی گھڑی اور روپے چھین لئے گئے تھے۔ آٹھ بجے کے بعد
اس علاقے میں گشت خطرے سے خالی نہیں ہے۔ جیب کترے غنڈے
یہیں کھڑے رہتے ہیں۔ بیمار بھی نہیں پڑتے تھا وہ ڈر گیا۔ اور بچاؤ کے
لئے سکڑ کر چلنے لگا۔ کہیں وہ غنڈے اس کی کمزوری تاڑ نہ جائیں؟
یہ سوچ کر وہ تھوڑا سا تن گیا۔
گلی کے موڑ پر آیا۔ دیکھا گلی پانی میں ڈوب گئی تھی۔ ایک بار
سوچا کہ جوتے اتارے لیکن پھر جوتے پہنے ہوئے پانی میں گھس گیا۔ وہ
پانی میں پیروں کو آہستہ آہستہ گھسیٹنے لگا۔ پانی کی آواز میں آس پاس
کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔
عجیب شہر ہے۔ دس منٹ بارش ہوئی نہیں کہ سارا شہر جام
ہو جاتا ہے۔ سڑکوں پر گھٹنے گھٹنے پانی بھر جاتا ہے۔
وہ پانی میں ہلکورے لیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ موڑ پر کھڑے
بات چیت کرتے ہوئے لوگ پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ اسے اطمینان ہوا۔
ڈر کچھ کم ہو گیا تھا۔
آدھی گلی پار کرنے کے بعد پانی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ خالی
زمین پر تیزی سے چلنے لگا۔ اندر ہی اندر ڈر تھا کہ وہ غنڈے اس کا
پیچھا کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تیزی سے چلتے ہوئے
اس نے دیکھا کہ دائیں طرف کے مکان کے سامنے بھی چار پانچ لوگ
کھڑے ہیں۔ اسے پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ ان میں سے کسی نے اسے
پکارا۔ نہ سننے کے انداز میں وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس کے پاؤں
کانپ رہے تھے اور رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر ایک تیز آواز آئی۔
اسے رک جانے کا حکم دیا گیا۔
وہ رک گیا۔ پاؤں کی تھرتھراہٹ کو سنبھالنے لگا۔ پتہ نہیں
یہ لوگ کیا کریں۔ ان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔
ایک آدمی اس کے پاس آیا اور پوچھا کہ وہ کہاں سے
آ رہا ہے۔ پر وہ چپ رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آواز گلے
کے نیچے کہیں رکی ہوئی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ بولنے پر اس کی دہشت
کا راز فاش ہو جائے گا۔ تب ان کا رویہ اور سخت ہو سکتا ہے۔
پھر اس آدمی نے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ اتنی رات گئے کیوں

گلیوں میں گھومتا ہے۔ اس کی آواز میں سرپرستوں کا سا رعب تھا۔
وہ سوچنے لگا کہ وہ چاہے تو رات بھر گھوم سکتا ہے۔ کسی کو
اس سے کیا لینا دینا۔ پولیس ہو کیا جو اس طرح جانچ پڑتال کر رہے ہو؟
اس نے سوچا کہ اگر کوئی جواب نہ دیا تو یہ لوگ ڈرا ہوا سمجھ کر
ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ "جی میں اسی پالے میں رہتا ہوں۔ پیچھے
دیکھنے گیا تھا۔" اسے لگا کہ بولتے وقت اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔
یہ ضرور تاڑ گئے ہوں گے۔ اس نے طے کیا کہ وہ اب نہیں بولے گا۔
ان کے غیر ضروری سوالوں کے جواب دینا گھٹیا قسم کا ڈرپوک پن نہیں
تو کیا ہے؟
"کب سے یہاں رہتے ہو؟" اس آدمی نے پوچھا۔ اس نے
چپ رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جواب دینا اسے ضروری محسوس
ہوا۔ "ایک مہینے سے" اس نے مختصر سا جواب دیا۔
اس آدمی نے کہا "اکیلے اکیلے سے آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ
ہمیں بھی ملنا چاہیئے۔"
وہ چپ رہا۔ خوف سے کانپ گیا۔ سوچا یہ لوگ اچھے آدمی
نہیں ہیں۔ آہستہ سے جیب گھڑی ٹٹولی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج
وہ بڑی طرح پھنس چکا ہے۔ اگر یہ لوگ گھڑی چھین لیں تو وہ کیا
کر سکتا ہے؟ کوئی سنوائی نہیں ہو گی۔
بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے کہا "جانے دو یار، بھلے
کا آدمی ہے، کبھی دے دیگا۔"
گلاس پٹکنے کی آواز ہوئی اور ایک اور شخص اس کے قریب آ گیا
وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ شاید اس نے زیادہ پی لی تھی۔ بولا "ایک بوتل
کا خرچ دیدو، یہ نہیں مانے گا" پھر اپنے آدمی سے بولا "تمہیں روپیہ
لینے کا طریقہ نہیں معلوم ہے۔ اپنے آدمیوں سے سیدھے ڈھنگ
سے مانگ کر لینا چاہیئے۔"
اسے لگا کہ بنا کچھ دیئے جان چھڑانا مشکل ہے۔ بیکار بات
بڑھانے پر یہ لوگ جو کچھ پاس ہے چھین لیں گے۔ اچھا ہے کہ کچھ دے دیا
جائے ـــ اپنے اس فیصلے پر اسے خوشی ہوئی۔
اس نے کہا "صرف پانچ روپے ہیں" اور پانچ کا نوٹ

نکال کر دے دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ جاؤ اور رات میں مت گھوما کرو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ ہیں نا۔ اس پاڑے میں کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بے جھجک آیا جایا کرو۔ کوئی کچھ بولے تو مجھ سے بتانا، سالے کی لاش گرا دوں گا۔"

وہ تیز تیز چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ بھاگنے لگا۔ اس کے پیر لڑکھڑاہٹ کے باوجود جلدی جلدی پڑ رہے تھے۔ "جان بچی لاکھوں پائے" کے ترنم میں گنگناتا چل رہا تھا۔ بھیگنے کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ جوتے کی چپچپاہٹ بُری نہیں لگ رہی تھی۔

وہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ریلنگ کا سہارا لئے ہوئے تھا۔ پیر بالکل بے کار سے لگ رہے تھے۔ سانس دورسے چل رہی تھی۔ جسم پسینے سے تربتر ہو گیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ باوجود گہرے اندھیرے کے وہ زینے جلدی جلدی چڑھ رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا۔ دھکا دے کر گھس گیا اور دھکا دے کر دروازہ بند کر لیا۔ اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ دو تین بار دروازے کو کھینچ کر اطمینان کر لیا کہ اچھی طرح بند ہے۔ انڈرویر کو چھوڑ کر باقی سب کپڑے جلدی جلدی اُتارے اور انھیں اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ جیب سے گھڑی نکالنا بھول گیا۔ لُنگی پہنی۔ تولیے سے پہلے تو کا پسینہ اور پھر سارے جسم کی نمی کو پونچھا۔ اسکا دل اب بھی دھک دھک کر رہا تھا۔ اُسے لگا کہ اُس کے پیٹ میں گھستے گھستے چھُرا رہ گیا ہے۔ اگر اس نے عقل مندی سے کام نہ لیا ہوتا تو نہ جانے اُس کا کیا ہوتا۔ وہ اپنی ذہانت پر خوش تھا۔

وہ دھم سے کرسی پر گر گیا اور سر کو کرسی کی پُشت سے ٹکا کر بے حس و حرکت ہو گیا۔ اُس کا نشہ ختم ہو چکا تھا۔ صرف آنکھوں پر نشے کا ہلکا سا پاؤ رہ گیا تھا۔ سوچا کل سے پینا پلانا چھوڑ دے گا۔ چھ بجے آفس سے سیدھا گھر آ جائے گا۔ خطرہ مول لینا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

اب خیال آیا کہ بیوی کہاں ہے۔ دوسرے کمرے میں شاید سو رہی ہو۔ اُسے ڈر لگا کہ کہیں اسی وقت وہ آ نہ جائے اور اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات دیکھ نہ لے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے لگا۔ کچھ دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔

پھر اپنا اس طرح بیٹھنا اُسے کھلنے لگا۔ سوچا اب کیا کرے۔ لیکن کوئی بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔

وہ اُٹھا اور کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک بند کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ مشکل سے دس بجے ہوں گے لیکن سڑک سنسان ہو گئی ہے۔ چاروں طرف سنّاٹا پھیل گیا ہے۔ بہت کم لوگ آ جا رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں ایک دو رکشوں کے گزرنے کے علاوہ سڑک پر زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ لیمپ پوسٹ کی بتیاں بجھ گئی ہیں جس سے اندھیرا اور گہرا ہو گیا ہے۔ چلنے والے لوگ سایوں کی طرح لگ رہے ہیں۔۔۔ حالانکہ یہ بات اُسے بعد میں بڑی فضول لگی لیکن خیال آیا کہ اگر کھڑکی سے کوئی اندر بم پھینک دے تو؟ اُس کا پورا جسم ایک دھماکے کے ساتھ اُڑ جائے گا۔ اُسکی بیوی پر کیا گزرے گی۔ وہ اکیلی چیخے گی چلّائے گی۔ پڑوس کے لوگ ڈر کر اپنے دروازے بند کر لیں گے۔

اُس نے کانپ کر کھڑکی بند کر دی۔ اُس کے ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ وہ اپنے اندر ہمت کو یکجا کرنے لگا۔ اتنا ڈرنے سے تو مر جانا اچھا۔ مر ہی جائے گا تو کیا ہو جائے گا؟ روز ہی تو کوئی نہ کوئی مر رہا ہے۔ کیا ہو جائے گا؟

کھڑکی کے بند ہونے سے باہر کی آوازیں گم ہو گئیں۔ اور کمرے کا سنّاٹا اور زیادہ بڑھ گیا۔ پڑوس سے کسی قسم کی بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر کیا بات ہے؟ لوگ "پاڑھا" چھوڑ کر چلے تو نہیں گئے؟ سارے مکان خالی ہو گئے کیا؟ وہ اور خوف زدہ ہو گیا۔ اُسے لگا کہ اس پورے "پاڑے" میں وہ اکیلا رہ گیا ہے۔

سنّاٹے کو توڑنے کے خیال سے وہ ٹیبل پر پڑی کتابوں کو جھاڑنے پونچھنے لگا۔ کتابوں کو چار پانچ بار زور سے پٹکا۔ ان آوازوں سے وہ خوش ہوا۔

آوازوں سے اُسکی بیوی کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ بغل کے کمرے سے اُس کے پاس آئی۔ اُسے اپنی بیوی کے پاس آ کر کھڑے رہنے کی آہٹ ملی لیکن اُس نے اُس پر کوئی توجہ نہ دی۔ لاتعلقی سے پہلے ہی کی طرح کتابوں کو جھٹکتا اور صاف کرتا رہا۔ اُس کی بیوی کچھ بولی نہیں۔ وہ اُسے دیکھتی رہی۔ اُس نے سوچا کہ اُس کی بیوی اُس کے اس کام سے متحیر ہو رہی ہو گی کیونکہ

اس نے پہلے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ اُس نے بیوی کی طرف پیٹھ کر دی اور کتاب کو یوں کھول لیا۔ جیسے پڑھ رہا ہو۔

تھوڑی دیر تک کتاب کو الٹنے پلٹنے کے بعد رکھ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا جھینپ مٹانے کے لئے بولا کہ سب کتابیں خراب ہو گئی تھیں۔ اُس کی بیوی نے کہا کہ ابھی تو صاف کی تھیں گندی کیسے ہو گئیں؟

وہ چونکا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ بیوی کی طرف کنکھیوں سے وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں بیوی کو اس کے خوفزدہ ہونے کا علم نہ ہو جائے۔

کچھ دیر بے کار سا کھڑا رہنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بیوی کی طرف دیکھنے کے بجائے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بیوی نے کہا کہ کم از کم جوتے تو کھول دیتے۔ اُسے اُسکی آواز میں طنز محسوس ہوا۔

وہ گھبرا گیا۔ کوئی بہانا نہ سوجھا کہ کس وجہ سے جوتا نہیں کھول پایا۔ وہ چُپ رہا اور جوتے کھولنے لگا۔ اُن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ جوتے نکال کر پیروں کو تولیے سے اچھی طرح پونچھا۔ انگلیوں کے بیچ میں میل بھر گیا تھا۔

اُس نے بیوی پر رعب جمانے کے خیال سے ڈانٹ کر پوچھا کہ بنیائن کہاں ہے؟ اور چور نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ خاص کر اُسکی آنکھوں کو۔ آنکھیں ملیں تو وہ جھینپ گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اُسکی حرکت خود اُسے بُری لگی۔ جس چیز کو وہ بیوی سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا، وہ خوف اسکی ہر حرکت سے اُس پر آشکارا ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے چہرے کو بے وجہ پونچھا اور پھر اپنی تھوڑی سہلانے لگا۔

بیوی نے بنیائن دیدی۔ وہ جلدی سے پہننے کی بجائے اُسے ——— آہستہ آہستہ پہننے لگا کچھ دیر تک وہ اپنے چہرے کو بنیائن کی اوٹ میں چھپا رہا جیسے اُسے پہننے میں دقت ہو رہی ہو۔

پھر کچھ سوچ کر اُس نے بنیائن نکال دی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کسے ایک چادر رکھتا ہوا بولا "غسل خانے تک ہو آتا ہوں۔"

وہ جلدی سے غسل خانے میں چلا گیا۔ بیوی وہیں بیٹھی رہی غسل خانے میں وہ اپنے آپ کو ٹھیک کرنے لگا تا کہ جب وہ باہر نکلے تو بالکل بدلا ہوا نظر آئے۔ بیوی کو کسی بات کا پتہ نہ چلے پھر سوچنے لگا کہ آخر کون سی ایسی بات ہو گئی ہے جو وہ اتنا ڈرنے لگا ہے۔ اس شہر اور خصوصاً اس "پاڑے" میں یہ باتیں تو بالکل عام تھیں۔ یہ بہت معمولی باتیں سمجھی جانے لگی ہیں اور دوسروں کے ساتھ بھی ہوتی ہیں۔ پھر اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے!

وہ غسل خانے سے باہر آیا۔ بیوی اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اب ٹھیک ہے۔

بیوی نے پوچھا کہ کھانا لگا دوں اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بیوی باورچی خانے میں جانے لگی تو اُس نے اُسے پیچھے سے غور کر دیکھا۔ اسکی چال بھدی تھی۔ وہ کافی پھیل گئی ہے۔ یکایک اتنی بدل گئی ہے کہ پہچاننا مشکل ہے۔ سوچا عورتیں بہت جلد ڈھل جاتی ہیں۔ پھر اطمینان کی سانس لی کہ جی چھوٹا۔ جب دیکھو سر پر سوار رہتی ہے۔ پرائی محل کا کوئی خیال نہیں رکھتی۔ اُس نے سانس کو زور سے پھیپھڑوں میں بھرا پھر فضا میں چھوڑ دیا۔ اس عمل سے تھوڑی دیر تک ہانپتا رہا۔

وہ کھانا کھا رہا تھا اور بیوی اُس کے ٹھیک سامنے بیٹھی اطمینان سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ بیوی کا اس طرح دیکھنا اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سر کو ضرورت سے کچھ زیادہ جھکائے تھا اور چاہتے ہوئے بھی اُسے اُوپر نہیں اُٹھا پا رہا تھا۔

بیوی نے حسب معمول کہا یہ "پاڑا" ٹھیک نہیں ہے۔ اتنی رات گئے کہاں گھومتے رہتے ہو۔ کبھی کچھ ہو گیا تو؟۔

وہ چونکا اور بیوی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُس کے باطن میں چھپا ہوا خوف اچانک چہرے پر اُبھر آیا۔ اُسے اُن غنڈوں اور اپنی بیوی میں بڑی مماثلت معلوم ہوئی۔ وہ بھی تو یہی کہتے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے کھانا ترک کر کے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسکی نظروں میں بڑی بے بسی تھی۔

بیوی نے کرسی آگے کو کھینچی اور کچھ جھک کر بولی۔ پڑوس کے شرما کی گھڑی اور دو سو روپئے چھین لیے گئے ہیں۔ ان کے پیٹ پر چھرا دکھا دیا گیا تھا۔ کسی طرح جان بچائی۔ اگر انھیں کچھ ہو جاتا تو ان کے بیوی بچوں کا کیا ہوتا؟ چھ بچے ہیں چھ!

اُس نے دیکھا کہ بیوی کے چہرے پر خوف کے بادل چھا گئے ہیں۔

اُس نے اُس قدر گھبرے پر اس قدر خوف کے آثار پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ جس خوف سے نجات پا گیا تھا اس نے اُس پر پھر قبضہ جما لیا۔

بیوی کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تھوڑی دیر قبل تین چار آدمی آئے اور دروازے کو پیٹنے لگے۔ تھوڑی دیر تو میں خاموش رہی لیکن جب وہ نہ مانے تو دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرے میں گھس آئے۔

"تم نے روکا نہیں" وہ چیخ پڑا۔

"روکا تو تھا مگر وہ مانے نہیں کہنے لگے "بم بنانے کے لئے پچیس پچیس روپیہ چندہ جمع کیا جا رہا ہے۔ پاڑے کے سب لوگوں نے دیدیا ہے۔ آپ بھی دیجئے۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اس طرح وہ اپنے خوف کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تک ٹہلنے کے بعد رُک کر پوچھا "تو تم نے کیا جواب دیا" اُس نے محسوس کیا کہ اُسکی آواز کانپ رہی ہے۔

"میں کیا کہتی؟ کہہ دیا کہ بابو موجود نہیں ہیں۔ صبح آکر لے لینا۔"

"تم واہیات عورت ہو۔ سالوں کو جھاڑو سے مارنا چاہیئے تھا۔ کل آئے تو بتاؤں گا اُن کو۔ ــــــ پوجا کا چندہ، بم بنانے کا چندہ، خون کرنے کا چندہ، شراب پینے کا چندہ.... چندہ..... چندہ... عجب تماشا ہے" وہ بڑے ڈرامائی انداز میں بولتا رہا تھا۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ پتہ نہیں ڈر کی وجہ سے یا غصے کی وجہ سے۔

بیوی نے کہا "آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟ وہ دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ کل نہ ملا تو اچھا نہ ہو گا۔ بابو کو سمجھا دینا۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔"

"سالے آوارہ، لوفر۔ کل ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ آئے بڑے لاٹ صاحب کے بچے" وہ مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کا خوف کم ہو گیا تھا۔

بیوی نے کہا "ہاتھ تو دھو لو" تو وہ چونک کر اُٹھا۔ نل پر ہاتھ دھو کر کرسی پر آ بیٹھا۔

باہر گلی میں بم پھٹنے کا زور دار دھماکہ ہوا اور اُسکی تیز آواز دور دور تک پھیل گئی۔ تھوڑی دیر تک سناٹا رہا پھر آس پاس کے مکانوں سے لوگوں کی خوفزدہ آوازیں آنے لگیں۔ وہ دونوں کھڑکی تک گئے۔ کھڑکی سے اُنہوں نے جھانکا۔ باہر سے لوگوں کے دوڑنے کی اور چیخ پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دونوں دیر تک یونہی خوف زدہ کھڑے رہے۔

وہ کھڑکی کے پاس آیا اور بیوی کے منع کرنے پر بھی بولٹ کھول کر ایک پٹ کو بڑی آہستگی سے تھوڑا سا وا کیا۔ باہر گہرا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ کچھ پرچھائیاں اِدھر اُدھر دوڑتی نظر آ رہی تھیں۔ پان والا اپنی دکان جلدی جلدی بند کر رہا تھا وہ سوڈے کی بوتلوں کو سمیٹ رہا تھا اور انہیں چھپا رہا تھا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور دو بوتلیں لے کر بھاگ گیا۔ پان والا چلاتا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر پر بوتلوں کے پھوٹنے کی آواز آئی اور پھر چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک آدمی رکشہ پر سوار آ رہا تھا۔ وہ رکشے سے کود کر تیزی سے بھاگا۔ رکشہ والا بھی بول کر لئے چلا رہا تھا اور کوئی کہہ رہا تھا "بھاگ سالے ورنہ ایک آدھ بم لگے گا اور ڈھیر ہو جائے گا"

اُس نے ڈر کر کھڑکی بند کر لی۔ بیوی اُس کی پشت سے سہارا لیے کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ بُری طرح خوفزدہ ہیں۔ بیوی نے کہا کہ یہ "پاڑہ" اچھا نہیں ہے کسی دوسرے "پاڑے" میں گھر تلاش کرنا چاہیئے۔

اُسے غصہ آ گیا "کلکتے کے ہر پاڑے کی یہی حالت ہے کہاں تلاش کریں؟"

بیوی بستر پر لیٹ گئی۔ اُس کی ساڑی بے ترتیب تھی اور موٹی موٹی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ اُسے گھن سی آ گئی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

بیوی کہہ رہی تھی "چار ہزار روپے پگڑی کے لگ گئے اور کرایہ بھی دو سو روپے ہیں۔ پھر بھی گھر ایسا ملا۔ اگر یہ سب پہلے جانتی تو تم کو کبھی یہ فلیٹ نہ لینے دیتی۔ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ پڑوسی بھی ایسے ہی لوگ ہیں۔ جنگلی اور غیر مہذب۔"

وہ باتھ روم گیا اور واپس آ گیا۔ بیوی بستر سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اُسے کھانے کی خواہش ہو رہی تھی نہ بیٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

جاکر بستر پر لیٹ گیا۔ جسم کی ساری نسیں بول گئی تھیں۔ پیٹھ میں درد تھا۔ باہر سے اب بھی شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیوی اُس کی بغل میں بیٹھی پیٹھ سہلانے لگی۔ پوچھا "درد کیسا ہے؟" اُس نے کہہ دیا "پہلے سے کچھ ٹھیک"۔

بیوی نے بڑے پیار سے کہا "تم نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا"۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تبھی دروازے پر دو تین دستکیں ہوئیں۔ دونوں ڈر گئے۔ بات چیت بند کرکے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سانس بھی بہت آہستہ آہستہ لے رہے تھے۔ بیوی اُس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ اُس کے پسینے کی بو سے اُبکائی سی آگئی۔ "کتنی پھوہڑ ہے" اُس نے سوچا "ٹھیک سے نہاتی بھی نہیں"۔ جی میں آیا کہ دھکا دے کر پلنگ سے نیچے پھینک دے۔ لیکن اُس نے منھ پھیر لیا اور منھ پر چادر ڈال لی۔ بیوی بھی اُس سے چپٹ کر سو گئی۔

اس بار کسی نے دروازے کو زور سے پیٹا اور اُسے آواز دی۔

بیوی نے کہا "کہیں وہ لوگ تو پھر نہیں آگئے۔ دیکھ تو لو ورنہ نہ جانے کب تک اسی طرح دروازہ پیٹتے رہیں گے"۔

وہ ڈرتے ڈرتے دروازے کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ دروازہ پھر پیٹا گیا اور پڑوسی کھنہ کی آواز آئی۔ اُس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ بولا "نیند آگئی تھی"۔

"ایک بات بتانے کے لیے آپ کو پریشان کیا" کھنہ نے کہا "ہرنند مر گیا۔ چھرا پیٹ میں گہرائی تک اُتر گیا تھا۔ اس واردات کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ دو ایک دن میں گڑبڑ ہو۔ سنبھل کر باہر نکلنا چاہیے۔ اگر ممکن ہوسکے تو ہفتہ دو ہفتہ کے لیے کہیں ہٹ جانا ہی مناسب ہوگا۔ پتہ نہیں کیا ہو۔ آپکی تو فیملی بھی ہے۔" پھر کھنہ چلا گیا۔

وہ کچھ دیر تک دروازے میں کھڑا اندھیرے میں ڈوبی سیڑھیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں کا اسی طرح گم ہونا ڈراونا لگا۔ اسکا جسم کانپ اٹھا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ [illegible] اس نے دروازہ تیزی سے بند کر دیا۔ جسم [illegible] شرابور [illegible]۔ وہ تیزی سے آکر پلنگ پر لیٹ گیا۔

بیوی نے اس کے جذبات کو بھانپ لیا۔ ڈری ہوئی آواز میں بولی "کھنہ صاحب کیا کہہ رہے تھے؟"

اُس نے اپنی آواز کو متوازن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "ہرنند مر گیا۔ یہی بتلانے آئے تھے"۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔

بیوی نے خوف اور حیرت سے کہا "مر گیا؟"

پھر دونوں چپ ہو گئے۔ جیسے کسی نے اُن کے منہ بند کر دیے ہوں۔ بیوی اُسکے سینے پر سر رکھ کر انگلیوں سے اُس کے کالے گھنے بالوں کو سہلانے لگی۔

اُس نے بیوی سے کہا "ٹھیک سے سو جاؤ۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔

بیوی پر اُسکی بات کا کوئی ردعمل نہ ہوا۔ وہ اُسکے جسم سے اور چمٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسکے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی بیوی کی پیٹھ پر اپنے آپ چلنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کو سہلاتے جا رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اس حرکت سے اُن کے حالات میں کوئی تبدیلی نمایاں ہوگی۔

بیوی نے دھیرے سے پوچھا "بتی بجھا دوں؟" اُسکی آواز کانپ رہی تھی۔ آواز کی یہ کپکپاہٹ خوف سے زیادہ جذباتی ہلچل کا نتیجہ تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اٹھی اور لائٹ آف کر دی۔ اُسے بیوی پر غصہ آرہا تھا کہ اُسے وقت اور موقع کا کوئی احساس ہی نہیں رہتا۔

کمرہ اندھیرے سے بھر گیا۔ بیوی دوڑتی ہوئی آئی اور دھڑام سے پلنگ پر گر گئی۔ اُس نے پوچھا "ڈرنے کی کیا بات ہے" بیوی نے جواب دیا "مجھے بہت ڈر لگتا ہے"۔ اُسکے ہونٹ بیوی کی پیشانی پر ٹک گئے۔

بیوی نڈھال سی خود سپردگی کے عالم میں تھی اور اب اسکے جذبات میں بھی ہلچل مچ گئی تھی۔ اُسی وقت ایک اور زور کا دھماکہ ہوا۔ یہ انکے مکان کے عین سامنے ہوا تھا۔ ایسا لگا کہ ان کے مکان کی ایک ایک اینٹ ہل گئی ہے۔ وہ دونوں جھٹکے سے الگ ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اُنھیں زبردستی کھینچ کر الگ کر دیا گیا ہے۔ لگاتار تین اور بم پھٹے۔ ان کی آوازوں سے [illegible] بدل گیا۔ چاروں طرف بارود کی بو پھیل گئی۔ اور دھوئیں سے پوری گلی بھر گئی۔ تھوڑی دیر بعد آس پاس کے مکانوں سے خوفزدہ لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ خوف اور تکان سے ہانپ رہے تھے۔ اُنکے جسم پسینے میں شرابور تھے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ باہر ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ کوئی چلا رہا تھا "مر گیا، مر گیا..."

وہ دونوں الگ الگ ہوئے تھے۔ اُنکے بیچ کا لگاؤ ختم ہو گیا تھا۔ پورا پاڑا ایک بھیانک سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔

■■

سونا ہی سونا

زمین بھرپور فصل دیتی ہے ... کسان کہتا ہے "دھرتی سونا اُگلتی ہے"

اب ملک کے اکثر حصوں میں فصلیں لہلہاتی ہیں ....
قحط کے لئے مشہور چند علاقے بھی آج ہرے بھرے ہو گئے ہیں ... ہر طرف سنہری بالوں کے انبار لگے ہیں .....
مٹی سونا بن گئی ہے
اچھی فصل کی وجہ کچھ یہ بھی ... بہتر بیج، زیادہ کھاد،

زیادہ پمپ یا کھیتی باڑی کے بہتر طریقے ....
حقیقت یہ ہے کہ دو برس کی خشک سالی کے بعد ہم نے اتنا اناج پیدا کیا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا
اسے سبز انقلاب کہئے یا کچھ اور ... گزشتہ برس ملک میں دس کروڑ ٹن سے زائد اناج پیدا ہوا ... 1966 سے دگنا
ہم آگے بڑھ رہے ہیں ... سائنس کی مدد سے ....

شاہد حسن

روشنی کا خنجر

انجنا نے اُسے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ منجو کہہ رہی تھی۔

"گگن دا۔ یہ ہے میری سہیلی انجنا۔ آپ سے نفرت کرتی ہے۔ کہہ رہی تھی ایسے لوگوں سے تو بھیڑیئے اچھے!"

"کیوں جی! کیا میں اتنا بُرا ہوں؟" وہ بالوں سے ڈھکے ہوئے اپنے مضبوط ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کالا ضرور ہوں لیکن اب اتنا بھی نہیں کہ....."

"نہیں دادا۔ یہ جھوٹ بولتی ہے۔" انجنا شرم سے سُرخ پڑ گئی اور بات کاٹتے ہوئے آہستہ سے بولی

"میں نے تو اس غنڈے کے بارے میں کہا تھا جو کچھ لوگوں کو بہکا کر شریف آدمیوں کی زمین جائداد چھینتا ہے۔"

"تب تو منجو ٹھیک ہی کہتی ہے! وہ غنڈہ تو میں ہی ہوں" اُس نے ہنستے ہوئے کہا

"یقین نہیں آتا" وہ لجاجت سے بولی

"کیوں؟"

"وہ تو بڑا سفّاک سا چہرہ ہے۔ بے رحم آنکھیں وحشت سے بھری ہوئی۔ موٹے بھدّے ظالم ہاتھ لیکن آپ....." اس نے گگن کے پُرکشش سراپا پر نظر ڈالی۔

"آپ کو دیکھ کر کون یقین کرے گا کہ ایسی تشدد پسند تحریک کا روحِ رواں اتنا سندر....." وہ پھر جھینپ گئی۔ ایک نازک اندام حسینہ سے اپنی تعریف سن کر گگن شرما سا گیا۔

مسکراتے ہوئے بولا

"انجنا! تم نے جم کاربٹ کا نام سُنا ہے؟ اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بہت اچھا خیال ہے۔ وہ تو انسانیت کا ہمدرد تھا اپنی جان پر کھیل کر نہ جانے کتنے لوگوں کی جان بچائی۔"

"لیکن وہ بھی تو بڑے خوبصورت شیروں کو اپنا شکار بناتا تھا۔"

"ہاں! لیکن صرف انھیں درندوں کو جو آدم خور ہوتے تھے۔" وہ بحث کے موڈ میں آگئی۔

"تو میں بھی جم کاربٹ ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اُن درندوں کا شکاری ہوں جو انسانوں کی شکل میں ہوتے ہوئے بھی انسانوں کا خون پیتے ہیں۔"

انجنا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ باہر کسی کار کے رکنے کی آواز آئی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ کوئی آرہا ہے۔ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔"

اور وہ خاموشی سے پیچھے کے دروازے سے نکل گیا

انجنا کی نگاہیں دور تک اس کے سائے کا تعاقب کرتی رہیں۔

منجو کے گھر سے لوٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

"کتنا عجیب ہے یہ گگن بھی۔! اچھی بھلی شخصیت کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ کتنے پُرکشش خدوخال، چوڑا سینہ، مضبوط جسم،

سلونی رنگت، بڑی بڑی، گہری گہری سوچتی ہوئی آنکھیں۔
—— اور ان آنکھوں میں ......" وہ شرما گئی۔ گالوں پر
آپ ہی آپ گلاب سے کھلتے چلے گئے۔
"کیا ان آنکھوں میں میرے لئے واقعی کچھ تھا یا یہ صرف
میری خوش فہمی ہے۔ پھر میری کلائیوں پر اس کی نظریں بار بار
کیوں پڑ رہی تھیں؟
اس نے اپنی گوری گوری سڈول کلائیوں کو دیکھا۔
اس کے ہاتھ واقعی بہت پرکشش تھے۔ گول گول گداز کلائیاں
لمبی نازک مخروطی انگلیاں، چمکتے ہوئے لمبے ناخن۔ ان
سب پر سے نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ گگن ان ہاتھوں
سے کتنا متاثر ہوا تھا اس کا ٹھیک اندازہ تو انجنا کو نہ تھا۔ ہاں
اس نے یہ ضرور محسوس کیا تھا کہ ان ہاتھوں سے نظریں ہٹانے
میں گگن کو خاصی کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔
"گگن! تجھے یہ ہاتھ اتنے ہی پسند ہیں تو انہیں تھام
کیوں نہیں لیتا؟ کیوں سر پھر گیا ہے۔ تیرا۔ کیا ملتا ہے تجھے
ان چوروں، ڈاکوؤں کی سرداری میں؟ ہر دم پولیس کا خوف،
قانون کے آہنی پنجوں سے فرار کی کوشش، موت کے منڈلاتے
سائے!" انہی خیالوں میں وہ کھوئی ہوئی جیسے ہی اپنے
گھر میں داخل ہوئی اس کی چار سال کی ننھی منی بہن اس
سے لپٹ گئی۔

دیدی! دیدی! امار (ہمارا) نام، تمار نام، ویت
نام۔ امار باڑی (گھر)، تمار باڑی نکسل باڑی"
"یہ سب کہاں سیکھا رے تو نے؟" وہ اسے لپٹاتے ہوئے
ہنس دی
"دیدی! ابھی لال جھنڈے کا ایک جلوس نکلا تھا۔
وہی لوگ گان کر رہے تھے۔"
"اچھا!!" اس نے بے بی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
سوچا "شاید پنڈت نہرو نے سچ کہا ہے کہ کلکتہ جلوسوں کا شہر
ہے۔"

وقت آہستہ روی سے گذر رہا تھا جیسے یہ وقت نہ
ہو یادوں کے گرد و غبار کا ایک انبوہ ہو جس میں انجنا کے
سارے نظریات دھندلا کر رہ گئے ہوں۔ انہی دھندلکوں
میں گگن کا چہرہ ڈوبتا ابھرتا رہتا۔
"گگن!" انجنا کے لبوں سے ایک سرد آہ سی نکلی۔ ابھی
کل چھ ماہ ہی تو ہوئے تھے جب وہ اس سے پہلی بار ملی تھی
لیکن اس عرصہ میں وہ کتنی بدل گئی تھی مگر کیا! ...... واقعی
اس میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ سب کچھ تو وہی تھا —— وہی
خوبصورت سا اس کا سجا سجایا کمرہ، شیلف میں سلیقہ سے
ترتیب دی ہوئی کتابیں —— الماری میں نئے فیشن کی قیمتی
ساڑیاں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر لیکمے اور میکس فیکٹر کے سنگار و آرائش
کے سامان، وہی سرو جیسا اس کا سراپا، وہی خوابیدہ آنکھیں،
وہی گلابی رنگت، وہی گھٹاؤں جیسے بال، وہی نازک سی
کلائی میں فیور لیوبا اور وہی خوبصورت ہاتھ جنہیں اپنے مضبوط
ہاتھوں میں تھامے گگن ایک دن کہہ رہا تھا۔
"انجو! ...... کتنی سندر ہیں یہ کلائیاں۔ میں نے زندگی
میں پہلی بار ایسے ہاتھ دیکھے ہیں۔" اس نے اپنی بند آنکھیں اس
پر جھکا دیں اور وہ لاجونتی کی طرح سمٹ گئی۔
"اچھا! وہ آہستہ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے مصنوعی حیرت
سے بولی
"شاید تم نے سمجھا تھا کہ لڑکیوں کے ہاتھ بھی تمہارے ڈاکوؤں
کی طرح بہت سخت، کھردرے اور بھدے ہوں گے۔"
"انجو!" وہ اداس ہو گیا۔
"تم ہم لوگوں کو ڈاکو سمجھتی ہو؟ ابھی تم بہت ناسمجھ ہو۔
ایک لڑکی جس کا باپ مشہور ڈاکٹر ہو، جو شہر کے فیشن ایبل
علاقہ میں رہتی ہو، جس نے کانونٹ کی تعلیم پائی ہو اور جس
کی زندگی میں کبھی کوئی حادثہ نہ پیش آیا ہو وہ ہم لوگوں کو
سمجھ بھی کیسے سکتی ہے؟"

"حادثہ! کاش تمہیں معلوم ہوتا گگن کہ جو کچھ ہوا وہ حادثہ نہیں تھا…" گگن نگیتا: اس نے اپنے دل میں کہا اور گگن جذبات سے مغلوب آواز میں کہے جارہا تھا۔

"تمہیں کیا معلوم کہ دن بھر کھیتوں میں کام کرنے کے بعد جب ہاتھوں میں صرف دو ٹکہ آتا ہے جس سے ایک کیلو چاول بھی مشکل سے ملتا ہے اور جسے کھانے کے لئے کئی منہ ہوتے ہیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ نہ اپنی کوئی زمین نہ اپنا کوئی ٹھکانہ۔ ادھر اُدھر سے چند تنکے گھاس پھوس جمع کرکے چھوٹا سا ایک گھونسلا بنا بھی لیا تو اس میں بارش کا ڈر، آندھی کا خوف اور بھیڑیوں کا ظلم۔ دوسری طرف عالیشان کوٹھیاں، چمکتی کاریں اور ہزاروں بیگھہ زمین جس پر ان کا حق ہے جنہیں اس زمین کی مٹی سے بدبو آتی ہے جنھوں نے کبھی اُسے چھوا تک نہیں، شاید دیکھا بھی نہیں! کون ظالم ہے انجو؟ کون ڈاکو ہے؟ وہ جن کے آباؤ اجداد نے اپنے خون آشام پنجوں کی طاقت سے ان کبوتروں کا خون چوس چوس کر ان کو اتنا کمزور کر دیا کہ ان میں فریاد کرنے کی بھی سکت نہیں رہی یا یہ جو اب اپنا حق لینا چاہتے ہیں۔ کیا حق ہے ایک انسان کو اپنے گوداموں میں غلہ جمع کرنے کا جب غلہ پیدا کرنے والے ہاتھ بھوک سے کمزور ہو رہے ہوں .... وقت بدل گیا ہے مس انجو! ...... رات کی تاریکیوں میں بہت سے خداؤں نے جنم لیا تھا جن میں کچھ زمیندار تھے، کچھ جاگیردار' کچھ نواب تو کچھ راجہ۔ اب دن کا اُجالا پھیلنے والا ہے۔ ان خود ساختہ خداؤں کو ہم چور چور کردیں گے۔ اگر ہمیں بندوق اٹھانی پڑے گی تو ہم اٹھائیں گے، بم بنائیں گے، گولے برسائیں گے، ماریں گے مریں گے — اپنے لئے' اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے۔

انجنا گگن کی طرف دیکھ کر خائف ہوگئی تھی۔ کتنا عزم تھا ان آنکھوں میں....... وہ سحر زدہ سی رہ گئی تھی۔ اس نے اپنے نظریات کی بنیادیں ہلتی ہوئی محسوس کی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہر طرف ایک گہرا دھندسا چھا گیا تھا جس میں ساری منزلیں، سارے راستے گم ہوگئے تھے۔

"شاید گگن ٹھیک ہی کہتا ہے ..... لیکن شاید یہ سب جھوٹ ہے..... سب جھوٹ..... سچ کیا ہے؟ کون جانے — کوئی رہبر نہیں، کوئی خضر نہیں۔ ایک گگن تھا جو قانون کو کچھ نہیں سمجھتا تھا لیکن جسے قانون بہت کچھ سمجھتا تھا اور اب وہ ...... جیل میں تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ہے بھگوان! اُس کی رکھشا کرنا!"

پوجا کی چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔ اس کی سہیلی گیتا بنارس سے آنے والی تھی۔ گاڑی آنے میں ڈیڑھ گھنٹے باقی تھے۔ انجنا اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔

"میں بھی کتنی جلد باز ہوں! اگر چائے پی کر آتی تو کیا مصیبت آجاتی! یہی نا کہ اگر گاڑی ٹھیک وقت پر آجاتی تو گیتا کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑتا لیکن آج کل گاڑیاں ٹھیک وقت پر آتی ہی کب ہیں!"

اُس کا موڈ بہت خراب ہوگیا تھا۔ کئی دن سے ٹھیک سے سو بھی نہ سکی تھی۔ چہرے سے تھکن صاف ظاہر تھی۔ گاڑی سات بجے صبح آتی تھی۔ جلدی میں وہ بغیر ناشتہ کیے گھر سے نکل پڑی تھی اسٹیشن پر آکر اُسے معلوم ہوا کہ ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے۔ اس نے صبح کا اخبار خریدا اور وقت گزارنے کے لئے پاس ہی ٹی اسٹال پر چائے پینے چلی گئی۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی اُسے اُبکائی سی آگئی۔ اتنی بدمزہ چائے اس نے زندگی میں پہلی بار چکھی تھی۔ جلدی سے اس نے چار آنے پیسے دوکاندار کی طرف پھینکے اور ابھی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھی تھی کہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک نوجوان تیزی سے اس پیالی پر جھپٹا اور دو ہی گھونٹ میں وہ جھوٹی چائے اس کے حلق کے نیچے اتر چکی تھی۔

"ماں! بھگوان تیرا بھلا کرے۔" وہ سلام کرکے اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ انجنا کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہے بھگوان! یہ ہمارے دیش کا حال ہے؟ ہمارا بھارت؟
وہ پاس ہی دکھی بنچ پر بیٹھ گئی۔۔۔ پڑھنے کے
لئے اس نے اخبار کھولا۔ وہی روز جیسی سرخیاں، لوٹ مار، بدامنی،
ہڑتال، ہنگامے، انتشار۔ اس نے اکتا کر اخبار ایک طرف سرکا دیا اور
بے مقصد ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کی نظر کچھ دور پر کھڑے ہوئے
ایک مدقوق سے شخص پر پڑی جو آئس کریم کھا رہا تھا۔ دو سات آٹھ
سال کے بچے ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے
آئس کریم کا خالی کارٹن پھینکا اور دونوں بچے تیزی سے اس پر
جھپٹے۔ کارٹن پھٹ چکا تھا اور دونوں ایک ایک ٹکڑا لئے اپنی
ننھی ننھی زبانوں سے اسے چاٹ رہے تھے۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔
اور اس کی گلابی ساڑی پر آنسوؤں کے قطرے چمکنے لگے۔ پرس
سے رومال نکال کر اس نے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ پاس ہی
لگے ہوئے نل سے منہ دھویا اور پھر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگی۔ اس کے
اندر اس وقت آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا اب تک میں اندھی تھی جو ایک بار
بھی ان واقعات کو نہ دیکھ سکی؟"

یکایک اسٹیشن پر طوفان سا آ گیا۔ انسانوں کا ہجوم ہر
طرف دیوانہ وار بھاگنے لگا۔ اس کے قدم بھی تیزی سے ٹرین کی طرف
بڑھے اور نگاہیں ہر ڈبہ کا جائزہ لینے لگیں۔ ایک فرسٹ کلاس
کمپارٹمنٹ میں ہلکے سبز رنگ کی ساڑی پہنے گیتا کھڑی مسکرا
رہی تھی۔ انجنا کے ہونٹوں پر بھی ایک بے جان سی مسکراہٹ دوڑ
گئی اور پھر دونوں فرط جذبات میں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

گیتا کے آ جانے سے اس کی طبیعت کافی بہل گئی تھی۔ دونوں
ساتھ ساتھ سیر کو جاتیں اور پوجا دیکھتیں۔ پورے شہر میں ایک نئی
زندگی اور نئی اُمنگ کا احساس ہوتا۔ زندگی کے اس شور و ہنگامے
میں وہ بہت حد تک اپنے پریشان کن خیالات سے چھٹکارا
پا چکی تھی لیکن اب بھی جب وہ اپنی کار میں گیتا کے ساتھ شہر کی
گنجان سڑکوں پر ہوتی اور تیز رفتار بسوں، ڈبل ڈیکر اور ٹراموں
کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر رکشوں میں جُتے انسان منوں بھاری

وجود کو کھینچتے ہوئے نظر آتے تو اسے ایک جھٹکا سا لگتا اور اکثر
رات کی تنہائی میں یادوں کے جھروکوں سے مختلف چہرے نظر آتا اور
پھر اس چہرے کے ساتھ بہت سے اور چہرے دکھائی دیتے۔
آئس کریم کے خالی کارٹن پر جھپٹتے ہوئے بچوں کے چہرے، جھوٹی
چائے پیتے ہوئے جوانوں کے چہرے، ایک پیسے ہوئے جوانوں
کے چہرے، ایک پیسے اور ایک روٹی کا سوال کرتے ہوئے
چہرے۔۔۔ پھر ہاتھوں میں بند وقیں تھامے ہوئے دبلے
پتلے بھوکے انسانوں کا ہجوم۔

چھٹیاں ختم ہونے پر گیتا چلی گئی تو یہ چہرے ہر وقت ہی
اس کے ساتھ رہنے لگے اور ہر روز ان چہروں کی تعداد بڑھتی رہی۔
پھر ایک دن اس ہجوم میں ایک اور چہرہ بھی شامل ہو گیا۔ اس
چہرے پر بھوک نہ تھی، وحشت نہ تھی، افلاس نہ تھا۔۔۔ بہت
ہنستا مسکراتا شاداب سا چہرہ تھا لیکن اس پر عزم تھا، ہمدردی
تھی اور دکھ تھا۔ اس چہرے نے ان تمام لوگوں کی نیندیں حرام
کر دی تھیں جن کے پاس کھانے والے کم تھے مگر اناج زیادہ تھا۔
پہننے والے جسم کم تھے لیکن لباس بہت تھے۔ دیکھنے میں یہ چہرہ
لکشمی مائی کا تھا لیکن جانے کیوں کچھ لوگوں کو اس میں کالی مائی
کا روپ نظر آتا اور وہ کانپ اٹھتے۔

وہ ایک اندھیری رات تھی۔ آسمان پر کچھ تھکے تھکے سے تارے
ضرور چمک رہے تھے لیکن ان کی روشنی زمین پر آنے سے پہلے
ہی کہیں راستہ بھٹک جاتی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔
کسی نے دروازہ کھولا اور روشنی کا تیز خنجر اندھیرے کے سینے
میں پیوست ہو گیا۔

"کون ہو تم؟" آنے والے نے سوال کیا
"انجنا"
"کیا چاہیئے؟" لہجہ میں حیرت و حقارت تھی۔
"تیس ہزار روپے اور وہ سب زمینیں جو تمہاری

ضرورت سے زیادہ ہیں؟" اس کا پیر ٹھکانہ تھا۔

"اچھا! تو اب ڈاکوؤں نے اپنے گروہ میں سندر مکھڑے بھی شامل کر لئے ہیں؟" وہ بڑی حقارت سے ہنسا۔

"جا کے کہہ دینا اپنے سرداروں سے کہ منیش سندری اُن سے بھی بڑا ڈاکو ہے۔"

"وہ تو سب کو معلوم ہے منیش جی! ورنہ اس وقت میں یہاں نہ ہوتی ہماری مانگ تو آپ کو پوری کرنا ہی ہے۔"

اس کے ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا۔ منیش اسکے لئے تیار تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے انجنا کی کلائی پکڑ لی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا ہاتھ کانپا اور پھر دھائیں دھائیں کی دو آوازوں کے ساتھ منیش کی چیخ فضا میں گونج اٹھی۔ دوسرے پل فضا پر وہی سکوت پھر چھا گیا۔ انجنا کے ساتھی تیزی سے اندھیرے سے نکل کر مکان میں داخل ہو گئے اور چند منٹوں میں وہ ہزاروں روپے اور بہت سارے زیورات لے کر فرار ہو چکے تھے۔

دوسری صبح یہ خبر بستی بستی نگر نگر پھیل چکی تھی اور چند ہی دنوں بعد انجنا کا نام اس علاقہ کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اس تحریک میں کوئی عورت ابھی تک اس سرگرمی سے شریک نہیں ہوئی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ خود بھی اپنے آپ سے خوفزدہ ہو گئی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس میں ہمت اور اعتماد پیدا ہو چلا اور پھر یکے بعد دیگرے کئی موقعوں پر اس کی ہمت نے ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ پولیس بھی ششدر رہ گئی۔

حکومت کی نظروں میں اب وہ بہت خطرناک مجرمہ تھی لیکن قانون کے لمبے ہاتھوں کی گرفت میں ابھی تک نہ آسکی تھی۔ وہ چھپ چھپ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہی۔ اس کی زندگی خانہ بدوشوں کی زندگی سے بھی بدتر تھی ——— صبح کہیں شام کہیں۔ کبھی کسی ٹرین کے تیسرے درجے کی سخت سیٹیں اس کا بستر ہوتیں تو کبھی بیکراں آسمان کے نیچے زمین کا کچھ حصہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی خواب گاہ ہوتا۔ ڈنلپ پلو کا طلسمی گداز وہ بھول چکی تھی چہرے کی رنگت سنولانے لگی تھی ——— نسوانیت اور نزاکت کا حریری آنچل تار تار ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھی، بہت خوش۔ بکھا خوش ہو گا کتنی اس کے ان کارناموں کو سن کر! اس خیال ہی سے اُسے جھرجھری سی آجاتی۔ اگر قسمت نے کبھی اسے کنتی سے ملایا تو وہ فرطِ مسرت سے اسے ...... اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لے گا اور دیوانہ وار ان کلائیوں کو چومتے ہوئے ضرور کہے گا ———

"انجو! تیرے یہ ہاتھ مجھے ہمیشہ سے اچھے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ تیرے ہاتھ ایک دن بڑے بڑے کارنامے انجام دیں گے۔ میں بہت خوش ہوں انجو!" اور پھر ان ہاتھوں کو تھامے ہوئے وہ اسے ان وادیوں میں لے جائے گا جہاں مسرتوں کے پھول کھلتے ہیں، ارمانوں کے شگوفے چٹکتے ہیں، جہاں انسان کو پیٹ بھر کھانا اور تن بھر کپڑا نصیب ہے۔ انھیں وادیوں میں وہ دونوں اپنا ایک گھر بنائیں گے ——— چھوٹا سا خوبصورت سا گھر، جس میں لذت آگیں پریشانیاں ہوں گی، کچھ آرزوئیں! ان کے معصوم بچوں کے قہقہوں سے یہ گھر گنگناتا رہے گا اور یہ زندگی ہنستی مسکراتی آگے بڑھتی رہے گی ——— ان نرم و نازک معصوم خوابوں کی تعبیر اتنی جلدی سامنے آئے گی! انجنا نے سوچا بھی نہ تھا۔

صوبے کے سیاسی حالات تیزی سے بدلی۔ ایک سرکار سے دوسری اور دوسری سے تیسری سرکار بنی لیکن کسی بھی حکومت کو استقامت نصیب نہ ہوئی اور پھر صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ صدر راج نافذ ہونے کے چند ماہ بعد ضمنی انتخابات ہوئے جس میں بائیں بازو کی جماعتیں برسرِ اقتدار آئیں۔ کچھ ہی دنوں بعد سیاسی مصلحتوں کی بنا پر انجنا اور اس کے ساتھیوں کا وارنٹ گرفتاری منسوخ کر دیا گیا اور وہ آزاد ہو گئی۔ حکومت نے اعلان کر دیا کہ جلد ہی کنتی اور اس کے دوسرے ساتھی بھی رہا کر دیئے جائیں گے ——— آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جب کنتی واقعی رہا ہو گیا ———

انجنا اس دن بہت مسرور تھی جھیل کے دورواڑے پر بہت سے لوگوں کے ہجوم میں اپنی مسکراہٹوں کی کلیاں کھلائے گگن کھڑا تھا۔ وہ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار انجنا پر پڑ رہی تھیں ـــــ اور انجنا کے جسم میں رہ رہ کر لذت آگیں لہریں دوڑ جاتیں۔ دونوں بے چین تھے ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بہت کچھ کہنے اور بہت کچھ سننے کے لئے۔ لیکن اس دن تو صرف دوسروں کے منہ سے انجنا کی جرأت وہمت کے قصیدے سن سن کر وہ خوش ہوتا رہا اور کسی نے انھیں تنہائی کا موقع ہی نہ دیا۔ رات کے دس بجے تک وہ بہت مصروف رہے اور جب انجنا رخصت ہونے لگی تو گگن نے سرگوشی کی۔

" انجو! کل مجھ سے وکٹوریہ میموریل میں شام کے سات بجے مل سکتی ہو؟"

" اچھا" اس نے وعدہ کرنے کے انداز میں سر کو جنبش دی ـــ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہاں سے چلی گئی۔

شام کے سات بج رہے تھے۔ وکٹوریہ میموریل کے سرسبز لان میں روشنی کے ننھے ایک دم سے بیدار ہو گئے۔ لوگ تفریح کے موڈ میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے مختلف اقسام کی خوشبوئیں ہوا کے جھونکوں سے ہم آغوش اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔ انجنا ہر آرائش سے بے نیاز جوڑے باڈر کی سفید ساڑھی پہنے ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ سامنے کھیلتے ہوئے بچوں پر اس کی پیار بھری نظریں بار بار پڑ رہی تھیں۔ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا

" انجو!"

" گگن"

وہ ایک طرف کو سرک گئی۔ گگن اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس کی پیار بھری نظریں انجنا سے ٹکرائیں اور وہ ایک دم سے چونک پڑا۔

" کیا یہ وہی انجنا ہے؟ وہی انجو جس پر نظر پڑتے ہی دور تک ٹیلیا کے پھول کھلتے چلے جاتے اور پہروں وہ نازک جھکی جھکی سی لڑکیاں سامنے رہتیں جن سے اپنے حسن و شباب کا بوجھ بھی نہیں سنبھلتا...... لیکن اب......"

" گگن!" انجنا نے بیتابی سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے: " آخر بھگوان نے ہمیں ملا ہی دیا۔"

مسرت و جذبات سے بوجھل آنکھیں اس کے شانوں پر جھک گئیں۔

" ہاں انجو! آج میں بہت خوش ہوں...... بے حد خوش! یقین نہیں آتا کہ اس وقت وہی لڑکی میرے پاس بیٹھی ہے جو کبھی مجھے بھیڑیا سمجھتی تھی۔" وہ اس کے ہاتھوں سے کھیلتے ہوئے بولا

" ہاں گگن!" وہ مسکرادی " تب میں اندھیرے میں تھی۔ میرے خیالات غلط تھے۔ مجھے اپنے دل و دماغ کی قوت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں نے تو کبھی سپنوں میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ ایک دن میں اپنے ہاتھوں سے بندوق بھی چلا سکتی ہوں ـــ اور یہ آنچل پرچم بھی بن سکتا ہے! میں سمجھتی تھی کہ لڑکیوں کے ہاتھ محبوب کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارنے، گھر سجانے اور ننھے بچوں کو سنبھالنے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان کی زیبائش کے لئے کیوٹکس کی چمک اور مہندی کی سرخی چاہیئے لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ ہاتھ بڑے بڑے کام بھی کر سکتے ہیں۔ اور جب یہ کسی پاپی کے خون سے رنگے جاتے ہیں تو ان کی سندرتا کتنی بڑھ جاتی ہے۔"

" انجنا!" گگن نہ جانے کیوں کانپ سا گیا۔ انجنا کی کلائیاں اس کے ہاتھ سے خود بخود چھوٹ گئیں ـــ

" انجو!" درد میں ڈوبی ہوئی اس کی آواز ابھری

" تیرے ہاتھ......... تیرے ہاتھوں کو کیا ہو گیا!! یہ تو تیرے ہاتھ نہیں! کہاں گئیں وہ نرم و نازک خوبصورت کلائیاں"

انجنا کو تیز جھٹکا لگا۔ حیرت سے اس نے گگن کی طرف دیکھا، پھر ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے ستارے امڈ آئے تھے قبل اس کے کہ گگن اس سے کچھ کہتا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یوسف ناظم

مردم شماری

دُنیا کے تمام مہذب ملکوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ گھریلو جھگڑوں، محلہ داری کی چپقلشوں، سیاسی بلووں اور ادبی بحثوں کی بنا پر مرنے سے جو لوگ بچ جائیں انھیں ہر دس سال کے عرصے میں کم سے کم ایک مرتبہ فرداً گن لیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی خیریت پوچھنے کے علاوہ اُنکے حالاتِ زندگی بھی دریافت کرلئے جائیں تاکہ یہ اطمینان ہوجائے کہ کہیں ان کے حالاتِ زندگی بدل تو نہیں گئے ہیں۔ لیکن بہت کم ملکوں میں ایسے جاں کاہ حادثے ہوتے ہیں ورنہ عام طور پر حالاتِ زندگی بدلا نہیں کرتے اور ایک ہی ڈھرے پر چلا کرتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو سب سے اچھے حالاتِ زندگی وہی ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک سے رہیں۔ مثلاً کسی صاحب کا ہاتھ دیکھ کر ایک نجومی نے کہا کہ آپ چالیس سال تک مفلس رہیں گے۔ ان صاحب نے بڑی اُمید سے پوچھا اس کے بعد کیا ہوگا۔ نجومی نے بتایا اُس کے بعد آپ کو مفلسی کی عادت ہوجائے گی ـــــ ان صاحب کی جب بھی مردم شماری کی گئی یہی معلوم ہوا کہ وہ اب بھی وہی کرتے ہیں جو پہلے کرتے تھے۔

کسی غیر شخص کے گھر میں بن بلائے داخل ہونے کا سب سے اچھا طریقہ مردم شماری ہے۔ بعض گھروں میں داخل ہونے کے بعد مردم شماری کرنے والے شخص کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ مردم شماری کر رہا ہے یا اختر شماری ـــــ خانہ آبادی اسے ہی کہتے ہیں۔

ایک مردم شمار کے ساتھ بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ یہ صاحب ایک گھر میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ صاحب خانہ پچھلی مردم شماری کے صدمے سے وفات پاگئے اور بیگم گھر میں موجود نہیں ہیں۔ مردم شمار نے سوچا اب دوبارہ کون اتنی دور آئے۔ انھوں نے گھر میں جو سب سے بڑا لڑکا نظر آیا اُسے پکڑا اور خانہ پُری کرکے واپس ہوگئے۔ دوسرے دن مردم شماری کے آفس پر بیگم پہنچیں اور دفتر والوں کو اس حادثے کی اطلاع دی کہ اُن کے آٹھ بچوں کا تو فارم میں داخلہ لیا گیا لیکن تین بچے مردم شماری سے رہ گئے۔ انھوں نے کہا ان کے لڑکے کو سب بچوں کے نام زبانی یاد نہیں تھے اس لئے گنتی میں گڑبڑ ہوگئی۔ باقی تین بچوں کے نام اندراج میں لکھتے وقت دفتر والوں کو معلوم ہوا کہ یہ تین بچے تو بیگم کے شوہر کے انتقال کے بعد نمودار ہوئے ہیں۔ انھوں نے بیگم سے پوچھا محترمہ آپ کے یہ بچے سات، پانچ اور چار سال کے ہیں جب کہ آپ کے شوہر کو گذرے ہوئے ۹ سال ہوگئے ہیں۔ محترمہ نے جواب دیا میں بھی نہیں اس میں آپکو کیا تکلیف ہے۔ پوچھنے والے صاحب شرما گئے اور بڑی مشکل سے کہہ سکے نہیں کوئی تکلیف نہیں۔ مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے میں نے بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ محترمہ نے مزید وضاحت کی کہ اس میں انوکھی بات کیا ہے اپنے شوہر کی زندگی میں بھی بچے میں ہی پیدا کرتی تھی۔ اس جواب سے مردم شماری کرنے والوں کے علم میں بیحد اضافہ ہوا اور ایک مردم شمار تو غش کھا کر گر پڑا ـــــ غش کھا کر گر پڑنے کی بات پر یاد آیا کہ بعض مہذب ملکوں میں کھانے کی چیزوں میں لوگ صرف غش ہی کھایا کرتے ہیں۔ اس پر کوئی اکسائز ڈیوٹی بھی نہیں لگتی۔

سُنا گیا ہے کہ فلسفے کے ایک پروفیسر صاحب کو گِنا گیا تو

انہیں اس وقت معلوم ہوا کہ انہوں نے اب تک شادی نہیں کی ہے اور شاید اسی کی وجہ سے اُن کے بچے بھی نہیں ہوئے ہیں۔ پھر بھی ان پروفیسر صاحب نے سوچا کہ فارم کے سب خانے خالی رہیں گے تو مردم شماری کے آفس والوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ اسلئے احتیاطاً انہوں نے اپنے نام پر دو بچے لکھوا دئے۔

ایک شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے مردم شماری کرنے والے سے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ بذاتِ خود سے گنے چُنے لوگوں میں سے ہے اور اُسے مزید گنا نہیں جاسکتا۔

مردم شماری کے معاملے میں ایک دقت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اچانک بکھرا جاتا ہے اور اُسے وقت پر بالکل یاد نہیں آتا کہ اس کی بیوی کی عمر کیا ہے اور اس کی شادی کب ہوئی تھی اور بچوں کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا تھا۔ عمریں خاص طور پر کچھ اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ لکھنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہونے پاتا کہ شادی پہلے ہوئی تھی یا بچے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ مردم شماری کا حملہ ایسا اچانک ہوتا ہے کہ آدمی کا دماغ لوکل ٹرین کی طرح فیل ہو جاتا ہے۔

بعض ہوشیار اور سمجھدار بچوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ مردم شماری کے ایک یا دو دن بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح دس سال مردم شماری کرنے والوں کی زد سے بچے رہتے ہیں۔

مردم شماری کے فوائد یوں تو بہت سے ہیں لیکن ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔

بعض ملکوں میں مردم شماری کے بعد یہ سمجھا جاتا ہے کہ کام اب شروع ہوا ہے اور بعض ملکوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ مردم شماری کے ساتھ سب کام بھی ختم ہو گئے۔ احتیاط کا یہی تقاضہ ہے۔

جو ملک بہت زیادہ ترقی کر گئے ہیں وہاں لوگوں کے علاوہ جانوروں کی بھی مردم شماری ہوتی ہے۔ بعض ملکوں کے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ دونوں مردم شماریاں ایک ساتھ ہی کرلی جاتی ہیں۔ کیونکہ وہاں آدمیوں اور جانوروں میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں ہوتا ——

وہ چاروں مارشلنگ یارڈ میں کوئلے سے لدے ویگنوں کے پاس کھڑے بیڑی پھونک رہے تھے۔ اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

اُن میں سے ایک نے زمین پر تھوک دیا۔ دوسرا تیز نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس مارشلنگ یارڈ میں تل چٹوں کی طرح گندے اور غلیظ لگ رہے تھے۔ اُن میں سے دو نے بنیائین اور ہاف پینٹ پہن رکھے تھے۔ باقی دو کھٹے پیجامے اور قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔

"سچ بے، کیا وہ تیری جان پہچان کی ہے؟" ہاف پینٹ والے نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں یار، وہ میرے ساتھ بچپن میں کھیلی ہے۔ اوروں سے پانچ روپے لیتی ہے، مگر مجھ سے دو ہی لیتی ہے۔" پاجامے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"تعلقات والی بات ہے نا" دوسرے پاجامے والے نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

اسی درمیان ویگنوں کے سرے پر انجن لگ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی رینگنے لگی۔ چاروں جھپٹ کر ویگنوں کے نیچے چلے گئے اور نیچے کے فریم میں لٹک کر چھپکلی کی طرح چپک گئے۔ گاڑی بھلائی اسٹیل یارڈ سے نکلتی ہوئی کارخانے کی چہار دیواری کے اندر چلی گئی۔

کارخانے میں کچھ دور جا کر وہ مال گاڑی جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ چاروں اپنی جگہ سے نیچے آ گئے۔ تھوڑی دور پر رکھے کیبل کے ڈرموں کے پاس پہنچ کر وہ اپنے کام میں لگ گئے۔ اُن کا کام تھا کیبل کا اوپری ان سولیشن چھیل کر تانبے کا تار نکالنا۔ وہ خاموش مشینی انداز میں کام کرتے رہے۔ تانبے کے تاروں کو وہ اپنی کمر کے گرد لپیٹے جا رہے تھے۔

دونوں ہاف پینٹ والے اندھرا پردیش کے تھے، ایک پاجامے والا پنجاب کا تھا۔ چوتھے کا کوئی پردیش نہیں تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو ٹھیک ہوگا کہ اُس کا وجود ہی ایک بھول تھی۔ وہ ایک طوائف کا لڑکا جو اپنی کارآمد تن کے بزنس میں بائی پروڈکٹ (By Product) کی طرح پیدا ہو گیا تھا۔ جس کا کوئی بھی مصرف نہ تھا۔

چاروں رائے پور کے ایک سیٹھ کے یہاں چوری کیا ہوا تانبا بیچتے تھے۔ تقریباً پچاس روپے کی مالیت کے تانبے کی قیمت انھیں چار روپے ملتی تھی۔ وہ برابر تانبا چرانے نہیں آ سکتے تھے، اس وجہ سے ایک مرتبہ کی ملاقات کے بعد وہ بکھر جاتے تھے۔ اور کچھ عرصہ بعد انجانی مقناطیسی کشش کی طرح پھر ملتے تھے۔

تانبے کے تار کو نکال کر انھوں نے اپنی کمر میں کس کر باندھ لیا۔ اور سب پھر خالی مال گاڑی کے ویگنوں کے نیچے لٹک کر باہر آنے لگے۔ سب بے چین تھے۔ وہ رائے پور پہنچ کر چار روپے کو اپنی مٹھی میں دیکھنا چاہتے تھے۔

اچانک 'دھپ' کی آواز ہوئی۔ سب نے جھک کر دیکھا، ایک ہاف پینٹ والا اپنی جگہ سے گر کر پٹری کی طرف لڑھک گیا تھا۔ ویگن کے پہیئے سے ٹکرا کر اس کا سر کچل گیا تھا۔

"سالا گر گیا!" ایک کے منہ سے نکلا، دوسرے ہی لمحہ، دوسرا ہاف پینٹ والا اپنی جگہ سے نیچے کود گیا اور پٹریوں کے درمیان سلیپروں پر جھک کر بیٹھ گیا۔

"یہ سالا کیوں کودا؟" ایک پاجامے والے نے کہا۔

"چپ بھی رہ!"

زندہ ہاف پینٹ والا مُردہ ہاف پینٹ والے کے پاس پہنچا۔ اُس نے فوراً اُس کی بنیائن الٹ دی اور کمر میں لپٹے تار کو نکال کر اپنی کمر میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ مردہ آدمی کی بنیائن کو لالچ بھری نظروں سے دیکھا، لیکن وہ خون سے لت پت تھی۔ نا اُمید ہو کر اُس نے اپنی نظریں مُردے کے ہاف پینٹ پر ڈالیں۔ اُس کی آنکھوں میں چمک اُٹھی۔ اُس نے لاش کا ہاف پینٹ اُتار لیا۔ پھر وہ پھاٹک کی طرف دوڑنے لگا۔

وہ مارشلنگ یارڈ ہوتا ہوا سیالدہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آپہنچا۔ اُس کے پاجامے والے دونوں ساتھی پلیٹ فارم پر بیڑی پھونک رہے تھے۔ اُس کے پاؤں بُری طرح تھک گئے تھے۔ اُس کے ساتھی نہ اُس سے کچھ بولے اور نہ اُس نے ہی کچھ کہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ آج دو آدمیوں کی محنت اکیلے اُس کے قبضے میں تھی۔

وہ صبح چھ بجے رائے پور پہنچے سیٹھ اپنی دکان کے تختے پر بیٹھا کسی ساتھی کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔

"شیشیا مر گیا۔" ہاف پینٹ والا بولا۔

"ہوں۔" سیٹھ نے بے دھیانی میں جواب دیا۔

"لیکن میں اُس کا تانبا بھی لے آیا ہوں سیٹھ، اُس کے چار روپئے بھی مجھے ملنے چاہیئے۔ اس تانبے کے لئے میں چلتی گاڑی سے کود اہوں۔"

سیٹھ کچھ نہیں بولا۔

"دو گے نا چار روپئے؟" ہاف پینٹ والا تیزی سے بڑبڑایا۔

"وہ شیشیا کا پینٹ بھی اُتار لایا سیٹھ!" پاجامے والا ہنسا۔

"کفن چور کہیں کا! سالے کمینے، لاش کو ننگا چھوڑ دیا!"

"واہ! پینٹ کیوں چھوڑ آتا! چار روپے دو گے نا؟" ہاف پینٹ والے نے اپنا سوال دہرایا۔

"دے بھی دو یار، اِس کمینے سور کو چار روپئے۔ جلد کرو، راماین

شروع ہو گئی ہو گی، پنڈت جی ہماری راہ دیکھتے ہوں گے۔" سیٹھ کے ساتھی نے کہا۔

سیٹھ لکڑی کے بکس سے روپے نکال کر گننے لگا۔

"اب یار، مجھے اُس کے پاس لے چل، شیشیا کے چار روپیوں سے میں دوبارہ اُس کے پاس جا سکتا ہوں، ہاف پینٹ والا دھیمے لہجے میں پاجامے والے کے کان میں پھُس پھُسایا۔

"کس کے پاس جائے گا؟" سیٹھ نے روپے بانٹتے ہوئے پوچھا۔

"رنڈی کے پاس۔" پنجابی لڑکے نے جواب دیا۔

"حرامی کمینے کے، سالے غارت ہو جاؤ!" سیٹھ بڑبڑایا۔ پھر آٹھ روپے، ہاف پینٹ والے کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا — "شیشیا تیرا کون تھا بے؟"

روپے اُس نے سیٹھ سے لے لئے۔ اور پھر مٹھی بھینچ کر اپنی جیب میں ٹھونستا ہوا بولا — بڑا بھائی۔ . . . کیوں؟

■■

رپورتاژ

حمید سہروردی

اُس رات کی بات

آج ۲۰ر تاریخ ہے

میں اپنے اندر ہی اندر خوشی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ بے چینی بڑھتی جا رہی ہے ــــ میں اکیلا کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہوں۔ کبھی کتابیں اُٹھا کر پڑھنے لگتا ہوں۔ کبھی کاغذوں پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگتا ہوں۔ کوئی تصویر بنانا چاہتا ہوں، اپنی کیفیت لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن کیوں ــــ؟ کمرے کے دروازے پر کسی کی آواز آتی ہے، میں دروازہ کھولتا ہوں۔ یہ میرا روم پارٹنر ہے، میری حالت کو دیکھ کر پوچھتا ہے "تمہاری حالت ایسی کیوں ہے، کیا تم کچھ سوچ رہے ہو ــــ؟" میں جواب نہیں دیتا۔ وہ خاموشی سے باہر چلا جاتا ہے۔

اس کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد، میں بھی چار دیواری کے بیچ سے اپنا اکیلا پن لئے باہر نکل آتا ہوں۔ کمرہ مقفل کرتے ہوئے ایک غیر معمولی پن کا احساس ہوتا ہے۔ میں سگریٹ جلاتا ہوں "سگریٹ چھوڑ دو یا موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اخباری سُرخی ذہن میں ایک بار پھر نمایاں ہو جاتی ہے ــ سگریٹ ــــ دھواں، دھواں سا چاروں طرف دھواں ہی دھواں ــ اور سگریٹ ــــ اگر سگریٹ چھوڑ دوں تو زندگی میں رہ ہی کیا جاتا ہے ــــ!

میرے قدم آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ جانے پہچانے راستے، وہی نظر آنے والے مکانات، وہی شناسا سا چہرے، دھول بھری سڑکیں، ٹھیلے، رکشے، کاریں، اور لوگ ــــ

یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ جس کا نام اورنگ آباد ہے۔ اس نام سے ہی اورنگ زیب کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔ تاریخ کے صفحات آنکھوں کے سامنے کھلنے لگتے ہیں۔ کیا ہمیں تاریخ نہیں چھوڑے گی۔ تاریخ لکھی جاتی ہے، ہمارے ہی لئے۔ وہ کارنامے جن سے ہم سیکھتے ہیں، تاریخ آنے والی نسلوں کو سبق دیتی ہے، زندگی کی پیچیدہ پرتیں کھولتی ہے۔ تاریخ ــ تاریخ ــ تاریخی شہر ــــ اس شہر سے ہی اردو کی ابتدا ہوئی تھی ــ اُردو ــــ وَلی، سراج اور نہ جانے کتنے شاعر اور ادیب اس سرزمین سے بلند ہوئے ہیں، اور اٹھ رہے ہیں۔

پُر شہر ــــ اور میں اپنے وطن سے سیکڑوں میل دور اس شہر میں اپنی زندگی گذار رہا ہوں۔ نہ جانے کونسی کشش تھی جو مجھے یہاں کھینچ لائی تھی ــــ خوشی ہے کس کو انکار ہو سکتا ہے ــــ یہ انٹرنیشنل شہر ہے۔ یہاں مختلف ممالک کے لوگ آتے ہیں، جاتے ہیں، یہیں سے ایلورا، اجنتا کے لئے، یہاں ہماری پرانی تہذیب ملتی ہے۔ یہاں سب کچھ تو ہے ــــ

پھر کیوں میں خود میں اکیلا پن محسوس کر رہا ہوں ــــ؟ میں اکیلا ہوں ــــ نہیں ــــ یہاں میرے اچھے ساتھی ہیں ــــ یہاں میرے دوست ہیں، صادق، قاضی سلیم، بشر نواز، جوگندر پال، رشید انور، محمود شیکل اور میرا روم پارٹنر آفاق۔ یہ سبھی میرے اچھے دوست اور ساتھی ہیں۔ میں اکیلا کیوں ہوں۔ میں کیوں آج محسوس کر رہا ہوں کہ مجھ میں کچھ پگھل رہا ہے۔ یہ شاید میرا وہم ہے۔ میں کیا چاہتا ہوں، میں خود سے سوال کرتا ہوں۔

ہم سب ایک جگہ مل کر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیوں ــــ؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی جی چاہتا ہے کہ ایسے سوالوں

پانی پر بہہ جائے۔

میں پھر ایک سگریٹ جلاتا ہوں — سگریٹ جلاتا ہوں —

سگریٹ — ! دیا سلائی بجھ جاتی ہے — سردی کافی ہے، ہوائیں سرد ہیں — گرم کپڑوں میں سردی گھس آئی ہے۔ موسم کا مقابلہ بہر صورت کرنا ہی ہوگا۔ ہمیں جینا ہے، کسی بھی طرح — دُکھ، سکھ تو ہماری زندگی کے جزو ہیں — افسانے لکھتے ہیں، نظمیں کہتے ہیں اور غزلیں کہتے ہیں، لیکن پھر بھی دُکھ سکھ دور نہیں ہوتے۔

میں اب شہر کی بڑی سڑک پر آ گیا ہوں۔ چاروں طرف روشنیاں ہیں۔ ہوٹل، دوکانیں، پان کی دوکانیں، جوتوں کی دوکانیں، فروٹ کی دوکانیں اور نگ آباد میلک مل — ہوٹلوں میں لوگ بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ دوکانوں میں کاروبار چل رہا ہے۔ زندگی ہے کہ تیز رفتار ہے — اور میرے قدم آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔

شام — شام — روزانہ شامیں آتی ہیں لیکن آج کیوں میں اتنا سوچ رہا ہوں۔ روزانہ اس منظر کو دیکھتا ہوں مگر آج ایسا کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ ہوٹل میں ریڈیو نج رہا ہے۔ بیرے گانے گا رہے ہیں اور چائے ٹیبلوں پر رکھتے جا رہے ہیں: ایک داخل ہو رہا ہے اور دوسرا ہوٹل سے باہر نکل رہا ہے۔ بس زندگی مسلسل بھاگ رہی ہے۔ میں اکیلا سڑک کے ایک کنارے چل رہا ہوں۔ قدموں کے نشان جاگتی سڑک میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ سڑکیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، لوگ سڑکوں کے دونوں طرف چل رہے ہیں۔ کچھ بیچ سڑک پر چل رہے ہیں، دیوانے کہیں کے۔ بیچ سڑک پر چلنا خطرناک ہے۔ مشینی موت کس کو پسند ہے۔ لیکن یہ دوڑے جا رہے ہیں لیکن کہاں۔

کہیں وہیں تو نہیں جا رہے ہیں، جہاں میں جانا چاہتا ہوں —

ثاوث حال

اخبار کی سرخیاں تو یونہی ہوتی ہیں۔ نہیں — کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے ان میں۔ اور یہ خبر کتنی اچھی ہے کہ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی شہر میں ہیں اور ہم سب نے مل بیٹھ کر چند سوالات پر بحث کرنے کا ایک موقعہ ڈھونڈھ نکالا ہے۔

جوگندرپال کے مکان پر ہی میری ملاقات کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی سے ہو چکی ہے۔ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کے افسانے اور طنزیہ مضامین میں نے پڑھے ہیں۔ کسی کتاب میں یا کسی رسالے میں۔ میں ایک گھنٹہ تک ان سے مسلسل باتیں بھی کر چکا ہوں۔ کتنے خوشگوار ماحول میں ہماری باتیں ہوئی تھیں، ادب پر، پھر اِدھر اُدھر کی باتیں۔ کتنی اچھی رات تھی وہ۔ سردی کافی پڑ رہی تھی، اور جوگندرپال کا خوبصورت بنگلہ — یونیورسٹی کالج کے قریب — اور ہم سب باہر کے ماحول سے بے خبر باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ رات — اور پھر — یونیورسٹی پورے اسٹاف اور پروفیسرس کو دعوت نامے مل چکے ہیں اور شہر کے تمام کالجوں کے پروفیسرس اور طلبا، کو مطلع کیا جا چکا ہے — آج رات — اور پھر

شبِ افسانہ

میں ٹاون ہال کے قریب پہونچ گیا ہوں۔ جو کافی سجایا گیا ہے۔ ٹاون ہال میں ہل چل ہے، چاروں طرف، اور عمارت روشنی میں بھیگی ہوئی ہے — کرسیاں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ اور فرش پر قالین بچھا ہوا ہے۔ ٹاون ہال کچھا کھچ بھرا ہوا ہے — ساری ہی نظریں باہر کے دروازے پر جمی ہوئی ہیں اور اوپر ڈائیس پر قاضی سلیم، بشر نواز، پروفیسر عصمت جاوید، پروفیسر شمیم احمد بیٹھے ہوئے ہیں، ان سب کی نظریں کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ لوگ کاروں میں آ رہے ہیں، رکشوں میں آ رہے ہیں، خواتین جوق در جوق چلی آ رہی ہیں۔ ایک ہنگامہ بپا ہوا ہے اور ہنگامہ — یوں لگتا ہے کہ سارا اورنگ آباد آج ٹاون ہال میں چلا آیا ہے۔ کاش یہ حالات — ہر رات میں تبدیل ہو جائے کیا یہ ممکن ہے — !؟

گھڑی مسلسل اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ ٹاون ہال کے اوپری حصے میں خواتین کا انتظام کیا گیا ہے۔ بچے رو رہے ہیں۔ بچے روتے ہی تو ہیں — پھر بھی یہ سب کچھ اچھا لگ رہا ہے — میں باہر دروازے پر آتا ہوں۔ صادق بے چین نظر آ رہے ہیں۔ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں، بس اب آنے والے ہی ہیں۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں، کالج کے طلبا زور زور سے باتیں کر رہے ہیں، بچوں کی آوازیں اور شور و غل۔ لیکن چہرے سے خوشی ٹپک رہی ہے۔ چاروں طرف ایک خوشی کا عالم ہے۔ بس ایک ہنگامہ ہے، بے چینی ہے۔ گھڑی مسلسل وقت بتا رہی ہے۔ وقت رکتا نہیں —! آسمان پر گھٹا چھا رہی ہے، خنک ہوائیں چل رہی ہیں —

ایک کار تیزی سے آتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ میں سمجھنے لگتا ہوں کہ شاید کرشن چندر آ رہے ہیں۔ کار رکتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ اندر سے ایک بھاری بھرکم شخصیت مسکراتے ہوئے باہر آتی ہے۔ یہ جوگندر پال ہیں۔ آیئے آیئے، اندر چلئے ـــ جوگندر پال کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ سدا بہار کی طرح مسکراتے ہوئے ڈائس پر ایک طرف کرسی پر بیٹھتے ہیں۔

ایک اور کار، دور سے آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کار ٹاؤن ہال کے احاطے میں آ کر رکتی ہے۔ دروازے کھلتے ہیں۔ پہلے صادق کار سے باہر آتے ہیں، ان کے بعد سلمیٰ صدیقی، پھر کرشن چندر۔ باہر کھڑے ہوئے کچھ لوگ اپنی اپنی جگہوں کو محفوظ کر لینے کے لئے اندر چلے جاتے ہیں ـــ سلمیٰ صدیقی، عمارت کو پر اشتیاق نظروں سے دیکھتی ہیں۔ انکی زبان سے بیساختہ نکلتا ہے کہ "کتنی خوبصورت عمارت ہے" واقعی اورنگ آباد یادگار شہر ہے۔ پھر کرشن چندر حیرت سے عمارت کو دیکھتے ہیں، زبان سے کچھ نہیں کہتے، صرف ایک لمبی سانس لیتے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک دیکھتا ہوں۔ سبھی چلنے لگتے ہیں۔ ذہن کے ایک کونے سے آواز آتی ہے کہ واقعی ادب جو ہماری عظیم الشان اور جلیل القدر اختراعی کوشش ہے۔ سبھی چلنے لگتے ہیں، ٹاؤن ہال میں داخل ہوتے ہیں، کرسیاں اعلان کر رہی ہیں، دیواریں بول رہی ہیں، اوپر سے عورتوں بچّوں کی آوازیں کم ہو گئی ہیں ـــ

ٹاؤن ہال کے فرش پر سُرخ قالین بچھا ہوا ہے۔ میں ہر لال چیز سے گھبراتا ہوں، مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کچھ گڑبڑ ہونے والا والا ہے ـــ سامعین میں ہر طرف جانے پہچانے چہرے نظر آ رہے ہیں، یعقوب عثمانی، قمر اقبال، مقبول سلیم، سلطان شمیم، اسرار حلمت اور یوسف عثمانی وغیرہ۔ کرشن چندر خوش ہیں سلمیٰ صدیقی مسکراتی ہیں۔

کرشن چندر کرسی پر بیٹھتے ہیں، سلمیٰ صدیقی کی نظریں عمارت کو تک رہی ہیں، خوشی سے سامعین پر نظریں گھما رہی ہیں، تمام ہال کھچاکھچ بھرا ہوا ہے۔

صادق مائیک پر آ کر مرہٹواڑہ یونیورسٹی گریجویٹ اردو ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقد کئے جانیوالے اس جلسے کی صدارت کے لئے قاضی سلیم کے نام کا اعلان کرتے ہیں۔ قاضی سلیم صاحب صدارت کی کرسی سنبھالتے ہیں۔ پروفیسر شمیم احمد مرہٹواڑہ پوسٹ گریجویٹ اردو ایسوسی ایشن کا تعارف کراتے ہیں۔

پروفیسر شمیم احمد کی تعارفی تقریر کے بعد صادق مائک پر آتے ہیں، اور نوجوان افسانہ نگار حمید سہروردی کے افسانے سے شب افسانہ کے آغاز کا اعلان کرتے ہیں۔ حمید سہروردی گلبرگہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے اورنگ آباد آئے ہوئے ہیں۔ یہ نئی نسل کے ایک اچھے افسانہ نگار ہیں، بقول میرزا ادیب "کرشن چندر سے حمید سہروردی تک اردو کی تین نسلیں پلیٹ میں آتی ہیں۔" میں جدید ترین نسل کے افسانہ نگار حمید سہروردی سے کہوں گا کہ وہ اپنا افسانہ سنائیں۔ حمید سہروردی کرسی سے اُٹھتا ہے، مائیک کے قریب آتا ہے، وہ خود میں بے کیفی کی حالت محسوس کرنے لگتا ہے، اتنے سارے لوگ، اور حمید سہروردی اب وہ اپنا افسانہ "چلتے ہوئے قدم" پڑھنے لگتا ہے۔ افسانہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

"..... میں سمجھتا ہوں کہ نشے میں آدمی سچائی کو پسند کرتا ہے، یہ جھوٹ ہے کہ نشے میں خود کو بھولتا ہے۔ ایسا نہیں، آدمی نشے میں ہی اپنے کو اچھی طرح سمجھتا ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس آدمی کا نشہ محض فراڈ ہے۔ میرا سگریٹ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میں وہاں سے آگے کو طرف بڑھنے لگا۔ ایکدم میرے ذہن کی رگیں کلبلانے لگیں۔ پابندی، ہر ایک کے لئے مشکل کام ہے۔ پابندی کے لئے بہت سی چیزوں اور اصولوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ قربانی دینی پڑتی ہے۔ قربانی دینے والا بہت بڑے جگر کا مالک ہوتا ہے پھر میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ذہن کی رگیں اسی رفتار سے کلبلانے لگیں..... موت سے بھاگ کر جائے بھی کہاں؟ کوئی راستہ نہیں، راستے تو جیتے دنوں میں پیدا ہوتے ہیں..... بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی باتیں جن سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہوتی، انھیں بغیر کسی احساس کے برداشت کرنا پڑتا ہے..... میرے قدموں کے نشان جاگتی سڑک پر تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم پھیلتا جا رہا ہے۔ دو کانوں میں روشنی جل رہی ہے..... بیچ سڑک پر چلتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ بیچ سڑک پر چلنا خطرناک ہے۔ مجھے مشینی موت پسند نہیں میں فوراً

فٹ پاتھ پر آ گیا۔ اور اچانک بتی کا کرنٹ فیل ہو گیا۔ میں نے ماچس جلائی لیکن ہوا کے سامنے ماچس خاموش ہو گئی ۔۔۔" افسانہ ختم ہوتا ہے ۔۔۔ چاروں طرف سے تالیاں ہی تالیاں سنائی دیتی ہیں۔

میرے بعد جانے پہچانے جدید شاعر، معتوب اور افسانہ نگار صادق سیاہ سوٹ میں ملبوس تالیوں کی گونج میں مسکراتے ہوئے مائک پر آتے ہیں ۔۔۔ ٹاؤن ہال سامعین سے بھرا ہوا ہے ۔۔۔ باہر دروازے تک پر ہاؤس فل کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ صادق اپنا افسانہ " ایک لفظ کی موت " ایک ایک سیکنڈ رکتے ہوئے سنانے لگتے ہیں۔ خاموشی چاروں طرف۔ صرف صادق کی آواز گونج رہی ہے۔

....." ماں کی کوکھ سے قبر کا راستہ طے کرنے تک انسان کو کتنے زمانوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔۔۔ کتنے مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔۔۔ کتنا رنج فرسا ہوتا ہے یہ سفر ۔۔۔ اس کا مشاہدہ ۔۔۔ اس کا تجربہ ۔۔۔ سچ ہے ہر نو مولود انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے روتا ہے کتنا تیز ہوتا ہے اس کا احساس ۔۔۔ کتنا بیدار ہوتا ہے اس کا شعور ۔۔۔

تالیاں۔ تالیاں ۔۔ تالیاں ۔۔

دوستوں کا خیال تھا کہ صادق اور حمید سہروردی کے افسانے اپنی جدت، تجریدیت اور پیچیدگی کے باعث پسند نہیں کئے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

صادق کے بعد سلمٰی صدیقی مائیک پر آتی ہیں۔ سلمٰی ہمارے لئے نئی نہیں ہیں لوگ انھیں رسالوں میں پڑھتے ہیں، لیکن آج وہ سب کے سامنے ہیں۔ ان کی زبان کے تو دشمن بھی قائل ہیں۔ تالیاں۔ تالیاں۔

سلمٰی صدیقی اپنا طنزیہ " اُدگھاٹن " سنانے لگتی ہیں۔ چاروں طرف ہنسی شروع ہوتی ہے، لوگ غموں کو بھول گئے ہیں، کچھ تو بے قابو ہو گئے ہیں۔ انھیں اس ماحول کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ صرف اپنے فن کاروں کے اور کچھ بھی نہیں سوچ رہے ہیں۔ سلمٰی صدیقی کا طنزیہ ختم ہوتا ہے۔ واقعی ان کا طنز بہت پیارا لگتا ہے۔ تالیاں۔ تالیاں۔ تالیاں۔

سلمٰی صدیقی کے بعد جوگندر پال مائیک پر آتے ہیں۔ اپنا افسانہ " بازیافت " سناتے ہیں۔ کہانی کا پورا ماحول، جوگندر پال خوب پڑھتے ہیں۔ گھڑی کے کانٹے برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ رات ڈھلتی جا رہی ہے۔ جوگندر پال اپنے خالص افسانوی انداز میں افسانہ سناتے جا رہے ہیں آدھ گھنٹہ ۔۔۔ خاموشی چاروں طرف ۔۔۔ صرف جوگندر پال ۔۔۔ خلق ۔۔۔ " نہ بابا نہ بابا، پچھواڑے بڈھا کھانستا ۔۔۔ پون گھنٹہ ۔۔۔ بازیافت ۔۔۔ جوگندر پال نے جہاں یہ محسوس کر لیا کہ وقت چل رہا ہے اور کہیں کچھ وقت کا احساس ہونے لگا ہو تو خاص انداز سے اپنے سامعین، اپنے دوستوں کو اپنے ماحول میں گم کر دیتے ہیں ۔۔ " ایک گھنٹہ ۔۔۔ " میں یہاں اپنے فلیٹ کے باہر دروازہ کھول رہا ہوں اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ فلیٹ کے اندر میرا مردہ وجود کسی مصری ممی کی طرح آنکھیں کھولے پڑا ہے اور اندر داخل ہوتے ہی میں اپنے اس بے جان وجود میں گھس جاؤں گا اور چین سے آنکھیں موند لوں گا اور سانس بھرنے لگوں گا! " جوگندر پال کا افسانہ انتہائی دلچسپی سے سنا گیا۔ پورے ایک گھنٹہ تک ۔۔۔ تالیاں، تالیاں، تالیاں،

اب تک چار فن کاروں نے چار افسانے سنائے، سبھی کو انتہائی دلچسپی سے سنا گیا۔ اب آخری فنکار کرشن چندر کی باری ہے۔

تالیاں ۔۔۔ تالیاں ۔۔۔ تالیاں

صادق ۔۔ کرشن چندر کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ " کرشن چندر، کرشن چندر ہیں " کرشن چندر کا افسانہ کافی پرانا ہونے کے باوجود بڑے اشتیاق سے سنا جا رہا ہے۔ عوام اپنے محبوب فن کار کو بڑے انہماک سے سن رہے ہیں۔ اس کرشن چندر کو جو ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ جس کے افسانوں کے تراجم کئی غیر ملکی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ کرشن چندر کا افسانہ اپنے مخصوص لب و لہجہ، مخصوص انداز بیان اور ڈرامائیت کے باعث بہت پسند کیا گیا ۔۔ تالیاں، تالیاں، تالیاں۔

شب افسانہ ختم ہوئی اسے کامیاب بنانے میں وہ سبھی سامعین تھے جنھوں نے اپنے فن کاروں کو سنا۔

مسیحجہ۔ قاضی سلیم نے کہا کہ سب سے پہلے تو صادق قابل مبارکباد
ہیں کہ انھوں نے ایسا خوبصورت پروگرام کیا جب کہ شہر میں و. م. بی کی
ند قوتوں کی چھاؤں میں ہم لوگ جی رہے ہیں، آرٹ اور ادب ہی ہم میں
ہی وہ دھندلی پیدا کر کے ہماری سنسکرتی و کلچر کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

آج آپ نے تین برصغیروں کے افسانہ نگاروں سے ان کے افسانے
سنے، کرشن چندر، جوگندر پال، صادق اور جمیلہ سہروردی، سبھی کا انداز
مختلف ہے۔

کرشن چندر ایشیا کے عظیم افسانہ نگار ہیں۔ جب بھی کوئی بڑا
ادیب یا شاعر پیدا ہوتا ہے وہ اپنے میڈیم کے سارے امکانات کو
استعمال کر لیتا ہے اس لئے آنے والوں کو یا تو اپنا راستہ الگ بنانا پڑتا
ہے یا وہ نقال بن کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ترقی پسند انداز بیان سے
الگ جوگندر پال کو اپنی راہ بنانی پڑی۔ یہی خانہ جدید ادب کا سبب
ایجاد بھی ہے۔ سلمیٰ صدیقی کی زبان اتنی ستھری اور نکھری ہوئی ہے کہ
افسانہ سن کر ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی
ہیں۔ سلمیٰ صدیقی کے زبان کے فنکارانہ استعمال ہی نے انھیں طنز نگاروں
میں اہم مقام دلایا ہے ——

قاضی سلیم تقریر کر کے اپنی نشست کی طرف پلٹ رہے ہیں۔
کرشن چندر کہتے ہیں۔ اب ہم بھی کچھ سننا چاہتے ہیں کچھ شعر و شاعری۔
قاضی سلیم دوبارہ مائیک پر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کچھ سوچ کر
اپنے مخصوص انداز میں ایک نظم سناتے ہیں۔

مکوڑوں اور کیڑوں میں بڑے گھمسان کا اک رن پڑا ہے۔
تبھی تو شہر میں ہلچل مچی ہے
جلا دو پھونک دو برباد کر ڈالو
چیر دو ہر جسم اندر جھانک کر دیکھو
سڑک پر خون بہتا ہے لے جھوم
خدا کا ذائقہ شاید ملے گا

نظم تالیوں کی گونج میں ختم ہو گئی۔ اب مائیک سے بشر نواز کے
نام کا اعلان ہوتا ہے۔
وہ کہاں سے کوئی نیا پن اپنے آپ میں لائیں گے۔ تم کی تنگ آ جاؤ گے اگر ان ہم بھی ایک تا نہ بیچے

بشر نواز کے بعد یعقوب عثمانی اپنی غزل ترنم سے سناتے ہیں۔
سامعین نے اس پروگرام کو خاموشی سے سنا۔ پروفیسر عصمت جاوید
کے شکریے پر پروگرام ختم ہوا۔

ایک خوشی کے احساس میں ڈوبے ہم سب، قاضی سلیم، بشر نواز،
پروفیسر شمیم احمد، صادق، اقبال بلگرامی اور میں ٹاؤن ہال سے آہستہ
آہستہ باہر سڑک پر پروگرام کی باتیں کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ سب ملا
شہر سنسان لگ رہا ہے۔ پھر وہیں جانا ہے، جہاں اکیلا پن ملے گا، میں
سوچتا ہوں۔ ایک سگریٹ جلاتا ہوں، لیکن ہوا کے سناٹے میں ماچس
خاموش ہو گئی ہے۔ سرد ہوا۔ چاروں ——

.... کنووکیشن کا دن۔ مجھ کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر کبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مفت مشورہ
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر ورکنگ سینٹروں سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے

خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لیے

گوشۂ مصطفیٰ زیدی

پیدائش

۱۹۳۰ء

الہ آباد

وفات

۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء

کراچی

تعلیم

ایم۔ اے (انگریزی)

پہلا تخلص

تیغ الہ آبادی

شعری مجموعے

زنجیریں ۱۹۴۷ء

شہر آذر

پہلا اڈیشن ۱۹۵۹ء

دوسرا اڈیشن ۱۹۶۷ء

موج مری صدف صدف ۱۹۶۰ء

روشنی ۱۹۶۳ء

گریباں ۱۹۶۴ء

قبائے ساز ۱۹۶۷ء

زیرِ ترتیب: کوہِ ندا

سلام مچھلی شہری

خوابوں کی سزا

ـــــ تیغ لاہور میں تم "مصطفےٰ زیدی" تو بنے
پھر بھی انداز وہی "دورِ الٰہ آباد" کا تھا
پھول ہونٹوں کے قریب آئے مچل کر لیکن
دل میں شعلہ سا وہی فطرتِ آزاد کا تھا

ایک لڑکی کے لیے تم نے بہت پہلے بھی
لوگ کہتے ہیں کہ مرنے کے لیے سوچا تھا
تم نے پہلے بھی مذاقِ طرب آگیں کے لیے
فرضِ ہستی سے مکرنے کے لیے سوچا تھا

شاہد و نغمہ و صہبا ہے ہماری پرواز
اور یہ پرواز دھندلکے کے سوا کچھ بھی نہیں
جسم کی قوسِ قزح، ساغر و مینا کا گلاب
ایک ڈھلتے ہوئے شعلے کے سوا کچھ بھی نہیں

ویرا، دو بچیاں اور جسم میں زہرِ شہناز
روح بھی چین سے تربت میں نہ ہوگی شاید
اپنے ہر دور میں چاہت کے لیے ترسے ہو
بات یہ ساری حکایت میں نہ ہوگی شاید

خیر، پہلے بھی، اسی طرح سے موت آئی ہے
ہم نے خوابوں کی ہمیشہ یہ سزا پائی ہے

کوچہ و بازار میں سناٹا ہے

جوش ملیح آبادی

کراچی
۲۴/۱۱/۷۰

اے میرے معنوی فرزند، مصطفےٰ زیدی، میں تیری موت پر کیا لکھوں، کیوں کر لکھوں۔

ہائے حبیب اُس وقت جب کہ دل، سینہ توڑ کر، نکل جانے پر آمادہ ہو، کس کی مجال ہے کہ مُنہ سے کچھ بول بھی سکے۔

اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں خاموشی اختیار کر لوں، اور میری خاموشی ایک ایسے دردناک نوحے میں تبدیل ہو جائے کہ ارض و سما کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

زیدی، تیرے بغیر میرے دل کی دُنیا سونی ہو کر رہ گئی ہے۔ کاش تو مجھ کو اپنے ساتھ لے جاتا۔

ہائے میری تنہائی اور اُداسی!

حد یہ ہے دل، بلکہ گویم، عجب قسم دھچکا

جوش

کراچی
۱۹ نومبر ۷۴ء

فیض احمد فیض

مصحفی نشتر نے لہو میں نہا کر بیکار کسی ادیب کا قلم
پر اپنے لہو تلاش کرتا رہا ہے، غالباً یہی تلاش مجاز عشق میں آج
کو بھی رہی ہوگی اگرچہ شاید انہیں اپنے قتل ہونے کا اتنی شدت
سے احساس نہیں تھا یا شاید ان کے زمانے میں اہل شہر کی
سفاکی اتنی مشتہر نہ تھی، اس سفاکی کی تاب وہی لا سکتا
ہے جو یا خود سفاک ہو یا مردہ دل، خونچکاں قلم اور فگار
انگلیوں والوں کا مقدر ہمارے جیسے شہر میں سچ پوچھئے تو خاک
و خون کی طلب کے سوا اور نہیں، اس وقت تک جب کہ اس
خاک و خون سے ایسے نئے شہر تعمیر نہ ہو جائیں جن میں
متاع ہنر کا صلہ سنگ باری نہیں گل باری رسم شہر ٹھہرے،

فیض احمد فیض

مصطفٰے زیدی

مصطفٰے زیدی کے زیرِ ترتیب مجموعے کی حسبِ ذیل نظمیں بلا عنوان ہیں۔
لیکن ہم انھیں عنوان کے تحت شائع کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

قتیلِ ناوکِ یاراں

یوں ہر گلی کنارہ کش و چشم پوش ہے
جیسے ہمارا گھر سے نکلنا گناہ ہو

منبر میں ایسا لحن ہے ایسا سروش ہے
جیسے ہمارا نامۂ رندی سیاہ ہو

یوں دن گذر رہے ہیں کہ فردا نہ دوش ہے
اے اعتبارِ وقت معین نگاہ ہو

اب تک قتیلِ ناوکِ یاراں میں ہوش ہے
اے دوستوں کی مجلسِ شوریٰ صلاح ہو

"میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

(غیر مطبوعہ)

دلِ شوریدہ

خود کو تاراج کرو زندگیاں کم کر لو
جتنا چاہو دلِ شوریدہ کا ماتم کر لو
تابِ دہشت کسی صحرا، کسی زندان میں نہیں
اس قدر چارہ گری وقت کے امکاں میں نہیں
خاطرِ جاں کے قرینے تو کہاں آئیں گے
صرف یہ ہوگا کہ احباب بچھڑ جائیں گے
گھر جو اجڑے تو سنورتے نہیں دیکھے اب تک
ایسے ناسور تو بھرتے نہیں دیکھے اب تک

عقل کے اور حوالوں سے کبھی میں نے خود کو
یہ بتایا کہ جنوں کیا ہے بکھرنا کیا ہے
دور اندیشی و ادراک کسے کہتے ہیں
ڈوبنا کیا ہے تلاطم میں ابھرنا کیا ہے
لیکن اک اور تڑپ اور لگن تھی جس نے
یہ سکھایا کہ دلسوں سے گزرنا کیا ہے
یا تو اس کھیل میں پڑنا ہی نہیں تھا یا اب
جاں کی بازی بھی لگا دی ہے تو ڈرنا کیا ہے
خود پہ احسان کیا تھا سو وہ احسان گیا
میں خود اپنی ہی نصیحت کا برا مان گیا

غیر مطبوعہ

مصطفیٰ زیدی

جلوسِ رسوائی

میں رات ایسے جزیرے میں تھا جہاں مجھ کو
ہر ایک جلوس حقیقت ملی گماں کی طرح

پکارتا تھا پر اسرار عالمِ موجود
خنک تھکی ہوئی ارواحِ رفتگاں کی طرح

دمک رہا تھا ہر اک گوشۂ وطن لیکن
خزاں کی دھوپ میں صحرائے بیکراں کی طرح

میں اپنی قوم سے اپنی زباں میں گویا تھا
زبانِ شہر خموشاں کے ترجماں کی طرح

ہر ایک شخص طلب گار تھا کہ شام و سحر
اسی کا نام لیا جائے اور اذاں کی طرح

وہ داستان تھی کسی اور شاہزادے کی
مرا لہو تھا فقط زیبِ داستاں کی طرح

میں ایسا سہم گیا تھا کہ میرا سایہ بھی
ڈرا رہا تھا مجھے دشتِ بے اماں کی طرح

وہ میرا عکس تھا یا اور کوئی صورت تھی
جو آئینے میں ملی یارِ بدگماں کی طرح

میرا فنکار قلم لکھ رہا تھا آج کی بات
زوالِ عہدِ گزشتہ کے نوحہ خواں کی طرح

وہ حبس تھا کہ نظر آئے جس میں شہر کا شہر
گھٹے گھٹے ہوئے زندانِ نازیاں کی طرح

زبان کٹ گئی مدحِ ستم گراں کرتے
ضمیر بک گئے اسبابِ مفلساں کی طرح

مسائلِ دل و جاں حل کئے گئے لیکن
سخن طرازیِ اجلاسِ ناصحاں کی طرح

اک ایسے گھر میں رہائش مجھے وعید ہوئی
کہ جو قفس کی طرح تھا نہ آشیاں کی طرح

ملا اک ایسا تمدن مجھے وراثت میں
جو اجنبی کی طرح تھا نہ باپ ماں کی طرح

جدھر جدھر سے بھی گزرا جلوسِ رسوائی
کھڑے تھے لوگ دریچوں میں شمع داں کی طرح

لئے ہوئے مرے ناکردہ جرم کی فردیں
ہر ایک دوست ملا مرگِ ناگہاں کی طرح

بوقتِ قتل بہت دور میرے سارے عزیز
صف آزما تھے نگہبانِ آسماں کی طرح

جنوں کی آگ میں جل بجھ چکا ہے میرا وجود
میں اُس کی راکھ سے ڈالوں کہاں کہاں کی طرح

مصطفیٰ زیدی

وہ

فن کار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی
وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی

اُترا تھا جس پہ بابِ حیا کا ورق ورق
بستر کے ایک ایک شکن کی شریک تھی

میں ایک اعتبار سے آتش پرست تھا
وہ سارے زاویوں سے چمن کی شریک تھی

وہ نازشِ ستارہ و طنّازِ ماہتاب
گردش کے وقت میرے گہن کی شریک تھی

وہ ہم جلیسِ سانحۂ زحمتِ نشاط
آسائشِ صلیب و رسن کی شریک تھی

ناقابلِ بیان اندھیروں کے باوجود
میری دعائے صبحِ وطن کی شریک تھی

(غیر مطبوعہ)

--

پہلا پتھر

صبا ہمارے رفیقوں سے جا کے یہ کہنا
بصد تشکر و اخلاص و حسن و خوش ادبی
کہ جو سلوک بھی ہم پر روا ہوا اس میں
نہ کوئی رمز نہاں ہے نہ کوئی بوالعجبی

ہمارے واسطے یہ رات بھی مقدر تھی
کہ حرف آئے ستاروں پہ بے چراغی کا
لباسِ چاک پہ تہمت قبائے زریں کا
دلِ شکستہ پہ الزام بد دماغی کا!

صبا جو راہ میں دشمن ملیں تو فرمانا
کہ یہ تو کچھ نہ کیا ہو سکے تو اور کریں
کہ اپنے دستِ لہو رنگ پر نظر ڈالیں
کہ اپنے دعوئ معصومیت پہ غور کریں

حدیث ہے کہ اصولاً گناہ گار نہ ہوں
گناہ گار پہ پتھر سنبھالنے والے
اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر رکھیں
ہماری آنکھ کے کانٹے نکالنے والے

غیر مطبوعہ

--

محدود خاندان خوشیوں سے بھرپور ہوتا ہے کیونکہ سب کو بہتر
تعلیم، اچھی غذا اور کپڑے فراہم ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر طرح
سے خوشی ہی خوشی میسر رہتی ہے۔
منظم اور خوشحال گھر کی طرح ایک محدود کنبہ بھی ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے خوشیوں سے بھرپور رہتا ہے۔
اپنے خاندان کو محدود کیجئے
اور بچوں کی پیدائش میں وقفہ ڈالئے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]

چھوٹا کنبہ
خوشحال کنبہ
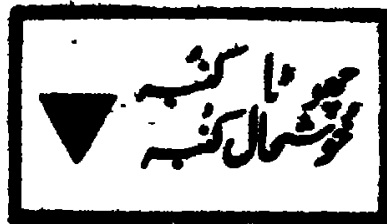
حسن ہمیشہ خوشی
کا سرچشمہ

احمد ندیم قاسمی

زیدی کا فن

مصطفیٰ زیدی کی "خودکشی" کی خبر سے متعلق جب ۱۳ر اکتوبر کو لاہور کے ایک روزنامے کا نمائندہ میرے تاثرات معلوم کرنے آیا تھا تو میں نے عرض کیا تھا کہ — مصطفیٰ زیدی کے فن میں اتنی زندگی اور رجائیت ہے کہ ان کا مبینہ اقدام خودکشی مجھے ان کے نظریۂ حیات سے متصادم نظر آتا ہے۔ بعد میں جو حالات سامنے آئے ہیں۔ ان سے مترشح ہوکر میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ اگر مصطفیٰ زیدی کو خودکشی ہی کرنا تھی تو یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک ایسی الوداعی تحریر چھوڑ کر ہم سے رخصت نہ ہوتے جس سے سارا منظر واضح ہو جاتا۔ اپنے اس مبینہ اقدام کے بارے میں مرحوم کا یہ سکوت اس امر کا شاہد ہے کہ جس شخص نے اپنی زندگی کے سولہ برس قانون کی گتھیاں سلجھانے میں گزار دیے اپنی موت کو کسی صورت میں بھی ایک الجھن نہیں بنا سکتا تھا۔ اگر انھیں خودکشی ہی کرنا تھی تو اپنی والدہ، اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے نام وہ چند سطور کی ایک وصیت ضرور چھوڑ کر جاتے۔

مصطفیٰ زیدی کا انتقال شعر و ادب کی دنیا کا ایک سانحہ ہے۔ ان کے فن کے بارے میں آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا اور لکھا جانا چاہیے۔ میں نے ان کی زندگی ہی میں ان کے فن سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کر لیے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۷ء میں لاہور کے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں زیدی مرحوم کے آخری مجموعۂ کلام "قبائے ساز" کی اشاعت کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں میں نے یہ تاثرات پیش کیے تھے۔

مصطفیٰ زیدی کا فن ۔۔ شاعری کا لفظ فارسی زبان میں مبالغے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ آپ شاعری نہ فرمایئے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ مبالغہ نہ کیجیے یعنی جھوٹ نہ بولیے۔ شاعری کو جھوٹ سے مترادف قرار دینے کا رجحان بہت پرانا ہے دراصل شاعروں اور شاعری کے نقادوں میں یہ نقطۂ نظر صدیوں تک عام رہا ہے کہ جب تک شاعر جھوٹ نہیں بولے گا۔ اچھا شعر نہیں کہہ سکے گا۔ یوں سلیقے سے جھوٹ بولنے کو بھی شاعری کا نام دیا جاتا رہا جب شعر و ادب میں حقیقت پسندی کی تحریک چلی تو اس کی مخالفت کے متعدد اسباب میں ایک سبب بھی شامل تھا کہ حقیقت اور صداقت تو شاعری کی دشمن ہیں۔ شاعری کے بارے میں یہ منفی اور مجہول رویہ اتنا قوی ہے کہ آج ہمارے ہاں جو مبہم، بلکہ بعض صورتوں میں بے معنی شاعری ہو رہی ہے، اسے بھی شعر و ادب میں حقیقت پسندی کی تحریک کا ردعمل قرار دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حقیقت سے فرار کی تاویل ہے۔

اردو میں جن شاعروں نے اپنے فن کی بنیاد حقیقت اور صداقت اور دیانت پر رکھی، اور اس کے باوجود فن کے جمالیاتی مطالبات کو نہ صرف پورا کیا، بلکہ انھیں اور نکھارا، ان میں مصطفیٰ زیدی کا ایک نمایاں مقام ہے۔ زیدی شعرا کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے شاعری کو سچ بولنا سکھایا۔ سچ بولنا ہر صورت میں مشکل ہے جب معاشرے کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہو تو سچ بولنا شیش محل پر پتھر پھینکنے کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ ہر معاشرے میں اس کی سزا

متزاد ہے۔ جس شخص کو یہ سزا قبول ہو گی وہی سچ بولنے کا حوصلہ کر سکے گا۔ پھر اپنے بارے میں سچ بولنا تو اس سے بھی زیادہ دشوار مرحلہ ہے یقیناً تہذیب کے بعض مثبت پہلو بھی ہیں۔ مگر اسی تہذیب نے ہمیں اپنے چہروں اور اپنی شخصیتوں پر خول چڑھائے رکھنا بھی سکھایا ہے ـــــ یوں ہم پوری زندگی اپنے آپ کو دھوکا دینے میں گزار دیتے ہیں اور اسے ہم نے وضع داری اور سفید پوشی وغیرہ کے سے مہذب نام دے رکھے ہیں۔ اس طرح جب ہم اپنے بارے میں سچ بولتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی راز فاش کر رہے ہیں اور ساتھ ہی صدیوں پرانے معاشرتی ضابطوں کو توڑ رہے ہیں اور معاشرتی ضابطوں کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ چنانچہ معاشرے کے حوالے سے اپنے بارے میں سچ بولنا سَر کو ہتھیلی پر رکھ لینا ہے۔ اسی لئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ مصطفےٰ زیدی شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اردو شاعری کو سچ بولنا سکھایا تو اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو حوصلہ مندی اور جرأت حقیقت اور صداقت، انصاف اور دیانت کی قدروں سے روشناس کرایا۔ اور کیا آج اس کے خلاف ردِ عمل کی زد میں آکر کسی فن کار کو خود اعتمادی حاصل ہو سکتی ہے؟"

مصطفےٰ زیدی نے صداقت اور حقیقت کو اپنے فن کی بنیاد بنایا ہے۔ مگر انھوں نے ان صفات کو ان کی مجرد صورت میں قبول نہیں کیا بلکہ انھیں شاعرانہ بصیرت کے ساتھ مشروط کر دیا ہے جس سے حقیقت اور فنی حقیقت کے مابین فرق نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وہ بصیرت ہے جو شاعر کو ایک مروجہ صداقت کا تجزیہ کرنا سکھاتی ہے اور ایک پاکیزہ تر اور بلند تر صداقت کی طرف لے جاتی ہے۔ مصطفےٰ زیدی کے کلام میں اس بصیرت کی جلوہ سامانیاں مصرعے مصرعے سے نمایاں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن ہر صداقت کی تجربہ گاہ ہے اور وہ اس تجزیئے کے بعد جس صداقت کو اپنے فن میں لاتے ہیں۔ اس کے چہرے پر بصیرت کی چھوٹ پڑ رہی ہوتی۔

ایک زمانے میں مصطفےٰ زیدی کا کلام پڑھ کر مجھے یہ خدشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ محض دروں بینی پر اکتفا نہ کر لیں۔ ظاہر ہے کہ دروں بینی کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ فن سے دروں بینی چھین لینے کا مطلب فن کار سے خود تنقیدی اور فکر و تامل کی قوتیں چھین لینا ہے۔ مگر جو دروں بینی اپنے ماحول، اپنے معاشرے، اپنے عصر سے کٹ جائے وہ مابعد الطبیعاتی صورت اختیار کر لیتی اور ادب کو محض مابعد الطبیعاتی بنا ڈالنے کو میں حقیقت اور صداقت کی تنسیخ قرار دیتا ہوں۔ یورپ سے واپسی کے بعد مصطفےٰ زیدی کے کلام میں دروں بینی کا یہ رجحان نمایاں ہونے لگا تھا، مگر آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیدی کے فکر میں نکھار کے لئے یہ مشق ضروری تھی۔ یہ اسی ریاضت کا نتیجہ ہے "قبائے ساز" کی نظموں اور غزلوں میں شاعر کی دروں بینی اور معاشرتی اور عصری احساسات گھل مل گئے ہیں اور یہ دروں بینی زیدی کے ہاں معاشرتی پس منظر میں اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہم ان کے محسوسات کو جیبوں اور کیتوں کی طرح چھو سکتے ہیں اور ان کی حدت اور نفاست سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ محسوسات کو حقائق میں بدلنے کی یہ نعمت بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے پھر اتنی گہری دروں بینی اور اتنے مکمل معاشرتی اور عصری شعور کے باوجود، تیز احساسات کی شعور پگھلا دینے والی شدت کے باوصف مصطفےٰ زیدی کہیں ہتھیار ڈالتے نظر نہیں آتے، وہ اداس بھی ہو جاتے ہیں، وہ رو بھی دیتے ہیں۔ مگر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ یہ رجائیت اس آدمی پر اعتماد کا معجزہ ہے جو شکست کھا کر بھی زیدی کے ہاں یہ نعرہ لگاتا ہے:

جاگ اے روح کی عظمت کہ سری خاک میں تنہا ہے!

مصطفےٰ زیدی کو لفظوں کی صحیح نشست کا جو ملکہ حاصل ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ وہ لفظوں کے شاعر کبھی نہیں تھے .... وہ محسوسات کے شاعر ہیں اور لفظوں کے مروجہ مفہوم کے سامنے سپر ڈالنے کے بجائے وہ ان کو نئے معانی سے آراستہ کرتے ہیں۔ "قبائے ساز" اور اس سے پہلے کے مجموعوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو زیدی کی نظموں اور غزلوں میں جگہ پا کر غیر معمولی طور پر چمک اٹھے ہیں۔ پھر یہ الفاظ جو بیشتر شاعروں کے لئے نظم و غزل کی تعمیر میں اینٹ، پتھر کا کام دیتے ہیں۔ مصطفےٰ زیدی کے ہاں باقاعدہ گونجنے لگتے ہیں۔

آخر میں مجھے مصطفےٰ زیدی کو مبارکباد پیش کرنا ہے کہ ان کی شاعری نے ان کی افسری سے ہار نہیں مانی۔ آج کا سی ایس پی بننے کے بعد کا کلام پڑھئے تو صاف معلوم ہو گا کہ ان کی شخصیت کے ان

دونوں پہلوؤں کے درمیان جگہ جگہ بڑے زور کا رن پڑتا ہے۔ اور ہر جھڑپ میں ان کا فن جیت رہا ہے اس کا گواہ ان کا سارا کلام ہے خصوصیت سے ان کی مشہور نظم "زخمِ سفر" پڑھئے جس کا موضوع شاعر کا قلم ہے مصطفےٰ زیدی اس نظم میں کہتے ہیں ؎

زمانہ یوں تو ہر اک پر نظر نہیں کرتا
قلم کی بے ادبی درگزر نہیں کرتا

اور پھر

سنو! قلم کے مہمات جاننے والو
دلِ حیات کی ضربات جاننے والو
مزاجِ ارض و سماوات جاننے والو
ادب کے جملہ مقامات جاننے والو
تمہیں نہ صرف شبستاں میں جاکے لکھنا ہے
ہر ایک عہد کے زنداں میں جاکے لکھنا ہے

اور آخر میں

جہاں بھی مطلعِ حق پر سحاب اُٹھے گا
کسی قلم سے کوئی آفتاب اُٹھے گا

اِن اشعار میں افسرانہ شان نہیں قلندرانہ شان ہے۔ شاعرانہ شان ہے۔ میں مصطفےٰ زیدی کی اسی شاعرانہ شان کا دل سے قدر دان ہوں۔ اس لئے کہ انکی یہ شان صرف ان کی جرأت ہی کی غماز نہیں ہے اس میں تو اس دیانت کو نمائندگی حاصل ہے جو اگر کسی شاعر سے چھن جائے تو باقی صرف ایک تک بند رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ دیانت ہے جس نے مصطفےٰ زیدی کی شاعری کو ان کی دوسری تمام حیثیتوں پر فوقیت دے رکھی ہے۔ اور یہی دیانت ان سے اس قسم کے عصر آفریں اشعار کہلواتی ہے۔

اِک دن عجب نہ ہو کہ دنیا کے واسطے
کوہ نساجوں کا مسلک رندانہ چھٹ گیا

●●

● تجدید خریداری منی آرڈر سے کیجئے

ڈاکٹر مسیح الزماں

مصطفیٰ زیدی، فن اور شخصیت

سید مصطفیٰ حسین زیدی تیغ الہ آبادی کی سب سے پرانی یاد میرے ذہن میں ایک رومانی نوجوان کی شکل میں ابھرتی ہے۔ یہاں رومانی کا لفظ میں نے عشق بازی کے عام مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اسکے اصلی معنوں میں۔ وہ بڑے جوشیلے، حساس، زود رنج، جذباتی اور تخیل پسند تھے۔ اُن کے والد سید لخت حسنین کسی سرکاری دفتر (غالباً سی۔ آئی۔ ڈی) میں اسٹینو اور شارٹ ہینڈ کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ دو شادیاں کی تھیں۔ کثیر العیال تھے۔ مصطفیٰ حسنین اور ان کے بڑے بھائی مجتبیٰ حسنین جن دو بھائیوں کو مجھے زیادہ قریب سے جاننے کا موقع ملا دونوں دوسری بیوی سے پیدا ہوئے تھے۔ مجتبیٰ حسنین کا جھکاؤ مذہب کی طرف تھا اور مصطفیٰ حسنین کا لا مذہبیت کی طرف۔ یہ سب بھائی بڑے ذہین، اطباع اور صلاحیتوں والے تھے۔ مجتبیٰ حسنین تقریباً دو سال بڑے تھے اور تعلیم میں بھی اتنا ہی آگے تھے۔ وہ نستعلیق قسم کے بردبار نوجوان تھے۔ اُن کے مقابلے میں تیغ سرگرم کارکنوں کی وضع میں انقلابی، ایک حد تک منہ پھٹ اور غصہ ور نظر آتے تھے۔ زیادہ تر کھدر کا سفید کرتا پاجامہ پہنتے تھے اور جاڑوں میں سیاہ رنگ کی جواہر بنڈی یا کوٹ پتلون۔ اس وقت وہ کرسچین کالج الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے اور ادبی جلسوں میں کبھی کبھی نظر آجاتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی میں بی۔ اے میں داخل ہو گئے۔ اردو بھی ان کا ایک مضمون تھا۔ میرے لکچر کلاس میں بھی آتے تھے اور ٹیوٹوریل میں بھی۔

مگر ایک دن سہ پہر میں کسی نے مجھے بتایا کہ باہر کے کمرے میں مصطفیٰ حسنین نام کے ایک طالب علم بیٹھے ہیں۔ میں نے سن لیا اور کوئی کام کر رہا تھا اس میں لگا رہا۔ خاصی دیر کے بعد میں باہر کے کمرے میں گیا تو دیکھا تیغ بیٹھے ہوئے کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے متعجب ہو کر کہا "ارے تیغ صاحب آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ کہلایا کیوں نہیں۔ مجھے تو معلوم ہوا تھا کہ مصطفیٰ حسنین آئے ہیں۔" انھوں نے نظریں جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا "میرا نام تو مصطفیٰ حسنین ہی ہے۔" میں نے دیر سے نکلنے کی معذرت کی تو مسکرا کر ریڈیو اسٹیشن سے متعلق کوئی بات کرنے لگے جس کے سلسلے میں وہ آئے تھے۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تیغ کے تخلص سے انکی شخصیت اس قدر وابستہ ہو چکی تھی کہ مصطفیٰ حسنین کا نام سن کر میرا ذہن ان کی طرف منتقل نہیں ہوا حالانکہ ہفتہ میں پانچ بار رجسٹر سے ان کا نام پکارتا تھا۔ اس کے کوئی دس سال بعد انھوں نے ڈیرہ غازی (مغربی پاکستان) سے مجھے لکھا:

> بہت دن ہوئے جب میں شروع شروع میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو آپ نے مصطفیٰ حسنین کے نام سے مجھے پہچانا نہیں تھا اُس وقت میں تیغ تھا۔ کس تخلص کی قضا بیت کو میں عین کی علیلوں میں سمجھتا ہوں۔ آخر تخلص کے بغیر بھی گزر ہو ہی سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی تخلص کے علاوہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی سے ابھی تک میں بھی مانوس نہیں ہوا ہوں، آپ کو تو شاید اور بھی مدت درکار ہو۔
>
> مصطفیٰ زیدی
>
> (پہلے کے تیغ الہ آبادی)

وجہ میں تیغ کا ... ایک جھٹکا سا لگا ہیئت کذائی

جوشیلے انداز کی وجہ سے میں توقع کرتا تھا کہ وہ باتیں زیادہ بنائینگے
گرم کرینگے۔ مرعوب کرنے کے لئے مشہور مصنفین اور کتابوں کے نام
گے، انٹلکچول بننے کی کوشش میں کچھ نقرے سنا مقولے اور اصطلاحوں
جگہ جگہ جا و بے جا استعمال کریں گے اور سوڈے کی بوتل کی طرح
جوش و خروش کا اظہار کریں گے۔ لیکن مجھے وہ اس سے بالکل مخالف
آئے۔ کلاس سے جانے کی کبھی چھٹی نہیں مانگی، ہمیشہ کتاب انکے
ں ہوتی تھی اور ٹیوٹوریل کا دیا ہوا کام مستعدی اور پابندی سے
تے تھے۔ درجے کے علاوہ بھی مجھ سے ملتے تھے مختلف پہلوں پر باتیں
ی تھیں لیکن کبھی درجے میں انھوں نے اس قرب کا غلط فائدہ اٹھانے
کوشش نہیں کی۔ اس زمانے میں میں نے بچوں کے لئے ایک مختصر سا
ڈراما لکھا تھا جس کا عنوان غالباً ریل تھا اور جو اس کورس سے شروع
تا تھا۔ اس وقت صرف پہلے دو مصرعے یاد آتے ہیں:

ریل چلے گی چھک چھک چھک ـــــ چھک چھک
سیٹی دے گی کو کو کو ـــــ کو، کو

یہ ڈراما "کھلونا" میں شائع ہوا۔ جس دن کھلونا بازار میں آیا
ں کے دوسرے دن جب میں کلاس میں گیا اور حاضری لینے کے بعد
ڈ پر نظر ڈالی تو یہ کورس پورا لکھا ہوا تھا۔ تحریر تیغ کی تھی۔ میں نے
اکر تیغ کی طرف دیکھا۔ وہ دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے
زیر لب مسکرا رہے تھے۔ میرے چہرے پر ناگواری کا کوئی نشان نہ
ا انھوں نے کہا "سر آج ہمیں ڈرامے ہی کے بارے میں بتایئے۔"
ں نے جواب دیا ـــــــــــ "ڈرامے کے بارے میں جاننے
کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے کرکے دیکھا جائے لیکن قصیدے کے
ے میں ایسا نہیں جو ہمیں آج پڑھنا ہے۔۔۔" تقریباً پندرہ دن
د ایک شام مجھے وہ ترسوپیا کے ایک مکان میں ایک ادبی تقریب
ے وعدہ کرکے لے گئے۔ وہاں پہنچا تو ادبی جلسوں والی جانی
صورتیں ایک بھی نہیں تھیں۔ کچھ دیر میں چند بچوں نے "ریل" کا
یا اور تیغ مسکراتے ہوئے داد طلب ہوئے۔ اسی زمانے کو یاد
ہوئے انھوں نے اپنے مجموعہ کلام "تشنگی" کے دوسرے ایڈیشن
لکھا ہے:

اس مجموعے کی تمام نظمیں ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان کی ہیں۔
یہ نظمیں مجھے الٰہ آباد کے ان دنوں کی یاد دلاتی ہیں جب خوشی خوشبو
کی طرح اور غم خم کی طرح ہوتا تھا۔ ادب، جمالیات اور جدلیات
پر دن رات بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ بحث میں شامل ہونے والے بزرگ
بھی تھے، جوان بھی تھے اور محض دیکھنے والے بھی۔ فراق گورکھپوری،
اپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، واحد جونپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین،
پروفیسر مسیح الزماں اور مسعود اختر جمال کے ساتھ ساتھ معصوم رضا
راہی، دیوندر اسر، اور میں ان نوجوانوں میں سے تھے جو ان صحبتوں
میں بیٹھتے تھے۔ کبھی بیت بازیاں ہوتی تھیں اور اس شرط کے ساتھ
کہ صرف غالب، میر، سودا اور انیس کے کلام کے حصے سنائے
جائیں گے..... جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی اور مجاز مرحوم
بھی گاہے گاہے الٰہ آباد آجاتے تھے۔ آئے دن مشاعرہ ہوتا تھا،
افسانے اور مضامین پڑھے جاتے تھے۔ ادب برائے ادب پر بحث
ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے موٹے ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ بلغزہ
نگاہوں سے لے کر خطرناک محبتوں تک کے مراحل طے ہوتے رہتے تھے۔

اس زمانے میں وہ جوش ملیح آبادی سے بہت متاثر تھے۔ ان
سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ کلام کا زور بھی بڑی حد تک جوش کی دین ہے
لیکن جوش کا انداز انھوں نے اختیار نہیں کیا کیونکہ ان کی طبیعت فکر کی
طرف زیادہ مائل تھی۔ وہ گہرے مطالعہ کے قائل تھے اور کتابیں لالا کر
اس کے بعض حصوں کو سمجھتے تھے ان پر بحث کرتے تھے اور بہت سعادت مند
شاگردوں کی طرح پیش آتے تھے۔ جو انتہا پسندی ان کے مزاج میں
تھی اس کے جلوے اس سلسلے میں بھی نظر آجاتے تھے۔ وہ جس استاد
سے عقیدت رکھتے تھے اس کی نگاہ التفات میں کمی کا شبہ ہوتا تو اسے
بہت زیادہ محسوس کرتے تھے۔ ان کے قطعات کا ایک مجموعہ "زنجیریں"
ان کے یونیورسٹی میں داخل ہونے کے پہلے ہی چھپ چکا تھا۔ بی اے
میں داخل ہونے کے پانچ مہینے کے بعد ایک دن انھوں نے یہ مجموعہ
میری نذر کیا۔ جلد الٹتے ہی میری نظر اس عبارت پر پڑی:

مشفق و محترم

ظاہر ہے کہ ایامِ جہالت کی اس شاعری کو اگر آپ ناقدانہ نگاہ سے دیکھیں گے تو مجھے سزا پائیں گے۔ لیکن اگر اس نغمے کے پس منظر میں آپ میرے بے پایاں خلوص اور بے حد احترام کو بھی پیش نظر رکھیں تو یقیناً آپ مجھے وہ اہمیت دینے پر مجبور ہو جائیں گے جو آپ اپنے سب سے زیادہ نیازمند شاگرد کو دے سکتے ہیں کیونکہ میں ہوں آپ کا

سب سے زیادہ نیازمند شاگرد

نومبر ۱۹۳۸ء تیغ الہ آبادی

یہ لگاؤ کی شدت بھی اسی رومانی مزاج کی خصوصیت ہے جس کے بارے میں میں نے ابتدا میں اشارہ کیا ہے۔ "زنجیریں" کے قطعات جسے تیغ نے اوپر ایامِ جہالت کی شاعری کہا ہے خاموش اشاریت، رومان پروری اور سنِ بلوغ کو پہنچنے والے نوجوان کی جذباتیت کے ساتھ ساتھ غنائیت اور جمالیاتی کیفیت رکھتے ہیں:

یاد جب آتی ہیں کالج کی سہانی راتیں — اور نم کرتی ہیں پھر وہ مری چشمِ نم کو
کوئی سر رکھ کے مرے دوش پہ یہ کہتا ہے — کس لیے روٹھ گئے کچھ تو بتاؤ ہم کو

آج وقتِ وداع اے ہمدم — میری آنکھوں میں اشک بھر آئے
ہٹ گیا کوئی یوں پسِ چلمن — جیسے بادل میں چاند چھپ جائے

کتنی معصوم ہیں یہ گاؤں کی دوشیزائیں — جیسے تاروں کی حسیں چھاؤں میں آکاش کی بیٹی
تکتی ہوں میں بڑی دیر سے گھونگھٹ کی قطار — اور سمجھتا ہی نہیں کوئی مرا مطلب کیا ہے

"زنجیریں" کا انتساب ہے:

"س" کے نام

جس کی ہر ہر ادا تھی کالج میں — زندگی کے خواب کی تعبیر
جس کے چہرے پہ گنگناتی تھی — صبح کی نقرئی حسیں تنویر

اور انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام "روشنی" کو پہلے ایڈیشن میں اس طرح معنون کیا تھا:

پریم کمار جین
کے نام

ترے جمال کو احساس یا درد ہو کہ نہ ہو

بچے پڑے سے ہیں ترانے ستارہ زخمی ہیں
حیات سوگ میں ہے بے نوا دلہن کی طرح
کہ نوجوان امنگوں کے ساز زخمی ہیں

"روشنی" کے اسی ایڈیشن کا دیباچہ بزرگوں، ادیبوں اور دوستوں کے شکریے کے بعد ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

اور جن ہستیوں کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے وہ ہیں۔

— سروج بینڈا، اگر "سرلا" کیر، پریم کمار جین اور خود میں!

یہ فہرست مئی ۱۹۴۹ء تک کی ہے۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی ہی میں اس میں اضافے ہوئے جو کافی شدت اختیار کر گئے۔ ایک سلسلے میں تو مجھ سے اور ڈاکٹر اعجاز حسین سے وہ بہت خفا ہو گئے اس لیے کہ ان کے حکم سے چپراسی نے اردو ڈپارٹمنٹ کے بالائی منزل پر استادوں کے بیٹھنے والے کمروں کو پہلے سے کھولنا بند کر دیا۔ تیغ انھیں انگریزی کے ایم۔ اے پریویس کے طالب علم تھے۔ انھوں نے شکایت کا ایک دفتر اعجاز صاحب کے نام لکھ مارا۔ پھر مجھ سے مل کر بہت سی شکایتیں کیں۔ میں عمر میں ان سے صرف پانچ سال بڑا تھا لیکن سمجھانے پر وہ مان لیا کرتے تھے اور اس طرح پیش آتے تھے جیسے میں ان سے انیس بیس سال بڑا ہوں۔ "اسے کیا کہتے ہیں" کے نام سے ان کا جو خط اسی رسالے میں کسی اور جگہ چھپا ہے وہ بھی اسی دور کی یادگار ہے جس میں انھوں نے بھڑاس نکالی ہے۔ اس کی انانیت اور جذباتیت اس زمانے کے تیغ کا عکس ہے۔ وہ بڑے ہونہار، ذہین، اور بیدار مغز طالب علم تھے بی۔ اے انھوں نے نمایاں طور پر پاس کیا۔ لیکن ایم۔ اے پریویس انگریزی کا امتحان دینے کا وقت آیا تو اس دن میری بھی ڈیوٹی تھی۔ وہ ہال میں نہیں تھے۔ مجھے بڑی تشویش ہوئی۔ دوپہر کو معلوم ہوا کہ وہ اسپتال میں ہیں اور خودکشی کی کوشش میں وہاں تک پہنچا دیے گئے ہیں۔

مضمون یونہی بڑی حد تک ذاتی ہو چکا ہے۔ ان سے ملنے اور اسپتال سے باہر آنے کے بعد ان کی باتوں کے ذکر میں کئی ایسے نام بھی آ سکتے ہیں جن کے استاد ہونے کی حیثیت سے ان کا لحاظ رکھنا میرا فرض ہے بلکہ ایک سلسلے میں تو بنارس میں شریک کار ہونے کی مزید پابندیاں قلم روکتی ہیں۔ اس لیے "افتادِ وداع" کی تفصیل چھوڑ کر اس

جذباتی نوجوان کے مزاج، پرشور متلاطم ندیوں کے سے جوش و خروش اور تندی و تیزی (Intensities) کا اندازہ کیجئے جو اب شہناز گل سے لگاؤ کے بعد آخری نیند سو گیا ہے۔ مجھے غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے:

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھے

رغبت اور احساس تیغ کے یہاں وجدانی ہیں۔ عقل کی گنجائش وفورِ شوق میں نہیں رہتی وہ حسن اور محبت سے حاصل کی ہوئی بصیرت میں پیش کرتے ہیں۔ تڑپ یا کشش میں وہ بے قابو ہیں اور یہی جذبہ ان کے یہاں شدتِ اظہار بن کر ظاہر ہوتا ہے: نظم "دور کی آواز" میں یہ کیفیت دیکھئے۔

عمر بھر کے لئے تمہارے پاس
رہ گئی ہے شگفتگی میری
آخری رات کے اُداس دیو
یاد ہے تم کو بے بسی میری؟
یاد ہے تم کو جب بھلائے تھے
عمر بھر کے کیے ہوئے وعدے
رسم و مذہب کی ایک پجارن نے
ایک چاندی کے دیوتا کے لئے
جانے اس گار، گاہِ ہستی میں
اس کو وہ دیوتا ملا کہ نہیں
میری کلیوں کا خون پی کر بھی
اس کا اپنا کنول کھلا کہ نہیں
آج کل اس کے اپنے دامن میں
پیار کے گیت ہیں کہ پیسے ہیں
تم کو معلوم ہو تو بتلانا
اُس کے کپڑوں کے رنگ کیسے ہیں
مجھ کو آواز دو کہ صبح کی اُدس
کیا مجھے اب بھی یاد کرتی ہے
میرے گھر کی اُداس چوکھٹ پر
کیا [illegible] اترتی ہے؟

اقتباس ذرا لمبا ہو گیا لیکن مصطفےٰ زیدی کے کلام کی ہندوستان میں کیابی کے پیشِ نظر بھی اور ان کی وارفتگی اور شدّتِ احساس کو نمایاں کرنے کے لیے بھی لمبے اقتباسات ضروری معلوم ہوتے ہیں یعنیا نہیں کہ مصطفےٰ حسنین یا تیغ محبت میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن ان کا جوش، جذبات کا وفور اور انانیت محبوب سے اتنے زیادہ مطالبات کرتا تھا کہ ان کے حصّہ میں مایوسی زیادہ رہتی تھی۔ پا لینے کے بعد بھی نہ پانے کا احساس، التفات و کرم کے بعد بھی تشنگی کی کیفیت جیسے ان کا مقدر تھی۔ یہ تمام شدید قسم کے ________ رومان پسندوں کا مقدر ہوتی ہے جو حقیقت و واقعیت سے آنکھیں بند کر کے خیالی دنیاؤں میں رہتے ہیں جو جذبات کے وفور کو محنت کا حاصل جانتے ہیں اور عملی زندگی اور اپنی خواہشات میں توازن نہیں لا پاتے۔

اسی آئینے نے دیکھے ہیں ہمارے جھگڑے
یہی زینہ ہے جہاں میں نے اُسے چوما تھا
ان قمیصوں میں ان اُلجھے ہوئے رومالوں میں
اُس کے بالوں کی مہک آج بھی آسودہ ہے
جو کبھی میری تھی انکار پہ بھی میری تھی
اب فقط بزمِ تصور میں نظر آتی ہے
رات بھر جاگ کے لکھی ہوئی تحریروں سے
اب بھی ان آنکھوں کی تصویر اُبھر آتی ہے

•

چاندنی کھل کے نکھر آئی ہے دروازے پر
اوس سے بھیگتے جاتے ہیں پرانے گملے
کس قدر نرم ہے کلیوں کا سہانا سایہ
جیسے وہ ہونٹ جنہیں پا کے بھی میں پا نہ سکا
اے تڑپتے ہوئے دل اور سنبھل اور سنبھل
یہ تری چاپ سے جاگ اٹھیں گی تو کیا ہوگا

•

صبح کیا جانے کہاں ہوتی ہے کب ہوتی ہے
جانے انسان نے کس وقت [illegible]

میری قسمت میں بس اک سلسلۂ شام و سحر
میرے گھر کے مقدر میں فقط تنہائی

میں پوچھتا ہوں کہ اے رنگ و نور کی دیوی —
علاج تیرہ شبی کیا اسی کو کہتے ہیں
بجھے بجھے سے یہ مفلس نصیبیے نہ جانے کیا
سُلگ سُلگ کے تری بے حسی کو تکتے ہیں
یہ گیت سر بگریباں ہیں تیرے جانے سے
یہ نوعروس بہارے بڑھا رہے ہیں سہاگ
کلی کلی کو تری بے رُخی کا شکوہ ہے
نفس نفس سے نکلتی ہے ایک ایسی آگ

اور اب جب نہ کوئی درد نہ حسرت نہ کسک
اک لرزتی ہوئی لَو کو تہِ داماں نہ کرو
تیرگی اور بھی بڑھ جائے گی ویرانے کی
میری اُجڑی ہوئی دنیا پہ چراغاں نہ کرو

اس طرح کی نظموں کا ایک سلسلہ ہے جو ان کی زندگی سے ہم آہنگ ہے لیکن میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس شدّتِ احساس نے مصطفےٰ زیدی کے یہاں الفاظ کے کیسے خوبصورت شیشوں میں ڈھلنا سیکھا ہے۔ ان استعاروں میں جاذبیت اور تازگی ہے جو ذہنی تجربے کو دلکش پیکر بنا دیتی ہے جس میں جمالیاتی کیف کی گنگناہٹ ہے۔

ان کی غزلوں میں یہ تجربے ایک دوسرے انداز سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہاں ٹھہراؤ بھی ہے اور واقعیت پسندی کی جھلکیاں بھی جو ان کی غزلوں کو انفرادیت بخشتی ہیں:

جسے کل تک حیا سے بات کرنا بھی نہ آتا تھا
ذرا ہم بھی تو دیکھیں اس کا اندازِ ستم لوگو
گزرنے کو تو ہم پر تم سے نازک وقت گزرے ہیں
نہ اپنی شکل آزردہ نہ اپنی آنکھ نم لوگو

خلوصِ دوست داری نے ہمیں جو دن دکھائے ہیں
ہمیں ان کا خیال آتا ہے لیکن تم سے کم لوگو
بہ قدرِ ظرف سب نے پیار کی قیمت لگائی ہے
کبھی آنسو، کبھی نغمہ کبھی دام و درم لوگو

جو دن گزر گئے ہیں ترے التفات میں
میں ان کو جوڑ دوں کہ گھٹا دوں حیات میں

ہم نے تو لُٹ کے محبت کی روایت رکھ لی
ان سے تو پوچھئے وہ کس لئے پچھتاتے ہیں

انھیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

ضبط اے دلِ بیتاب دوسروں کی محفل ہے
لوگ اس کی پلکوں میں ڈھونڈھ لیں گے افسانے

اس جذباتی دنیا سے دور مصطفےٰ زیدی کی ایک فکری دنیا بھی ہے جس میں وہ زندگی کی بے رحمیاں بھی دیکھتا ہے اور استحصال کا جبر بھی اور وہ کبھی اس جبر کو دور کرنے کے لئے تڑپتا ہے اور کبھی انفرادی غم سے غمِ کائنات تک پہنچ جاتا ہے۔

تیرے غموں سے ایک بڑا فائدہ ہوا
ہم نے سمیٹ لی دلِ مضطر میں کائنات

مصطفےٰ زیدی کا خیال ہے کہ انسانی رشتوں میں جس آئینۂ جمال کی وجہ سے استواری ہے وہ جیسے کو زندگی کی قدر بنانے والی معاشر میں چکنا چور ہو جاتا ہے اور انسانی چہرہ اپنی بنیادی کثافتوں کے ساتھ نمایاں ہونے لگتا ہے۔ وہ اس آئینۂ جمال کو دوبارہ پا لینے کا بھی تقاضا کرتا ہے اور اس ازلی و ابدی تمنا سے بھی بے خبر نہیں جس کی وجہ سے فکری اور ابدی انسانی باتیں ہو جاتی ہیں۔
[illegible] جمال آدھا تھا اس نظم

کہ جس کے ماتحت سُنا ہے ساری کائنات ہے
میں سوچتا تھا دل میں عرش و فرش کو سمیٹ کر
کدھر سے آئے ہیں یہ قافلے کدھر کو جائیں گے
یہ عمر ہیں جو سوچئے تو خار سوچئے تو گل
پھینک سکیں تو کس کے حق میں زہر کس کو انگبیں
خیال تو بھٹک چلا تھا اور ابھی کہ یک بہ یک
زمیں پہ ایک سانپ زخم کھا کے چور ہو گیا
فضا میں ایک چیل دائرے بنا کے رہ گئی

سماج کی پیچیدہ ساخت پر ان کی نظر تھی اور وہ جانتے تھے کہ اس تماش میں انسان اور انسانیت کس جگہ پر ہیں تاہم انھیں اس یقین بھی تھا کہ ان حالات پر ایک نہ ایک دن قابو پالیا جائے گا اور زندگی کو اس طرح سنوارا جاسکے گا کہ وہ جنت بن جائے۔ وہ صرف سرمایہ داری، صنعتی نظام کو بُرا نہیں کہتے کیونکہ یہ تولد ووشاری ہیں بہت فرسودہ سی چیز بن کر رہ گئی ہے بلکہ انھیں سماج کی دوسری برائیوں کا بھی علم ہے جس کی طرف وہ اشارے کرتے ہیں:

لعنتیں یوں تو مشینوں کی بہت ہیں لیکن
لعنتیں صرف مشینوں سے نہیں اگتی ہیں
ان میں اس ملک کا بھی ہاتھ ہوا کرتا ہے
جس میں کچھ لوگ خود اپنی ہی بقا کی خاطر
دوسرے لوگوں کے انفاس چُرا لیتے ہیں
اور اس دوڑ کی رفتار میں اندھے ہو کر
قحط پڑتا ہے تو کھلیان جلا دیتے ہیں
ان دماغوں کو جو تخلیق پہ آمادہ ہیں
جیل کے آہنی بستر پہ سُلا دیتے ہیں

مئی ۱۹۵۶ء میں مصطفیٰ زیدی نے ایک فورڈ پریفیکٹ خریدی اور ایک عزیز اور ایک دوست کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے سفر پر چل پڑے۔ کبھی کبھی اس سفر کا حال مصور کارڈوں کے ذریعہ میرے پاس بھی پہنچتا رہا۔ اس سفر میں ان کی ملاقات ایک جرمن لڑکی ویرا فان ہل سے ہوئی۔ ۱۹۵۷ء کے آخر میں ایک خط میں انھوں نے اطلاع دی — "آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ ویرا فان ہل کا نام اب ویرا زیدی ہو گیا ہے۔" میں نے سوچا یہ بیتاب موج ساحل آشنا ہو گئی۔ لیکن موج اور ساحل کا ربط ٹھہراؤ نہیں، جو کنارے سے لپٹ لپٹ کر پھر دھارے کی طرف لہراتی نہ جائے وہ موج ہی نہیں۔ وہ بے قرار روح ایک جگہ ٹھہرنا تو جانتی ہی نہ تھی۔

زیدی سرکاری افسر ہو گئے۔ پاکستان کی سرکاری مشین کا جزو بن گئے اور اپنی ہوش مندی، انتظامی صلاحیت، کارکردگی کے حسن پر اہم سے اہم تر درجے حاصل کرنے لگے۔ ان مختلف مصروفیتوں میں پرانی یادوں کا بھی ہوش نہیں رہا یا یوں سمجھئے کہ فاصلے اور مشغولیت نے انھیں یکسر گھیر لیا اور نامہ و پیام کا سلسلہ جو سال میں دو چار خطوں سے زیادہ کا نہ تھا ختم سا ہو گیا۔ کافی دنوں کے بعد یہ اشعار ملے:

اپنے جیسے کئی آشفتہ جگر اور بھی ہیں — لیکن اے وقت وہ صاحب نظراں کیسے ہیں
کوئی ان چاہنے والوں کا ملجائے تو اتنا پوچھیں — آجکل اپنے مسیحا نفساں کیسے ہیں
آندھیاں تو یہ سُنا ہے کہ اُدھر بھی آئیں — کونپلیں کیسی ہیں شیشوں کے مکاں کیسے ہیں

اور پھر اس کے بعد ان کی معزولی کی خبر ملی۔ ان کا پتہ معلوم نہیں تھا، پرانے پتوں سے اور بعض رسائل کی معرفت میں نے کئی خط لکھے لیکن کوئی جواب نہیں ملا اور پھر ایک دن وہ خبر سننے میں آئی جو ہم سب کے لئے افسوس اور رنج کا موقع تھی۔ اب تو جتنے منہ اتنی باتیں کا معاملہ ہے۔ ایک نظم میں اُنھوں نے لکھا تھا:

موت تو میرے لئے ایک تاثر ہے جسے
اک نہ اک روز ہم انسان دبا ہی لیں گے
اس دکھاوے کے تمدن سے نکل کر اک روز
اپنے انجام کے اس راز کو پا ہی لیں گے

میں سمجھتا ہوں کہ زیدی کی شوریدہ سری بڑی حد تک ان کے اس انجام کی ذمے دار ہے شاید یہ جینیس کی خصوصیت ہو لیکن انکی صلاحیتیں ادب کو بہت کچھ دے سکتی تھیں۔ نظم و نثر دونوں پر انھیں بڑی قدرت تھی چیزوں کو سمجھنے اور حالات کا تجزیہ کرنے کا بھی مادہ تھا سماجی علوم سے واقف مختلف عوامل سے آشنا لیکن جس طرف بڑھتے تھے ہمہ تن شوق اور سراپا کدّ و ہو کر بڑھتے تھے آخر صہبا کی یہ تندی آبگینہ کو پگھلا ہی گئی۔ ■■

غزلیں

انور حادث

مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہو

یہ غلط ترے کفن کو مری داستاں نہیں ہے
یہ نہیں کہ تیرے غم کا کوئی رازداں نہیں ہے

ترے زائرینِ مرقد سے ہنوز نابلد ہے
یہ جہانِ دوش و فردا جو ترا جہاں نہیں ہے

تری آہ کے شرارے ہیں ستیزہ کار کب سے
فلکِ ستمگری پر اثرِ فغاں نہیں ہے

تیرے نذر آبگینہ ہے خلوصِ بے ریا کا
مرے دستِ بے نوا میں کوئی ارمغاں نہیں ہے

تری خاک کا مقدر تب و تابِ جاودانہ
تری زندگی کی ضامن رگِ کہکشاں نہیں ہے

■■

عبدالحمید ارشد

اب کس کو پوچھتے ہو دوانہ تو مر گیا

اتنا تو یہ ضرور ہوا خود بکھر گیا
لیکن لہو سے رنگِ گلستاں نکھر گیا

کیفیتِ جمال و جلال و نگاہ و سوز
کتنے ہی حادثات سے شعلہ گزر گیا

وہ زہر جس کی ذہن کو پہچان بھی نہیں
وہ زہر درد بن کے بدن میں اتر گیا

ماتم کناں ہیں لوگ، پریشاں ہیں محفلیں
اب کس کو پوچھتے ہو دوانہ تو مر گیا

ارشد نشاطِ کار کی ابلہ فریبیاں
کیسے ہیں لوگ، کہتے ہیں طوفاں گزر گیا

■■

میں شب گزیدہ پھر بھی تلاشِ سحر میں ہوں

کچھ سوجھتا نہیں میں کسی کے اثر میں ہوں
مدت سے دوست محبسِ دیوار و در میں ہوں

منزل کو پا کے بھی مجھے منزل نہیں نصیب
دل کی یہ بات کس سے کہوں میں سفر میں ہوں

میں جانتا ہوں شب کی سیاہی ہے ناگزیر
میں شب گزیدہ پھر بھی تلاشِ سحر میں ہوں

کتنے حسین بگولے ہیں حسنِ نگاہ تک
بیچارگی نہ پوچھ کہ میں اپنے گھر میں ہوں

ارشد تمام رات نگاہوں میں کٹ گئی
بادِ سحر میں ماتمِ خونِ جگر میں ہوں

■■

مصطفیٰ زیدی

مصر

انگلستان جاتے ہوئے جبرالٹر کے بندرگاہ پر علالت کی حالت میں یہ نظم لکھی گئی تھی۔

یہ زندگی، یہ مختصر سی زندگی
اگر یونہی علالتوں کے سلسلے میں کٹ گئی
اگر یہ بانسری نہ اوس پی سکی، نہ چاندنی کے نرم گھاؤ سہہ سکی
اگر عروسِ شام کی ردا نحیف انگلیوں میں تھرتھرا کے رہ گئی
تو میں کہاں کہ خود اپنے حوصلے کے بل پہ اپنی زخم خوردہ کائنات کو سجاؤں گا
دریدہ پیرہن میں زرد پھول باندھ کر
میں سرخ کونپلوں کی انجمن میں کیسے جاؤں گا

سحر سویز پہ ہوئی
تو جلتی آنکھ، تپتے جسم، خشک لب کے باوجود
میں کیبنوں کی تنگیوں کو چھوڑ کر کھلی ہوا میں آ گیا
سویز اپنے ساحلوں کے درمیان ایسے بہہ رہی تھی جیسے کوئی اپنے حسن کا وقار جانتے ہوئے قدم اٹھائے
ادب سے ایک قطار میں جہاز ایسے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی جگنوؤں کا قافلہ گپھا میں جائے
زنگیوں کے چہرے یوں اُجڑ گئے تھے جیسے کوئی اک قدم کے فاصلے پہ موت سے نظر ملائے

نگارِ ارضِ نیل کے سنہرے جسم کے گداز سے لپٹ کے ایک ایک آرزو چہک گئی
نگارِ ارضِ نیل کی لٹیں کھلیں تو دور دور تک ہوا مہک گئی
ہوا مہک گئی تو کیا
کہ میں ڈٹال اور اسپرٹ کا مہمان تھا
سو تھکے ہوئے قدم
سفر کے پہلے سنگِ میل سے لپٹ کے رہ گئے

مجھے کسی ملول دل شکستہ یاد کی طرح
سلگتے آنسوؤں کی لوریوں میں نیند آ گئی

مگر حسین قاہرہ کی رات جاگتی رہی
عجیب بت کے عاشقوں کو موت آ گئی تو کیا
عجیب بت کی عظمتِ حیات جاگتی رہی

مصطفےٰ زیدی

ویلز کی گاڑی

دن بھر کے سورج کی ہمت ٹوٹ چکی تھی
ویلز کو جانے والی گاڑی چھوٹ چکی تھی
یہ احساس تھا جیسے دل آباد نہیں
جانے کونسا اسٹیشن تھا یاد نہیں ہے
یوں بے رنگ تھے جیسے دشت میں گزریں سوں
ہم ہونے کو کیا تودا ہوں یا کچھ ہوں

کافی دیر میں سہ پہر کی گاڑی آئی
ہم نے اپنا کوٹ سنبھالا ٹکٹ اٹھائی
کوریڈر میں داخل ہوتے ہی لہرائے
جسم کو جیسے بھولے سے بجلی چھو جائے
وہ منگیت تھی یا تارا تھی یا نسرین تھی
ایسی شکل تو سارے لندن میں بھی نہیں تھی

دو گھنٹوں میں دوست بنے ہم پیار جتایا
یہ قصہ تو خیر کسی فرصت پہ اٹھایا
لیکن اتنا یاد ہے جب سورج نے جگایا
وہ بھی نہیں تھی اپنا اسٹیشن بھی نہیں تھا
جانی پہچانی چیزیں تھیں خاموشی تھی
ویلز کی گاڑی، ویلز سے واپس آ پہنچی تھی

— —

مصطفےٰ زیدی

مارگریٹ

محل کے در پہ کلیسا کے طاقِ کہنہ میں
کہاں کہاں نہ چراغاں ہوا دلِ بیتاب
پھر ایک بار کسی بے ستون کا پتھر
مزاجِ تیشہ کا پرساں ہوا دلِ بیتاب
وہی قدیم کہانی نئے سرے سے چلی
وہی رقص وہی عنواں ہوا دلِ بیتاب
تمام رات بکنگھم میں دیپ جلتے رہے
تمام رات شہید اک ہوا دلِ بیتاب
جو لوریوں کے ترنم میں سج کے آتا تھا
وہ خواب خواب پریشاں ہوا دلِ بیتاب
کئی لباس تھے پر صرف چاک ہونے کو
ہم عاشقوں کا گریباں ہوا دلِ بیتاب
ابھی جب اپنی عنایات کا خیال آیا
سنا ہے حسن پشیماں ہوا دلِ بیتاب
نہ یہ کہ بات فقط ٹاؤن سنڈ پہ گزری
کسی کا ہم پہ بھی احساں ہوا دلِ بیتاب

— —

مصطفیٰ زیدی

ایک نظم

اس اداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی

میری مضمحل ہمدم
آج میری پلکوں پر
تیری انگلیوں کا لوچ
سسکیاں سی بھرتا ہے
ٹیٹ گیلری کے بُت
کیو گارڈن کے پھول
ٹیمز کی سُبک لہریں
خوں نگار شاور کے
وہم آزما کوٹے
ایسٹ اینڈ کی دنیا
فنچلے کے رستوراں
ڈسٹ منسٹر کے گیت
جیمز پارک میں تیرے
قرب کی جواں دھڑکن
انتظار کے پودے
اعتبار کی شبنم
میری مضمحل ہمدم
تیرا غم نہ اپنا غم

اس اداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی

مصطفیٰ زیدی

کربلا

کربلا میں تو گنہگار ہوں لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزندی کی
جسم سے رُوح سے احساس سے عاری کیوں ہے
ان کی مسمار جبیں ان کے شکستہ تیور
گردشِ چرخِ شب و روز پہ بھاری کیوں ہیں
تیری قبروں کے مجاور ترے منبر کے خطیب
فلس و دینار د تو جسے بھکاری کیوں ہیں

روضۂ شاہِ شہیداں پہ اک انبوہِ عظیم
بل ایر اور کرمسلر کے نئے ماڈل کو
اسی خاموش عقیدت سے تکا کرتا ہے
جس کو کہہ دوں تو کئی لوگ بُرا مانیں گے
غیر تو رمزِ غم کون و مکاں تک پہنچے
کربلا تیرے یہ غم خوار کہاں تک پہنچے

دل کو تہذیبِ تمنّا میں خدا ملتا ہے
جنبش یک لبِ عیسیٰ میں خدا ملتا ہے
شورِ ناقوس و نقارا میں خدا ملتا ہے
سنگِ محرابِ کلیسا میں خدا ملتا ہے
تیرے دیوانوں کو اے شاہدِ بیابانِ فرات
اپنی بے مائگی ذہن میں کیا ملتا ہے؟

(کربلا میں لکھی گئی)

مصطفیٰ زیدی

فرانس

یوں نرم نگاہی سے ہوا شام کا آغاز
جس طرح کبوتر کے پرے سر سے گزر جائیں
جیسے ترے گیسو مری آنکھوں پہ بکھر جائیں

اس شام سراپردۂ اسرار سے تقدیر
جھکتے ہوئے سورج میں نہاتی ہوئی نکلی
لوور کے در و بام سجاتی ہوئی نکلی

اس دیس سے آیا ہے ابھی ایک مسافر
جس دیس میں اک خوابگہِ یار ہے منزل
اک حرفِ جنوں، وحشتِ بیمار ہے منزل

اک عمر تو گزری ہے سرِ منبر کی محراب
اک شام گناہوں کی حرارت میں بھی گزرے
اے سیم بدن تیری عبادت میں بھی گزرے

ناچ اے لب و رخسار کے جلتے ہوئے حلقے
اس لمس کے تہذیب و تمدن سے لپٹ کر
اس شاہدۂ زیست کے اقرار سے کٹ کر

گا اے ابدی نیند سے مخمور جوانی
مرمر کی رگوں میں تپشِ جام اچھل جائے
پتھر کی قبا آنچ کے احساس سے جل جائے

جھوم اے دلِ دانا کہ وہ کل آ کے رہے گی
جب ہم دلِ ناداں کا علم لے کے چلیں گے
سینے میں غضب لب پہ قسم لے کے چلیں گے

زہرہ کے حسیں جسم اپالو کے حسیں خواب
ہم رنج کے نغمے تری تکذیب کریں گے
پیدل ہیں تو رفتار پہ تادیب کریں گے

اے عقل محبت کی سزا ہے کہ نہیں
اے جسم ترا پیار روا ہے کہ نہیں
اے پردۂ اسرار خدا ہے کہ نہیں

(پیرس) — —

مصطفٰے زیدی

نوحہ

(اپنے مرحوم بھائی مجتبٰی زیدی کی یاد میں)

تم کہاں رہتے ہو اے ہم سے بچھڑنے والو
ہم تمھیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں ؟
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے
بھائی آواز اگر دے تو سُنو گے کہ نہیں ؟
دشتِ غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے
کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہو گا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سُن نہ سکے
تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہو گا
ہم تو جس وقت بھی جس دن بھی پریشان ہوئے
تم نے آکر ہمیں محفوظ کیا ، راہ دکھائی
اور جب تم پہ بُرا وقت پڑا تب ہم لوگ
جانے کس گھر میں کہاں سوئے ہوئے تھے بھائی

(۲)

ہم تری لاش کو کاندھا بھی نہ دینے آئے
ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا
ہم نے اس زیست میں بس ایک نگیں پایا تھا
کسی تربت میں وہی ایک نگیں چھوڑ دیا
(نامکمل ـــــ وہ نوحہ جو کبھی مکمل نہ ہو سکا)

مصطفٰے زیدی

چیرنگ کراس

کوئی تم سے پوچھے ـــــ

ستاروں کی رونق، چراغوں کی قربت، شبستاں کے اسرار کافی نہیں تھے

جو تم نے کسی طاق دل سے لرزتی ہوئی موم بتی کی لو بھی چرالی ؟

کوئی ہم کو دیکھے ـــــ

سرِ رہ گزر ایسے بیٹھے ہیں جیسے

کسی نے ذرا بھی جو پوچھا تو اُس سے بگڑ کر کہیں گے

یہ دیر و حرم تو نہیں کعبۂ آستاں تو نہیں ہے

خدا کی زمیں ہے ، رہِ عام ہے کوچۂ یار نامہرباں تو نہیں ہے

مصطفیٰ زیدی

احسان فراموش

جب منڈیروں پہ چاند کے ہمراہ
بجھتی جاتی تھیں آخری شمعیں
کیا ترے واسطے نہیں ترسا اس کا مجبور مضمحل چہرا؟
کیا ترے واسطے نہیں جاگیں
اس کی بیمار رحم دل آنکھیں؟

کیا تجھے یہ خیال ہے کہ اسے
اپنے لٹنے کا کوئی رنج نہیں
اس نے دیکھی ہے دن کی خونخواری اس پہ گذری ہے شب کی عیاری
پھر بھی تیری طرح وہ بے چاری
ساری دنیا سے شکوہ سنج نہیں

زندہ باد اے انائے جذبۂ ضبط
مرحبا اے شکوہِ خدامی
اس کی قربت سے پھول تجھ کو ملے، زندگی کے نئے اصول ملے
تیری الفت سے کیا ملا اس کو
زحمتیں، اضطراب، بدنامی!

—

مصطفیٰ زیدی

ڈوور

آؤف ویڈر ذہن، فرالائن، آؤف ویڈر ذہن
(خدا حافظ خاتون خدا حافظ)
مے خانے سے میلوں جگمگ کرتی نہر
تیرے سینے کی طغیانی میں دل کی لہر
ریت کی دیواروں سے بنا تھا پیار کا پہلا شہر

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈوور کے ملاح
میں ان خوابوں کے مبہم سناٹے سے آگاہ
اونچی لہریں، بڑھتا دریا، نیچی شہر پناہ

شاید اس طوفان میں ساری بنیادیں ہل جائیں
یا مشرق اور مغرب کے ساحل اک دن مل جائیں
یہ مبہم مبہم سپنے کملائیں یا کھل جائیں
آؤف ویڈر ذہن، فرالائن، آؤف ویڈر ذہن!

—

مصطفیٰ نیابری

غزل

بے نور ہوں کہ شمعِ سرِ رہگذر میں ہوں
بے رنگ ہوں کہ گردشِ خونِ جگر میں ہوں

اندھا ہوں یوں کہ کور نگاہوں میں رہ سکوں
بہرہ ہوں یوں کہ قصۂ نامعتبر میں ہوں

ذرّے جوان ہو کے اُفق تک پہونچ گئے
میں اتنے ماہ و سال سے بطنِ گہر میں ہوں

لاکھوں شہادتوں نے مجھے واسطے دیئے
میں شب گزیدہ پھر بھی تلاشِ سحر میں ہوں

سفّاک بچپنوں کا کھلونا بنا ہوا
دنیا کی زد میں پنجۂ شمس و قمر میں ہوں

میں جنگلوں کی ذات سے تو بچ کے آ گیا
اب کیا کروں کہ وادیِ نوعِ بشر میں ہوں

جی چاہتا ہے مثلِ ضیا تجھ سے مل سکوں
مجبور ہوں کہ محبسِ دیوار و در میں ہوں

خوابوں کے رہرو! مجھے پہچاننے کے بعد
آواز دو کہ اصل میں ہوں یا خبر میں ہوں

اتنی تو دور منزلِ وارفتگاں نہ تھی
لیکن یہ راستوں پہ ہوں کہ ابھی تک سفر میں ہوں

کیسا حصار ہے جو مجھے چھوڑتا نہیں
میں کس طلسمِ ہوش رُبا کے اثر میں ہوں

زنداں میں ہوں کہ اپنے وطن کی فصیل میں
عزّت سے ہوں کہ جسم فروشوں کے گھر میں ہوں

مصطفیٰ زیدی کے

جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

شاعرو، سرو میں تشبیہہ کہاں ڈھونڈو گے
کہ وہ معیارِ قد و قامت و گیسو آئی

میرا قرآن تھا جو مصحفِ روشن وہ کھلا
میرا ایمان تھی جو جنبشِ ابرو آئی

شام کو قوسِ قزح ایسے بکھر کے نکلی
جیسے تو اپنے اٹھائے ہوئے بازو آئی

اپنے سینے پہ لئے پھرتی ہیں ہر شخص کا بوجھ
اب تو ان راہ گزاروں میں مری خو آئی

جانے کیوں آج ملک گیر ہے میری آواز
بامِ گردوں پہ گئی تھی کہ تجھے چھو آئی

(غیر مطبوعہ)

ڈاکٹر سید محمد عقیل

تیغ الٰہ آبادی
ایک ہم جماعت، ایک دوست

یادیں بھی کیسی نسٹالجک (nostalgic) ہوتی ہیں۔ مدیر کتاب نے تیغ الٰہ آبادی کے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش کر کے مجھے ایک لذت آمیز کرب میں مبتلا کر دیا۔ لذت یہ کہ اس دور کی دلچسپیوں، مشغولیت اور بے فکرے پن کی یادیں تازہ ہو کر لپٹنے لگے جب انسان کے قدم ہوا کے ساتھ اڑے اڑے اٹھتے ہوتے ہیں اور کرب یہ کہ امتداد زمانہ نے وہ ساری یادیں چشم زدن میں مٹا دیں۔ تقسیم ہند نے ایک اتنی بڑی فصیل کھڑی کر دی کہ جو اس پار گیا وہ گویا عدم آباد چلا گیا۔ بس فرق یہ کہ یہاں صرف یہ احساس ہے کہ فصیل کے دونوں طرف لوگ زندہ ہیں اگر کبھی گردش روزگار نے موقع دیا تو ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور عدم آباد میں ملاقات کا دار و مدار صرف روز محشر پہ ہے۔ تیغ ان لوگوں میں سے تھے جو ہم لوگوں سے اگر ... اس پار چلے گئے اور عدم آباد میں بسے رہ گئے۔

تیغ، الٰہ آباد کے ... رہنے والے تھے مگر ان کا خاندان بجنور کا تھا ... میں ... کا آبائی مکان تھا۔ ان کے آباؤ اجداد کب سے الٰہ آباد میں اقامت پذیر ہوئے اس کا علم نہیں ہاں ان کے والد مرحوم لحنت حسنین صاحب الٰہ آباد ... آئی۔ ڈی۔ کے محکمہ میں انسپکٹر تھے۔ خلافت کی تحریک ان دنوں زوروں پر تھی لحنت حسنین صاحب نے سرکاری

مصطفیٰ زیدی

ملازمت کے تحت، تحریک خلافت میں حصہ لینے والوں کو کافی گرفتار کیا چنانچہ مولانا محمد علی سے متعلق کر کے مسلمانان الٰہ آباد نے ان کے خلاف ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔

محمد کا دشمن علی کا عدو
کہاں کا ہوا لحنت حسنین تو

یہ وہ دور تھا جب تحریک خلافت مسلمانان ہند کے لئے ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔ اس لئے وہ کسی کی یہ غلطی کیسے برداشت کرتے چنانچہ لحنت حسنین صاحب کے خلاف مسلمانان الٰہ آباد نے اپنے غم و غصہ کا اظہار اس طرح کیا۔ لیکن لحنت حسنین صاحب کو میں نے دیکھا ہے۔ نہایت معقول اور متوازن آدمی تھے۔

تیغ صاحب، الٰہ آباد کے ماڈرن ہائی اسکول (جو اب کالج ہو گیا ہے) میں ہم لوگوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچا تو تیغ، نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ایک ہی شہر میں رہنے کی وجہ سے ملاقات پہلے سے ہی تھی جو محرم کی مجلسوں اور قصیدہ خوانی کی محفلوں سے شروع ہوئی۔ اس وقت تک تیغ نے شاعری نہیں شروع کی تھی اور صرف مصطفےٰ حسنین کے نام سے جانے جاتے تھے۔ لاابالی پن اور بات بات پر بگڑ جانے اور خفا ہو جانے کی کیفیت ان میں بچپن سے تھی اس لئے ہم لوگ اپنے حلقے میں انھیں "گرم" کہتے تھے اور انھیں اس القاب نے اکثر

مخاطب بھی کرتے لیکن دوستوں کی ایسی باتوں کا کبھی اس وقت
تک [illegible] تے۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر اچانک ان میں تبدیلی
آنا شروع ہوئی۔ ایک دن دیکھا کہ مصطفےٰ حسنین، کھدر کا کرتا
پہنے، ناخن اور بال بڑھائے سفید چپل (جسے قصداً کہیں کہیں
سے پھاڑ دیا گیا تھا) پہنے، عجیب سی شکل بنائے چلے آ رہے ہیں۔
پوچھا گیا کہ بھئی یہ کیا ہے۔ کہنے لگے کہ کچھ نہیں۔ میں اپنے کو ڈی۔
کلاس کر رہا ہوں۔ آج کل مارکسی لٹریچر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔
تم لوگ بورژوا ذہنیت والے ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ظاہر
ہے کہ ہم لوگوں کے لئے یہ تمام باتیں عجیب و غریب تھیں۔ یہ
تمام الفاظ غیر مانوس۔ مارکس، اینگلز کے نام تک سے واقف
نہ تھے بھلا ان کی فلاسفی کے پڑھنے کا کیا سوال تھا۔ سب
لوگ تیغ کے گرد جمع ہو گئے کہ بھئی یہ سب کیا ہے؟۔ ہم لوگوں کو
بھی بتاؤ۔ مگر مصطفےٰ حسنین کچھ بگڑے (کیونکہ ان کی دوستی کا
یہی طور تھا) کچھ بتایا۔ کچھ کے لئے کہا کہ تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔
غرض کہ بات ختم ہو گئی۔ ہم لوگوں نے اسے بھی ان کے بگڑ پن
پر محمول کیا۔ لیکن اس دن سے برابر ہم لوگ انھیں اسی حلیہ میں
دیکھتے اور سمجھتے کہ بھئی مصطفےٰ واقعی کچھ بڑی گہری باتیں پڑھا
کرتا ہے۔ ہم لوگ جو صرف کورس کی کتابوں تک محدود تھے
انھیں یہ سعادت کہاں نصیب تھی۔

ماڈرن اسکول کے پرنسپل ایک ڈاکٹر گھوش صاحب تھے
جو اپنے سمر فریم اور دوروں سے ملاقات کرانے کے لئے مشہور
تھے۔ اتفاقاً وہ بیمار پڑے۔ علالت طول کھینچ گئی اس لئے
ان کی جگہ ان کے بیٹے نے لے لی۔ نئے پرنسپل کو نیا شوق پیدا
کرنے میں ایک مرتبہ اسکول کے ہال میں ایک اسمبلی کرتے
اخلاقیات کا سبق پڑھانے کے بعد مشاعرے کا سلسلہ شروع
کر دیتے۔ طالب علموں کو جو کچھ بھی یاد ہوتا وہ سناتے۔
پرنسپل صاحب اس میں کافی دلچسپی دکھاتے۔ مجھے یاد ہے
کہ سب سے پہلے احسان دانش کی نظم تھی۔

"نذر مادر تازی عید کے دن کپڑوں میں چھپے جاتے ہیں"

نہیں سنی تھی۔ میرا ایک ہم جماعت محمود تھا جو اس نظم کو ایک
خاص سوز و گداز کے ساتھ پڑھتا تھا۔ انہی مشاعروں میں
ایک دن اعلان ہوا کہ اب مصطفےٰ حسنین اپنی نظم سنائیں گے۔
ہم لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ شاعر کب سے ہو گئے۔ خیر جیسا کہ
ہوتا ہے لڑکوں نے خوب تالیاں پیٹیں۔ مصطفےٰ حسنین اسٹیج
پر گئے اور ایک نظم پڑھنے کا اعلان کیا جس کا عنوان مہمان
تھا۔ اور اسے لحن سے پڑھنے لگے۔ لیکن لحن سے پڑھنا ان کے
بس کا نہ تھا۔ اس لئے کہ آواز کبھی دب جاتی کبھی ابھرتی۔
چنانچہ لڑکوں نے ہوٹ کرنا شروع کیا۔ آخر مصطفےٰ خفا ہو کر اتر
آئے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر غصے میں بھرے ہوئے اٹھے اور
دوبارہ پڑھنے کی اجازت چاہی۔ پرنسپل ان کا بہت خیال
کرتے تھے اس لئے اجازت دے دی چنانچہ وہی نظم اس
مرتبہ انھوں نے تحت اللفظ پڑھنی شروع کی آواز بھاری تھی اور
رعب دار۔ اس مرتبہ معاملہ بن گیا۔ ایک دن ہم لوگوں کی
نجی صحبت میں انھوں نے انکشاف کیا کہ وہ جوش صاحب سے
لکھنؤ میں ملے تھے اور ان کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے ہیں اور
جوش صاحب نے ان کا تخلص تیغ رکھا ہے۔ انھیں دنوں جوش
کا نیا مجموعہ 'سنبل و سلاسل' شائع ہوا تھا۔ اس کتاب پر لکھا تھا
'تیغ کے لئے' اور نیچے 'جوش'۔ اس کے بعد غالباً شنکر راؤ پبلس
پونا لکھا ہوا تھا (لیکن یہ خود تیغ نے اپنی طرف سے لکھ لیا
تھا جوش کی تحریر نہ تھی جو بعد کو معلوم ہوا) ہم لوگوں پر
کافی رعب پڑا کہ جوش جیسے شاعر سے ان کی ملاقات ہے۔
معلوم نہیں کہ تخلص، واقعی جوش کا رکھا ہوا تھا یا مصطفےٰ
کی اپنی جدتِ طبع کا نتیجہ تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن میرے ایک دوست شیخ محی الدین
جو بڑے ذہین طالب علم تھے اور ہم لوگوں کی صحبتوں میں پیش
پیش رہتے، مجاز کا مجموعہ آہنگ لئے ہوئے آئے اور کہنے
لگے کہ بھئی مصطفےٰ نے کمال کر دیا۔ مجاز کی نظم اپنے نام سے
پڑھ دی۔ بس پھر کیا تھا ہم لوگوں نے انھیں پکڑا کہ بھئی یہ کیا

میں آ گیا۔ مجھے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بہت سی نظمیں کہہ ڈالی ہیں
اور ایک دن ایک کاپی لے بھی آئے جس میں بہت سی نظمیں لکھی
ہوئی تھیں۔ یہ ان کا اس وقت کا مجموعہ تھا۔ کیا معلوم کہ وہ کاپی
کیا ہوئی ہو گی۔ اس کی کچھ نظمیں تو چھپیں اور باقی کہاں گئیں
کچھ پتہ نہیں۔ اسی زمانے میں ان کے ایک بھائی احمد رضا صاحب
کانپور میں تعینات تھے۔ وہ خزانے کے محکمے میں ٹریژری افسر
تھے۔ کانپور کی تعلیم کے وقت تیغ کا قیام اپنے انھیں بھائی
کے ساتھ تھا۔ تیغ صاحب کا جو مزاج تھا اس سے ان کے
اعزا اکثر پریشان رہتے بے انتہا مذہبی گھرانے میں یہ تقریباً باغی
قسم کے آدمی پیدا ہو گئے کس طرح کوئی انھیں برداشت کرتا۔ احمد
رضا صاحب خود بڑے مذہبی تھے اور تیغ پر اس وقت لامذہبیت کا
جنون سا چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ احمد رضا صاحب کے خلاف
ایک نظم لکھ ڈالی جس کا ایک شعر یوں ہے۔

حضرتِ احمد رضا کو کوئی سمجھا دے یہ بات
مادہ آئے گا اک دن روح کی کل کائنات

ایونگ کرسچین کالج میں اردو کے استاد مولانا داور الحق
صاحب تھے۔ بڑے دلچسپ اور باغ و بہار قسم کے انسان۔ ہم لوگوں
سے کلاس میں خوب نوک جھونک چلتی۔ مولانا جو مطلب بتاتے ہم
لوگ دوسرا مطلب نکالتے اور کہتے کہ مولانا یہ معنی بھی تو ہو سکتے
ہیں۔ مولانا خفا نہ ہوتے بلکہ ایک خاص زوردار لہجے میں فرماتے
"صاحب جو میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے جو آپ لوگ کہتے ہیں بالکل
غلط۔ پڑھیئے لاحول ولا قوۃ اور آگے چلئے۔" جن لوگوں نے مولانا سے
کبھی درس لیا ہے وہ ان کے اس تیور سے واقف ہوں گے۔ مولانا
کے اصرار پر تیغ نے انٹر میں فارسی بھی لی تھی۔ مولانا سادہ آدمی
تھے جو اردو بھی پڑھاتے اور فارسی بھی اس لئے اکثر ازراہ مزاح
فرماتے۔ I am The head of The department
and also Thetail of the department
ہم لوگ محض مولانا کی گل افشانیوں کو سننے کے لیے اس طرح
کی باتیں کرتے اور مولانا اپنے فن میں بڑے ماہر تھے اور ہم

حرکت ہے۔ اس انکشاف سے بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم
سب لوگوں کو میں نے بے وقوف بنایا تھا۔ یہ آغا جانی کی مشہور
نظم ہے۔ پھر انجمن میں کیا سب لوگ اپنی نظمیں پڑھتے ہیں۔ بات
رفت گزشت ہو گئی لیکن یہ شعر خوانی کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔
اور ایک دن تیغ صاحب نے باقاعدہ ایک طرحی مشاعرے
کی بنیاد رکھ دی۔ پرنسپل کو راضی کر کے ایک مشاعرے کا اعلان
کیا گیا۔ کارڈ چھپوائے گئے۔ مارچ کی ابتدا تھی کہ مشاعرہ
کیا گیا۔ ہم لوگوں نے اپنے اپنے تخلص طے کیے اور روایتی
انداز کی الٹی سیدھی غزل کہی میں نے شبنم، محی الدین نے
آفتاب تخلص رکھا اور تیغ تو پہلے ہی سے تیغ تھے۔ طرح تو یاد
نہیں مگر مجھے اپنا مقطع یاد ہے۔

بکھرتے ہیں موتیوں سے گلستاں کی جھولیاں
شبنم ہمارے دم سے چمن میں بہار ہے

سالانہ امتحانات آئے اور صحبتیں درہم برہم ہو گئیں۔
تیغ صاحب ہم لوگوں سے ایک سال آگے تھے اس لئے ہائی
اسکول کا امتحان انھوں نے ۱۹۴۴ء میں دیا۔ طالب علم بہت
ذہین اور محنتی تھے لیکن ریاضی ان کے بس کی نہ تھی اور اس
لئے اسی میں ہمیشہ مار کھاتے کبھی کبھی تو فیل ہو جاتے۔ چنانچہ
ہائی اسکول سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے لیکن اردو میں امتیاز
حاصل کیا۔ پھر ایک سال تیغ الہ آباد سے غائب رہے۔ انٹرمیڈیٹ
میں انھوں نے سائنس لی اور ایگریکلچر کالج کانپور میں داخلہ
لے لیا لیکن شاعری اور کشت کاری میں زمین آسمان کا فرق سہی مگر
اتنا بڑا فرق تو تھا ہی چنانچہ ان سے نبھ نہ سکی۔ سالانہ امتحان ہوا
تو پہلے ہی سال میں فیل ہو گئے۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں جب ہم لوگ
الہ آباد کے مشہور کالج ایونگ کرسچین کالج میں داخل ہوئے تو
اچانک دیکھا کہ تیغ صاحب بھی فائل اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔
بھائی بھئی یہ کیا ہوا۔ تم تو کانپور میں کشت کاری کر رہے تھے۔ کہنے
لگے بھئی تم لوگوں کو چھوڑ کر معلوم ہوتا تھا جیسے ریگستان میں چلا
آیا ہوں۔ اس لیے واپس چلا آیا۔ اب سوچتا ہوں کہ پھر نہ لوٹوں

لوگ بہرحال طالب علم۔

رفتہ رفتہ۔ تیغ، محی الدین اور میں، تینوں، کرسچین کالج کے ادبی ہیرو ہو گئے۔ اردو اور انگریزی کے تمام سائل طالب علم ہم لوگوں سے پوچھا کرتے اور ہماری باتیں حرفِ آخر ہوا کرتیں۔ سہ ماہی امتحان ہوا تو میری پوزیشن تمام آرٹس کے طلباء میں اول تھی، محی الدین کی دوسری اور تیغ کی تیسری۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ ہم دونوں ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن میں امتیاز کے ساتھ پاس کر کے آئے تھے اور تیغ کا ہائی اسکول سیکنڈ ڈویژن تھا۔ لیکن تیغ بے انتہا محنتی، کسی حد تک تعلّی اور بڑی لگن کا انسان تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت کم اپنی ہار مانتے ہیں۔

وقت گزرتا گیا۔ تیغ ہم لوگوں سے کچھ کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ کالج میں دو پارٹیاں بن گئیں تیغ کے ساتھ سائنس کے لڑکوں کا گروپ تھا اگرچہ وہ آرٹس کے طالب علم تھے، اور میرے اور محی الدین کے ساتھ آرٹس کے طالب علموں کا گروپ۔ کچھ لوگ تھے جو دونوں طرف دلچسپی لیتے تھے۔ تیغ اب اپنی شاعری بھی زوروں پر تھی اور پڑھائی بھی۔ شہر کے مشاعروں میں وہ باقاعدہ شرکت کرنے لگے تھے۔

فراق صاحب سے ان کی ملاقاتیں رہتیں۔ فراق ان دنوں روپ کی رباعیاں کہنے میں منہمک تھے چنانچہ تیغ نے بھی فراق کے رنگ میں بہت سی رباعیاں کہہ ڈالیں جو کالج کی میگزین میں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں ہم ترقی پسند ادب سے باقاعدہ روشناس ہوئے اور کرشن چندر، عصمت اور بیدی وغیرہ کے افسانے پڑھنے لگے مجھے یاد ہے سب سے پہلے تیغ نے مجھے کرشن چندر سے روشناس کرایا۔ افسانوں کا مجموعہ مجھے انھوں نے پڑھنے کو دیا تھا وہ "زندگی کے موڑ پر" تھا جسے ہم لوگ مذاق میں "زندگی کے موڑ پر" کہتے تھے۔

کرسچین کالج لائبریری کی اس کتاب میں آج بھی تیغ کے تبصرے لکھے ہوں گے اور بہت ساری کتابوں پر ہم دونوں کی تحریریں، تبصرے ہوں گے۔ کیونکہ اس زمانے میں ہم دونوں آدمی زیادہ غلط راستے کے مرتکب ہوتے۔ لائبریری کی جو کتاب پڑھتے اس کے آخری صفحات پر کتاب کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھتے۔ تیغ تو یہاں تک لکھ دیتے کہ مزید معلومات کے لیے تیغ سے ملیئے۔

کرسچین کالج میں یہ دستور تھا کہ پہلے سال کے سالانہ امتحان میں جو طالب علم اول آتا اُسے سو (۱۰۰) روپے کا ایک وظیفہ ملتا اور اسے جینیوریا اسکالر Jannier Scholarship کہا جاتا۔ یہ اسکالرشپ وہاں کے ایک سابق پرنسپل ڈاکٹر Jannier کا جاری کردہ تھا۔ اور اس جینیوریا اسکالر کا نام کالج کے ہال کے دروازے پر آویزاں کر دیا جاتا۔ سالانہ امتحان آیا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ کوشاں تھے کہ یہ وظیفہ ہمیں ملے۔ جب نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ تیغ نے ہم سب کو شکست دی اور جینیوریا اسکالر ہو گیا۔ اس کا نام آج بھی ۱۹۴۲-۴۳ء کے سال میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگوں میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا لیکن ملنا جلنا اب ویسا نہ رہا۔ پھر ایک دن یہ خبر سنی کہ تیغ نے ایک لڑکی سے عشق شروع کر دیا۔ لڑکی کا [illegible] تھا۔ تیغ کی ایک نظم کالج میں "س" کے نام سے چھپی اور اب یہ باقاعدہ ایک اسکینڈل سا بن گیا۔ جب جولائی [illegible] میں تیغ صاحب مع اپنے ایک مجموعے کے آئے جس کا نام زنجیر تھا۔ اس پر فراق صاحب کا مقدمہ تھا۔ پہلے صفحہ پر تیغ کی ایک تصویر تھی جس کے نیچے چھپا تھا۔

قدر فرما تیغ کی اے دخترِ گنگ و جمن
تیغ جو اس وقت ہے پیغمبرِ شعر و سخن

جیسا کہ ہوتا ہے کہ دوست آپس میں ایک دوسرے پر جملے بازیاں کرتے ہیں، ہم لوگ بھی ادھر سے کب [illegible] تھے۔ ان کے اس معاشقے پر تبصرہ کرنے کے سلسلے میں [illegible] ہم لوگوں کی آپس میں جھڑپ ہو گئی اور تیغ صاحب مجھ سے بہت ناراض ہو گئے۔ آپس میں بول چال بند ہو گئی۔ [illegible] لوگ ادھر اُدھر کی لگا کر اور اس معاملے کو ہوا دینے لگے۔ [illegible] کی شاعری زوروں پر تھی زنجیریں قطعات کا مجموعہ تھا

اختر انصاری کے مجموعہ آبگینے سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ وہی تیغ کا ماڈل تھا۔ دھر فراق صاحب سے بھی ان کی تلخی بڑھ چکی تھی کیونکہ مقدمہ جو کتاب پر لکھا گیا تھا فراق صاحب کا کہنا تھا کہ اس میں تیغ نے بہت کچھ ان کی مرضی کے بغیر خود اپنی طرف سے بڑھا لیا ہے معلوم نہیں کہ معاملہ کیا تھا۔ اسی دوران ہم میں پھر مصالحت ہو گئی آئندہ با احتیاط کہہ کر میں نے بھی اپنا سلسلہ ان سے قائم کر لیا۔ ہمیں اسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ علی سردار جعفری کی نئی دنیا کو سلام ساتھ بیٹھ کر کالج کے کیمپس میں ہم للکار للکار کر پڑھتے اور مذہب کو برا بھلا کہتے جس کی وجہ سے انسان جاہل اور روایتوں کا پابند ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی زمانے میں تیغ نے ایک نظم لکھی 'انسان پیدا ہو گیا' جس میں ایک مصرعہ تھا۔ ؎

قرآں سے بڑھ کے اب مرے دیواں کی دھوم ہے۔

یہ نظم ان کے مجموعہ روشنی (ہندوستانی ایڈیشن) میں شامل ہے۔ اس پر ایک حلقے میں بڑی لے دے ہوئی۔ لیکن تیغ صاحب اس سے خوش تھے کیونکہ بہر حال یہ باتیں ان کے خیال سے انھیں جوش کے قریب لے جا رہی تھیں جن کے نقش قدم پر وہ ان دنوں چلنے کے خواہش مند تھے۔ انہی دنوں کسی صاحب نے تیغ کے اس رویہ کے خلاف ایک نظم لکھی اور عنوان رکھا "شیطان پیدا ہو گیا" اور تیغ کو 'ہرمن جعفر لو' کا لقب دیا۔ تیغ صاحب سالہ لائے۔ یہ نظم ہم لوگوں کو دکھائی اور خوب قہقہہ مار کر ہنسے اور کہا کہ دیکھو مولوی مجھ سے کیسے پریشان ہیں۔ پھر جوش کی ایک نظم جو حرف و حکایات میں شامل ہے، اس پر ایک لمبی نظم اپنی سنائی جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

وہ خدا جو قلم کا اک جھلملاتا سین ہے
وہ خدا جو آدمی کی ذات کی توہین ہے

اس میں کچھ جوش کی نظم کے بھی شعر شامل تھے اور کچھ ان کے اپنے تھے۔

تیغ صاحب کو اب ریڈیو وغیرہ سے بھی موقعے ملنے لگے تھے۔ اس موقع پر ایک قصہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ایک روز جب کالج جانے کا وقت تھا دیکھا کہ تیغ صاحب پیدل دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ خیال ہوا کہ کوئی حادثہ ہوا؟ کیا بات ہوئی۔ روک کر پوچھا چاہا مگر انھوں نے جواب نہ دیا۔ تقریباً تین بجے کالج آئے اور کہنے لگے کہ مجھے لکھنؤ کے لئے جہاز پکڑنا تھا کیونکہ آج ہی میرا پروگرام ریڈیو پر ہے۔ اسی لئے بھاگ رہا تھا تاکہ بمھرولی ہوائی اڈے پر ٹھیک وقت سے پہنچ جاؤں۔ آج شام کو آپ لوگ سنیئے گا (حالانکہ ان کی آواز کا ریکارڈ الہ آباد میں پہلے ہی ہو چکا تھا) چنانچہ ہم تمام اُن کے ساتھی شام کو ان کی نظم سننے کے لئے جمع ہوئے واقعی ان کی نظم نیا آفذ ریڈیو پر انھیں کی آواز میں آ رہی تھی۔ خیر ایسی باتیں سب کی زندگی میں ہوتی ہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی منزل پر اس کے متمنی ہوتے ہیں کہ لوگ ہمارے کارناموں کا نوٹس لیں۔ تیغ صاحب اس وقت عمر کی جس منزل میں تھے اس میں اس طرح کی باتیں عجوبہ نہیں۔

کالج کا دوسرا سال تھا کہ پھر ایک قصہ سننے میں آیا کہ تیغ صاحب نے ایک دوسرا عشق شروع کر دیا۔ ایک لڑکی سرلا کپور تھی جس سے انھیں دلچسپی ہو گئی۔ اب اس پر نظمیں ہونے لگیں۔ روشنی میں ایک ہم جماعت خاتون سے 'نظم وہی ہے جو سرلا کپور پر لکھی گئی۔ روشنی کے ہندوستانی ایڈیشن میں خود تیغ نے اپنے دیباچے میں، ان لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کی بے اعتنائیوں کا شکوہ کیا ہے۔ عبارت یوں ہے۔

"اور جن ہستیوں کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ کرنا بھی ضرور ہے وہ ہیں سرشٹ بھٹناگر، سرلا کپور، پریم کمار جین اور خود میں"

پریم کمار جین کے نام روشنی معنون کی گئی ہے۔ اور ایک قطعہ بھی ان کی شان میں لکھا ہے۔ ان کا ذکر پھر کیا جائیگا۔ امتحانات آئے اور سب سلسلے ختم ہو گئے۔ نتیجہ نکلا تو تیغ نے ہم سب کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ وقت اس کی بہت اہمیت

ہوتی تھی کہ فرسٹ ڈویژن کی پورے صوبے میں کیا پوزیشن ہے۔ کیونکہ اسکالرشپ سولھویں پوزیشن تک ملتا تھا اور برٹش حکومت میں یہ ایک اہم اعزاز تھا کہ کسے اسکالرشپ ملا اور کسے نہیں ملا۔ آئی ایس سی میں ہم تینوں فرسٹ ڈویژن پاس تھے یعنی تیغ کی پوزیشن نویں تھی اور میری چودھویں۔

یونی ورسٹی ہم سب لوگ بڑے کرّوفر کے ساتھ اکڑتے ہوئے پہنچے۔ سب فرسٹ ڈویژن۔ سب اپنے کالج کی ناک۔ لیکن الٰہ آباد یونی ورسٹی میں فضا ہی دوسری تھی۔ یو۔پی کے تقریباً تمام پوزیشن ہولڈر وہاں اکٹھا ہو گئے تھے۔ فرسٹ بھی، سیکنڈ بھی، تھرڈ بھی۔ ہم لوگوں نے اب اپنی اَنا کی دوسری صورتیں نکال لیں۔ کسی نے بال بڑھا لئے، کوئی تنقید لکھنے لگا، کوئی افسانے۔ اور تیغ تو پہلے ہی ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ یونی ورسٹی پہونچ کر ہم لوگ اور پھیلنا شروع ہوئے۔ فراق صاحب انگریزی میں، ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب اردو میں اور ترپاٹھی جی (ڈاکٹر رام پرشاد) تاریخ میں میرے استاد تھے۔ تیغ نے تاریخ کے بجائے معاشیات کا مضمون لیا تھا اس لئے ان کے استاد پروفیسر دُودرا تھے۔ ہم لوگوں نے تقریباً تمام افسانوں کے مجموعے، ناول، تنقید اور شاعری کے مجموعے اور جو بھی الم غلم پایا سب پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں کرشن چندر کے بے انتہا قائل تھے۔ شاعری میں راشد، سردار اور اقبال کا مجھ پر بڑا اثر تھا، تیغ، جوش، اقبال اور فیض کے بہت قائل تھے چنانچہ یہ اثر ان کی شاعری کے ہر موڑ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اسی زمانے میں قرۃ العین حیدر کا ”میرے بھی صنم خانے“ شائع ہوا۔ تقسیم ہو چکی تھی۔ پناہ گزیں دونوں طرف مارے پھرتے تھے۔ الٰہ آباد میں بھی، اچھا خاصا جتھا پناہ گزینوں کا پہنچا۔ اسی وقت کرشن چندر کا مجموعہ ”ہم وحشی ہیں“ بھی شائع ہوا۔ ہم لوگ ’میرے بھی صنم خانے‘ اور ’ہم وحشی ہیں‘ پڑھتے اور غیظ و غضب پر آنسو بہاتے۔

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم طاری تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ اسے ہندوستان میں رہنا ہے یا پاکستان جانا ہے۔ خاندان سب اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔ تیغ سے جب اس موضوع پر باتیں ہوتیں تو وہ ہمیشہ اپنے خاص انداز میں ہنستے اور اس بات پر کوئی تبصرہ نہ کرتے بلکہ ہمیشہ کتابوں کی باتیں، مضامین، افسانوں کی باتیں، شاعروں کے تذکرے، یہی ان کی گفتگو کا موضوع ہوتے۔ اسی زمانے میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین الٰہ آباد کے سکریٹری بھی ہو گئے اور بڑے زور شور سے انجمن چلانے لگے۔ یونی ورسٹی میں اس وقت ایک مارکسسٹ (MARXIST) کلب بھی قائم تھا جس کے اراکین میں، پروفیسر نرودا تنے، آشا رام، ڈاکٹر ذاکر انصاری، پرکاش چند رگپت، ڈاکٹر ستیش چندر، دیویندر استر اور نسیم انصاری خاص تھے۔ مارکسسٹ کلب میں ہم لوگوں کو بھی دلچسپی تھی لیکن رفتہ رفتہ مارکسسٹ کلب کی رفتار سُست پڑتی گئی اور وہ ختم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں بھی باسی پن آ گیا۔ تیغ کی اراکین انجمن سے نہ بنی اور وہ اس سے علاحدہ ہو گئے۔ پھر ایک انجمن حیات نو، قائم کی گئی جس کی نشستیں تیغ کے گھر پر اور اسلامیہ کالج، الٰہ آباد میں ہونے لگیں۔ پھر سب کچھ چھوڑ کر تیغ ایک رسالہ نکالنے کے انتظام میں مصروف ہوئے۔ نکالا اور بڑی دھوم دھام سے نکالا۔ ”کرن“ اس کا نام رکھا اور بڑی تندہی سے اس میں لگ گئے۔ لیکن ادبی رسالہ اور وہ بھی بغیر کسی سرمائے کے صرف چندہ پر نکالنا ہر ایک کا کام نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن بعد رسالہ بند ہو گیا۔

انھی دنوں ایک اور اسکینڈل اُن کے نام سے مشہور ہوا۔ الناکس میں اُن کے ہم جماعت ایک خوبصورت صاحبزادے بھی تھے۔ کسی اچھے گھر کے آدمی تھے۔ بہت وجیہہ مگر کسی قدر نسوانیت ان پر طاری رہتی تھی۔ سنا کہ تیغ صاحب اُن کے نام سے نظمیں لکھتے ہیں۔ اور وہ نظمیں ان صاحبزادے کے نام سے چھپتی ہیں۔ روشنی بھی انھیں کے نام معنون کی گئی۔

اپنی تمام علمی اور ادبی صلاحیتوں کے باوجود تیغ صاحب

کو کچھ اس کا بھی شوق تھا کہ لوگ اُن کے متعلق، بُرے بھلے کچھ نہ کچھ باتیں کرتے ہی رہیں۔ چنانچہ گھر میں، ایک دن کسی سے خفا ہو گئے اور غصّے میں آکر دھتورا کھا گئے۔ ڈاکٹر کے یہاں لے جائے گئے۔ کسی طرح جان بچی۔ بی۔اے۔ پاس کرتے کرتے کوئی مشاعرہ الٰہ آباد میں مکمل نہ سمجھا جاتا جس میں تیغ صاحب شریک نہ ہوں۔ ایک خاص گھن گرج کے ساتھ جب وہ اپنی نظمیں پڑھتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ یونی ورسٹی کی یونینیں جو شور و شغب کے لئے عام طور پر مشہور ہوتی ہیں! تیغ کی نظمیں اس خاموشی کے ساتھ سنتیں کہ مجال نہ تھی کہ کوئی چوں بھی کرے۔

اردو کی کلاس میں ہم لوگ ایک دوسرے کے مخالف بیٹھتے اور ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھتے اگرچہ اب کوئی کشیدگی نہ تھی۔ تیغ صاحب الٰہ آباد سے باہر بھی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے جس کے لیے انھیں اچھی خاصی رقم کبھی مل جایا کرتی۔ اس وقت بھی ان کا لباس وہی ایک کھدّر کا کرتا۔ ایک چپل جو زیادہ تر سفید ہوتی۔ سردی ہوتی تو ایک گرم چادر لپیٹ لیتے۔ موٹے فریم کا چشمہ جو الٰہ آباد میں ایک طرح کا فیشن بن گیا تھا۔ چشموں کی دوکانوں پر اکثر تیغ کے حوالے سے لوگ چشمے کا فریم ڈھونڈتے تھے۔ الٰہ آباد اس وقت اتفاق سے اچھے شعرا کا بھی مرکز ہو گیا تھا فراق، وامق جونپوری، راہی، مسعود اختر جمال، مظفر شاہ جہاں پوری گاہے ماہے مجاز سب یہاں موجود رہتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں اس وقت اوپندر ناتھ اشک اور بلونت سنگھ بھی شامل ہوا کرتے۔ دلچسپ بحثیں ہوا کرتیں۔ تیغ نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں جو حیثیت بنالی تھی وہ یقیناً ہر ابھرتے ہوئے فن کار کے لئے باعث رشک ہو سکتی ہے۔

بی۔اے کا نتیجہ نکلا تو تیغ کی پوزیشن چھٹی تھی۔ فرسٹ ڈویژن تو تھا ہی۔ لیکن اردو میں ان کے نمبر مجھ سے کم تھے جس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ انگریزی میں البتہ ان کے نمبر مجھ سے زیادہ تھے چنانچہ انگریزی کا گولڈ میڈل تیغ کو اور اردو کا مجھے ملا۔ ہم دونوں نے ایم۔اے کے لئے انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے لیے فارم بھرا۔ پھر کچھ یوں ہوا کہ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب مجھ پہ زور ڈال کر مجھے اردو کی طرف کھینچ لائے لیکن تیغ انگریزی میں ڈٹے رہے۔ اب چونکہ شعبے الگ الگ تھے اس لیے گاہے ماہے ملنا جلنا رہتا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد خبر ملی کہ شعبۂ انگریزی میں کسی لڑکی سے ان کا معاشقہ شروع ہو گیا۔ یہ بڑی خطرناک بات ہو سکتی تھی اس لئے کہ ایک طرف تو اب ان کی عمر پختگی کی منزل کی طرف رواں تھی دوسری طرف ملکی حالات اس بات کے متحمل نہ ہوتے۔ سلسلہ چلتا رہا۔ پہلے سال کے امتحان میں تیغ کی پوزیشن اول نہ ہو سکی جس کا انھیں بڑا قلق ہوا۔ دوسرے سال غالباً ستمبر کا مہینہ تھا کہ خبر ملی کہ اچانک تیغ صاحب نے اس لڑکی کے غم میں افیون کھا کر خودکشی کر لی۔ ہم لوگ دوڑے ہوئے ان کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اسپتال میں ہیں۔ انھیں کالون اسپتال الٰہ آباد میں داخل کر دیا گیا تھا جہاں وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں پڑے تھے۔ لیکن فیصلہ زندگی کے حق میں رہا۔ اچھے ہونے کے بعد انھوں نے تعلیم چھوڑ دی کیونکہ یونی ورسٹی اب ان کے لئے خطرناک بھی ہو سکتی تھی۔ ایم۔اے کا ایک سال کرنے کے بعد وہ گھر بیٹھ رہے اور پھر اک دم نارمل ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے الیکشن، مشاعرے اور دوسری ادبی دلچسپیاں، یہی ان کے مشغلے رہ گئے۔ اسی دوران ایک دن ڈاکٹر اعجاز حسین اور وامق صاحب سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وامق صاحب نے بے تکلفی میں ان سے اس واقعے کو پوچھ لیا۔ تیغ صاحب نے ٹال مٹول کی اعجاز صاحب جو تیغ کے استاد بھی رہ چکے تھے اپنے خاص انداز میں ازراہ مزاح بولے۔ ؎

وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

بات اس وقت ختم ہو گئی لیکن تیغ صاحب نے اعجاز صاحب کی بات کا بہت بُرا مانا۔ گھر جا کر اعجاز صاحب کو ایک سخت خط لکھا اور ان سے تمام تعلقات ختم کر لیے۔ ایک روز تیغ سے میری ملاقات ہوئی تو سخت شکایت کرنے لگے۔

پھر ایک دن اچانک سننے میں آیا کہ تیغ کو اُن کے بھائی بھتیجی حسنین زبردستی پاکستان لے گئے تو بڑا تعجب ہوا۔ وہ شخص جو پاکستان کے متعلق کبھی باتیں کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا، پاکستان کیسے گیا۔ بہت دنوں تک یہی خیال رہا کہ وہ واپس آ جائیں گے۔ لیکن پھر خبر ملی کہ لاہور کے کسی کالج میں انھوں نے ایم۔اے میں داخلہ لے لیا۔ پھر معلوم ہوا کہ کراچی کے کسی کالج میں معلّم ہوگئے۔ پھر اطلاع آئی کہ سول سروس آف پاکستان میں منتخب ہوگئے۔ ڈیرہ غازی خاں، نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ اس کی بھی اطلاعیں ملتی رہیں پھر اچانک سب خبریں بند ہوگئیں۔ ایک مرتبہ نقوش لاہور، ملا تو تیغ پر "ایک تھا راجہ" کے عنوان سے ایک مضمون نظر آیا۔ جانے کیا کیا۔ تیغ کے متعلق لکھا تھا۔ ہندستان میں اُن کی زندگی کے متعلق ساری معلومات غلط سلط درج تھیں۔ تیغ کی ایک بڑی خوبصورت تصویر بھی چھپی تھی، جو غالباً ہانگ کانگ یا سنگاپور ایرپورٹ کی تھی۔ پھر ایک دن اچانک یہ خبر بھی آئی کہ مصطفےٰ زیدی معطل کر دیئے گئے۔ مجھ سے خط و کتابت مدت سے بند تھی اس لئے اِدھر اُدھر سے خبریں سنتا رہا۔ پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ مصطفےٰ زیدی (تیغ الہ آبادی) کا قتل ہوگیا اور معاملہ عشق ہی کا نکلا یا جو کچھ بھی ہوا ہو۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرا ایک حصّہ کم ہوگیا ہو۔ کیونکہ میری تعلیمی زندگی میں جس قدر واسطہ اس شخصیت سے تھا، شاید ہی کسی سے رہا ہو۔ بی اے کلاس میں اس جگہ کو دیکھتا رہا جہاں تیغ بیٹھتے تھے اور جہاں اب دوسرے طلبا بیٹھے ہوئے درس لے رہے تھے۔ تاہم جب تک اس کی یادیں ہم لوگوں کے ساتھ ہیں ہم اسے زندہ تصور کرتے ہیں۔ وہی کھلی کھلی ہنسی، وہی بھاری بھرکم آواز اور وہی کھدر کا کرتا اور جواہر کٹ جیکٹ اور مشاعرہ کی گرجدار آواز جو تصور میں بار بار ابھرتی ہے۔ آج اُن کے متعلق پاکستان سے خبریں آتی ہیں کہ وہ رشوت ستانی اور اسمگلنگ میں ملوث تھے تو یقین نہیں آتا کیونکہ تیغ میں چاہے جو خرابیاں رہی ہوں مگر ایسی باتیں ان کے مزاج سے کوسوں دور تھیں۔ اور اگر یہ سچ ہے تو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا ایسی بھی کایا پلٹ سکتی ہے کیونکہ دنیاوی معاملات میں وہ قطعی ہوشیار نہ تھے۔ روپیہ پیسہ اور دولت سے انھیں کبھی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں وہ ہوشیار لوگوں کے چنگل میں بڑی آسانی سے ضرور پھنس سکتے تھے اور غالباً یہی ان کے ساتھ ہوا۔

تیغ کی شاعری کے متعلق میں کچھ نہ کہوں گا۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ ہندستان میں ان کی نظموں کے محرکات کیا تھے۔ کس موقع پر کون سی نظم کہی گئی اور ان نظموں کے اشاروں میں کون کہاں چھپا ہوا ہے۔ دیکھنا ہے کہ ادب کے پارکھ کیا تجزیہ ان کے فن اور کلام کا کرتے ہیں۔ میں نے تو انھیں ایک ہم جماعت کی حیثیت سے دیکھا ہے اور سمجھتا ہوں کہ ہندستان میں ان کی زندگی کی تمام دھوپ چھاؤں کی تشریحات مجھ سے بہتر کم حضرات کر سکتے ہیں۔ اسے انا سمجھیے یا صرف تیغ سے وابستگی۔

■■

رام لعل

مصطفیٰ زیدی

(کچھ یادیں کچھ باتیں)

جس شخص کے بارے میں مجھے یہ سطور لکھنی پڑ رہی ہیں اُسے میں پوری طرح سے نہیں جانتا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں جس زمانے میں اس سے ملا تھا اس وقت وہ تیغ الہ آبادی تھا۔ جسے اُس نے خود ہی مار ڈالا تھا اور پھر اپنا نام مصطفیٰ زیدی رکھ کر ایک نئی زندگی اوڑھ لی تھی۔ اب تک لوگ اُسے نئے نام سے ہی جانتے آئے ہیں۔ تیغ الہ آبادی کو سب بھلا چکے ہیں۔

یہ بیس اکیس سال پہلے کی بات ہے۔ آزادی کے بعد میں اپنا بسا بسایا (؟) دو ڈھائی سال رہ کر لکھنؤ چلا آیا تھا۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں سے ملنے بنارس جاتا رہتا تھا۔ صغیر احمد صوفی انہی میں ایک تھا۔ اُسی کے مکان پر تیغ سے بہت ہی مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ انہی دنوں اس کے بارے میں ایک بات بہت مشہور ہو چکی تھی کہ اس نے الہ آباد میں کسی ہندو لڑکی کے عشق میں ناکام رہ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی! اس کے لئے میرے دل میں ہمدردی سے کہیں زیادہ تجسس کا جذبہ تھا۔ (میں نے کسی لڑکی سے آج تک عشق نہیں کیا۔ نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے) جو لوگ شدید قسم کا عشق کرتے ہیں ان کے لئے میرے دل میں ہمیشہ ایک خاص جگہ بنی رہی ہے۔ میں انھیں جاننا چاہتا ہوں۔ انھیں چھو کر محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ اس خواہش پر میں کبھی قابو نہیں پا سکا۔ جب تیغ کے بارے میں یہ واقعہ سنا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس سے اچانک مل کر تو اور بھی خوشی ہوئی۔ انہی دنوں اس کا پہلا شعری مجموعہ (غالباً) روشنی شائع ہوا تھا۔ اور ہندی میں بھی گیتوں کا ایک مجموعہ آیا تھا جو شاید اُسی لڑکی کے نام معنون تھا۔ اس کے ساتھ بنارس میں تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ جلدی میں تھا۔ الہ آباد واپس جا رہا تھا۔ لیکن اس نے مجھے بتایا۔ "میں بہت جلد ہی لکھنؤ آ رہا ہوں۔ تم سے ملوں گا۔"

میرا پتہ نوٹ کر کے وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد صوفی کے ساتھ اس کے بارے میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ لمبا سانولا نوجوان۔ شاید دو ایک برس مجھ سے بڑا آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ۔ آنکھوں سے جھانکتا ہوا ایک دانشورانہ قسم کا کرب۔ آواز مرعوب کرنے کی حد تک بھاری ڈرامائی!

کوئی ایک ہفتے کے بعد وہ لکھنؤ آیا۔ آتے ہی مجھے ایک خط لکھا۔ جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں مجھے چائے پر بلایا۔ کنٹونمنٹ میں کلے اسکوائر کالونی کے کسی بنگلے میں اس کا قیام تھا۔ وہ بھی کوئی زیدی ہی تھے۔ شاید اس کے بڑے بھائی رہے ہوں گے! لیکن وہاں بھی زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ اگرچہ میں نے اپنے تجسس کو دور کرنے کے لئے اس کی خودکشی کی کوشش کے بارے میں ذکر چھیڑ ہی دیا تھا۔ جس پر اُس نے بہت محتاط لہجے میں کہا ـــــــ اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ میں جانتا ہوں تم کیوں بے تاب ہو۔ شاید مجھے سمجھانے کی کوشش بھی کرو گے اور یہ بھی باور کرانے کی کوشش کرو گے کہ میں نے غلطی کی تھی۔

لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اگرچہ میں اب بھی زندہ ہوں۔ لیکن خودکشی کے بارے میں میرے خیالات اب بھی وہی ہیں۔ لیکن اس مسئلہ پر پھر بات ہوگی۔ کہیں اور ملیں گے! تم بتاؤ کہاں مل سکتے ہو؟ اور کب۔!

میں نے اُسے چار باغ کے ایک ریسٹوران کا پتہ دے دیا۔ ان دنوں میں عیش باغ روڈ کے ایک بوسیدہ سے مکان میں رہتا تھا۔ جس میں ڈرائنگ روم بھی نہیں تھا۔ اپنے دوستوں سے میں ریسٹورانوں میں جاکر ملتا تھا۔ ان دنوں میں کافی ہاؤس بھی نہیں جاتا تھا۔ لکھنؤ کے کسی ادیب یا شاعر سے میری ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں پہلی بار منظر سلیم، معصوم رضا راہی اور باقر مہدی سے بھی چار باغ کے اسی ریسٹوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ سات ٹیبلوں کا بہت ہی مختصر سا ریسٹوران تھا۔ اب تو نام بھی یاد نہیں رہا۔ اس کے مالک کا نام یاد آرہا ہے۔ 'بابولال' کوئی گڑھوالی تھا۔ اب وہاں کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا آفس ہے۔ اور بابولال بھی اسی میں ملازم ہے۔ کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔

تیغ الہ آبادی اور میں جیسے ہی اس ریسٹوران میں داخل ہوئے اور ہمارے سامنے چائے رکھ دی گئی تو ہماری باتوں کا موضوع 'خودکشی' ہی جیسے اپنے آپ قرار پاگیا۔ یا جیسے یہ پہلے سے ہی طے ہوچکا تھا۔ اور تیغ اس موضوع پر بولنے کے لئے گھر سے ہی تیاری کرکے آیا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہارے ذہن میں شاید یہ سوال گردش کر رہا ہے کہ میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

میں نے جواب دیا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری شخصیت اس وقت میرے لئے بہت ہی پراسرار بنی ہوئی ہے۔ کیوں کہ تم موت کے منہ سے واپس لائے گئے ہو۔ پتہ نہیں تم مر کر لوٹے ہو یا مرنے سے پہلے ہی واپس آگئے ہو۔ بہرکیف میرے ذہن میں یہ سوال تو یقیناً موجود ہے کہ تم خودکشی جیسے فعل کے مرتکب کیوں ہوئے لیکن ساتھ ساتھ میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ جن لمحوں میں تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا یعنی تم نے اچانک خودکشی کرلینے کا فیصلہ کرلیا تھا تم اپنے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں جنھیں تم چھوڑ کر جارہے تھے خصوصاً اس لڑکی کے بارے میں جسے تم اپنی موت سے متاثر کرنا چاہتے تھے تمہارے اندر کس قسم کے خیالات ابھر رہے تھے۔ ! تم افسردہ تو یقیناً رہے ہوگے۔ اتنی خوبصورت دنیا جو تمہارے لئے اچانک بے حد اندھیری اور غیر دلچسپ بن گئی تھی اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کرتے وقت تم نے کیا محسوس کیا تھا میں یہ سب جاننا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر تیغ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا تھا، کچھ لمحوں تک خاموش سا رہ گیا تھا لیکن پھر اچانک بہت ہی گمبھیر آواز میں کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے خودکشی کے موضوع پر بحث کرنے کے لئے یہ سب ہرگز اہم نہیں ہے۔ اگر تم میری ذات کو اس سے الگ کرکے سوچو تو شاید میں زیادہ متوازن ہوکر بات کرسکوں۔ کیونکہ میں درحقیقت خودکشی کی اہمیت پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ خودکشی انسان کے لئے اچانک ضروری کیوں ہوجاتی ہے؟ یہ دراصل ہے کیا چیز؟ انسان اس کے سامنے بے دست وپا کیوں ہوجاتا ہے؟

میں سمجھ گیا وہ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس بات کو بالکل ٹال ہی دینا چاہتا ہے۔ میں نے بھی اُسے مجبور نہ کیا۔ اُس سے کہا۔ "لیکن اگر تم مجھ پر خودکشی کی ہزاروں برسوں پھیلی ہوئی تاریخی اہمیت جتانے کی کوشش کروگے تو ہوسکتا ہے ہم اصل موضوع سے بہت دور چلے جائیں۔ کیوں کہ مجھے بھی معلوم ہے انسان نے مختلف ادوار میں مختلف حالات میں کئی بار انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بھی خودکشی کی ہے ہمارے اپنے ملک میں ستی کا چلن رہا ہے جسے میں INSTITUTIONAL SUICIDE کا نام دیتا ہوں اس زمانے میں بڑے بڑے لوگ اس کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔"

تیغ بولا۔ "میں اسے SAVAGE NOBILITY کہوں گا"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خودکشی کو کسی نہ کسی زاویئے سے SAVAGE مانتے ہو!"

"نہیں میرا ریمارک اس کی تاریخی حیثیت کے بارے میں تھا۔ جنگ میں جب فوجیں لڑنے کے لئے جاتی رہیں تو ان کے سامنے بھی

موت ہی ہوتی ہے۔ بالکل واضح اور صاف۔ انھیں معلوم ہوتا ہے وہ مرنے کے لئے بھرتی کیے گئے ہیں۔ بعض مہموں پر موت کس قدر سامنے ہوتی ہے۔ پیچھے ہٹنے کے لئے بھی کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ تب وہ نعرے لگاتے ہوئے کود پڑتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی خودکشی ہی ہوتی ہے۔ اور ایسا بھی بارہا ہوا ہے کہ دشمن نے کسی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کئی روز تک محاصرہ ڈالے رہا اس وقت شہر والوں کے لئے سوائے خودکشی کر لینے کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ اگرچہ انھیں یقین دلایا گیا کہ اُن کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود کو جلا ڈالا۔ ہندستان میں ایسا بارہا ہوا۔ بیرونی حملوں کی وجہ سے جوہر کی رسم کا ذکر اسی سلسلے میں آتا ہے۔

DEATH HAS THE ONLY HONOURABLE ALTERNATIVE FOR THEM.

میں نے کہا — "کبھی کبھی بیماریوں نے بھی کسی کسی شہر یا قصبے والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی جانیں خود ہی دے دیں۔ جب بیماری سے بچنے کی کوئی اُمید نہیں رہ گئی۔ پرانے زمانے میں پلیگ نے بھی اس قسم کا افسوسناک ماحول بنا دیا تھا۔"

میں دراصل پلیگ اور خودکشی کا ہی موازنہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ سمجھتا ہوں خودکشی بھی دراصل ایک وبا ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہم پھر اس کی تاریخی حیثیت پر ہی بحث کرنے لگے ہیں۔ اس پر تو ہمارا کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں خودکشی کے کون سے اسباب ہو سکتے ہیں اس پر گفتگو کریں تو اچھا ہوگا۔"

"بہت سے اسباب ہیں!"

"مثلاً—!"

"پاگل پن، اکثرت شراب نوشی!"

"تم شراب تو نہیں پیتے ہو؟ میں نے سنا ہے کہ نہیں پیتے ہو—"

"تم نے ٹھیک سنا ہے لیکن مجھے زیرِ بحث مت لاؤ یار!"

"ان ایام سوری!" میں ذرا کھسیانا ہو کے رہ گیا... شخصیت

کو فراموش نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا —

"دیگر اسباب میں گھریلو جھگڑے، غریبی، پریشانی، کسی خاص بیماری کی وجہ سے جو ناقابل علاج ہو چکی ہو، بے شغلی بھی، کسی خاص واقعے کی بنا پر ندامت کا شدید احساس بھی ہو سکتا ہے، بدچلنی، مراق، کڑھن، ہسٹریا، کاہلی، کسی خاص چیز پر قبضہ کرنے کی شدید خواہش، بے ہمتی، بددلی، بے نوائی وغیرہ وغیرہ"

مجھ سے جیسے پھر بھی رہا نہ گیا۔ کہا — "محبت میں ناکامی بھی!"

"یقیناً یقیناً یہ بھی ایک فیکٹر ہوتا ہے۔!"

یہ کہہ کر وہ خیالات کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا۔ میری طرف دیکھتا بھی رہا۔ شاید سوچتا بھی رہا ہو کیا مجھے اپنی محبت کی ناکامی پر ضرور بولنا پڑے گا! پھر جیسے اُسے کہنے کو ایک بات سوجھ گئی۔ بولا بولا —

ABSENCE OF PHYSICAL FEAR OR LACK OF INTELLIGENCE

بھی خودکشی کے اسباب بن جاتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑی وجہ وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کی تھی کہ آدمی اچانک گھر جاتا ہے۔ جیسے دماغ میں کوئی مہلک قسم کا پھوڑا اچانک پھوٹ پڑے۔ جیسے پلیگ کا پھوڑا ہوتا ہے نا! آدمی کے لئے بچ نکلنا محال بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں اسی کا قائل کرنا چاہتا ہوں۔ آدمی اس وقت بالکل بے بس ہوتا ہے۔ لاچار ہوتا ہے کسی مذہب کے نزدیک یہ فعل کتنا ہی مذموم کیوں نہ ہو اور قانون کی نظر میں کتنا بڑا جرم کیوں نہ قرار دیا گیا ہو (مجھے یاد نہیں آتا۔ تیغ پر خودکشی کرنے کی کوشش میں کوئی مقدمہ چلایا گیا تھا یا نہیں!) آدمی تو اس وقت اپنے ذہنی پلیگ کی تحویل میں ہوتا ہے۔ اس کے اختیار میں ہی کہاں ہوتا ہے کہ وہ مذہب یا قانون کے احکام کا احترام کر سکے! اس وقت تو وہ صرف اتنا ہی سوچ سکتا ہے کہ اس کے وجود کا کوئی بھی لمحہ اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ ایک موڑ، ہر ایک کرائسس
[illegible]

کی تعلیم و تربیت [illegible] ناگہانی صورت حالات جس کے اندر وہ پھنس کر رہ جاتا ہے ان پر اس کا کوئی جبر و اختیار نہیں ہے۔ یہ صداقت اس پر عین آخری لمحات میں ہی گویا منکشف ہوتی ہے۔ جسے میں مینٹل کرائسس کہتا ہوں۔ اسی وقت وہ خودکشی کو دریافت کرتا ہے جو اسے اس عذاب سے نجات دلا سکتی ہے اور خودکشی کرنے کے لیے کوئی طریقہ بھی وہ خود ہی ایجاد کرتا ہے۔"

میں نے کہا ــــ "لیکن خودکشی اس کی اپنی دریافت کہاں ہوئی! یہ تو اُسے معلوم ہی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی کئی آدمی اپنی جان خود لے چکے ہیں۔!"

تیغ نے جواب دیا ــــ "یہ صحیح ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی انسان کے علم میں کسی اور شخص کی عملی طور پر خودکشی کر لینے کا واقعہ نہ ہو! اس نے اس کا ذکر صرف ناولوں یا نظموں میں ہی پڑھ رکھا ہو۔ جیسے گوئٹے کا WERTHER اور بائرن کا MANFRED اور لامارٹینی کا RAFAEL وغیرہ ڈرامے جب پیرس میں پہلی مرتبہ اسٹیج پر پیش کیے گئے تو اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اسی انداز میں خودکشی کی تھی جس میں ان ڈراموں کے کردار اپنی جان لے لیتے تھے۔"

"لیکن ہمارے زمانے کے طریقے تو بالکل دوسرے ہیں نا؟"

"ہر ملک میں خودکشی کے طریقے کچھ نہ کچھ جدا تو ہوتے ہی ہیں۔ اسے تم CHARACTERISTIC OF NATION بھی کہہ سکتے ہو۔ مثلاً مصر میں کاربولک ایسڈ کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے۔ بلجیم اور اٹلی میں ریل گاڑیاں زیادہ پاپولر رہی ہیں۔ جو اب ہمارے یہاں بھی پاپولر ہوتی جا رہی۔ فرانس میں اور انگلستان میں بھی عرصہ تک کوئلے کے گیس سے ہی کام لیا جاتا رہا۔ لیکن بہت سے عام طریقے پھانسی، ڈوب جانا، چاقو مار لینا، زہر پی جانا، گولی مار لینا، گلا گھونٹ لینا یا کسی اونچی جگہ سے چھلانگ لگا دینا وغیرہ ــــ ہر ملک میں رائج ہو چکے ہیں۔"

"اور تازہ ترین طریقہ نیند کی گولیاں کھا کر سو جانا دریافت کیا گیا ہے!"

یہ سن کر تیغ کچھ دیر تک بالکل خاموش سا رہ گیا تھا۔

میں نے پھر کہا ــــ "تم نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ آدمی اپنی موت کا طریقہ بھی خود ہی ایجاد کرتا ہے۔ یہ سب طریقے کسی نہ کسی ذریعے سے انسان کے علم میں آ ہی جاتے ہیں۔ سنے سنائے قصوں کے ذریعے سے یا اخبارات کی خبریں پڑھ کر۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر وہ خودکشی بھی کر لیتا ہے تو اس کی موت درحقیقت اس کی اپنی یعنی اوریجنل نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی زندگی کی دی ہوئی ثابت ہوئی جسے وہ چھوڑ دیتا ہے۔ اپنے جسم کو یا اس دنیا کو خیرباد کہہ دینے کا عمل بھی دراصل اس کا اپنا نہ ہوا۔ جو گولی اس کے دماغ کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیتی ہے یا رسّی کا جھٹکا جو اُسے LIBERATE کر دیتا ہے اس کی کیفیت تو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود ہوتی ہے۔ یہ سارے فعل دوسرے لوگوں سے بھی سرزد ہو چکے ہوتے ہیں۔ جو اس کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں یقیناً محفوظ پڑے ہوتے ہیں۔ وہیں سے وہ اچانک نکل کر آ جاتے ہیں۔ اس آخری اور لمحاتی کرائسس میں جب انسان مر جانے کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے۔ وہی ذہن دراصل اسے مرنے کا بھی حکم دیتا ہے ــــ تمہاری یہ بات تسلیم کر کے میں کہہ رہا ہوں کہ آدمی کسی ذہنی بھونڈرے کی وجہ سے بے بس ہو جاتا ہے۔ لیکن مرنے کا جو طریقہ وہ اختیار کرتا ہے وہ اس کا اپنا ہرگز نہیں ہوتا۔ اسی ذہن کا ہی ہوتا ہے۔ محفوظ ذہن کا۔ وہی اس طریقے کا بھی اظہار کرتا ہے۔ لہٰذا مرتے وقت بھی وہ ایک قسم کے فیشن یا رائج شدہ طریقے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں وہ خود کو آزاد کر کے بھی ایک قسم کی غلامی میں ہی جکڑا رہ جاتا ہے۔ جس انفرادیت کے لئے وہ اپنی جان دیتا ہے اس کے لئے کوئی انوکھا یا غیر رائج شدہ طریقہ کیوں نہیں ڈھونڈتا؟"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ شاید ہم دونوں
ب دوسرے کی دلیلوں اور منطق کے قائل ہو چکے تھے۔ لیکن
ں آج تک وہ چہرہ نہیں بھول سکا جو اپنی خودکشی کے ناکام
قدام میں سے اُبھر کر میرے سامنے آیا تھا اور تین چار گھنٹوں
ت میری نظروں کے سامنے موجود رہا تھا۔ پتہ نہیں اس نے
ے فعل سے اور کس کس کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے
اتھ تو اس کی ملاقات محض اتفاقیہ ہو گئی تھی۔ جو لوگ اس کے
ریب رہے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں اس کے ساتھ پڑھتے
ہے تھے۔ یا اسے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ (مثلاً ڈاکٹر
ج الزماں اور ڈاکٹر ابو محمد سحر وغیرہ۔) وہ اس ہندو لڑکی
بھی جانتے ہوں گے اور خودکشی کے اسباب کو بھی۔ جن کے
رے میں تیغ نے میرے ساتھ عمداً کوئی گفتگو نہیں کی تھی مگر چہ
۔ سے رخصت ہوتے وقت اس نے مجھے اپنا مجموعۂ کلام اور
ندی کے گیتوں کی ایک چھوٹی سی کتاب فرید دی تھی جو اسی
لی کے نام معنون تھی۔ اور اپنی ایک تصویر بھی مجھے دی تھی
آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس تصویر کے پیچھے اسی کے
ز رائٹنگ میں دسمبر ۱۹۴۹ء لکھا ہوا ہے۔ یہ تصویر اب میں
اب کی نذر کر رہا ہوں۔) اس میں اس نے سفید کرتا اور گہرے
رکی جواہر جیکٹ پہن رکھی ہے۔ یہ اس زمانے کا ترقی پسند
رباتی شاعر تیغ الہ آبادی ہے جس سے میں پھر کبھی نہیں مل
کا۔ اس کے کافی عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان چلا
ا ہے اور اب مصطفیٰ زیدی کے نام سے شاعری کرنے
ا ہے۔ یہ سن کر مجھے فوراً احساس ہوا تھا اب وہ واقعی خودکشی
نے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے تیغ الہ آبادی کا خاتمہ کر دیا
۔ یہ طریقہ یقیناً انوکھا ہے۔ بہت دلچسپ بھی۔ لیکن میں یہ بھی
نا چاہتا تھا وہ سچ مچ تیغ الہ آبادی کو مکمل طور پر دفنا
اسے یا نہیں؟ اس کی یاد اسے ابھی تک ہانٹ کرتی ہے کہ
یں؟ میں نے یہ بھی سنا تھا وہ پاکستان سول سروس میں
۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہو چکا ہے اور ایک جرمن عورت سے
شادی بھی کر چکا ہے۔ سب سے پہلے اس نے ایک ہندو لڑکی
سے عشق کیا تھا۔ اس کے بعد ایک جرمن نژاد خاتون کو اپنی رفیقہ
حیات بنایا۔ اب اس کو زہر دے کر مار دیئے جانے کی اطلاعات
آئی ہیں تو پتہ چلا ہے کہ وہ کسی مسلم پری چہرہ خاتون کے عشق
میں گرفتار تھا۔ میرا خیال ہے اس کی شخصیت کے اس پہلو
کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ کسی دوسرے مذہب و
قومیت کی خواتین سے اس کی رغبت اس کے لئے فطری کیوں
تھی؟ اور پھر وہ اپنی ایک ہم مذہب خاتون کی طرف کیوں
واپس گیا؟ کچھ بھی ہو ایک زہر یقیناً اس کا ہمیشہ تعاقب کرتا رہا
جہاں جہاں وہ گیا۔ آخری بار اس نے یہ زہر خود نہیں پیا۔ اپنی
ہم مذہب خاتون کے ہی ہاتھ سے پیا۔ (اخبارات کی خبروں
کے مطابق!) وہ مصطفیٰ زیدی ہو کر بھی تیغ الہ آبادی سے پیچھا نہیں
چھڑا سکا! تیغ الہ آبادی جو خودکشی کا مبلغ تھا۔ (میں اسے اس
کتبہ فکر کا محدود معنوں میں Protagonist بھی
کہوں گا) اس کی باتیں میں بھلا نہیں سکا ہوں۔ انہیں میں
اب بھی یاد کرتا ہوں۔ کیوں کہ ان میں ایک بہت اچھے شاعر
کا ایک بنیادی کرب چھپا ہوا ہے۔ مصطفیٰ زیدی یقینی طور پر تیغ
الہ آبادی سے بڑا شاعر تھا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے ہمراز
بھی تھے۔ مصطفیٰ زیدی نے تیغ کا دو بار گلا گھونٹنا چاہا لیکن تیغ
الہ آبادی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اس کے اندر ہمیشہ زندہ
رہا۔ پچھلے چند برسوں میں اس نے ایسی نظمیں لکھیں جن سے
یہی احساس ہوتا تھا ؎

لٹ گئی دولت ایمان و متاع عرفاں
کیسۂ منبر و محراب و کلیسا مد دے ---

مجھ کو چپ چاپ اس طرح مت دیکھ
میرے بستر کی سلوٹیں مت کھول
رات میں کتنی دیر سویا ہوں
بول اے صبح کے ستارے بول

مصطفیٰ زیدی

پہلی محبت

ڈاکٹر مسیح الزماں کی ادارت میں ایک رسالہ "انتخاب" الہ آباد سے نکلتا تھا۔ اس کے جنوری ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں مصطفیٰ زیدی (جو اس وقت تیغ الہ آبادی کے نام سے لکھتے تھے) کا یہ منحط نما افسانہ شائع ہوا تھا۔ افسانہ کا عنوان ہمارا دیا ہوا ہے۔ (ادارہ)

اسے کیا کہتے ہیں؟

آپ نے میرا خط واپس کر دیا۔ اس عنایت کا شکریہ۔ لیکن کیا آپ ازراہِ مہربانی اس جذبہ کو بھی واپس کر سکتی ہیں جو ایک عرصہ ہوا آپ نے خود مجھ سے چھینا تھا۔ کیا آپ ان بیشمار آنسوؤں کو میرے دل کے اس صدمت میں واپس کر سکتی ہیں جہاں ایک بھیانک خلا میری زندگی کا منہ چڑا رہا ہے جہاں رات کی خاموشیوں میں ہیبت اور خوفناک چڑیلیں رقص کرتی ہیں جہاں روشنی کی ایک دھندلی سی کرن کا پرتو بھی نہیں!

آپ نے میرا خط واپس کر دیا لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس غیر متوقع نفرت کا اس قلب پر کیا اثر پڑے گا جہاں محبت ہی محبت ہو جہاں انسانیت اور آدمیت کے وہ چراغ روشن ہیں جن کی مبہم سی ضیا بھی کائنات کو منور کر سکتی ہے۔ کیا آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس معصوم دل پر کیا گزرے گی جسے پہلے ہی غم دوراں نے مجروح کر دیا ہے۔

آپ نے میرا خط واپس کر دیا۔ یہ کوئی عشقیہ خط نہیں تھا۔ مجھے دعویٰ ہے کہ میں نے آج تک آپ کو کوئی عشقیہ خط نہیں بھیجا۔ یہ سچ ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اپنی طویل اور تنہا راتوں کو آپ کی یاد میں رو رو کر گزارا ہے یہ سچ ہے کہ میں نے آپ کے تصور کی تصویر کی پرستش کی ہے لیکن میں نے آج تک آپ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے آج تک آپ کو یہ نہیں بتایا کہ آپ میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں نے آج تک یہ نہیں کہا کہ آپ میرے اجڑے ہوئے گنج کو اپنے رخساروں سے گلاب کی نزہت بخش سکتی ہیں میں نے آج تک آپ پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ آپ کی لغزیدہ خرامی میرے پامال سبزے کو تازگی دے سکتی ہے — لیکن یہ سب کیوں؟ اظہارِ محبت میں کیا چیز مانع ہو سکتی تھی؟ سنئے۔ میں نے آپ کو ستاروں سے زیادہ معصوم اور پھولوں سے زیادہ انجان سمجھا تھا میرا خیال تھا کہ محبت کا اظہار جوانی کے لیے بادسموم بن جاتا ہے — آج معصومیت کا وہ اعلیٰ تصور میری نگاہوں سے گر چکا ہے آج صرف آپ ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی تمام عورتوں کی عزت میرے لیے مبہم بن کر رہ گئی ہے کیونکہ میں آپ کو نسوانی طبقہ کی اعلیٰ ترین عکاسی سمجھتا ہوں۔ غالباً آپ نے خود کو میرے لیے وسیع بنانا چاہا لیکن آپ یہ نہیں سمجھیں کہ میں کالج کے ان عمومی لڑکوں میں سے نہیں ہوں جن کے اعصاب پر عورت سوار رہتی ہے۔ جن کے لیے کسی بھی نسوانی شکل کی ذرا سی جھلک کائنات بن جاتی ہے۔ میرے سامنے محبت کے علاوہ زندگی کے اور بھی موضوع ہیں — میں نے ان تمام باتوں کے باوجود محبت کا فریب کھایا تھا لیکن میں اس فریب میں بھی اس جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا جسے آپ نے عملاً اپنے کردار سے ظاہر کیا۔

آپ نے میرا خط واپس کر دیا لیکن آپ نے خود اپنے اوپر وہ ظلم کیا ہے جس کا انتقام مستقبل آپ کو دے گا۔ سنئے۔ آپ دوسروں کو دھوکا دے سکتی ہیں لیکن اپنے نفس کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔ شاید آپ میری نگاہ رستاخیز کے عمق کو بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ اپنے دل کو ٹٹولیے اور جواب دیجئے، کیا آپ مجھ سے ... نہیں لگا میں خود فریبی

یا مبتلا ہوں، ہر گز نہیں، یہ ایک حقیقت اور اٹل حقیقت ہے کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ یہ آپ کے دل کی آرزو ہے کہ آپ میری گرم سانسوں کو اپنے نرم چہرے پر محسوس کریں۔ یہ آپ کے سینے کی خواہش ہے کہ تھر تھراتے ہوئے ہونٹوں سے اپنے تشنہ ملس ہونٹوں کی کسک کو آسودگی دیں۔ یہ آپ کا ارمان ہے کہ اپنے سینے کو میرے بازوؤں میں جذب کردیں، اپنے وجود کو میرے وجود میں کھو دیں! اور اگر یہ جھوٹ ہے تو آپ مجھے بتائیے کہ میرا نام سن کر آپ کے چہرے پر شرم کے سرخ سرخ ڈورے کیوں دوڑ جاتے ہیں۔ اس دن جب ہم دونوں نے ڈرامے کی ایکٹنگ میں ساتھ ساتھ حصہ لیا تھا تو آپ کی نگاہیں کیوں خوشی سے چمک رہی تھیں؟ لیکن ———

آپ نے میرا خط واپس کر دیا ——— ایک وجہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ آپ خود کو میری نگاہوں میں وقیع بنانا چاہتی ہیں۔ لیکن ہو سکتا یہ وجہ غلط ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ مجھے بھی ان لڑکوں کے معیار پر دیکھنا چاہتی ہوں جو آپ کو دور سے آتے دیکھ کر فلمی گانے گانا شروع کر دیتے ہیں، جو کلاس میں آپ کے اوپر چاک اور سنگترے کے چھلکے پھینکتے ہیں جو کالج اسمبلی میں مقرر کی آواز سننے کی جگہ آپ کے چہرے کو تاکا کرتے ہیں ——— ممکن ہے آپ یہ چاہتی ہوں کہ میں اس سطح پر اتر آؤں جہاں سونے اور تانبے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جہاں جسمانی اتصال کو محبت کہا جاتا ہے۔ شاید آپ کا یہ مقصد ہو کہ میں اپنے سچے عقاید کو آپ کے جھوٹے اوہام پر قربان کر دوں۔ میں بھی انھیں باتوں کو ماننے لگوں جنھیں عموماً مانا جاتا ہے ——— ان تمام باتوں سے برطرف ایک بات اور جو بہت زیادہ کھٹک رہی ہے یہ ہو کہ میرے اور آپ کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے جسے دولت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آپ کو ریشم اور حریر کی ساریاں پسند ہیں مجھے معمولی کپڑا بھی نصیب نہیں۔ آپ عموماً ہوٹل اور کیفے کو نوازتی رہتی ہیں مجھے ایک وقت کا کھانا بھی انتہائی مشقت کے بعد ملتا ہے آپ ایک عالیشان کوٹھی میں رہتی ہیں میں ایک تنگ و تاریک مکان میں مقیم ہوں ——— اس خلیج کو تاریخ کے مضبوط معمار بھی صدیوں اور قرنوں میں بھی نہیں پاٹ سکے۔ یہ خلیج انسانی خون سے بنی ہے جس کے ایک ایک

قطرے میں حقائق کے وہ شرمناک قصے منعکس ہیں جن میں سرمایہ دار اپنی صورت دیکھ کر جھلا جاتے ہیں ——— یہ وہی خلیج ہے جسے فاشزم کہا جاتا ہے یہ وہی خلیج ہے جسے روایتی افسانوں میں سماج کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آپ نے میرا خط واپس کر دیا ——— شاید اس لئے کہ میری انفرادیت بہت ارزاں ہو جائے۔ شاید اس لیے کہ میں اپنے معیار سے نہیں گر سکتا، شاید اس لئے کہ میں الہیات کو نہیں مانتا، شاید اس لئے کہ میں ایک غریب انسان ہوں ——— لیکن کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے چراغوں کی لو میری آہوں کی آندھیوں سے نہیں کانپے گی۔ آپ کے ریشم و دیبا کے پردوں میں میرے گرم گرم آنسو آگ نہیں لگا دیں گے؟ ——— میں حسن کی بارگاہ میں بھی اپنی انسانی عظمت کو نہیں کھونا چاہتا۔ محبت کی موت پر بھی مجھے اپنی خودداری عزیز ہے۔ آپ اپنی ذہنی نفسیات کا ثبوت دے چکیں، مستقبل میرے صبر و استقلال کا ثبوت دے گا۔ ان روایتی افسانوں کو بھول جائیے جنھیں الف لیلیٰ کے کرداروں نے جنم دیا تھا۔ ان قصوں کو طاق نسیاں میں رکھ دیجئے جن پر مجنوں، فرہاد، مہینوال، رومیو اور اسی نوع کے دوسرے نام جلی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ آج کا تمدن گزرے ہوئے کل کے تمدن کو برداشت نہیں کر سکتا۔ آج سے میں کوشش کروں گا کہ ان آہوں کو کچل کر رکھ دوں جو آپ کی یاد میں ضائع ہوتی ہیں، ان آنسوؤں کو کھول میں پی لوں جو آپ کے تصور میں برباد ہو جاتے ہیں۔

آپ نے میرا خط واپس کر دیا ——— شاید آپ اُسے واپس کرنے پر نادم ہوں کیونکہ یہ خط تو آپ کو پڑھنا ہی پڑے گا کیونکہ یہ خط آپ ہی کے نام نہیں ہے بلکہ تمام نسوانی طاقتوں کے نام ہے جو کالج میں قدم رکھتے ہی مغرور ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ خط میرے ہی طرف سے نہیں ہے بلکہ لاکھوں کروڑوں مجبور، بے بس، اور ستائے ہوئے انسانوں کی طرف سے ہے۔ کیونکہ یہ خط ایک خط نہیں ہے بلکہ اس تہذیب کا ایک مستحکم نقش ہے جو میرے دل میں پروان چڑھ رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ محبت کی شکست آج مجھے خون رُلا رہی ہے (اور نہ جانے کب تک رُلائے) لیکن آج اس فریب کے پردے کے چیتھڑے چیتھڑے ہو گئے ہیں

جس نے دو سال تک مجھ کو بھی نہ دیکھنے دیا۔ محبت آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ محبت انسان کا ذلیل ترین پہلو ہے۔ میں ان ادیبوں اور فن کاروں پر لعنت بھیجتا ہوں جنھوں نے میرے سینے کو جذباتی احساس سے بھر دیا تھا۔ جنھوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ عورت فطرت کا شاہکار ہے۔ عورت دیوی ہے۔ عورت کائنات کے سینے کا مقدس ترین راز ہے۔ معاف کیجئے گا اگر میں کہوں کہ عورت نے فطرت کی تذلیل کی ہے۔ عورت دیوی نہیں مرگھٹ کی وہ ڈائن ہے جو سل، دق، اور آتشک کے جراثیم کی طرح انسان کو موت کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ عورت مقدس نہیں عورت قرنوں کی نجاست اور گندگی کو اپنے چہرے سے لپیٹے ہے ——— وہ گندگی جو سفید اور گلابی غازے کی دبیز تہ سے بھی نہیں چھپتی!

آپ نے میرا خط واپس کر دیا ——— اب آپ کا ریشمی آنچل نہایت آسانی سے لڑکوں کے کنوارے دلوں سے تلطف حاصل کر سکے گا۔ اب آپ ہر بوالہوس کی راہ میں اپنے سنہرے روپہلے جال پھیلا سکتی ہیں لیکن اب ڈھونڈھنے سے بھی آپ کو کوئی معصوم دل نہیں ملے گا۔ اب آپ اپنی انتھک کوششوں کے باوجود اس پرخلوص محبت کو نہیں پا سکتیں جو صرف ایک بار پیدا ہوتی ہے اور شاید میرے ذہن کے منتشر ذرے آپ کے دل سے اس وقت بھی چھیں جب آپ کیف اور سکون کی نیند میں غرق ہوں گی۔

اور جب رات بھیگ چلے گی تو آپ ٹھوکریں کھاتی ہوئی زیدی کے معصوم بازوؤں کو ڈھونڈیں گی۔ لیکن زیدی آپ کو نہیں ملے گا، کیونکہ زیدی مر چکا ہے ——— آپ کا زیدی ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سو گیا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا زیدی پیدا ہو چکا ہے جسے آپ نہیں جانتیں ——— اور جو آپ کو بھی نہیں جانتا!! ■

سحر انصاری

جو سنا افسانہ تھا

(ویرا زیدی سے ایک خصوصی انٹرویو)

مصطفیٰ زیدی کی "مرگِ ناگہاں" نے ان کی شخصیت کے اتنے پہلوؤں کی نشان دہی کر دی ہے کہ اگر کوئی انھیں سمیٹنا چاہے تو اسے خاصی محنت اور تحمل سے کام کرنا ہوگا۔ سوچا یہ گیا کہ مصطفیٰ زیدی کے نقاد اور ان کے دوست ان کی زندگی کے صرف چند زاویوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن ان کی ذاتی زندگی کے کوائف ان کے متعلقین سے بہتر شاید کوئی اور نہ بتا سکے چنانچہ میں اور صہبا لکھنوی صاحب نومبر کی ۲۲ ویں صبح کو مصطفیٰ زیدی کے ماموں جناب حسن مصطفیٰ کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ جہاں ویرا بھابھی بھی آنے والی تھیں۔ ہم ایک کاغذ پر سوال مرتب کرنے لگے۔ جن سے ویرا زیدی اور مصطفیٰ زیدی کے گھریلو اور ذاتی قسم کے واقعات ابھر کر سامنے آ سکیں۔ اتنے میں ویرا زیدی اور شاہ رضا وہاں آ گئے۔ میں نے ہمت کر کے اس سوگوار چہرے کو دیکھا جس نے اپنی وفا اور دردمندی میں مشرقی خواتین کو بھی مات کر دیا ہے۔ زیدی مرحوم نے اس بدیسی خاتون کے بارے میں ایک نظم کہی تھی۔ بدیسی۔ جس کے یہ مصرعے ذہن میں ابھرنے لگے ؎

سات سمندر پار سے گوری آئی پیا کے دیس
روپ بدیسی، لیکن جیسے پورب کا سندیس
لمبی لمبی پلکیں، جن میں تلواروں کی کاٹ
نیلی نیلی آنکھیں، جیسے جمنا جی کے پاٹ
اجلی اجلی یا ٹھنڈے ٹھنڈے دریاؤں میں سیپ
روشن روشن چہرہ، جیسے دیوالی کا دیپ

گندم کی جیسی رنگت کے نرم، سنہرے کیس
آئی پیا کے دیس
تپتی دھرتی، جلتا سورج، نئی نئی ہر بات
اٹھارہ گھنٹوں کے دن، اور چھ گھنٹوں کی رات
نئے نئے کپڑے پہنے اور سیکھے دو بجے ڈھنگ
ٹوٹی پھوٹی اردو، جس کے الٹے سیدھے بھیس
آئی پیا کے دیس

کشادہ پیشانی، بڑی بڑی گہری آنکھیں، جن میں اداسی اپنا مسکن بنا چکی تھی، گندم کی سی رنگت اور سنہرے کیس اب موجود تھے لیکن ان سب پر گہرا سوگ طاری تھا۔ ان آنکھوں کے بند ہو جانے کے بعد۔ جنھوں نے اس روشن روشن چہرے کو دیوالی کے دیپ کے روپ میں دیکھا تھا۔ آج وہ ٹوٹی پھوٹی نہیں بلکہ بڑی شستہ اور رواں اردو بول رہی تھیں۔

صہبا صاحب نے اُن سے سوال کیا۔

"آپ کب اور کہاں پیدا ہوئی تھیں ۔۔۔؟"

"جی میں۔ کہاں پیدا ہوئی تھی؟" انھوں نے کچھ گھبرا کر جواب دیا۔ شاید یہ سوال ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھیں ساری گفتگو مصطفیٰ زیدی کے بارے میں رہے گی۔ لیکن مصطفیٰ زیدی سے دلچسپی رکھنے والے اُن کی شاعری سے محبت کرنے والے یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ ان کی شریکِ حیات خود کیا ہیں اور انھوں نے کہاں تک اس شاعرِ بےباک کو خوش رکھا

کو ذہنی رفاقتیں دی ہیں۔

صہبا صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔

"جی ہاں۔ آپ اپنے بارے میں بتائیے۔ اپنی ابتدائی زندگی پر اگر کچھ روشنی ڈال سکیں تو مناسب ہوگا"

ویرا زیدی نے کہنا شروع کیا۔ اور ہم خاموش سنتے رہے۔ اس موقع پر شاہد رضا، حسن مصطفےٰ اور بیگم حسن مصطفےٰ کی موجودگی اس اعتبار سے بہت مفید رہی کہ جہاں کہیں ویرا زیدی پوری وضاحت نہ کر سکتیں ان میں سے کوئی اس کو اچھی طرح بیان کر دیتا۔ اس طرح درمیان میں جو باتیں ہوتی رہیں ان سے بھی مصطفےٰ زیدی کی زندگی، معروفیات اور افتادِ طبع کے بہت سے گوشے ہمارے سامنے آ گئے۔

ویرا زیدی کہہ رہی تھیں:

۱۹۳۰ء میں "مورشی" ایسٹ افریقہ میں میری پیدائش ہوئی۔ ٹانگانیکا جس زمانے میں برطانوی مقبوضہ علاقہ تھا اس وقت میرے والدین وہاں سکونت پذیر تھے۔ وہاں میرے والد کے کافی کے کھیت تھے۔ ساتھ ہی وہ فورڈ ایجنسی میں حصّہ دار بھی تھے۔ میری والدہ آسٹروی گوسلاوی ہیں۔

مصطفےٰ زیدی سے آپ کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ اور پاکستان آ کر آپ ان کے ساتھ کہاں کہاں رہیں — ؟

مصطفےٰ زیدی سے ۱۹۵۰ء میں لندن میں میری ملاقات ہوئی۔ میں وہاں تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھی۔ وہ کولمبو پلان کے تحت تعلیم حاصل کرنے انگلستان آئے ہوئے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ سیالکوٹ میں اسسٹنٹ کمشنر اور ڈیرہ غازی خاں میں فورٹ منرو میں پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان آ کر میری ان سے شادی ہوئی۔ فورٹ منرو میں چھ ماہ رہنے کے بعد وہ لیہ میں ایس ڈی ایم رہے۔ پھر چھ یا آٹھ ہفتے رہنے کے بعد لیہ کے کمشنر زبیری صاحب نے کہا کہ وہاں گرمی زیادہ ہے لہٰذا کسی اچھی جگہ تبادلہ کر دینا مناسب رہے گا یعنی خانیوال تبادلہ ہو گیا۔ یہ جگہ بھی آب و ہوا کے لحاظ سے اتنی اچھی نہ تھی۔ اس کے بعد زبیری صاحب کی کوشش سے مصطفےٰ کی پوسٹنگ خانیوال سے مری ہو گئی۔ وہاں سات یا نو مہینے رہے، پھر ڈپٹی سکریٹری تعلیم خیرپور میں رہے۔ خیرپور سے منٹگمری تبادلہ ہو گیا۔ اس کے بعد دوبارہ لاہور آئے اور دو سال تک وہ لاہور میں ڈپٹی کمشنر رہے۔ ایک سال کے بعد وہ ملک سے باہر گئے پھر واپس آ کر بنیادی جمہوریت کے سکریٹری ہو گئے۔

آپ پاکستان کے اتنے شہروں میں رہیں۔ مختلف افراد کی زندگی کا مشاہدہ آپ نے کیا ہوگا۔ یہ بتائیے کہ آپ کو مغربی اور مشرقی زندگی میں کوئی فرق نظر آتا ہے۔؟

جی ہاں دونوں جگہ کی زندگی میں فرق ضرور ہے۔ لیکن یہ فرق باہر کی زندگی یا بیرونی سجاوٹ اور بناوٹ میں محسوس ہوتا ہے لیکن اچھے گھرانوں میں مشرق اور مغرب کا کوئی فرق مجھے محسوس نہیں ہوتا ہے۔ گھریلو زندگی بہت سی اچھی باتیں اور جذبات و احساسات اچھے گھرانوں میں مشترک اور یکساں ہوتے ہیں۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے یہاں کے ماحول میں خود کو خوب ڈھال لیا ہے۔ یہاں کا لباس اختیار کیا۔ اردو زبان سیکھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔

آپ اتنی اچھی اردو کس طرح بول لیتی ہیں؟ اردو آپ نے کب اور کس سے سیکھی؟

شروع میں ایک استاد رکھا تھا۔ پھر کچھ مصطفےٰ سے سیکھی لیکن جب مصطفےٰ کی والدہ صاحبہ ہمارے ساتھ آ کر رہیں تو اُن سے میں نے گھر کے طور طریقے بھی سیکھے اور اردو بھی خاصی سیکھ لی۔

آپ کا پہلا بچہ کب اور کہاں پیدا ہوا تھا؟

"پہلا لڑکا مجتبیٰ ۱۹۵۵ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوا"

اور بچی؟ عصمت!

"جی! عصمت مری میں جنوری ۱۹۵۸ء میں پیدا ہوئی تھی"

مصطفےٰ زیدی گھریلو معاملات سے کس حد تک دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں گھر کا ماحول زیادہ پسند تھا یا باہر کی زندگی؟

وہ گھریلو زندگی بہت پسند کرتے تھے۔ انھیں بناوٹ پسند نہ تھی۔ ان کے مزاج میں دکھاوا نہیں تھا۔ عام زندگی میں ہم بہت مطمئن تھے۔ کبھی کبھی ذہن پر کوئی بوجھ ہوتا تھا تو اداس ہو جاتے تھے۔ میری شادی سے چند ہفتے پہلے ان کے بڑے بھائی مجتبیٰ زیدی کا انتقال ہوا تھا — اور وہ ذہنی طور پر بہت پریشان اور اداس رہتے تھے۔ اُن کی موت کا غم انھیں بہت زیادہ تھا اور مجتبیٰ زیدی تھے بھی بہت اچھی شخصیت کے مالک۔ جب میری والدہ مصطفیٰ سے شادی کی اجازت دے چکی تھیں تو اسی زمانے میں بڑے بھائی ایک دن کے لئے ہمارے یہاں جرمنی میں ٹھہرے۔ ان کے اخلاق و عادات کو دیکھ کر میری والدہ نے کہا کہ اگر مصطفیٰ ان سے ۵۰ فی صد بھی ہیں۔ تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی اچھی طرح گزرے گی۔

کیا زیدی صاحب آپ کو اپنے شعر سناتے تھے؟

ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی وہ مجھے اپنی نظمیں سناتے تھے۔ ویسے ہمارے گھر میں کوئی نہ کوئی مہمان ہمیشہ رہتا تھا۔ ادیب، سرکاری افسر، رشتہ دار اور دوست وغیرہ آتے تھے تو تقریباً روز ہی مشاعرے کی سی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر نظمیں میں نے اسی قسم کی محفلوں میں سنی ہیں۔ بعض الفاظ کا جنھیں وہ میرے لئے مشکل سمجھتے تھے، انگریزی میں ترجمہ کر دیتے تھے ——

بعض اخبارات نے لکھا ہے کہ آپ نے اردو میں ایم۔ اے کیا ہے یہ کہاں تک درست ہے؟

جی یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے اورینٹل کالج لاہور میں ایک ڈپلوما حاصل کیا تھا جو غیر ملکیوں کو اردو سیکھنے پر دیا جاتا ہے۔ اردو میں ایم۔ اے میں نے نہیں کیا۔

وہ شعر کس طرح کہتے تھے؟ کیا کوئی خاص خود طاری تا تھا۔ یا کوئی اہتمام کرتے تھے؟

شعر کہنے کے لئے کوئی التزام یا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ وقت کی یا موڈ کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ان کے یہاں آورد نہیں بلکہ آمد تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے، کار چلاتے ہوئے بچوں سے کھیلتے ہوئے شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا اس لئے بعد میں کاغذ پر لکھتے تھے۔ قرآن کے بہت سارے حصے انھیں زبانی یاد تھے۔ بے شمار آیات وہ گفتگو کے دوران حوالے کے طور پر زبانی سنا دیتے تھے۔

آپ دونوں آپس میں اور بچوں سے کس زبان میں بات چیت کرتے تھے؟

آسان گھریلو باتیں اردو میں کرتے تھے۔ اور شروع میں ہم زیادہ تر انگریزی بولتے تھے۔ لیکن جب بچے بڑے ہوئے تو ہم نے طے کیا کہ بچوں کی زبان اردو رہے۔ چنانچہ زیادہ تر ہم اردو میں بات کرتے تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ بچوں کو ہر ممکن سہولت اور مواقع دیں تاکہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اُبھار سکیں۔ ہم نے سوچا کہ وہ اس ماحول کی زبان کو اپنائیں جس میں وہ پرورش پا رہے ہیں تاکہ بڑے ہو کر انھیں اپنے ماحول سے لڑنا نہ پڑے۔

کیا بچوں کو بھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہے؟

جی۔ مصطفیٰ نے بچوں کو خاص طور پر لڑکے کو شعر و شاعری سے دور رکھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ زندگی میں جن چیزوں میں وہ مبتلا رہے ان کے بچے بھی مبتلا رہیں۔ لڑکے کے بارے میں وہ کہتے تھے یہ سب کچھ بنے لیکن سی۔ ایس۔ پی یا شاعر نہ بنے۔ لڑکے کی عمر اس وقت بارہ سال ہے اور ابھی سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ذہن منطقی ہے۔ لڑکی اس سے ذرا مختلف ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ لڑکی فائن آرٹ یعنی موسیقی کی طرف زیادہ توجہ دے رہی ہے تو ہم نے یہ کوشش کی کہ وہ موسیقی کے سلسلے میں اپنی صلاحیت کو آگے بڑھائے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بچے میں جس قسم کی صلاحیت ہو اسی قسم کی تربیت اسے دینی چاہیئے۔

آپ پر انھوں نے کون کون سی نظمیں لکھی ہیں؟ کیا آپ ان سے ان کی شاعری کے بارے میں کچھ سوالات کرتی تھیں؟

بدیسی اور اعتراف جیسی دو نظمیں خاص طور پر انھوں نے میرے لیے لکھی ہیں۔ ایک اور نظم "شریک حیات" کے لئے بھی لوگ کہتے ہیں کہ مجھ پر ہے لیکن یہ میری شادی سے بہت پہلے لکھی ہے اور شبخون میں چھپ چکی ہے۔ اس نظم میں "شریک حیات" کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا تھا کہ آپ جو نظم کس پر کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا ایسا نہیں ہوتا ہے کہ ہم کسی کو ذہن میں رکھ کر لکھتے ہیں۔ انسپریشن تو کسی سے بھی حاصل ہو سکتا ہے لیکن باقی باتیں تو ہمارے ذہن ہی کا حصہ ہوتی ہیں۔ جب ہم شعر لکھتے ہیں تو اس میں ابھرنے والی شخصیت اس شخصیت سے مختلف ہوتی ہے۔

زیدی صاحب کس قسم کے کھانے پسند کرتے تھے۔؟

کسی خاص قسم کے کھانے سے انھیں رغبت نہیں تھی۔ وہ سب کچھ کھا لیتے تھے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں یہ چیز کھاؤں گا اور یہ نہیں۔ البتہ ایک بات پر بہت توجہ دیتے تھے کہ کھانا لگانے میں سلیقہ ہو۔ اور کھانا دیکھنے میں اچھا لگے۔ کھانے میں انھیں ہر چیز پسند تھی لیکن پان سے انھیں سخت نفرت تھی۔ ہم میں سے کوئی پان نہیں کھاتا تھا۔ انھوں نے شادی کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ تمہارا جو جی چاہے کرنا لیکن پان کبھی نہ کھانا۔

آپ کو زیدی صاحب کے کون سے اشعار یا نظمیں یاد ہیں؟

میں نے ان کی زبان سے بہت اشعار اور نظمیں سنیں لیکن میں کبھی ان کے اشعار کو دہراتی نہیں تھی۔ میں نے کئی بار یاد کرنے کی کوشش کی لیکن یاد نہیں کر سکی۔

بچوں کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ آپ جرمنی واپس چلی جائیں گی یا بچوں کو یہاں لے آئیں گی؟

بچوں کے لئے میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ غالباً میں یہاں آکر رہوں گی۔ اس وقت میں بچوں کی وجہ سے جرمنی جا رہی ہوں کہ وہاں ان کا تعلیمی سال ضائع نہ ہونے پائے۔ پھر ان کو تسلی دینے کے لئے میرا وہاں ہونا ضروری ہے۔ میں مصطفیٰ کے شوہر سے جرمنی گئی تھی۔ وہاں اگرچہ میری والدہ ہیں لیکن اتنے سال یہاں رہنے کے بعد میں وہاں اکیلی محسوس کرتی ہوں۔ شاید چار پانچ سال بعد یہاں آجاؤں گی۔ یہاں میری سسرال ہے اور عزیز اور دوست ہیں جن سے اخلاقی مدد ملتی ہے۔

آپ کے والد زندہ ہیں؟

جی نہیں۔ جنگ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب صرف والدہ ہیں۔

اردو، انگریزی اور جرمن کے علاوہ آپ کو اور کون کون سی زبانیں آتی ہیں۔

میں تھوڑی بہت لاطینی، اطالوی، یوگوسلاوین زبانیں بول سکتی ہوں لیکن اتنی نہیں جانتی کہ کوئی مضمون وغیرہ لکھ سکوں۔

کیا آپ کو بھی شاعری سے اور لکھنے پڑھنے سے دلچسپی رہی ہے؟

شاعری سے دلچسپی بس پڑھنے اور سننے کی حد تک رہی ہے میں نے خود شاعری نہیں کی۔ شروع میں کچھ مضامین میں نے لکھے ہیں۔ مجھے میوزک سے بہت دلچسپی تھی۔ ویسے یہاں آنے کے بعد میں نے اسے بھی چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹے شہروں میں یہاں موسیقی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ شروع میں مصطفیٰ کا اور میرا ارادہ ستار خریدنے کا تھا لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ عام لوگ اس بات کو اچھا نہیں سمجھیں گے تو میں نے ارادہ ترک کر دیا۔

جرمن شعرا میں آپ کسے پسند کرتی ہیں۔؟

ایک زمانے میں مجھے رلکے پسند تھا لیکن چونکہ وہ بہت رومانٹک اور ناقابل فہم ہے اس لئے میں نے اس کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس کے مقابلے میں ایڈورڈ میورک اور گوئٹے اور شلر مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ ان کے خیالات میں اور ان کی شاعری میں سادگی ہوتی ہے۔ میں سادگی ہی میں حسن تلاش کرتی

تھی وہ سب مجھے گویئے اور شلر زیادہ پسند تھے۔ ان شاعروں کا نقطۂ نظر قنوطی نہیں تھا بلکہ رجائی تھا اس لئے مجھے اوشل شعراء کے مقابلے میں میوزک اور گویٹے اور شلر ہمیشہ پسند آتے ہیں۔

ویرا زیدی شائستہ لب و لہجہ میں روانی سے اردو بول رہی تھیں۔ ان کا یہ پہلو بھی ہماری خواتین کے لئے سبق آموز ہے کہ انھوں نے کس طرح ایک اجنبی ماحول میں خود کو ڈھال لیا۔ جب وہ کہہ رہی تھیں کہ مصطفیٰ زیدی ایک غیر معمولی انسان تھے اور میرے لئے ایک مثالی شوہر کی حیثیت رکھتے تھے تو ہم نے اپنے دل کی بات بھی کہہ دی کہ بھابی اگر وہ مثالی شوہر تھے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بھی ایک مثالی بیوی ہیں۔

ان باتوں میں خاصا وقت ہوگیا تھا۔ ان کے چہرے پر غم اور آنکھوں میں بے پایاں اُداسی تھی۔ ایک لٹے ہوئے انسان کی سی اُداسی۔

ہم نے شاہد رضا سے مصطفیٰ زیدی کی ابتدائی زندگی اور کچھ اور ایسے واقعات کی بابت سوالات کا آغاز کر دیا جو ان کے علم میں ہوں۔

شاہد رضا نے بتایا کہ مصطفیٰ زیدی عمر میں مجھ سے دو سال بڑے تھے بچپن ہی سے میں ذہنی طور پر ان سے بہت قریب تھا۔ ایک ساتھ ہی ہماری پرورش ہوئی میرے دادا اسد بخت حسین صاحب مجھے اپنا نواں بیٹا کہا کرتے تھے۔ دادا مرحوم پولیس میں تھے۔ اس لئے وہ کسی حد تک سخت گیر تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ترقی کو تج کر اپنے آٹھ بیٹوں کی تربیت کی۔ سب نے ایم۔ اے کیا اور سب اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ ان کا ایک ضابطۂ حیات تھا، اور چونکہ مصطفیٰ زیدی کی طبیعت مختلف تھی ——— ان کا رجحان اس ضابطۂ حیات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اس لئے وہ ان سے بغاوت کرتے تھے۔ شروع ہی سے وہ باقی افراد سے مختلف اور منفرد تھے۔ بعد میں یہ ان کی عادت بن گئی کہ جب کسی چیز کو منع کیا جاتا تھا وہ اسی کو کرتے تھے وہ کسی حالت میں بھی مصالحت نہیں کرسکتے تھے۔ ———

مجھے بھی شروع میں شاعری سے دلچسپی تھی اگرچہ میں خود شعر نہیں کہتا تھا۔ لیکن ادبی ذوق میں ہم ایک دوسرے کے شریک تھے۔ ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں ہم دونوں نے مل کر الہ آباد سے ایک ادبی رسالہ نکالا جس کا نام کرن تھا۔ ہم دونوں کا جیب خرچ اسی رسالے میں لگ جاتا تھا۔ اس میں اشتہار کوئی نہیں ہوتا تھا لہٰذا ساری ذمے داری ہم پر ہی تھی۔ ہم خود ہی اُسے بک اسٹالوں پر تقسیم کرنے کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ اس کے صرف دو شمارے نکل سکے۔ دوسرے میں ہم نے صفی لکھنوی کا ایک قطعہ چھاپ دیا جس پر حکومت کو اعتراض ہوا اور ضمانت ضبط ہوگئی۔

مصطفیٰ زیدی ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے۔ ان کے آنے کے کچھ عرصے بعد ہم بھی پاکستان آگئے ———

——— یہاں غم دوراں کے ہاتھوں ہم میں ایک دوسرے سے دوری رہی لیکن جب کبھی کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو وہ مجھے مشورے میں شریک رکھتے تھے۔ بعض اوقات تو مجھے لاہور بھی بلا لیتے تھے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج میں ملازم ہوگئے۔ اس کے بعد پشاور چلے گئے۔ میں ایئر فورس میں شامل ہوگیا پھر سی ایس پی ہوگئے۔ خط و کتابت کا سلسلہ جو ہم میں ایک عرصے سے جاری تھا، ٹیلی فون کی شکل اختیار کر گیا۔ جب وہ کراچی آتے تھے خواہ آدھ گھنٹے کے لئے سہی، ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ میرے اور ان کے بہت گہرے تعلقات رہے۔ درمیان میں جو باتیں رہ جاتی تھیں وہ زبانی بتا دیتے تھے۔ اس طرح میں کم و بیش تمام واقعات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں ان کی بیشتر نظموں کی تخلیق کا پس منظر بھی جانتا ہوں۔ میں مذاقاً ان سے کہا کرتا تھا کہ مصطفیٰ میں تمہاری ہر نظم کے پس منظر کو جانتا ہوں کہ فلاں خیال تم نے فلاں ناول سے لیا ہے۔ لہٰذا میں ان کی تشریح لکھ کر تمہیں بدنام کروں گا۔

ہم نے کہا کہ صاحب اس مذاق سے قطع نظر آپ کو واقعی ان کی نظموں کے پس منظر پر سیر حاصل مضمون لکھنا چاہیئے۔

جس پر انھوں نے آمادگی کا اظہار کیا۔

شاہد رضا نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ جس زمانے میں مصطفیٰ زیدی نوعمر تھے اور ہم یادہم میں پڑھا کرتے تھے، وہ بہت نمازی تھے۔ یہ واقعہ زنجیریں کی اشاعت سے پہلے کا ہے۔ مذہب سے اس قدر لگاؤ تھا کہ ایک ہزار دانوں کی تسبیح اور تہجد کی نماز تک پڑھتے تھے۔ جمعہ کو جعفر طیار کی نماز بھی پڑھتے تھے۔ لیکن پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ بالکل بدل گئے۔ انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ایک زمانے میں حالات نے مجھے Sensuous بنا دیا تھا لیکن اب میں کچھ سوچ کر ایک الگ راہ بنا رہا ہوں۔ اپنے مزاج میں توازن پیدا کر رہا ہوں۔ میں مجموعی طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک ایسے انسان تھے جو اپنی عقل و شعور کے سہارے ہمیشہ تلاش حق میں مصروف رہے۔ آپ اگر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ۱۹۶۵ء کے بعد واقعہ کربلا سے ان کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی ـــــــــ ان کی نظموں میں کثرت سے اس کے اشارے ملتے ہیں۔

بیگم حسن مصطفیٰ جو مصطفیٰ زیدی کی ممانی ہیں۔ بہت مخلص اور متواضع خاتون ہیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں مصطفیٰ زیدی کی شاعری اور ان کی شخصیت سے بہت دلچسپی تھی۔ دوران گفتگو یکے بعد دیگرے وہ زیدی کے تقریباً سارے مجموعے لے آئیں اور ان کی باتیں بڑے تاثر کے ساتھ بیان کرتی رہیں۔ اپنے ماموں حسن مصطفیٰ صاحب سے مرحوم کو جو لگاؤ تھا اس کا حال سنایا کہ کراچی آنے کے بعد کس طرح ان سے ملنے کے لئے بے چین رہتے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ماموں کو برابر ٹیلی فون کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ظرافت شوخی اور ذہانت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چلتے پھرتے، بچوں سے کھیلتے ہوئے وہ شعر کہہ لیتے تھے۔ ایک دن ان کے بچے کی مرغی پر نظم کہہ کر دے دی۔ جب والدہ کربلائے معلی جا رہی تھیں۔ تو الوداع کہتے وقت سب کو ہنساتے رہے اور یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیا کہ ہم انھیں خدا حافظ کہنے آئے ہیں۔

حسن مصطفیٰ صاحب تہذیب و شائستگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ مصطفیٰ زیدی میں جو حسن اخلاق اور خوش خلقی تھی اس کی ہلکی جھلک حسن مصطفیٰ صاحب میں نظر آتی ہے۔ ان کے رکھ رکھاؤ اور سلجھے ہوئے مزاج میں ایک ایسی نرمی ہے جو کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ حسن صاحب نے زیدی مرحوم کے بارے میں بتایا کہ وہ یہاں کے حالات سے متاثر تھے۔ اور اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ اپنی صلاحیتوں سے یہاں کے معاشرے کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکے تھے۔ ان کا ارادہ اس ملک کو چھوڑ کر کسی مغربی ملک میں بس جانے کا تھا۔ وہ کہتے تھے ماموں میں اپنی ساری کتابیں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں میں اردو تہذیب اور اردو زبان کو بھول جانا چاہتا ہوں ـــــــــ جذباتی بہت تھے اس لئے ان پر ہر بات کا بے حد اثر ہوتا تھا۔ کراچی کے قیام کے دوران میں نے ان سے کہا تھا کہ بھئی تم تو اب چلے جاؤ گے۔ لیکن جانے سے پہلے جوش صاحب کی شاعری کا ایک کلیات تمہاری نگرانی میں شائع ہو جائے تو اچھا ہے۔ اور یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔ کیونکہ تم جوش صاحب کے بہت قریب رہے ہو۔ ان کے کلام کی ایک ایک کیفیت سے واقف ہو۔ چنانچہ جوش کا کلیات مرتب کرنے کا کام انھوں نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ افسوس کہ وہ ادھورا رہ گیا۔

ویرا بھابی مصطفیٰ زیدی کا سامان دیکھ کر دوبارہ آ گئیں وہ غم سے بے حد نڈھال اور افسردہ دکھائی دے رہی تھیں۔ انھوں نے کراچی کے ان اخباروں اور رسالوں کو سراہا جو مصطفیٰ زیدی کی شاعرانہ حیثیت اور ان کی شخصیت کے صحیح خد و خال ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہم فی الحال مصطفیٰ زیدی کا مجموعۂ کوہ ندا خوب صورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بعد میں ان کے خطوط، کربلا اور پرانے مجموعے بھی شائع کریں گے۔ ویرا بھابی نے بتایا کہ مصطفیٰ زیدی کتابوں کی معیاری اور

(بقیہ صفحہ ۱۹۲ پر)

تبصرہ

تبصرہ کیلئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں

صحرا میں اذان شاعر:۔ گوپال متل

قیمت: چھ روپے ضخامت:۔ ۱۱۲ صفحات۔

ناشر:۔ مکتبہ تحریک ۹/ ۲ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی

گوپال متل اردو ادب کے ان چند شاعروں میں ہیں جن کے کلام پر کوئی تنقیدی فارمولا پورا نہیں اُترے گا۔ اگر کوئی بھی نقاد اپنے شعری نظریات کی کسوٹی پر متل کی شاعری کو پرکھنے کی کوشش کرے گا تو ممکن ہے کہ اس نقاد کو خود اپنی کسوٹی کندن جیسی لگے اس کی تنقید میں متل کی شاعری الگ چمک دمک لئے ہوئے نظر آئے گی۔

گوپال متل کو اردو شاعری کے کسی بھی دور یا سکول سے وابستہ کرنے کی کوشش بھی ناکام رہے گی متل کی شاعری اس زمرے میں آتی ہے جسے انگریزی زبان میں Pure poetry کہتے ہیں.

متل نہ صرف یہ کہ صحیح معنوں میں شاعر ہے بلکہ ذہین شاعر ہے اس ذہانت میں جہاں متل کے اپنے مطالعے کا بہت بڑا ہاتھ ہے وہاں ان کی شخصیت میں اس ذہین دور کی بھی پرچھائیاں رچی بسی ہوئی ہیں جس نے اردو ادب کو کئی نمایاں اور منفرد آوازیں عطا کی ہیں۔

"صحرا میں اذان" متل کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ پہلا مجموعہ "رہا" ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ متل دراصل اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس نے راشد، میراجی، عدم، حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر اور فیض احمد فیض جیسے اہم شعرا کو جنم دیا تھا۔ وہ عہد صحیح معنوں میں شعری ریاضت، ذہانت اور ادبی ظرفت کا عہد تھا۔ متل کی شاعری دراصل اُسی ریاض، اُس ذہانت اور اعلیٰ ظرفی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

شاعری میں فکری تنوع ہر عہد میں الگ روش کا حامل ہوتا ہے۔ جس عہد کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں جہاں راشد اور میراجی نے نظم کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا وہاں غزل میں عدم نے اپنا ایک الگ اسلوب قائم کیا، حفیظ نے شاعری کو لطیف نغمگی عطا کی اور فیض و دیگر اہم شعرا نے اپنی شاعری میں رومانیت اور سیاست کا حسین سنگم پیش کیا۔

متل کی شاعری میں سیاست اور رومانیت کا سنگم نہیں ہے بلکہ سیاسی اور سماجی ماحول کا ایک ذاتی مشاہدہ ہے۔ یہیں متل کا لب و لہجہ اپنے ہمعصر شعرا سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک انا پرست شخص کی آواز ہے جس نے مختلف تحریکوں کو اپنی آنکھوں سے جنم لیتے دم توڑتے دیکھا ہے اور ایک بے لاگ لیکن الگ تھلگ مبصر کی طرح اظہار رائے کیا ہے۔

متل نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ جہاں متل شخصی طور پر ایک مخصوص سیاسی نظریے میں یقین رکھتا ہے وہاں اُس نے اپنی نظموں کو اُس سیاسی نظریے کا پراپیگنڈہ پلیٹ فارم نہیں بننے دیا۔ اس سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ متل نے اپنے سیاسی نظریے کے واضح اظہار سے گریز کیا ہے اور یہ بھی وہ اپنے سیاسی نظریے میں محدود ہو کر نہیں رہ گیا۔

شاعری میں ذاتی پسند اور ناپسند کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ قاری نظم یا غزل کو خود اپنے طور پر سمجھنے کا یقین رکھتا ہے لہٰذا میں یہاں اپنی طرف سے متل کی شاعری کے اس خاص پہلو کا کوئی منطقی نتیجہ اس لئے اخذ نہیں کروں گا کہ ناقد کی رائے اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی شاعر کی شاعری اور قاری کی ذہنی توفیق۔ میں یہاں شاعر اور قاری کے درمیان بچولیا نہیں بننا چاہتا۔

اس مجموعے میں بیشتر نظموں کا عنوان نہیں دیا گیا محض نظم لکھ دیا گیا ہے جس سے ان نظموں کا حوالہ دینے میں کافی مشکل پیش آتی ہے۔ تاہم ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ سے متعلق متل کی نظم (صفحہ ۸۰) ہر حیثیت سے پورے اردو ادب میں ایک ایسی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے جو ایک متوازن ذہن کی تخلیق ہے۔ دونوں ملکوں کی جنگ پر اتنی پُر درد، پُر تاثیر اور متوازن نظم شاید ہی لکھی گئی ہو۔ صفحہ ۴۲ اور صفحہ ۶۶ پر درج نظمیں بھی متل کے مخصوص انداز فکر اور عمدہ شاعری کی اچھی مثالیں ہیں۔

غزلوں میں متل جدید فکر اور رچے بسے کلاسکی انداز کا حامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اپنے انجام سے ڈرتا ہوں میں
دل دھڑکتا ہو کہ بیٹھا ہوں میں

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں

سکوں ہے گھر میں مگر اس کی لذتیں مت پوچھ
وہ زندگی جو سرِ رہ گذر گزاری ہے

ہر ایک شخص ترکِ تمنا کا مدعی
ہر ایک شخص تیری تمنا لئے ہوئے

جب سے جدا ہوئے ہیں طبیعت اُداس ہے
اور لطف یہ کہ تجھ سے کوئی مدعا نہ تھا

میں اگر چپ تھا تو بیگانۂ ماحول نہ تھا
جانتا تھا کہ زمانے کی ہوا بدلے گی

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سرعت سے دنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

اس لئے چپ ہوں کہ بات اور نہ بڑھ جائے کہیں
ورنہ سچ یہ ہے کہ کچھ تم سے گلہ ہے تو سہی

اور اب متل کی غزلوں کے کچھ ایسے اشعار ملاحظہ فرمایئے جو ایسا سہل ممتنع
لب و لہجہ لئے ہوئے ہیں کہ عمر بھر آواز کی تپسیا کرنے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

ہوس کو سہل نہ سمجھو، ہوس کے رستے میں
کہیں کہیں تو محبت کا احتمال بھی ہے

ایک بے کیف سا تسلسل ہے
کوئی غم ہے نہ شادمانی ہے

وہ ایک میں کہ سراپا سوال ہوں کب سے
وہ ایک تو کہ تجھے فرصتِ نگاہ نہیں

متل کے کلام کے مطالعے سے اُس کی شخصیت کا ایک نہایت دلچسپ پہلو ہمارے سامنے اُبھرتا ہے۔ کھلنڈرا اور شرارت سے بھرا ہوا متل۔ اردو ادب میں ایسے معیاری اشعار کم ہی ملیں گے جن میں بھرپور چوٹ بھی ہو اور شعر بھی ادب کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو۔ متل کے ہاں ایسے اشعار جا بجا نظر آئیں گے۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

شہر میں تذکرۂ دشت و بیاباں ہو، مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

کیوں نہ اب وضعِ جنوں ترک کریں، لوٹ چلیں
اس سے آگے جو ہے جنگل، وہ گھنیرا ہوگا

آؤ کہ جشنِ شہادت ہی میں شرکت ہو جائے
اپنی کھڑکی ہی سے مقتل کا نظارہ دیکھیں

اور دوسروں پر ہنسنے والا شخص جب خود اپنے آپ پر ایک نظر ڈالتا ہے تو وہ بے ساختہ انداز بھی ملاحظہ ہو ؎

اگر تم ہنس دیئے احوالِ غم پر، کیا تعجب ہے
کہ میں خود بھی بہ مشکل ضبط کرتا ہوں ہنسی اپنی

آج ہمارے ہاں شاعری کو جس طرح الگ الگ خانوں میں بانٹا جا رہا ہے متل کا یہ مجموعۂ کلام ان تمام کوششوں پر ایک متبسم طنز ہے کہ شاعری صرف شاعری ہے۔ صحیح اور سچی شاعری جسے کسی ایک دور یا فیشن یا تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ "صحرا میں اذان" ایک ایسے اوریجنل دماغ کی تخلیق ہے جسے کسی بھی دور میں پڑھ کر لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔
طباعت، کاغذ اور کتابت نہایت عمدہ ہے۔ (موہن چراغی) ■

سلسلہ صفحہ ۹۰

دیدہ زیب طباعت و کتابت کا بہت خیال رکھتے تھے اور ناشر سے اس بات پر جھگڑتے تھے کہ کتاب کی قیمت اصل لاگت سے بھی کم رکھی جائے اور اکثر اپنے پاس سے بھی رقم دے دیا کرتے تھے لہٰذا ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ان کا کلام سلیقے اور اہتمام سے شائع کیا جائے۔
مصطفیٰ زیدی کے بارے میں ہم یہ باتیں اس طرح سن رہے تھے جیسے کوئی داستان ہو۔ ایک جیتا جاگتا انسان اور ایک شعلہ بیان شاعر اب واقعی داستان بن چکا ہے۔
[illegible]

تلخ، تند، شیریں

فانی کا رازدار کون ہے؟ میکش اکبرآبادی

جون کے "کتاب" میں جناب حکیم مختار احمد صاحب بدایونی اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب کے فانی صاحب مرحوم سے متعلق مضامین نظر سے گزرے تو میں سوچنے لگا کہ ان میں فانی کا رازدار کون ہے۔ اگر حکیم صاحب فانی کے رازدار ہیں اور آگرے بھی تشریف لائے ہیں تو ستارہ کا کچھ نہ کچھ حال ان کو ضرور معلوم ہوگا۔ اگر میں فانی صاحب کا رازدار ہوتا تو مجھے بھی نورجہاں کے متعلق کچھ واقفیت ہوتی۔ رہی ڈاکٹر مغنی صاحب کی رازداری تو انھیں فانی صاحب کی رازداری کا دعویٰ نہیں ہے البتہ وہ نورجہاں کے رازدار ضرور ہیں لیکن ان معاملات میں ڈاکٹر صاحب حکیم صاحب سے زیادہ تجربہ کار معلوم نہیں ہوتے۔ حکیم صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ "نورجہاں نے سوچا ہو بڑے شاعر کی سوانح حیات لکھی جا رہی ہے اس سلسلے میں میرا بھی نام آجائے گا..." ان لفظوں میں یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ان میں سے کس کا کسی بڑے آدمی سے [illegible] ہے اس فخر کے لئے وہ غلط بات بھی کہہ دیتی ہیں مگر اس میں اتنی حقیقت تو ضرور ہونی چاہئے کہ کسی نہ کسی عنوان سے ان میں باہم تعارف اور رسم [illegible] ہو۔ اس لئے یہ بات بعید نہیں ہے کہ فانی کسی قدر نورجہاں سے مانوس رہے ہوں لیکن یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ فانی علی الاعلان نورجہاں سے عشق کا کئی بار فرماتے ہوں۔ میں نے اردو ادب میں ستارہ کا جو واقعہ لکھا ہے وہ میرے اس قیاس کا ثبوت ہے۔ اسی وجہ سے میں نے مغنی تبسم صاحب سے درخواست کی تھی کہ یہ واقعہ درج نہ کیا جائے کیونکہ میں نورجہاں کو معتبر راوی نہیں سمجھتا ہوں۔ مغنی تبسم صاحب نے اس موقع پر حدیث کے راویوں کا ذکر بے ضرورت فرمایا۔ یہ نقد رواۃ ہی کا کارنامہ تھا کہ من گھڑت احادیث چھانٹ دی جائیں ورنہ احادیث کا مجموعہ بھی فانی صاحب کی سوانح عمری ہی بن جاتا۔ نورجہاں کی روایت کو مغنی صاحب قرآن مطلق سمجھتے [illegible] کہ اس کی تنقید و تصحیح کا حق ہے۔ اس

ضمن میں ڈاکٹر مغنی صاحب نے میرے جس خواب کا ذکر کیا ہے وہ فی الجملہ صحیح ہے مگر حرف بحرف صحیح نہیں ہے اور روایت میں الفاظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

ستارہ کا واقعہ میں نے اردو ادب میں اور اس سے پہلے شاعر کے فانی نمبر میں لکھا تھا اس موقع پر پوری تفصیل لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے

ستارہ سے اور فانی صاحب سے میرے یہاں تعارف ہوا تھا۔ ایک روز فانی صاحب کی موجودگی میں وہ اتفاقاً آگئی۔ اور فانی صاحب کی ایک مسلسل غزل اس نے ترنم سے پڑھ کر سنائی۔ اس کے انتخاب سے فانی صاحب بہت متاثر ہوئے ستارہ میرے یہاں کے حا[illegible] باشعور میں نہ تھی مگر فانی صاحب کے فرمانے سے میں نے دو تین بار فانی صاحب کی موجودگی میں اسے بلوالیا۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ تین چار ملاقاتیں ستارہ سے فانی صاحب کی ہوئیں پھر ایک روز فانی صاحب [illegible] صاحب کے ساتھ میرے یہاں آئے اور ستارہ کے یہاں چلنے کی فرمائش کی میں نے معذرت کر دی اور اسکے مکان کا پتہ بتلادیا۔ اسکا مکان میرے مکان سے بمشکل پچاس گز ہوگا اور میرے مکان کے برآمدے سے اسکی گلی کا موڑ اچھی طرح نظر آتا تھا۔ یہ دونوں حضرات آدھ گھنٹے کے قریب بازار میں ٹہلتے رہے اور اسکی گلی کے اندر جانے کی ان کی ہمت نہ ہوئی حالانکہ اس گلی میں اور شرفا کے مکان بھی تھے اور عوام فانی صاحب سے واقف بھی نہ تھے۔ اس لئے کم سے کم اس کا یقین نہیں کہ کیسے فانی صاحب نورجہاں والے فانی ہو سکتے تھے۔ ستارہ سے پھر ملاقات نہ ہوئی اور فانی صاحب حیدرآباد چلے گئے۔ اور جب ۱۹۳۰ء میں بچے لیکے مشاعرے میں دو تشریف لائے تو مجھے انھوں نے شعر تو سنایا

گرچہ تھی صبح اگر سب نور — اوج پر تھا مگر ستارۂ شام

لیکن ستارہ کے متعلق کوئی بات نہ پوچھی۔ نہ کبھی ان دنوں کا موضوع سخن دلبا بنا۔ ہے۔ چونکہ [illegible] فانی صاحب کی عمر میں باپ بیٹے کا سا فرق تھا مگر وہ مجھ سے کافی

بے تکلف تھے اور شائستگی کے ساتھ ہر موضوع پر گفتگو کرلیتے تھے نہ میں نے انکو
دوسرے احباب سے اس قسم کی بات یا مزاح کرتے دیکھا لیکن مجھے حکیم صاحب
کے اس نظریہ سے اتفاق نہیں ہے کہ محبت صرف ایک ہی سے ہوسکتا ہے تو نوجوان
مہ نوجوان اور نوجوان کے بعد ستارہ سے نہیں ہوسکتی ہے افلاطونی عشق پرانی داستانوں
میں تو ضرور پایا جاتا ہے مگر ہم جیسے دنیا دار اور مجاز پرست لوگ اسے کچھ
معنی دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ میں ایسی غیر افلاطونی محبت کو عیب بھی نہیں سمجھتا۔
فانی صاحب ایک صحیح ذوق کے صاحب دل انسان تھے وہ اگر نقش جان کے
حسن سے متاثر ہوسکتے تھے تو نوجوان اور ستارہ کے حسن سے کیوں متاثر نہیں
ہوسکتے تھے لیکن وہ یقیناً ایک نہایت شریف اور نیک کردار کے انسان تھے انکے
متعلق یہ کس طرح یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے فسق کا علی رؤس الاشہاد
اعلان کرتے ہوں اس سے زیادہ اگر کچھ ہوگا تو ان کا اور خدا کا معاملہ ہے اس
لئے بہتر یہ ہے کہ ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب مختار احمد انصاری یا مکلش اکبرآبادی
کوئی دخل نہ دیں۔

● روشن خلش

محمد علوی کی تخلیقات حاصل کتاب ہیں۔ جاں نثار اختر کی غزل بھی
خوب ہے۔ "فانی حقیقت کے آئینے میں" (حکیم مختار احمد بدایونی) کا جواب
فانی حقیقت اور آئینہ" (ڈاکٹر مغنی تبسم) کے ذریعہ بڑے شاندار انداز میں
دیا گیا ہے۔ فانی بدایونی کو میں بھی بہت پسند کرتا ہوں لیکن حقائق پھر حقائق
ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا علامہ اقبال، ماوزے تنگ اور ہیمنگ وے نے پانچ
پانچ عورتوں کو زندگی کا شرف بخشا۔ ماؤ کی داشتہ چیانگ چنگ ماؤ کے لئے
دن سانپ نامی کا سبب بنی رہی۔ نطشے آتشک سے پاگل ہوکر مرا۔ دوستوئفسکی
دلال تھا۔ شیلے نے اپنے استاد پر ہاتھ صاف فرمایا۔ طالسٹائی، گوئٹے
مائیکل انجلو، بالزاک، اور بائرن کی نجی زندگیاں بے حد لغو اور افسوسناک
تھیں۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ درست لیکن ان سے ان حضرات کے ادبی
رتبہ پر کہاں حرف آتا ہے۔ اگر ریسرچ میں ان ساری چیزوں سے پردہ اٹھایا
گیا تو اس سے انکو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہو ان حضرات کی تحقیر تو مقصود نہیں ہوتی۔

● ادبی رسائل کا مستقبل

احسان نظمی

آپ کا اداریہ پھر قابل توجہ ہے۔ آج سے چند ماہ قبل بھی آپ نے
ادبی رسائل کے مستقبل امکانات پر اپنی کالموں میں توجہ دلائی تھی اور اسی پر
قارئین کے خیالات بھی آپ نے شایع کئے تھے۔ اسی موضوع پر دوبارہ آپکا
اداریہ اس کی اہمیت کا مزید احساس دلاتا ہے۔ مگر اداریے کہاں تک مفید ہوسکتے
ہیں اس کا فیصلہ کرنا چاہیئے؟ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آپ ادبی رسائل
کے مستقبل پر اہم اور مفید اقدامات کے حق میں ہیں مگر محترم ــــــــ! اردو
رسائل کا مستقبل قارئین کے ہاتھ میں ہے یا مدیران اس کے ذمہ دار ہیں؟
آپ نے مسئلہ کو صحیح روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ اردو
رسائل یکسانیت کا شکار ہیں۔ ایک آدھ درجن نظموں اور غزلوں کے علاوہ
چند کہانیاں اور مضامین ــــــ یہی تو کل کائنات ہیں اردو کے ادبی رسالوں کی
جسے قارئین دلی سے نکلنے والے رسالے میں بھی پاتے ہیں اور لکھنؤ، عظیم آباد،
کلکتہ، دوسرے شہروں سے شایع ہونے والے رسالے میں بھی ـــ سائنس کے
کے موضوع پر سماجیات کے مسئلہ پر، دوسری زبانوں کے ادب سے متعلق
مضامین شایع کرنے کا سلسلہ اگر شروع کیا جائے تو اردو رسالوں کے
لئے بھی اور قارئین کے لئے بھی بہتر ہوگا۔ اس لئے جب تک مدیران رسائل
اس یکسانیت میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے وہ صرف قارئین سے گلہ اور شکوہ نہیں
کرسکتے۔
اگر "کتاب" ہی اس سلسلے میں پہل کرے تو یہ ایک خوش آئند اقدام
ہوگا اور ممکن ہے دوسرے رسالے بھی اسکی پیروی کریں۔

● سروے اور سندری

یوسف جمال

نظموں میں کرامت علی کرامت، مظہر امام اور ظہیر صدیقی اور غزلوں
میں جاں نثار اختر، ناصر غوری، مخمور سعیدی اور بشیر نواز بالخصوص پسند آئے۔
کرشن چندر ... "منزلوں کی بات ہے راستے
میں کیا ہوں) انتہائی دلچسپ ہے اگلی قسط کا شدید انتظار ہے تقریباً
سبھی افسانے اچھے اور پر اثر ہیں، لیکن سروے اور سندری بہت خوب ہے۔
صہبا وحید کے مجموعہ "تمنا کا دوسرا قدم" پر ذکا صدیقی کا تبصرہ
غیر منصفانہ ہے ذکا صدیقی نے شاعر کی خصوصیات سے ہی بحث کی ہے شاعری کی
نیز خامیوں پر غالباً تعلقات نبھانے کی وجہ سے روشنی نہیں ڈالی ہے اس
لئے یہ تبصرہ نہیں بلکہ تعریف محض ٹھہرا۔

● ظفر غوری کے

خوشی بلکہ فخر کی بات ہے کہ "کتاب" کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسمیں فی الحال رسالہ کے مواد سے قطع نظر، پہلا صفحہ ہی نہایت اہم موضوع اور مسئلہ کی جانب توجہ کھینچتا ہے۔ آخر اردو کے ادبی جرائد ان مخدوش حالات میں کس طرح زندہ رہ کر ادب عالیہ کی خدمت کرسکتے ہیں؟ کیا عام قاری کی دلچسپی پیش نظر رکھ کر یا پھر صرف اپنے اہل قلم کے ذوق پر؟ اس سلسلہ میں صورت حال کے زیر عنوان آپ کی تین باتیں اس مسئلہ پر پوری طرح روشنی ڈالتی ہیں۔ ادب اور قاری دونوں کے تفصیلی خیالات کا مطالبہ کرتی ہیں۔ آج کل بہتر سے بہتر رسائل قاری سے دور نہ ہونے کی غرض سے کسی نہ کسی مزنگ "فارمولا" کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسے ایک دو رسالے جنہوں نے ادبی خدمت بھی کی ہے اور عام قاری کے مذاق کو بھی بلند کیا ہے" انھیں پڑھنے والوں بلکہ خریدنے والوں کی کمی کی شکایت ہے۔ اگر فارمولا رسائل ہی چلانا ہیں تو ڈائجسٹ کیا برے ہیں۔ عام و خاص ہر ایک کی تسکین ذوق کا سامان مل سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسمیں بھی نا دلٹ اور ادب لطیف کی ضرورت ہو وہ مرتبین نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ دوست نوازی اور حلقہ پروری کے باعث نہایت کم معیاری چیزیں بھی اسمیں شامل کر لیتے ہیں۔ ورنہ ادبیات سے قطع نظر عام دلچسپی کے مد نظر "شبستان" اور "ہما" ڈائجسٹ بازار میں کسی سے کمتر نہیں ہیں ادبی ڈائجسٹ والوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

خالص ادبی معیار پر تو رسالہ مخصوص حلقہ کے لئے ہی نکل سکتا ہے اسمیں نقصان اور زبوں حالی کی شکایت ہی بے جا ہے۔ اور ان میں بھی زیادہ تر دوست نوازی کا جذبہ کارفرما ہے۔ گستاخی معاف ان رسائل میں ہر ماہ دو چار ناموں کے لئے بالخصوص اور بقیہ لوگوں کے لئے بالعموم رعایت۔ ملتی آتی ہے۔ آخر کیا ضرورت ہے جبکہ ایک صاحب کی ہر ایک چیز رسالے کے کئی صفحات غیر ضروری طور سے گھیرلے؟ صرف نام کی بدولت رسائل زیادہ عرصہ نہیں چل سکتے۔۔۔۔ آپ عام قاری کے مذاق کو بلند کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں تو اس کے لئے بہتر مواد بھی ہر ماہ فراہم کرنا ضروری ہے۔

خطوط میں ایم۔ اے نصر اور فیروز کے خطوط بھرپور توجہ چاہتے ہیں اور اشتراک عمل بھی۔

اگلے شمارہ میں

مضامین

تاریخ، تہذیب اور ادب — سیّد احتشام حسین
یگانہ کی غزل — سلیمان اطہر جاوید
امراؤ جان ادا۔ ایک مطالعہ — قاضی عبدالرحمان ہاشمی

ناول، افسانے، ڈرامہ، طنز و مزاح

کرشن چندر
اقبال مجید
اظہر افسر
نور شاہ
ابراہیم شفیق
رضوان احمد
سلمیٰ شاکر
محسن علی

نظمیں غزلیں

میکش اکبرآبادی، بلراج کومل،
ساجدہ زیدی، منصور سبزواری،
غلام مرتضیٰ راہی، پرکاش فکری،
ظہیر غازی پوری، صلاح الدین پرویز،
برنام نظر، رسول احمد،
ظفر غوری، حنیف کیفی،
ساجد اقبال، فیروز، فاضل انصاری۔

تبصرے خطوط

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

شمارہ ۹۵
اگست ۱۹۷۱ء

تزئینِ سرورق ٭ قیصر سرمست

مضامین

منظومات

ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح

تبصرہ

تلخ، تُند، شیریں

ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر ٭ کتابت ٭ طباعت ٭ قیمت موجودہ شمارہ ٭ زر سالانہ ٭ حیاتی خریداری ٭ دفتر ماہنامہ کتاب
شمیم احمد ٭ قادر قریشی ٭ نامی پریس ٭ ایک روپیہ ٭ دس روپے ٭ ۱۰۱ روپے ٭ کپور مارکیٹ لکھنؤ

پہلا صفحہ

وزیر اعظم کے اس اعلان کے بعد کہ جلد ہی اتر پردیش میں اُردو کی ترقی کے لئے اقدامات کئے جائیں گے اور اگر کسی اسکول یا کالج میں ایک طالب علم بھی اُردو کی تعلیم حاصل کرنا چاہے گا تو اس کا انتظام کیا جائے گا' ریاستی حکومت نے اپنے سالانہ بجٹ میں اُردو کے لئے چند مراعات کا اعلان کیا ہے۔ یہ مراعات ان اُمیدوں کو پورا تو نہیں کرتیں جو وزیر اعظم کی تقریر سے پیدا ہوئی تھیں لیکن بہر حال انھیں اردو کی ترقی کی راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی جانب ایک قدم ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

ریاست میں اُردو اکادمی کے قیام اور محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی ڈائرکٹر (اُردو) کی تقرری سے اردو رسائل و کتب کی اشاعت اور ابتدائی درجوں سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک اردو تعلیم کی سہولتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے اُردو دوستوں کو بھی عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ حکومت یہ یقین دہانی تو کر سکتی ہے کہ اگر کسی کلاس میں دس یا اسکول میں چالیس طلبا ہوں تو ان کے لئے اردو کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا یا انھیں کسی ایسے قریبی اسکول میں منتقل کر دیا جائے گا' جہاں یہ سہولتیں موجود ہوں لیکن وہ اُردو تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلبا تو پیدا نہیں کر سکتی اور نہ یہ اس کی ذمہ داری ہے ——— اگر ہم ان مراعات سے فائدہ اُٹھا نہ سکے تو اس کی ذمہ داری خود ہماری ہی ہو گی۔ ریاست کے ۷۰ ہزار پرائمری اسکول میں سے اگر ہم دس ہزار اسکولوں میں بھی اُردو کی تعلیم کا انتظام کرا سکے تو یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہو گی۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے انجمن ترقی اردو کو مقامی سطح پر تمام علمی اور ادبی انجمنوں کا تعاون حاصل کر کے فوراً سرگرم عمل ہو جانا چاہیئے تاکہ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اردو اسکولوں اور کالجوں کے قیام کے مسئلہ پر اب سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ ایسے تعلیمی اداروں کو فوری سرکاری امداد کی پیش کش ہے اگر ہم نے کام نہ لیا تو یہ ایک بڑی بدقسمتی ہو گی۔

ریاست میں سرکاری لائبریریوں نے اُردو کتابوں اور رسائل کی خریداری ایک عرصہ سے بند کر رکھی تھی۔ دوسری ریاستوں کے لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اس ریاست سے شائع ہونے والے جرائد کی ایک کاپی بھی کسی ریاستی لائبریری میں نہیں خریدی جاتی تھی۔ اس صورت حال میں اب بہتری کے امکان پیدا ہوئے ہیں لیکن اگر حسب سابق ان مراعات کا دائرہ صرف حکام رس لوگوں تک ہی محدود رہ گیا تو اس کے لئے اکادمی کے ممبروں اور اردو کی ترقی میں سرگرم دلچسپی لینے والوں کے علاوہ اور کسے ذمہ دار قرار دیا جا سکے گا؟ حکومت کو بہر حال ہرگز نہیں۔

تاریخ میں بین اقوامی شہرت کے مالک اور علی گڑھ میں شعبہ تاریخ و سیاسیات کے سابق چیرمین پروفیسر محمد حبیب کا ۷۷ برس کی عمر میں ۲۲ جون کو انتقال ہو گیا۔ پروفیسر حبیب اپنی ذات میں انجمن تھے اور انہوں نے اپنی شخصیت اور علم کی بصیرت سے جو چراغ جلائے تھے وہ ملک کے متعدد تعلیمی اداروں میں علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ حبیب صاحب علی گڑھ میں رہ کر بھی گروہی سیاست سے دور رہے اور انھوں نے ہمیشہ درس و تدریس کو ہی اپنی منزل جانا۔ ان کے انتقال سے تاریخ کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہ ہو سکے گا۔ ادارہ پروفیسر عرفان حبیب' مرحوم کے دوسرے اعزا اور ان کے مداحوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

میکش اکبر آبادی

غزل

یہ رنگ و نور بھلا کب کسی کے ہاتھ آئے
کدھر چلے ہیں اندھیرے یہ ہاتھ پھیلائے

خدا کرے کوئی شمعیں لئے چلا آئے
دھڑک رہے ہیں مرے دل میں شام کے سائے

بجھا نہ صبح کو بھی وہ چراغ لالہ رخاں
جو شام حسن میں نظروں سے ہم جلا آئے

کہاں وہ اور کہاں میری پُر خطر راہیں
مگر وہ پھر بھی میرے ساتھ دور تک آئے

میں اپنے عہد میں شمعِ مزار ہو کے رہا
کبھی نہ دیکھ سکے مجھکو میرے ہم سائے

چلے چلو کہ بتا دے گی راہ خود رستے
کہاں ہے وقت کہ کوئی کسی کو سمجھائے

حرم کی آبرو ہم نے بہت رکھی پھر بھی
کئی چراغ صنم خانے میں جلا آئے

میں اپنے دل کو تو تسکین دے بھی لوں میکش
وہ مضطرب ہے بہت کون اس کو سمجھائے

—

سیّد احتشام حسین

تاریخ، تہذیب، ادب

ادبی تخلیق اور ادبی مطالعہ دونوں کا انحصار فرد اور سماج کی ظاہری اور باطنی کشمکش کے وجدانی اور ذہنی ادراک پر ہے۔ اس لئے کسی سنجیدہ سائنسی مطالعہ اور اعلیٰ تخلیق میں اسی فکری پہلو کو اوّلیت حاصل ہے۔

عام طور پر انسان کی زندگی میں کشمکش اور تناؤ کے تین رقبے یا دائرے ہوتے ہیں جو ابتدائے شعور ہی سے مختلف قسم کے خارجی اور داخلی تصادمات سے پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں۔ اور جب شخصیت منضبط اور پختہ ہونے کی منزلوں میں پہونچتی ہے اس وقت وہ ایک چوتھے دائرے میں داخل ہوجاتی ہے جہاں پہلے تین دائروں کی خصوصیات مخصوص تناسب سے یکجا ہوجاتی ہیں۔ اس اجمال کی مختصر تفصیل یوں ہوسکتی ہے:

پہلا محدود انفرادی دائرہ جس میں انسان خود اپنی ذات اور کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، دوسرا وہ جس میں اسے اپنے ابنائے جنس سے متعلق ہونے کا احساس ہوتا ہے اور اسکی شعوری سماجی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ تیسرا وہ جس میں انسان عناصرِ فطرت پر قابو حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا اور کائنات سے اپنے رشتہ پر غور کرتا ہے۔ انھیں مختلف دائروں کی کشمکش سیکڑوں شکلیں اختیار کرتی ہے اور زندگی میں انفرادی یا سماجی پیچیدگیاں پیدا کرکے انھیں حل کرنے پر اکساتی ہے۔ اس سے وہ علوم جنم لیتے ہیں جنھیں نفسیات، تاریخ، معاشیات، فلسفہ، اور عمرانیات کے علاوہ سائنس کے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان علوم سے کام لیکر انسان اپنی ذات کا شعور حاصل کرتا ہے اور وہ رشتے استوار کرتا ہے جو فرد، سماج اور فطرت کو ایک کڑی میں منسلک کر دیتے ہیں اور شخصیت ایک ایسا لباس پہن لیتی ہے جن میں تینوں منازل کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی انفرادی کوششیں اور اظہار کی خواہشیں شعر، ادب اور فن بنتی ہیں اور اجتماعی عمل سے تاریخ اور تہذیب کا دامن بھرتا ہے۔

بادی النظر میں یہ رشتے سیدھے سادے ہیں لیکن نفسیات، سماجیات اور سائنس کے مطالعہ کے بعد ہر فرد ایک محشرِ خیال معلوم ہونے لگتا ہے اور ہر سماجی گروہ متصادم انفرادی اور جماعتی عزائم کا مجموعہ دکھائی دیتا ہے۔ فرد اپنی جگہ پر ایک وحدت ہے اور کئی دوسری مفروضہ وحدتوں کے مجموعے کا ایک ننھا سا جزو بھی۔ جماعت کبھی مذہب اور عقیدہ کی بنیاد پر مستحکم ہوتی ہے کبھی لسانی اشتراک کی وجہ سے، کبھی قومی وحدت کے مفروضات کی بنیاد پر کبھی تہذیب کی۔ اسی طرح کبھی فطرت کے متعلق انسان کا ردِ عمل مادّی اور عقلی ہوتا ہے کبھی مابعد الطبیعاتی اور متصوفانہ، اسلئے انسان کو فرد کی حیثیت سے یا سماج کے رشتے میں سمجھنا اور فطرت کے کائناتی نظام میں اس کا مقام متعین کرنا بہت دشوار ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں خود فرد کے اندر جنسی میلان اور اخلاقی احتساب، احساسِ کمتری و برتری، ارتفاع اور ذہنی الجھنوں کی کشمکش کی وجہ سے شخصیت کے خط و خال پہچاننے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ علم و حکمت کی روز افزوں ترقی کے باوجود ابھی تک نہ تو فرد کی اندرونی دنیا کے حدود یقینی طور پر ناپے جا سکے ہیں اور نہ سماج کی مختلف شکلوں کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہوسکا ہے۔

پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف سماجی اور سائنسی علوم انسان
کی راہ میں چراغ جلاتے جارہے ہیں۔ نفسیات، فلسفہ اور سائنس
نے بہت سی گتھیاں سلجھائیں اور بہت سے عقدے وا کئے ہیں اور
ادب و فنونِ لطیفہ نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی روح تک پہنچنے
میں مدد دی ہے۔ دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب علم ناقص ہوتا
ہے یا کسی محدود نقطۂ نظر یا خیالی مفروضے کی روشنی میں حقائق کو
سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نتائج گمراہ کن،
ادھورے اور غلط ہو جاتے ہیں اور وہ چاہے تاریخ ہو یا فلسفہ،
شاعری ہو یا ادب، کسی کا مطالعہ تشفی بخش نہیں ہو سکتا۔

تہذیبِ انسانی کے عروج و زوال کی تاریخ ممکن ہے
عمومی طور سے بعض منازل ارتقا یا بنیادی ادوار کے سانچے
میں ڈھالی جاسکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی طرح
کی قطعیت پر زور دیکر تہذیبی ارتقا کے میکانکی اصول بنا لینا
نہ صرف غلط ہوگا بلکہ تاریخ کی گتھیوں کو سلجھانے میں بھی مدد نہ
دے سکے گا۔ فلسفۂ تاریخ کے بعض علماء اور صاحبِ بصیرت
مفکرین نے بھی اپنے نقطۂ نظر سے قومی افتخار کے احساس
اور بعد کے معلوم نتائج سے مرتب کئے ہوئے اسباب کی روشنی
میں تاریخی واقعات کو اسی طرح ترتیب دے لیا ہے اور ان کی
توجیہہ اس طرح کی ہے کہ ان کا اندازِ نظر حالات کے بہاؤ پر حاوی
ہو جاتا ہے اور ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ گویا واقعات ایک بنے
بنائے نظریہ کے مطابق وقوع پذیر ہوئے حالانکہ کبھی کبھی بعض
بڑے واقعات بھی اس مخصوص مذہبی، نفسیاتی یا عمرانی توجیہہ
کی تاب نہیں لاسکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسباب و علل، اثرات
اور نتائج کے رشتوں سے انکار کیا جائے یا ارتقائے تہذیب میں
کچھ اساسی اصولوں کی تلاش کو بالکل عبث قرار دیا جائے یا اعداد
و شمار اور تاریخی حقائق کی بنیاد پر نکالے ہوئے نتائج کی نفی کی جائے
بلکہ کہنا یہ ہے کہ ایسے مطالعہ میں ہر ملک اور ہر علاقہ، ہر قوم اور ہر اہم
طبقہ کے ظاہری اور باطنی رشتوں کی پیچیدگیوں کو نگاہ میں رکھا جائے تاکہ
تغیر اور ارتقا پر اثر انداز ہونے والا کوئی عنصر نظر انداز نہ ہونے پائے۔

اس کی کوشش اکثر علم تاریخ کے فلسفیوں نے کی ہے لیکن واقعات
اور ان کے روابط کی تعبیر میں ابنِ خلدون، واٹی کو، ہیگل، مارکس
ریناں، کروچے، اور ٹوائن بی سب اپنے اپنے نظریات کے اتنے
پابند ہو جاتے ہیں کہ بعض ایک دوسرے کی ضد نظر آنے لگتے ہیں
اس کے باوجود یہ بھی درست ہے کہ تاریخ ہی ہمارے شعور کی تربیت
کرتی ہے اور قوموں کے کردار اور عمل کی امتیازی خصوصیات کا علم
دے کر ہمیں اپنی راہ معیّن کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس سے منہ
موڑ کر کسی ملک کے قومی مزاج اور اس کے بین الاقوامی رشتوں
کو سمجھنا آسان نہیں رہے گا۔ اس لئے نہ صرف قومی تہذیب کے
پیچ و خم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بلکہ مستقبل میں ایک
متوازن تہذیبی نقطۂ نظر اختیار کرنے کے لئے کسی نہ کسی شکل
میں تاریخ کی تعلیم کو لازمی اور ضروری قرار دینا چاہیئے بشرطیکہ
تاریخ دیانتداری سے لکھی گئی ہو اور ارتقائے انسانی کے اکثر پہلوؤں
اور ان کے باہمی رابطوں کی سائنسی توجیہہ کرتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ نفسیات کے بعض علما تاریخ کی اہمیت
کو تسلیم نہیں کرتے شاید اس کا سبب یہ ہو کہ عام نفسیات فرد
کو اپنا مرکزِ توجہ قرار دیتی ہے اور تاریخ جماعت یا قوم یا مختلف
انسانی گروہوں کو سامنے رکھتی ہے لیکن سماجی نفسیات نے
تاریخ اور تہذیب کی اندرونی رفتار سے بحث کرکے یہ واضح
کر دیا ہے کہ نہ صرف جماعتی بلکہ انفرادی نفسیات پر بھی تاریخ
کے خارجی محرکات غیر معمولی اثر ڈالتے اور انھیں نئے سانچے
میں ڈھالتے ہیں۔ فلسفانہ قطعیت اور صوفیانہ دروں بینی کے
شیدائی تاریخی ارتقائے نفس کو نظر انداز کرتے ہیں لیکن وہ بھی
اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ علم جذبات پر اثر ڈالتا
اور محرکات کی شدّت اور ہلکے پن کی راہیں کھولتا ہے۔ اسکا
ہمیں علوم و فنون کی تاریخ کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

تاریخ کا مطالعہ اپنے وسیع ترین مفہوم میں تہذیب، علوم،
فنونِ لطیفہ اور فلسفیانہ افکار کا مطالعہ بھی بنجاتا ہے۔ کبھی
ایسا ہوا ہے کہ مورخین نے انسان کے باطنی یا روحانی ارتقا

سمجھنے کے لئے فنونِ لطیفہ ہی سے مدد لی ہے کیونکہ وہاں انسان کی تخلیقی قوت خارجی اور داخلی حدود کو توڑ کر ان کیفیات کی تصویر بناتی ہے جنمیں بیک وقت عصری اور ابدی زندگی جھلکنے لگتی ہے۔ جہاں تک تخلیقی ادب کا تعلق ہے وہ بیشتر فن کی پابندیوں کے ساتھ ادیب کے انفرادی جذبات اور تصورات کو پیش کرتا ہے اور بظاہر ہر فرد کی داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اسے زمان و مکان سے ماورا نہیں قرار دیا جاسکتا، دوسرے لفظوں میں ادب ایک دوسری سطح پر ان تاریخی حقائق کو پیش کرتا ہے جو واقعات کے ظاہری اظہار میں نہیں سموئے جاسکتے بلکہ تہذیب کی قدریں بن کر تخیلی کرداروں اور فرضی داستانوں، تشبیہوں اور استعاروں، تمثیلوں اور علامتوں میں قید ہوگئے۔ اگر اعلیٰ ادب کے اندر سے انسانیت کی روح جھانکتی ہوئی دکھائی نہ دے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ادیب نے زندگی کا مطالعہ سطحی طور پر کیا تھا یا زندگی کو ایک ایسے آئینہ میں دیکھنا چاہا ہے جو صحیح تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ادب زندگی کا عکس ہے یا اس کی ایک نئی تخلیق، تو کچھ لوگ افلاطون اور ارسطو کے "نظریۂ نقل" کے سطحی مفہوم کو سامنے رکھ کر یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ محض نقالی کسی طرح اعلیٰ ادبی تخلیق نہیں بن سکتی۔ ایسے لوگ سرے سے تخلیقی ادب کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتے کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادیب کا شعور حقائق کو اپنی گرفت میں لاتے اور اپنی تخلیقی قوت سے انھیں مرتب اور منظم شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ادب کا یہ تصور نہ تو فرد کی انفرادیت کو نظرانداز کرتا ہے اور نہ تاریخی شعور کو، یہی نہیں بلکہ اس سے کسی ایسی انسانی قدر کی نفی بھی نہیں ہوتی جو علم و حکمت کے مختلف ذرائع سے وجود میں آچکی ہے اور انسان اسے ایک تہذیبی قدر سمجھ کر عزیز رکھتا ہے۔

آج ادیبوں کا ایک طبقہ سائنس اور ٹکنالوجی سے مرعوب اور متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ انسانی مفاد اور ارتقا صرف سائنس سے وابستہ ہے۔ جو تہذیب ان کے سایہ میں پروان چڑھے گی اسے نہ تو شعر و ادب کی ضرورت ہوگی اور نہ شعر و ادب اسکی معنویت اور افادیت میں اضافہ کر سکیں گے۔ یہ طبقہ تہذیبی ارتقا کا ایک محدود

نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ دوسرے سرے پر ایک ایسا گروہ بھی ہے جو ادب کو شخصیت کے غیر معتدل اور غیر معمولی پہلوؤں اور حیرت میں ڈال دینے والے انوکھے جذبات اور محسوسات کے اظہار تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور اس طرح وہ ادب کی سماجی اور تاریخی اہمیت کا منکر ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے نقطۂ نظر سے ادب، تہذیب، سماجی تفکر اور اجتماعی علم کا اظہار نہیں کرتا محض ایک غیر معمولی فرد کی غیر معمولی قوتِ تخلیق کا اضطراری نتیجہ قرار پاتا ہے، یہ صرف اتفاق ہے کہ کچھ لوگ اس میں سماجی اور تہذیبی حقائق کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے بھی ادب تاریخی تصویرِ تہذیب کا جز نہیں بن سکتا۔ ایک انتہا پسند گروہ وہ بھی ہے جو شعر و ادب کو صرف لاشعور کی جنبشِ زیرِ نقاب سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں ادب بے ربط محسوسات اور نامعلوم اندھے محرکات کا نتیجہ ہے اور ادیب غیر شعوری قوتوں کے اظہار کا آلۂ کار۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کے لوگ بھی ادب کے تاریخی کردار کو پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ تو کیا تسلیم کر لیا جائے کہ ادب کی کوئی تہذیبی اور علمی اہمیت نہیں ہے۔ اس کا محض اظہار ہوتا کافی ہے؟

جیسا کہ کہا گیا اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ ادب کا بڑا حصہ اعلیٰ انفرادی ذہن کی تخلیق ہوتا ہے لیکن اگر یہ انفرادی قوتِ تخلیق اجتماعی شعور کا جز نہ بنے تو ادب اپنے اصل مقصد یعنی ابلاغ سے محروم رہے گا۔ کوئی ادبی کارنامہ ادنیٰ ہے یا اعلیٰ، سطحی ہے یا گہرا، اسکا اندازہ اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ادیب اور قاری کے درمیان جذباتی یا ذہنی ردعمل کا کوئی رشتہ قائم نہ ہو۔ جنھوں نے اعلیٰ ادب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ادیب کی انفرادیت کو مجروح کئے بغیر یہ رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور اسی کو ادب کے سماجی اظہار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس وقت تک تو ادب کا مطالعہ یہی بتاتا ہے کہ جتنا اعلیٰ ادب ہوتا ہے اتنی ہی اس کی سماجی، تہذیبی اور آفاقی اہمیت ہوتی ہے۔ (اور یہ باتیں اس کے جمالیاتی اور فنی اکتساب کے منافی نہیں ہوتیں) اور اس پر ادیب کی انفرادیت کا نقش بھی اتنا ہی گہرا ہوتا ہے۔ تنقیدی مطالعہ کے لئے اس کی مختلف حیثیتوں پر الگ الگ بحث

جاسکتی ہے لیکن اس کی عظمت ان سب کی مجموعی وحدت میں پوشیدہ
ہے۔ عالمی ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہو جس کی عظمت
راز اس کے کارناموں کی تہذیبی اور آفاقی معنویت میں پوشیدہ نہ
۔ یہ معنویت انفرادی اظہار ہونے کے باوجود اجتماعی ہوتی ہے یہ
قیقت اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم ترین اعلیٰ
دب، ادب ہی نہیں تاریخ بھی ہوتا ہے، فلسفہ اور سیاست بھی،
غرافیائی اور اقتصادی معلومات کا ذخیرہ بھی ہوتا ہے اور مذہب
عقائد کا ترجمان بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وید، مہابھارت، توریت، ایلیڈ
شاہنامۂ جدید، یونانی ڈرامے، کالی داس کے ناٹک اور اس طرح
بہت سی تخلیقات عالم انسانی کا ادبی سرمایہ بھی ہیں، تہذیبی اور
ی دستاویز بھی۔ تاریخ قدیم کے مورخوں نے ان سے اس لئے کام
یا ہے کہ اپنی ابدیت کے باوجود وہ تاریخی حقائق کا سرچشمہ بھی ہیں
ن کا مطالعہ مخصوص قوموں اور زمانوں میں انسانی رشتوں، خیالوں
رخوابوں کی مستند تصویر بھی پیش کرتا ہے۔

اس حقیقت کو ایک اور طرح ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔
قبل تاریخ عہد سے اس وقت تک ہر سماج میں فنون لطیفہ اور خاص کر
دب کی بقا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر دور میں اظہار حقائق کا ایک
قینی ذریعہ بنے رہے ہیں۔ ان میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، اظہار کے
سلوب بدلتے رہے ہیں، معنوی پیکر نئے سانچوں میں ڈھلتے رہے
یں، زندگی کی ہما ہمی میں ان کی اہمیت کے مدارج تبدیل ہوتے رہے
یں، ان کی تفریحی اور تعلیمی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہی ہے لیکن تسلسل کسی
کسی شکل میں برقرار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب انسانی کے
بعض پہلو فنون لطیفہ یا ادب ہی کے پیمانے سے ناپے جاتے رہے
یں کیونکہ شعر و ادب ہی کے ذریعہ سے سماجی عمل کا ایک حصہ قدروں
یں تبدیل ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ بعض حالات میں ادب انسانی
رتقا کا اندازہ لگانے کے لئے تاریخ، عمرانیات اور فلسفہ سے زیادہ
ارآمد اور موثر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ انفرادی طور سے ادب خود اپنے
ظام جذبات کے سمجھنے اور انھیں منظم کرنے میں مدد دیتا ہے اور ادیب
کی شخصیت کو وسیع کر کے انسانی اور آفاقی شخصیت میں تبدیل کرتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مغل سلطنت کا زوال، انگریزی حکومت کا
استحکام، ۱۸۵۷ء کی بغاوت، قومی شعور کی نشوونما بظاہر غیر ادبی
سماجی محرکات ہیں لیکن ان کو پیش نظر رکھے بغیر سرسید، حالی، آزاد،
نذیر احمد، شبلی اور اقبال وغیرہ کے ادبی کارناموں کی پرکھ ناممکن
ہوگی۔

یہ چند ایسے حقائق کی جانب اشارے ہیں جنھیں محض یہ کہہ کر
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ ادیب سیاست، سماجی مسائل اور
افکار کا تذکرہ کر کے ادیب سے اس کی انفرادیت اور ادب سے
اس کی آفاقیت چھین لینا چاہتے ہیں یا زندگی اور ادب کے تعلق
کا ذکر کر کے ادیب کی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار پر پہرے بٹھانے
اور شعر و ادب کے قدموں میں زنجیریں ڈالنے کے لئے کوشاں ہیں کیونکہ
عہد قدیم کے اعلیٰ ادب میں کوئی افادی یا سیاسی تحریک شعوری طور پر
کام نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت بھی ادب زندگی کے مجموعی شعور کا
نتیجہ تھا اور زندگی کے اکثر پہلوؤں کا احاطہ کر لیتا تھا۔ یہی ادب کی
عظمت اور گیرائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ادب کا مطالعہ کسی حیثیت سے کیا جائے اس کی کامیابی کی
پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ فن کے جمالیاتی لوازم کے ساتھ ساتھ
اس میں گہرا، دیرپا، اثر انگیز فکری یا جذباتی مواد پایا جاتا ہو۔ جہاں
فن اور موضوع ادیب کی گرفت میں ہوتے ہیں، جہاں ادبی اور فکری
قدریں ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہیں وہاں ادب ارتقائے
فکر کی تاریخ میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے۔ صدیوں سے ادب
اسی طرح مسرت جوئی اور تخلیقِ اقدار کا جز بنتا رہا ہے اور صدیوں
سے ادیب اپنی اس قوت سے انسانی مسرت اور علم میں اضافہ کر رہے
ہیں۔ آج اس سائنس کی روز افزوں ترقی کے دور میں بھی ان کے سامنے
یہی نصب العین ہے حالانکہ علوم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ جذباتی
عمل اور ردِ عمل کی دنیا بھی بہت بدل گئی ہے۔ جب ہم سائنس کی مہلک
خوفناک، انسان دشمن قوتوں کا تصور کرتے ہیں تو ہمیں اپنی ذات
نہایت حقیر، کمزور اور مجبور نظر آتی ہے اور جب ہم اس کے تعمیری
افادی اور ارتقائی پہلوؤں پر نظر کرتے ہیں تو وہ ہماری دوست

مددگار اور شریک کار معلوم ہوتی ہے۔ ایک ہی چیز کے متعلق ہمارے یہ دوہرے ردِعمل، سماجی فکر کے مختلف طریقوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم اسے نہ سمجھیں تو اپنی جذباتی زندگی کے متعلق بھی ہمارا رویہ متعین نہیں ہو سکے گا۔ اور یہی محسوس ہوگا کہ ہماری جذباتی زندگی ہیچ اور ہمارا وجود بے حقیقت ہے۔ اس خیال نے کچھ لوگوں کو اس منزل پر پہونچا دیا ہے کہ انھیں ادب کبھی بیکاری کا مشغلہ نظر آتا ہے، کبھی محض اپنے ڈھکے چھپے اعصابی ردِعمل کا بے سمت اور بے سوچا سمجھا اظہار — دونوں حالتوں میں ایسے دانشور یہ بھول جاتے ہیں ادب نے انسانی ذہن کی تعمیر میں کتنا حصہ لیا ہے۔ اگر یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے تو پھر یہ سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ آج بھی ہماری انفرادی اور سماجی یا جذباتی اور ذہنی تعمیر میں ادب کی تعلیم اور ادب کا مطالعہ کس طرح مفید ہو سکتا ہے۔

تاریخ، ادب اور تہذیب کے متعلق ان چند خیالات کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب کی تاریخی اور سماجی اہمیت کے خلاف جو خالص جمالیاتی یا سائنسی مفہوم میں افادی ردِعمل ہے اس سے وابستہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ ادب کی تہذیبی اہمیت نہ تو اس کے فنی اقدار کے خلاف ہوتی ہے اور نہ سائنسی حقائق کے، لیکن ان خیالات کی باقاعدہ تشکیل اور اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ جدید ہندوستان کے تعلیمی نظام میں ادب کے مطالعہ کو اس کا مناسب مقام نہیں دیا جاتا۔ ادب کی تعلیم اس وقت اس کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر سے الگ کر کے دی جا رہی ہے، ادبی تاریخیں تذکرے ہیں جن میں تاریخ کا شعور کارفرما نہیں ہوتا۔ ادبی تنقید اشعار کے مطالب اور شعرا کے متعلق معمولی واقفیت تک محدود ہے۔ جب تک ادب کی تعلیم قومی اور انسانی اقدار کی روشنی میں نہیں دی جائے گی، جب تک اس کی مدد سے ہر دور میں انسان کے بدلتے ہوئے کردار کو سمجھنے کی کوشش نہیں ہوگی اور جب تک ادب کا مطالعہ دوسرے امدادی علوم کے ساتھ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس کی صحیح اہمیت کا احساس نہیں ہو سکے گا۔ ادبی مطالعہ کا گہرا تعلق جذباتی ہم آہنگی، تاریخی شعور، ذوقِ جمال کی تربیت اور فطرتِ انسانی کے اندر کی انفرادی، سماجی اور حیاتیاتی کشمکش سے ہے۔ ان مسائل کا ایک رخ تہذیبی اور تاریخی ہے ایک جمالیاتی۔ ان سب کو پیشِ نظر رکھے بغیر ادبی تنقید کا کوئی سائنٹفک نظریہ وجود میں نہیں آ سکتا۔

ادبی تخلیق (مقصد اور افادیت کی بحث سے بالکل الگ) ایک عمل ہے اور ہر عمل ظاہری یا باطنی تغیر لاتا ہے۔ عمل کا مقصد ہی ایک حالت سے دوسری حالت میں داخل ہونا ہے، اسی وجہ سے ادبی تخلیق کے دوران ایک ادیب تغیر کی کربناک اذیت سے گزرتا ہے اور نتیجۂ تخلیق ایک تسلی بخش صورتِ حال تک لے جاتا ہے اور اس ذہنی یا جذباتی تناؤ کو سکون بخشتا ہے جو خواہشِ اظہار سے وجود میں آیا تھا۔ جب ادیب کا یہ عمل خود ادیب کے اندر ایک نفسیاتی تغیر کا سبب بنتا ہے تو اس کا اظہار دوسروں کے اندر بھی تغیر لا سکتا ہے اور یہی اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ ادب تہذیبی اور تاریخی حرکات سے اس طرح وابستہ ہے کہ زندگی کے عام دھارے میں انھیں ایک ساتھ رکھنا ہی اطمینان بخش ہو سکتا ہے۔ تاریخ اور تہذیب کے ارتقا کا انکار کرنے والوں کو ہمیشہ یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ سماج پر سائنس اور مختلف علوم، ٹکنالوجی اور عام علمی ترقی کے اثرات کا انکار تو کر نہیں سکتے، صرف یہ کہہ کر حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کے باطن کی دنیا ایک رازِ سربستہ ہے جہاں تاریخ اور سائنس کی رسائی نہیں اس لئے انسان ترقی نہیں کرتا بلکہ بنیادی طور پر ایک ہی رہتا ہے اور ادب اسی انسان کا ترجمان ہے۔ ادبی تنقید کے لئے یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ وہ ظاہر و باطن، فرد اور سماج، داخلی اور خارجی محرکات کے باہمی تعلق کی کھوج کرے کیونکہ اسی سے اس تخلیق کی گتھی کھل سکے گی جو عظیم ہے اور جو فرد کا اظہار ہوتے ہوئے بھی سماج کے مسائل کا اظہار معلوم ہوتی ہے۔

منظر

بلراج کومل

سہانی صبح کے ساحل پہ رک جانے کو ہیں
خوابوں کی رنگیں کشتیاں
جب آنکھ کھلتی ہے
دریچے میں کرن کی گنگناہٹ!
گھنٹیاں بجتی ہیں، آوازوں کی دوری
کس قدر مانوس لگتی ہے
ابھی اڑتے ہوئے آئیں گے پنچھی
سبز پیڑوں، وادیوں، ننھے گھروندوں، دور دیسوں سے
مجھے محسوس ہوگا
یہ کوئی پیغام لائے ہیں
مرا وہ کون ہے جو صبح دم دل میں اترتا ہے
یہاں سے دور اک چھوٹا سا جوہڑ ہے
برس گذرے جو چہرہ میں نے دیکھا تھا
وہ اسکے بے زباں پانی میں روشن ہے کنول کے روپ میں شاید
کسانوں کو صدا آواز دیتا ہے
میں سرگوشی کی پرچھائیں گذرتے دیکھتا ہوں
جاگ اٹھتا ہوں

مرا کھویا ہوا سورج
مجھے واپس بلاتا ہے
وہ موجِ گرم کی مانند میرے جسم سے پیہم گذرتا ہے
گلی سونی لگی تو میں نے سوچا
ا باہر رہوں
مجھ کو منظر سے بھلا کیا واسطہ ہوگا؟
یہ لمحہ مختصر ہے
وئی منظر آنکھ کے الزام سے باہر نہیں ہوتا
ل جاتا ہے پل بھر میں
ھر جاتا ہے چہرے پر

وہ ننھا گاؤں جلتا ہے
وہ میرے سبز، ہنستے، گنگناتے پیڑ جلتے ہیں
وہ میرے لوگ جلتے ہیں
مری آواز جلتی ہے
مرا ہر گیت جلتا ہے
یہ منظر کیوں بکھر جاتا ہے چہرے پر
تماشائی نہیں ہوں میں تو منظر ہوں
حدِ آفاق تک چلتا ہوں، کھیتوں، وادیوں میں جسم کی قاشیں بکھرتی ہیں
یہ قاشیں بیج کے مانند دھرتی میں اترتی ہیں
انہیں جب سینچتی ہے موجِ خوں تو موسمِ گل میں ہزاروں پھول کھلتے ہیں
میں سورج کے لئے زندہ ہوں لیکن خاک کی تعظیم کرتا ہوں
سہانی صبح کے ساحل پہ
آوازوں کی دوری مجھ کو کیوں مانوس لگتی ہے!؟ ——

بلراج کومل

اظہار

صداؤں کے بھنور میں
ہم نے نخلِ آرزو کے
زرد پتّوں سے کہا ہوگا
کہ اب موجِ فنا
اظہار سے آزاد ہے شاید

بڑی بیکار ہوتی ہے
یہ رسمِ گفتگو
جس میں اچھوتے لفظ جذبوں سے جدا ہو کر
ذرا سی دیر کو پرواز کرتے ہیں
مگر برگ و گل و نغمہ کی روشن وسعتوں سے
لمحہ پرواز میں محروم رہتے ہیں۔

ملاقاتوں کے بنجر سلسلے
الفاظ، تلمیحات، میلی دھند کے بادل
یہاں پر پھیلتا جاتا ہے ذہنوں پر
انا کا گرد آلودہ فسردہ آسماں
آؤ، امنڈتی تیرگی میں
کوئی دیوانہ، کوئی آشفتہ سر ڈھونڈیں
کوئی جذبہ حصارِ چشم و لب میں مضطرب ہوگا
دلوں کا عہد رسمِ مے کشی کا منتظر ہوگا

کرشن چندر

مشینوں کا شہر

دسواں باب

ڈاکٹر پارکنز مائیکرو ویو کا بکسا لے کر ڈرائنگ روم میں
ا ___ بولا "فون تو کٹ چکا ہے۔ مگر مائیکرو ویو کے اس بکسے کو میں
ٹھیک کر کے نیویارک سے رابطہ قائم کر لیا ہے ۔"

"دلّی کا کیا ہوا" بادل نے پوچھا۔

"دلّی شہر تباہ ہو چکا ___ اب اس پر نقلی انسانوں کا
، ہے ۔"

" اور نیویارک ؟" ڈاکٹر روبن ہائمر نے بے چینی سے پوچھا۔

" نیویارک پر چاند سے بمباری کی جارہی ہے۔ چاند پر بھیجے
سب روبو باغی ہو چکے ہیں۔ باغی ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے
ٹ مار مزائیل کا رخ زمین کی طرف پھیر دیا ہے۔ نیویارک کی
زین عمارتیں ماچس کی تیلیوں کی طرح جل رہی ہیں ۔"

" مجھے وہ دن یاد آجاتا ہے جب امریکی انسان نے سب
نوں سے پہلے چاند پر قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد ہم لوگ دوسرے
دں پر جانے والے تھے ۔"

" مگر انسان اپنی کاوش کو بھول گیا۔ اس نے روبو بنانے
ع کر دیے" شیخ مقصود بولا " انسان کو اسی لئے زوال آیا کہ
نے خود سے کام کرنا چھوڑ دیا ۔"

" واشنگٹن کی کیا خبر ہے ؟"

" واشنگٹن تباہ ہو چکا ہے۔ لندن تباہ ہو چکا۔ پیرس
اری کی جارہی ہے۔ براولپنڈی ختم ہے۔ ٹوکیو کا نام و نشان
نہیں۔ ماسکو۔ بیکنگ۔ سب بڑے بڑے شہروں پر چاند سے
راکٹ مزائیل پھینکے جا رہے ہیں اوپر چاند سے حملہ ہے۔ نیچے روبو
کا غدر ہے ۔"

شیخ مقصود بولا " ہم اسے غدر کہتے ہیں۔ روبوں اسے
اپنی پہلی جنگ آزادی کے نام سے پکاریں گے ۔"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

پروفیسر پاٹل جو دور بین لگائے فیکٹری کے باہر کا آہنی جنگلہ
دیکھ رہا تھا۔ یکایک چونک کر بولا " ارے ؟ وہاں ولیم جیگر اور چپل
کیا کر رہے ہیں" ؟

" ولیم جیگر اور چپل" ؟ ریما کے منہ سے حیرت کی ایک
ہلکی سی چیخ نکل گئی ۔

" ذرا دور بین مجھے دینا " اس نے پروفیسر پاٹل سے کہا۔

پروفیسر پاٹل نے اسے دور بین دیدی ___ وہ دور بین
سے دیکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ میں کمنٹری دیتی جارہی تھی۔

" ولیم جیگر آہنی جنگلے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ سری دھر کے
قریب ___ وہ اس سے ہات ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہا ہے۔ سری دھر انکار
میں سر ہلا رہا ہے۔ وہ اس کے اور قریب جا کر سری دھر کی خوشامد
کرتا معلوم ہوتا ہے۔ چپل خاموش کھڑی ہے۔ جیگر کی بغل میں۔

. . . . سری دھر آہنی جنگلے کا دروازہ کھولنا چاہتا ہے۔ مگر نہیں
کھلتا اندر سے تالا لگا ہے۔ لمبا تڑنگا جیگر خوش نظر آتا ہے۔ اس

نے چھلانگ لگا کر جنگلے کو پار کر لیا ہے۔ سری دھر نے اسے راستہ دے دیا ہے۔ مگر جیگر اب جنگلے کے دوسری طرف سے چنچل کو اٹھانے میں مصروف ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا۔" روبن ہائیر بولا "کہ جیگر کا چنچل سے کبھی کوئی تعلق تھا۔"

"ہائے رام!" کہہ کر سیما زور سے چیخی۔ دوربین اس کے ہاتھوں سے گر گئی۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بادل اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے تسلی دینے لگا۔

اتنے میں ڈاکٹر پارکنز نے دوربین اٹھالی تھی۔ چند منٹ تک خاموشی سے دوربین کی طرف دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بغیر اس نے دوربین اپنی آنکھوں سے ہٹا کر تپائی پر رکھ دی۔

سب اس کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگے۔

ڈاکٹر پارکنز نے سر جھکائے ہوئے کہا "انھوں نے ان دونوں کو ختم کر دیا ہے۔"

"روبو عورتوں کا بھی احترام نہیں کرتے۔"

"ہم نے ہی اسے ایسا بنایا ہے۔ ان کے اندر صرف کام کرنے کی حس ہے۔ باقی حسیات ہم نے ان میں پیدا ہی نہ ہونے دیں۔ تو اب گلہ فضول ہے۔" شیخ اپنی چھوٹی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

"مگر سری دھر نے تو انھیں جانے کی اجازت دی تھی۔ کم سے کم دوربین سے تو ایسا لگتا تھا۔" جاوید بولا۔

"سری دھر روبوں کا لیڈر ہے۔ اور لیڈر صرف اپنی سیاست کی پروا کرتے ہیں۔ انسانی جان کی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ اور اگر سری دھر روبوں کا لیڈر ہے تو وہ کیسے روبوں سے غداری کر سکتا تھا ممکن ہے روبوں نے ہی کچل ڈالے۔"

روبن ہائیر نے جواب دیا۔

بڈھا ڈاکٹر پامر گھبرا کر بولا "اب وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ سب لوگ ٹکٹکی لگا کر آہنی جنگلے سے لگ کر ایک دیوار کی طرح کھڑے ہیں۔ چہروں کی دیوار۔ کیونکہ ایک روبو کو دوسرے روبو سے پہچاننا کبھی کبھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کیوں ہم نے انھیں ایک ہی سانچے اور ٹھپے میں ڈھال دیا؟"

"ورنہ ہر سانچہ مختلف ہوتا اور لاگت زیادہ آتی۔ ہم قدرت کی طرح بے وقوف نہیں ہیں کہ ہر روبو کو ہر انسان کی طرح مختلف چہرے دیتے۔" بادل بولا "مگر ہم نے ان کو مختلف نمبر تو دیے۔"

"تاکہ کارخانے میں حاضری کے وقت گننے میں آسانی رہے۔"

"روبو کبھی اپنے کام سے غافل نہیں رہتے۔ انھیں معلوم ہی نہیں چھٹی کیا چیز ہے۔ تفریح کسے کہتے ہیں۔"

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔" ڈاکٹر پامر بولے "ہم نے اس جزیرے میں عورتوں کو ممنوع قرار دے کر سخت غلطی کی ——— عورتیں تہذیب لاتی ہیں اور شرافت کی نرمی۔ اور ہمدردی کا گداز۔ اور آنسو۔ اور معصومیت۔ وہ سب چیزیں ہم نے کھو دیں۔ روبو بناتے بناتے ہم خود روبو سے ہو گئے۔"

"دوسری طرف یہ بات بھی ہے۔" بادل بولا۔ "اگر آج زیادہ عورتیں ہوتیں تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو چنچل کا ہوا۔"

سیما کا سارا بدن کانپا۔ اس نے اپنا چہرہ پھر اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ ڈاکٹر پارکنز نے بات کا رخ بدلنے کی خاطر کہا "اب وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

جاوید بولا۔ کیونکہ اب اس نے دوربین اٹھالی تھی ——— "وہ اس قدر خاموش چپ چاپ جنگلے سے لگے کیوں کھڑے ہیں؟ لگتا ہے جیسے خاموشی نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔"

بادل بولا "جانے ان کے دل میں کیا ہے۔ وہ کس چیز کا یا کس وقت کا یا کس شخص یا کس سگنل کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کچھ کرتے کیوں نہیں؟"

"ایسے نہ کہو بادل!" جاوید کانپ کر بولا "وہ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ اگر جنگلے پر زیادہ زور دیں تو آہنی جنگلہ ماچس کی

تیلی کی طرح ٹوٹ جائے گا ۔"

گمان کے پاس ہتھیار تو نہیں ہیں ؟" ڈاکٹر پاٹل نے اپنے دل کو تسلی دینا چاہی۔

"ہتھیار نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔" شیخ مقصود بولا "وہ لوگ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ ہم لوگ پانچ منٹ سے زیادہ ان کے سامنے ٹھہر نہ سکیں گے۔ وہ ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح ہمیں ڈبوتے ہوئے ہمارے سروں کو کچل کر گزر جائیں گے۔"

یکایک جاوید ملک کو کچھ یاد آیا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ بولا ——

"میرے کام کرنے کے کمرے میں ایک بجلی کی موٹر پڑی ہے۔ میں اس کی مدد سے ایک نئے قسم کا روبو تیار کر رہا تھا جو اب تین چوتھائی مکمل ہو چکا ہے۔ بھیم۔ رستم اور ہرکولیس کی ساری خوبیاں اس میں جمع کر دی ہیں۔ میں اس کا نام ارجن رکھنا چاہتا ہوں۔"

"جلدی بات کرو کیا کہنا چاہتے ہو۔" بادل جھنجھلا سا بولا۔

"اس بجلی کی موٹر کو میں یہاں لے آتا ہوں اور اس کے تار ہم ٹوٹے ہوئے تار سے جوڑ کر سارے آہنی جنگلے کو برقا دیتے ہیں۔ جو بجلی کی رو آہنی جنگلے پر دوڑے گی جو روبو اسے ہاتھ لگائے گا۔ یا چھوئے گا۔ اس وقت بجلی کے جھٹکے سے ختم ہو جائے گا۔"

"تو فوراً لے آؤ —— بجلی کی اس موٹر کو۔"

"مگر بھاری ہے۔" جاوید بولا۔ "میں اکیلا اسے اٹھا نہ سکوں گا۔"

روبن ہائیمر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

جب روبن ہائیمر اور جاوید چلے گئے تو ڈاکٹر پارکنز نے پھر دوربین اٹھائی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے بادل سے کہا: "سرکی دھر روبوں سے کچھ مشورہ کر رہا ہے۔ مائی گاڈ۔"

"کیا ہوا ؟"

"اس نے چھلانگ لگا کر آہنی جنگلے کو پار کر لیا ہے اور اب دوسرے روبوں کو اندر آنے کے لیے کہہ رہا ہے۔" ڈاکٹر پارکنز جلدی جلدی کہنے لگا۔ "دو روبو اور اندر آ گئے۔ پانچ اور۔"

شیخ مقصود بولا۔ "اگر اس وقت جلدی سے روبن ہائیمر اور جاوید نہیں آتے ہیں تو سمجھو ہم ختم ہیں۔"

سیما ڈرائنگ روم سے اٹھ کر دوڑی اپنے کمرے میں گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک المناک راگنی سیما کے کمرے سے آنے لگی۔ سیما ستار بجا رہی تھی۔

"اگر سیما ستار بجا سکتی ہے۔" شیخ مقصود بولا "تو سمجھو ابھی دنیا ختم نہیں ہوئی۔"

"نہیں —— یہ بات نہیں ہے۔" بادل بولا۔ "جب سیما کے دل میں کوئی نیا خیال یا نئی ترکیب آتی ہے۔ تو وہ اپنے ذہن میں اس کی تصویر صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ستار بجانے لگتی ہے۔ موسیقی سے اس کے تخیل کو پر لگ جاتے ہیں۔ وہ ضرور اس وقت کچھ سوچ رہی ہے۔"

"دس اور روبو جنگلے کو عبور کر کے اندر آ گئے ہیں۔" ڈاکٹر پارکنز نے دوربین سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ سب فیکٹری کے اندر آ رہے ہیں۔"

بلونت سنگھ اور شیخ مقصود دونوں باری باری کہنے لگے۔

"یہاں تک آنے میں انھیں بہت دیر لگے گی۔"

زیادہ دیر تو نہیں مگر آدھا گھنٹہ پونا گھنٹہ ضرور لگ جائے گا۔ ہم نے ادھر آنے والی سیڑھیوں کا آہنی دروازہ بند کر دیا ہے اور فیکٹری کے گیٹ کو بھی بند کر دیا ہے۔ صرف بجلی گھر کی طرف ہم نہ جا سکے۔"

ڈاکٹر پاٹل نے مایوسی سے سر ہلا کے کہا۔ "ہم چاروں طرف سے گھر چکے ہیں۔"

اتنے میں ڈاکٹر روبن ہائیمر اور جاوید ملک بجلی کا موٹر لے کر آ گئے۔

"اتنی دیر کیوں کر دی ۔" ؟

جاوید ملک تار سے تار جوڑتے ہوئے بولا۔ "میں ڈاکٹر روبن ہائیمر سے نئے روبو کے دماغ کے سلسلے میں مشورہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹر روبن ہائیمر نے اس کے دماغ کو ٹھیک کر دیا ہے۔"

ہاں۔" ڈاکٹر روبن ہائیمر بولا۔ "بے حد خوبصورت وجیہ اور

پروقار جسم بنایا ہے جاوید نے۔ اس روبو کا۔ میں نے اسے بہترین دماغ دے کر سلادیا ہے۔ اب وہ سات سال تک سوتا رہے گا۔"

جاوید بولا: "اسے سونے دو جب تک ارجن سوتا رہے گا مہابھارت کی جنگ نہیں چھڑے گی۔ رستم سہراب کی کہانی نہیں دہرائی جائے گی۔ ہرکولیس کو زمین کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں لینا پڑے گا۔ پرومیتھس نیند کی زنجیروں سے جکڑا روح کی بے چین آگ نہیں چرا سکے گا۔"

"بجلی دوڑاؤ ۔۔۔" ڈاکٹر پارکنز بولا "جلدی سے بجلی دوڑاؤ اس آہنی بنگلے میں ورنہ سب روبو اندر آجائیں گے۔ آہ۔"

"کیا ہوا؟"

"بجلی کی رو بنگلے میں چلنے لگی۔ اٹھارہ ہزار وولٹ کی بجلی نے روبوں کی پہلی صف کو جو بنگلے سے لگی کھڑی تھی جلا کر راکھ کر دیا ہے۔"

"بلونت سنگھ کہاں ہے؟" بادل نے پوچھا۔

"نیچے کمرے سے حساب کتاب کا کھاتہ لانے گیا ہے۔" شیخ مقصود نے کہا۔

"اس وقت اس کا کیا کام ہے۔ کیا تک ہے؟"

"مرتے وقت حساب کتاب کی سوجھی ہے جناب کو۔"

اتنے میں بلونت سنگھ لیجر اٹھائے ہوئے کمرے کے اندر آگیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے پھر وہی سوال کیا تو وہ بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ حساب کتاب ہونا چاہیے۔ پیشتر اس کے کہ..... پیشتر اس کے ... میرا مطلب ہے۔ ممکن ہے نیا سال ہماری زندگی میں نہ آئے اور حساب کتاب کبھی نہ ہوگا۔"

"کیا دکھائی دے رہا ہے؟" ڈاکٹر پاٹل نے ایسے اطمینان سے پوچھا جیسے صرف گہری مایوسی ہی پیدا کر سکتی ہے۔

"کچھ نہیں۔" ڈاکٹر پارکنز بولا "ہر طرف نیلا ہی نیلا رنگ نظر آرہا ہے۔"

"روبو کی وردی کا رنگ۔" بادل نے ہونٹ سکوڑ لیے ۔۔۔

ڈاکٹر پارکنز بولا: "وہ لوگ ڈاک کے بحری جہاز سے اب اسلحہ اتار رہے ہیں۔"

"تو میں انھیں کیسے روک سکتا ہوں۔" روبن ہائیمر جھلا کر بولا۔

"مائی گاڈ۔" پارکنز چلا اٹھا۔ "انتم جہاز نے اپنی توپوں کے دہانے ہمارے گھر کی طرف کر دیے ہیں۔"

"توپوں کے دہانوں سے چند منٹ کے لیے گولے برسیں گے پھر سب ختم۔"

"ختم یعنی انت۔" ڈاکٹر پاٹل بولا "انت سے انتم۔ انتم نام جہاز کا خوب رکھا ہے کسی نے۔"

"معلوم ہوتا ہے روبوں میں حس مزاح جاگ رہی ہے۔" ڈاکٹر پارکنز نے کہا۔

"حس مزاح کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" ڈاکٹر روبن ہائیمر نے آہستہ سے خوفناک لہجے میں کہا۔ "اتنا ضرور جانتا ہوں کہ روبوں کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔"

"یہ بات سب جانتے ہیں۔" کرسی پر بیٹھے بیٹھے پارکنز کے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی ۔۔۔ اور اس نے دوربین روبن ہائیمر کو دے دی۔ اور خود ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولا: "یورپ والوں نے بہت برا کیا جو روبوں کو لڑنا سکھا دیا ۔۔۔ ورنہ ایمان کی بات ہے کہ اپنا نقلی انسان بڑے کام کا تھا۔ مگر انھوں نے نقلی انسانوں سے اصلی انسان کا کام لینا شروع کر دیا اور انھیں لڑنے جھگڑنے میں ماہر بنا دیا۔"

"حالانکہ ان صفات میں ہماری مکمل اجارہ داری تھی۔" شیخ مقصود نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "انھیں سپاہی بنا دینا غلط تھا۔"

"میں کہتا ہوں انھیں روبو بنانا ہی غلط تھا۔" بلونت بولا۔

بادل بولا: "نہیں بلونت میں آج بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں ۔۔۔ کہ ہم نے ان کی تخلیق کر کے کوئی غلطی کی۔"

"آج بھی نہیں مانو گے؟" بلونت بولا

"آج بھی نہیں۔" بادل غرور سے بولا۔ "آج انسانی تہذیب

کا آخری دن ہے۔ لیکن آج بھی میں اپنی غلطی تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔"

بلونت لیجر کے حساب کتاب میں لگ گیا۔ گنتے ہوئے بولا "آٹھ کروڑ ڈیڑھ سو پندرہ روپے۔"

بادل کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے روبن ہائیر سے بولا "ڈاکٹر روبن ہائیر شاید زندگی کے آخری لمحوں میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہیں شاید ہماری گفتگو کا آدھا حصہ دوسری دنیا کی طرف پہنچ رہا ہے۔ مگر میرے باپ کا خواب برا نہیں تھا ––– کام کی غلامی کو توڑنے کے لیے اس نے روبو کو ایجاد کیا۔ زندگی بہت سخت تھی۔ تلخ اور کام سے چور چور کر دینے والی۔ اس لئے اس نے روبو ایجاد کیا۔ ایک نقلی انسان جو اصلی انسان کی تھکن دور کر سکے۔ اسے کڑے کاموں سے نجات دلا سکے۔

"میں جانتا ہوں تمہارے پتا جی کے دماغ میں یہی تھا" ––– پاٹل بولا "لیکن مگر ہم لوگ محض آدرش وادی نہ تھے۔ میں نے چالیس برس اسکے ساتھ کام کیا ہے۔ میں جانتا ہوں جوں جوں ہم روبو بناتے گئے۔ منافع کا میدان وسیع ہوتا گیا۔ منافع کا بھوت ہمارے دماغ پر سوار ہوتا گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم روبو پر سوار تھے روبو ہمارا غلام تھا۔ ہم منافع کے غلام ہوتے گئے۔"

"میں اپنی بات کروں گا" بادل چھاتی ٹھونک کر بولا "میں نے کبھی منافع کا خیال نہیں کیا۔ میں نے اپنی تخلیق کو مکمل کرنے کے لیے کام کیا۔ کام کی خاطر کام۔ تاکہ انسان کام کا غلام نہ رہے۔ کام کس لیے ––– ؟ ایک روٹی کے لیے ؟ ۔ چھی! کیا انسانی تہذیب کی یہی معراج تھی۔ اسی لیے میں نے آپ سب لوگوں کے ساتھ کام کیا تاکہ انسان کو روٹی کی غلامی سے نجات دلا سکوں۔ میں اس گندے معاشی نظام سے انسانیت کو اوپر اٹھانا چاہتا تھا۔ غریبی کو ہمیشہ کے لیے دور کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے انسانوں کی ایک نئی نسل کا خواب دیکھا تھا۔"

"پھر کیا ہوا!" پارکنز آہستہ سے بولا ––

"میں دنیا کے انسانوں کو جنت کا نمونہ دینا چاہتا تھا۔ جس میں دودھ دہی روٹی اور کپڑا۔ گھر اور تعلیم کے تقاضوں نے لاکھوں کروڑوں روبوں کی مدد سے اوپر اٹھ کر ہر مسئلے کو حل کرتے ہوئے آدمیت کی ایک نئی سطح کو پا لیتے۔ یہ میرے باپ کا خواب تھا۔ بس اگر ایک سو سال ہمیں اور مل جاتے۔ صرف ایک سو سال۔ پھر تم دیکھتے۔

"پچاس کروڑ نو لاکھ ستاون ہزار آٹھ سو دس روپیہ" بلونت لیجر سے گنتے ہوئے بولا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

سیما کے کمرے سے ستار کی دھن اونچی ہونے لگی۔

"موسیقی بھی انسان کو اوپر اٹھاتی ہے۔" پارکنز بولا۔

"ہمیں کچھ ادھر بھی دھیان دینا چاہیئے تھا۔ روبو اور روپے کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ہیں۔ جو انسان کو اونچا لے جا سکتی تھیں۔"

"مثلاً" بادل نے پوچھا۔

"مثلاً۔ موسیقی" جاوید بولا "حسن۔ لطافت۔ نزاکت۔ محبت کی ایک نگاہ۔ صبح دم کنول کی پتی۔ ہر ایک قطرہ ہیرے کی طرح چمکتا ہوا ––– ہم سب ان باتوں کو بھول گئے اور منافع کے کارخانے میں جا گھسے ––– ورنہ دنیا بڑی خوبصورت تھی۔"

"سات ارب اور اٹھاسی لاکھ روپے" بلونت سنگھ نے گنتے ہوئے کہا ––

"شاید جس دن یہ فیکٹری بنی تھی۔ جس دن ہم نے اپنی ذمہ داری نقلی انسان کو سونپ دی تھی۔ شاید ہم اسی دن مر گئے تھے۔" روبن ہائیر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا "شاید ہم اپنے بھوت ہیں جو سو سال کے سایوں کی طرح اس فیکٹری پر منڈلا رہے ہیں۔ جس پر چند منٹوں کے بعد روبوں کا اختیار ہو جانے والا ہے۔ لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ ہو چکا آج کا لمحہ ماضی میں کھو چکا۔ ۔ میری گردن پر ایک کاری زخم ہے جس سے خون رس رہا ہے۔ تم پارکنز تمہاری پیٹھ میں روبو نے ایک خنجر پیوست کر دیا ہے۔ چند منٹ کے بعد آنے والے مستقبل کو ہم ماضی کی آنکھ سے کیوں نہ دیکھیں۔

"سات ارب اکہتر کروڑ ––– اور۔ ۔ ۔ اور۔ ۔ ۔ بلونت سنگھ بولا "یہ قصور کس کا ہے۔"

"ہمارا نہیں ہے" بادل سختی سے بولا "یہ روبوں کا قصور ہے۔ بغاوت انھوں نے کی ہے"

"ہمارا بھی قصور ہو سکتا ہے" شیخ مقصود بولا "ہم نے منافع کی رقم بڑھانے کے لیے انھیں اتنی تعداد میں مینوفیکچر کر دیا کہ وہ ساری دنیا پر چھاتے چلے گئے۔ اور انسان اسی حساب سے کم ہوتے چلے گئے۔

روبن ہائیر دور بین سے دیکھتے ہوئے بولا "مجھے ابھی خیال آیا ہے۔ شاید انسان اتنی جلدی اور یوں ختم نہیں ہو سکتا"

یکایک جاوید اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سر جھکا کر بولا "قصور میرا ہے۔۔۔۔ سارا قصور میرا ہے"

"تمہارا؟" ڈاکٹر پامل حیرت سے جاوید کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ میں نے نقلی انسان کے جسم میں آپ کو بتائے بغیر کئی تبدیلیاں کر دیں"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" بادل گھبرا کر بولا۔

"میں نے روبو کا کریکٹر ہی بدل دیا۔ جسم میں چند تبدیلیاں اور ان کی نفسیات میں چند اضافے کرنے سے ان کی شخصیت ہی بدل گئی"

"مگر تم نے ایسا کیا کیوں" ڈاکٹر پارکنز نے پوچھا۔

"اور ہم لوگوں کو بتایا تک نہیں۔؟" شیخ مقصود نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہ تبدیلیاں آہستہ آہستہ خاموشی اور رازداری سے کرتا رہا۔ میں نے یہ راز ہر ایک سے چھپائے رکھا۔ سوائے ایک کے۔ میں انھیں آہستہ آہستہ انسانی سطح پر لانا چاہتا تھا۔ کام کرنے کی قوت اور صلاحیت میں وہ پہلے ہی ہم سے بہتر ہو چکے تھے"

ڈاکٹر روبن ہائیر نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ بولا "مگر اس سے اس بغاوت کا کیا تعلق جو اس وقت روبوں نے کی ہے"

"میرا خیال ہے روبوں کی بغاوت کا اس تبدیلی سے گہرا تعلق ہے" جاوید بولا "وہ اب مشین نہیں ہے۔ انھیں اپنی برتر قوت کا احساس ہو چکا ہے اور وہ ہم سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ کیونکہ ہم اب بھی انھیں مشین سمجھ کر ان سے ویسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔ جس سے ان کے دل میں ہر انسان کے لیے نفرت پیدا ہو چلی ہے۔ ان نئے نقلی انسانوں کو جنھیں میں روبو کے بجائے ڈوبو کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ میں نے گھنٹوں ان سے باتیں بھی کی ہیں اور ان کی نفرت کی منطق کو سمجھنے اور بدلنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتے۔ کیونکہ میں نے انھیں مشین نہیں بننے دیا۔ مگر عام طور پر انسانوں سے نفرت کرنے سے میں انھیں باز نہیں رکھ سکا اور جب میں نے یہ نفرت دیکھ لی تو میں نے مزید ڈوبو بنانے بند کر دیے۔ اور ــــ"

"ٹھہرو" بادل نے اسے روک کر کہا "تم اقبال کرتے ہو کہ تم نے روبو میں کئی غیر قانونی تبدیلیاں پیدا کر دیں"

"ہاں"

"تو تمہیں اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ ان تبدیلیوں کا اثر کیا ہوگا"

"امکانات کا اندازہ تھا۔ پورا اندازہ نہیں تھا"

"تم نے ایسا کیوں کیا جاوید" بادل کے لہجے میں گلہ تھا۔

"اپنی خاطر۔ محض تجربے کی خاطر۔ تجربے کا حق تو ہر سائنسدان کو ہے"

"یہ سچ نہیں ہے"

یہ سیما کی آواز تھی۔ وہ اب کمرے سے باہر نکل کر خاموشی سے ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی ــــ وہ لوگ اپنی بحث میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ انھوں نے سیما کی آمد کو فوری طور پر بالکل محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب سیما نے کہا "یہ سچ نہیں ہے" تو سب کی نگاہیں مڑ کر سیما پر مرکوز ہو گئیں۔

بادل سیما کے قریب جا کے کہنے لگا "اوہ سیما ــــ مرنا بہت مشکل ہے۔ اور تمہیں دیکھ کر زندگی کے حسن کا اندازہ ہوتا ہے ــ میرے قریب رہو ــــ ان آخری لمحوں میں"

"میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی ہوں بادل" سیما نے اپنے شوہر سے کہا۔ پھر جاوید کی طرف مڑ کر بولی "مگر جاوید اکیلا اس

کے لیے قصوروار نہیں ہے۔"

"نہیں ہے"؟ ڈاکٹر پارکنز نے دہرایا۔

"ہاں اس نے یہ تجربے اس لیے کیے کہ میں اسے اکساتی رہی اب کہہ دوں نا جاوید کتنے سالوں سے میں تمہیں ان تبدیلیوں کے لیے کہہ رہی تھی"؟

"نہیں۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ تبدیلیاں کیں اور ان تبدیلیوں کے لیے کلی طور پر میں ہی ذمہ دار ہوں۔"

"اس کی بات کا یقین نہ کرو۔ میں نے جاوید سے کہا تھا وہ روبو کو ایک روح عطا کر دے۔"

"یہاں روحوں کی کوئی بات نہیں ہو رہی ہے" بادل بولا "خود جاوید مانتا ہے کہ اس نے روبو کے جسم میں چند۔۔۔ چند نفسیاتی اور جسمانی تبدیلیاں کیں تاکہ۔۔۔ تاکہ۔۔۔ وہ انسانوں کے کچھ قریب ہو سکیں چند خفیف تبدیلیاں۔"

"لیکن تبدیلیاں بہت اہم ثابت ہوئیں" سیما بولی۔

"کیسے"؟ بادل نے پوچھا۔

"میں نے سوچا ان تبدیلیوں کے بعد ان کی انسانی ساخت اور نفسیاتی سطح اس قسم کی ہو جائے گی کہ وہ ہمارے زیادہ قریب آ جائیں گے تو ہمیں بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ اگر وہ انسان کی طرح ہو جائیں گے تو ان کے لیے نفرت کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر روبن ہائیر نے ایک تلخ ہنسی کے ساتھ کہا "یہی تمہاری غلطی تھی۔ انسان سے زیادہ کوئی نفرت نہیں کر سکتا۔"

"یوں نہ کہو ڈاکٹر ہائیر۔۔۔" سیما لجاجت سے بولی "مجھے ان نقلی انسانوں اور اصلی انسانوں کے درمیان مغایرت کی یہ دیوار بہت بری لگتی تھی۔ میں نے اس دیوار کو ڈھانا چاہا۔ اس لیے میں نے جاوید سے کہا۔"

"اور جاوید نے ویسا ہی کیا۔ جیسا تم نے کہا۔"

"ہاں۔ کیونکہ میں نے اس سے کہا تھا۔"

جاوید بولا "نہیں یہ سچ نہیں ہے۔ میں نے اپنی خاطر۔۔۔ اپنی خوشی کی خاطر یہ تجربے کیے۔ ساری ذمہ داری میری ہے۔"

"ذمہ داری میری ہے۔ میں جانتی تھی" جاوید مجھے انکار نہ کر سکے گا۔"

"کیوں"؟ ڈاکٹر روبن ہائیر نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں۔۔۔" بادل بولا "جاوید شروع ہی سے۔ پہلے دن ہی سے سیما سے محبت کرتا تھا۔ قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔"

ڈاکٹر پاٹل جو ان سب سائنسدانوں سے معمر تھا۔ بلکہ تقریباً مرحوم ڈاکٹر گھوش کی عمر کا تھا۔ اپنے صوفے سے اٹھ کر جاوید کے پاس گیا اور اس سے پوچھنے لگا "کب سے تم نے یہ تجربے شروع کیے"؟

"کوئی تین سال ہوئے۔"

ڈاکٹر روبن ہائیر بولا "اپنی لیبارٹری میں تجربے کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن فیکٹری میں تجربے کرنا گناہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر جاوید ملک نے اپنی لیبارٹری میں ایک ایسی روبی تیار کی ہے جو ہو بہو سیما سے ملتی ہے۔ مگر اس میں انسان کی سی زندگی اور روح نہیں آئی۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ وہ ایسی لگتی ہے۔ جیسے وہ خوابوں میں چل رہی ہو۔ اور خلاؤں میں گھوم رہی ہو۔ اس کی آنکھیں غیر ارضی ہیں۔۔۔ میں نے ابھی اس کی لیبارٹری میں اس کے ارجن کو دیکھا ہے۔ خوبصورت انسان کا ارفع ترین نمونہ۔ مگر وہ سو رہا ہے کوئی ایسی دوا دی ہو ڈاکٹر جاوید نے اسے کہ وہ سات سال تک سوتا رہے گا۔ سات سال کے بعد کیا ہوگا کون جانے۔"

"یہاں یہ فکر ہے کہ سات منٹ کے بعد کیا ہونے والا ہے۔" شیخ مقصود نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر پاٹل نے اپنی ٹھوڑی پر ہات رکھ کر کچھ سوچا۔۔۔ جاوید سے پوچھا۔

"اور ایسے روبو۔۔۔ یا لوبو تم نے کتنے بنائے ہیں"؟

"کوئی تین سو کے قریب ہوں گے۔۔۔ یعنی ان دو کو چھوڑ کر جو میری لیبارٹری میں ہیں۔ باقی سب میں نے فیکٹری میں بنائے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا" پاٹل سوچ سوچ کر بولا "کہ کھربوں کی تعداد میں چند سو روبو بدلے گئے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا"

"بلاشبہ اس تناسب سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔" ڈاکٹر روبن ہائیر بولا۔ "مگر مصیبت کی بات تو روبو کی تعداد ہے۔"

"کیا؟" پاٹل بولا۔

"تعداد۔ پروفیسر پاٹل۔ ہم نے روبوٹوں تو ادمیں دنیا بھر میں پھیلائی کیے ہیں کہ ان کی تعداد ہر سال انسانوں کی تعداد سے بڑھتی چلی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ ———— اگر یوں نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟"

"کیا تم مجھے ذمے دار ٹھہرا رہے ہو؟" بادل نے بھڑک کر پوچھا۔

ڈاکٹر پارکنز نے بادل کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "شاید آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ فیکٹری کا انتظام روبوں کو کنٹرول کرنا ہی یہ غلط ہے۔ یہ روبوں کی مانگ ہے جو پیلائی کو ہر سال بڑھاتی رہی ہے۔"

"اور اس بڑھتی ہوئی مانگ اور اسے پورا کرنے والی پیلائی کے چکر میں انسان کو ختم ہونا ہوگا۔" سیما نے نفرت اور تضحیک سے کہا۔

"کون مرنا چاہتا ہے؟" بادل نے سیما سے پوچھا۔ "ہم سب جلد سے جلد اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔"

"گیارہ ارب نوسو اکہتر روبوٹ۔" بلونت لیجر بند کرتے ہوئے بولا۔ "ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"کہو۔"

"چھوڑو بھی۔" پارکنز بیزاری سے بولا۔ "اب کوئی ترکیب کام نہیں کرے گی۔"

"مگر ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" بلونت بولا۔ "میری ترکیب نہایت عمدہ ہے۔ مجھے اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں روبوں سے اس کے لیے بات چیت شروع کر سکتا ہوں۔"

"تمہارا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو چنچل اور جیگر کا ہوا۔"

"ہو سکتا ہے۔" بلونت بولا۔ "اور اگر میری ترکیب کامیاب رہی تو سب کی جان بھی بچ سکتی ہے۔"

"ایسی کونسی ترکیب ہے تمہاری؟" بادل نے پوچھا۔

بلونت بولا۔ "میں ان سے کہوں گا خوبصورت روبوٹ ذہین روبو۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ طاقت ہے۔ ذہانت ہے۔ اور اب تمہارے پاس اسلحہ بھی ہیں۔ مگر ایک چھوٹی سی چیز کی کمی ہے" کاغذ کے ایک پرزے کی۔"

بادل خوشی سے اچھل کر کہنے لگا۔ "میرے مرحوم باپ کے بنائے ہوئے فارمولے کی جو سیف میں بند ہے۔"

"ہاں۔" بلونت بولا۔ "اور میں ان سے کہوں گا۔ روبو صاحبان! اس فارمولے کے اندر آپ کی تخلیق کا راز بند ہے اور اس کاغذ کے پرزے کو حاصل کیے بغیر آپ لوگ اپنی تعداد میں ایک روبو کا اضافہ نہیں کر سکتے۔ اگلے ۳۰ سال میں اس دنیا میں ایک روبو بھی زندہ نہیں رہے گا۔ ذرا سوچیے ———— ہمیں مار کر آپ کا اپنا حشر کیا ہوگا۔ کیسا دردناک انجام رہے گا آپ کا بھی۔"

اس لیے محترم روبو۔ خواتین و حضرات کیا آپ مجھے سن رہے ہیں؟ اگر آپ ہماری جان بخشی کر دیں۔" بلونت کے چہرے پر اب اعتماد کی سرخی آ چکی تھی۔ "اگر آپ ہماری جان بخش دیں اور ہمیں انتم جہاز پر کسی الگ تھلگ جزیرے کی طرف صحیح و سلامت جانے دیں۔ تو ہم یہ فیکٹری اس کا سارا ساز و سامان مع اس پر اسرار فارمولے کے آپ کی بھینٹ کر دیں گے۔ بس یہی میری تجویز ہے ——— محترم روبوں صاحبان ہماری زندگی بخش دو۔ اپنی تخلیق کا راز دریافت کر لو۔"

بادل بولا۔ "بلونت کیا تم اسے مناسب سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔" بلونت بولا۔ "اگر یوں نہ ہوگا تو ہم سب کی جان جائے گی۔ اور وہ ایک دن سیف کھول کر اس راز کو دریافت کر لیں گے۔"

"بادل بولا۔" ہم اس فارمولے والے کاغذات کو پھاڑ بھی تو سکتے ہیں۔"

"تو ہم اپنی زندگی کی آخری امید سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

بلونت نے جواب دیا۔ "اس جزیرے میں ہم لوگ تیس چالیس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ فارمولا بیچ کر ممکن ہے ہم اپنی جان بچا لیں۔ مگر کب تک؟ فارمولے پر عمل کر کے وہ لوگ اپنی تعداد بڑھاتے جائیں گے۔ اور آخر کو پھر ہماری پناہ گاہ پر حملہ کر کے ایک ہی وار میں ہم کو ختم کر دیں گے۔"

بادل نے کہا۔

بلونت نے ہنس کر کہا: "کون احمق انھیں مکمل فارمولے کے کاغذات حوالے کر دے گا۔"

"بادل نے کہا: "میں دھوکا دینے کے خلاف ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے — بعد میں اپنے جزیرے پر سلامتی سے پہنچ کر انھیں باقی حصہ اس مسودے کا بھجوا دیں گے۔"

حساب کتاب یہ بیٹھتا ہے کہ میں گفت و شنید کرتا ہوں روبو مان جاتے ہیں۔ ادھورا فارمولا ان کے حوالے کیا جاتا ہے ہم سب لوگ سلامتی سے جہاز پر روانہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد میں خاموشی سے اپنے کیبن میں بند ہو کر اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتا ہوں اور اس وقت — اس وقت۔"

اس وقت روبن ہائیمر نے خوش ہو کر کہا: "اس وقت ایٹم جہاز کی توپوں کے دہانے اس فیکٹری کی طرف موڑ دیے جائیں گے اور چند منٹ ہی میں یہ روبو بنانے والی دنیا کی واحد فیکٹری تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی مرحوم گھوش کا مسودہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"

شیخ مقصود اٹھ کر کہنے لگا: "میں اس تجویز کے خلاف ہوں۔"

"تم ڈاکٹر پارکنز بولو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟" بادل نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔"

"تم ڈاکٹر روبن ہائیمر؟"

"ٹھیک ہے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر پاٹل؟"

"انسانیت کے بچاؤ کے لیے اس مسودے کو بیچنا ہی پڑے گا۔"

"کیا خوفناک فیصلہ ہے۔" بادل بولا "مسودے دے کر ہم اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں اور اس طرح سے انسان کو بھی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہونے سے بچا سکتے ہیں — دوسری طرف اس بات کا ڈر ہے کہ روبو لوگ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں اور پیشتر اس کے کہ ہم انھیں تباہ کریں وہ ہمیں تباہ کر دیں۔"

"مگر اب دوسرا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔"

"ہاں۔ اب ایسا ہی کرنا ہوگا۔" بادل بولا۔

"مگر تم نے مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں۔" سیما بادل سے کہنے لگی۔

بادل نے مسکرا کر سیما کی طرف دیکھا۔ کیونکہ اب اسے بلونت کی ترکیب پر یقین سا آ چلا تھا۔ وہ مسکراتے بلکہ تقریباً ہنستے ہوئے سیما کو اپنی بانہوں میں لے کر چک پھیریاں لیتے ہوئے خاموشی سے کہنے لگا۔

"حسینہ مان جائے گی۔ حسینہ مان جائے گی۔"

(باقی باقی)

سارے گاؤں میں اس کا نام چرچا ہے۔ اگر ایسے کسی
چھوٹے گاؤں میں اخبار ہوتا تو یہ خبر جلی سرخی سے چھپتی۔
بسنتی کی ہمت کی سب داد دیتے ہیں... عمر یہی اس
کے لگ بھگ .... دُھن کی پکی ... سلائی مشین خرید رکھی
ہے۔ گاؤں کے بینک نے اسے قرضہ دیا تھا۔ پڑوسیوں
کے کپڑے سی کر وہ گھر کا خرچ چلانے میں اپنے خاوند
کا ہاتھ بٹاتی ہے... کتنی جان ٹھمک ہے۔
گھر کے کام دھندے سے فارغ ہو کر وہ
دیر سے سیتی ہے۔ کیونکہ اس کی جھونپڑی میں بجلی
لگی ہوئی ہے

بجلی دیہات میں بھی پہنچ چکی ہے.... چھوٹے
چھوٹے کارخانے.... مشینیں.... پمپ وغیرہ....
یہ سب اسی کی کرامات ہے اور تو اور اب کولہو بھی بجلی سے
چلتا ہے۔ تیلی نے بیل فروخت کر دیئے ہیں۔ اب اس کا
لڑکا پالی ٹیکنیک میں پڑھتا ہے۔ کون جانے کسی دن
وہ تیل کے لئے کھدائی کرنے لگے۔

آج، کل سے بہتر ہے *
کل، آج سے بھی بڑھ کر ہوگا۔

* "آج کا ہندوستان" پروگرام کی مکمل تفصیلات کے لئے ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔ ... بلڈنگ، پارلیمنٹ اسٹریٹ۔ نئی دہلی ۱ کو لکھئے۔

بسنتی رات میں سلائی کرتی ہے

اقبال مجید

پرانا نمبر

ایک مکان تھا۔ خوبصورت اور آراستہ۔ اس مکان میں ایک ٹیلیفون تھا۔ اس مکان میں کئی بار آگ لگی۔ اور ایک دن روزروز کی آتش زدگی سے تنگ آکر اسکے پرانے مکین اُسے چھوڑ کر چلے گئے ——

مگر یہ سارا کا سارا حادثہ ایک دو دن میں نہیں ہوا

ہوا یہ کہ ایک دن۔ ایک بہت بڑی سڑک پر بہت بڑے بازار کے درمیان بہت سے لوگوں کے سامنے ایک بہت بوڑھے آدمی کو ایک موٹر نے ٹکر ماری اور چلی گئی۔ آدمی زخمی ہوا کسی نے اسکی طرف دیکھا بھی نہیں۔ مگر اُس مالک مکان نے دیکھا۔ رُکا۔ اور اپنی محبوبہ کو ٹیلیفون کیا۔

" اپنی گاڑی فوراً یہاں بھیجدو —"

"کیوں —؟"

"ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اور میں زخمی کو اسپتال پہنچانا چاہتا ہوں"

"تم تو ٹھیک ہو نا —؟"

"ہاں — میں ٹھیک ہوں"

"تو پھر کیوں بورکر رہے ہو" اتنی بات ہوئی پھر ٹیلیفون کٹ گیا۔ مالک مکان کو ٹیلیفون کٹ جانے کا بیحد غم ہوا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر ٹیلیفون جڑا رہے تو انسانیت پر بڑے احسانات کئے جا سکتے ہیں۔ اسکی محبوبہ نے موٹر نہیں بھیجا صرف اتنا ہی نہیں۔ اس نے ٹیلیفون کاٹ دیا۔

مالک مکان نے ٹیکسی سے زخمی کو اسپتال پہنچایا۔ ایمرجنسی والے کمرے میں کوئی طالب علم ڈاکٹر ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ میں لئے حیرت سے مالک مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی اسکا بھی ٹیلیفون کٹ گیا تھا۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر مالک مکان سے بولا۔

"کئی بار ملایا مگر ہمیشہ انگیج ۔ بڑے مشکل سے ملا تو اس نے کاٹ دیا"

"کس نے —؟"

"شیلا نے"

"کون شیلا —؟" مالک مکان کو حیرت ہو رہی تھی۔

"ایک نرس ہے۔ اتنی خوبصورت اتنی جان لیوا جیسے احمد شاہ ابدالی کی کنیز"

"یہ بوڑھا ابھی ابھی سڑک پر موٹر سے ٹکرا گیا ہے۔ شائد دو چار گھنٹے بعد مر جائے۔"

اس کے لئے کچھ کیجئے —" مالک مکان نے بڑی لجاجت کے ساتھ طالب علم کو متوجہ کیا۔ پھر ایک وارڈ بوائے بلوایا گیا۔ ایک کال بک نکالی گئی۔ کال بک کے کالم بھر کر ایک ہاؤس سرجن کی طلبی کے لئے اس وارڈ بوائے کو معمور کیا گیا۔ وارڈ بوائے چلا گیا۔ ڈاکٹر طالب علم پھر غمگین ہو گیا۔

بھرتی کرنے کے چار گھنٹے بعد مالک مکان نے پھر اسپتال ٹیلیفون کیا تاکہ بوڑھے کے بارے میں معلومات کر سکے۔ اسے معلوم ہوا کہ وارڈ بوائے ہاؤس سرجن کے پاس سے ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔

"تو کیا زخمی بڑھاپے ہی پڑا ہے"۔

"ہاں ـــــ"

"کسی ڈاکٹر نے اسے نہیں دیکھا"

"نہیں ـــ"

"کیا بروقت طبی امداد کے نہ ملنے پر آدمی مرسکتا ہے؟"

"ہاں ـــــ"

"کیا اسپتال میں بھی آدمی مرجاتا ہے۔ اس لئے کہ وقت پر ڈاکٹر اسے دیکھ نہیں سکا۔؟"

"[illegible]" جواب میں کسی نے کہا۔

مالک مکان ساڑھے پانچ بجے وارڈ بوائے کے گھر گیا۔ اس کے گھر پر تالہ لگا تھا۔ اسپتال کی ایک نوجوان دائی کے ساتھ بتایا گیا وہ میٹنی شو دیکھ رہا تھا۔ سینما ہال میں جاکر مالک مکان نے اُسے آواز دی۔ گریبان پکڑ کر باہر لایا۔ طمانچے ملے، اسکوٹر رکشا پر بٹھا کر ہاؤس سرجن کے گھر بھیجا۔ رات سات بجے بوڑھے کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ پانچویں دن مالک مکان کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ـــــ

"میں زید بول رہا ہوں ـــ" آواز آئی۔

"فرمایئے۔"

"میرے زخمی باپ کو آپ نے ہی اسپتال میں بھرتی کیا ہے؟"

"جی ـــ"

"کیا آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ کس سے ہوا۔؟"

"جی ہاں ـــــ"

"کیا آپ مجھ سے مل سکتے ہیں۔؟"

"میں آپ سے ضرور ملوں گا ـــ"

ان پانچ دنوں میں مالک مکان کو زخمی آدمی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ زخمی آدمی سونے چاندی کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ اسکے پاس بہت سے مکان تھے اسکا ایک ہی لڑکا تھا اور اس کے یہاں بہت سے ٹیلیفون لگے تھے۔

مالک مکان نے ایکسیڈنٹ کے بعد بوڑھے کو اسپتال پہنچا کر اسی وقت پولیس کو ٹیلیفون کیا تھا۔ جواب میں کسی نے کہا تھا۔

"ہم نے ریسیور کو کریڈل پر سے ہٹا کر الگ رکھ دیا ہے۔ کوں۔ کوں۔ کوں۔" جب ٹیلیفون انگیج ہوتا ہے تو اس میں سے بہت منحوس آواز آتی ہے۔ ریسیور کو کریڈل پر سے ہٹا کر رکھ دینا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اندر ہوتے ہوئے بھی باہر [illegible] کا بورڈ لٹکا دیا جائے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ اگر ٹیلیفون سے کوں کوں کی آوازیں نہ آتیں تو مالک مکان پولیس کو مندرجہ ذیل کام کی باتیں بتاتا ـــــ

(۱) کہ اس نے بوڑھے آدمی کا ایکسیڈنٹ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

(۲) کہ بوڑھے کو ایک کالے رنگ کی ایمبیسیڈر گاڑی نے ٹکر ماری تھی۔

(۳) کہ گاڑی کے نمبر پورے نہیں پڑھے جاسکے صرف اچٹتی سی نظر میں U S کے بعد ۲ کا ہندسہ پڑھا جاسکا۔

(۴) کہ گاڑی چلانے والا آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک لگائے تھا اور اسکی گردن موٹی تھی۔

دوسرے دن مالک مکان نے وائی کو ٹیلیفون کیا۔ وائی مالک مکان کا دوست تھا۔ اس کا ہم پیشہ۔ مالک مکان نے اسے بتایا کہ وہ پولیس کو ٹیلیفون کرنا چاہتا تھا۔ کہ ایک آدمی کی زندگی اور موت کا سوال تھا کہ ایک آدمی کو انصاف کی ضرورت تھی۔ کہ مجرم کو پکڑا جاسکتا تھا۔ لیکن وہاں سے کوں کوں کی جاں سوز آوازنے اس کے اعصاب کو شل کردیا۔

مالک مکان کے دوست نے اسکی پوری بات چیت سنی لیکن اتنی بات اس سے کہنے میں اُسے بہت چلانا پڑا ٹرنک کال پر اونچی آواز میں بولنا پڑتا ہے۔ لیکن اسکے دوست نے اتنی محنت کے باوجود اس کے توسلوں پر پانی پھیر دیا۔

"آخر تم کو کیا پریشانی ہے۔" اس کا دوست بولا۔ "تم کیوں

ان چکروں میں پڑ رہے ہو۔"

"اس لئے کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ قتل کی کوشش ہے۔" مالکِ مکان نے اسے سمجھایا۔

"قتل کی کوشش۔؟"

"ہاں ـــــ"

"کیسے؟ مجھے سمجھاؤ۔"

پھر مالک مکان نے اسے بتایا کہ وہ بوڑھا ایک بہت مالدار آدمی ہے۔ اور اس کا لڑکا اس کی اکیلی اولاد ہے۔ وہ جوان ہے، عیاش ہے باپ کی دولت پر جلد از جلد قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔"

"لیکن یہ لڑکا کہاں سے کود پڑا ـــــ"

"اسی نے اپنے باپ پر موٹر چڑھا دی تھی۔"

"تمھیں کیسے معلوم ـــــ؟"

مالک مکان نے اسے بتایا کہ وہ اسکے لڑکے سے مل چکا ہے، لڑکے سے ملاقات کی غرض یہ تھی کہ وہ اسے بتائے کہ جس موٹر سے اسکا باپ کچلا ہے اس کا رنگ کالا ہے۔ اس کے نمبر LU 52 سے شروع ہوتے ہیں۔ اسے چلانے والا سنہری کمانی کی عینک لگائے تھا۔ اور اسکی گردن موٹی تھی۔ لیکن جب وہ اس لڑکے کے پورٹیکو میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پورٹیکو میں کالے رنگ کی ایمبیسڈر کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے نمبر بھی LU 52 سے شروع ہوتے تھے اور جو آدمی اس سے مسکرا کر ہاتھ ملانے بڑھا تھا وہ سنہری کمانی عینک لگائے تھا اور اسکی گردن موٹی تھی۔ لیکن مالک مکان کا دوست پہلے تو اسے سچا ماننے سے انکار کرتا رہا وہمی اور شکی سمجھتا رہا لیکن مالک مکان کے بہت زور دینے پر اس نے سنجیدہ ہونے سے انکار کر دیا۔ مالکِ مکان نے اسکی بڑی منت سماجت کی اور بولا۔

"تم سنجیدہ کیوں نہیں ہوتے؟"

"آپ کا ٹائم ختم ہو گیا۔" درمیان میں آپریٹر کی آواز آئی۔

مالکِ مکان نے پھر غصے سے کہا۔ "لیکن میرا دوست سنجیدہ کیوں نہیں ہوتا ـــــ؟"

آپ کا دوست سنجیدہ ہونے سے انکار کر رہا ہے کیونکہ وقت ختم ہو گیا ہے ـــــ" آپریٹر نے جواب دیا۔

"ہلو۔ ہلو ـــــ" مالکِ مکان ریسیور میں چیخا۔ آپریٹر کی نرم سی آواز آئی۔

"بیکار مت چلائیے۔"

"کیوں ـــــ؟" وہ جھنجھلا گیا۔

"ہر بات اپنے وقت کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ آپکی بات کا وقت ختم ہو چکا۔" جواب ملا۔

"لیکن مجھے کچھ کہنا ہے۔"

"وقت کا گذر جانا ایک محرومی ہے ایسا المیہ جو ہمیں گونگا کر دیتا ہے۔" اور یہ کہہ کر آپریٹر نے فون کاٹ دیا

ہر ٹرنک کال کے ساتھ ایک خرابی یہ ہے کہ وقت ختم ہو جانے پر وہ کٹ جاتی ہے۔ مالک مکان میں دوبارہ ٹرنک بک کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

پھر اسی رات مالک مکان نے ایک کام کیا۔ اس نے حادثہ کے وقت جو کچھ دیکھا تھا ایک کاغذ پر تحریر کیا اور اس کی دو کاپیاں بنائیں۔ ایک کاپی لے کر وہ اپنے شہر کے ایک خاصے نامور روزنامہ کے دفتر گیا۔ اس نے ان لوگوں سے بتایا کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ اسے اخبار میں چھپوانا چاہتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے پولیس کو اس سلسلہ میں رپورٹ کی؟"

"ابھی نہیں۔ لیکن آج میں تھانے جا کر رپورٹ کر دونگا۔"

مالک مکان کو معلوم ہوا کہ بوڑھے زخمی کو پرائیوٹ وارڈ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وارڈ میں چوبیس گھنٹہ کئی نرسیں موجود رہتی ہیں کئی جمعدار ہاتھوں میں پاٹ لئے اندر آتے جاتے رہتے ہیں بیٹے نے زخمی باپ کو بچانے کے لئے بلند پائے کے دو تین ڈاکٹروں کو لگا رکھا ہے۔

مالکِ مکان نے ٹیلیفون ڈائرکٹری میں ڈاکٹر آرکا نمبر تلاش کیا۔ جس کی دیکھ ریکھ میں بوڑھے کا علاج ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر فون پر مل گیا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ آپ کا مریض کیسا ہے؟ میرا مطلب پرائیوٹ

وارڈ نمبر ۳ سے ہے۔

"بہت اچھا ہے۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اب تک مرا کیوں نہیں؟"

"یہ تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہے؟ دوسری طرف سے کوئی بولا۔ مگر یہ ڈاکٹر کی آواز نہیں تھی۔ مالک مکان کی لائن پر کوئی اور دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"میرا بھائی تین روز تک اسپتال میں پڑا رہا لیکن کسی نے پلٹ کر خبر بھی نہیں لی۔ کیونکہ وہ غریب تھا نادار تھا بے کس مظلوم تھا"

"سنئے آپ کس سے بات کرنا چاہ رہے ہیں؟" یہ آواز ڈاکٹر آر کی تھی۔ مالک مکان سے مخاطب تھا۔

"وہ اسے اپنے لئے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔" دوسری طرف سے کوئی کہہ رہا تھا۔ "وہ جانتے ہیں کہ وہ بڑا آدمی ہے پیسہ والا ہے۔ وہ کبھی اسے انجکشن دیتے ہیں اور کبھی خون اور آکسیجن۔ کبھی کیپسول دیتے ہیں اور کبھی گولیاں اور ٹانک دنیا کے تمام دولت مند لوگوں کو ڈاکٹر اپنے لئے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہیلو ڈاکٹر آر۔" مالک مکان چلایا۔ لیکن اسکی لائن پر دوسری آواز پھر غالب آگئی۔

"وہ جانتے ہیں کہ وہ اسے بچا نہیں پائیں گے۔ انکا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ جلد سے جلد جتنا زیادہ سے زیادہ ممکن ہو سکے اس سے اینٹھ لیں۔ نوچ لیں اس کے پاس سے۔ وہ اسے جینے سے مرنے نہیں دیں گے۔"

"یہ کون بیچ میں بول رہا ہے۔" دوسری طرف سے مالک مکان کو پھر ڈاکٹر آر کی آواز سنائی دی۔ لیکن کوئی جواب میں کسی اور سے کہہ رہا تھا۔ "تم کس کس سے لڑو گے۔ وہ پورا گروہ ہے۔ وارڈ بوائے، نرسیں، کمپونڈر، ڈاکٹر، سب ایک منظم گروہ کے مانند ایک ہی سازش میں بندھے ہوئے اُسے لوٹ رہے ہیں۔ وہ تو اسی رات مر جاتا جس وقت تم نے اسے اسپتال پہونچایا۔ لیکن انھیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اسکے مر جانے میں وہ لوگ کسقدر خسارے میں رہیں گے۔"

"ہلو ڈاکٹر آر ---- یہ کون ڈسٹرب کر رہا ہے۔ میں تو صرف اُس بوڑھے کی خیریت پوچھنا چاہتا ہوں جو کہ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گیا تھا۔" اس بار مالک مکان ریسیور میں زور سے چلایا۔ ڈاکٹر آر نے اُدھر جواب میں ضرور کچھ کہا۔ مگر مالک مکان اسکی آواز نہیں سُن سکا۔ اس کے کانوں میں پھر انھیں دو آدمیوں کی بے ربط گفتگو سنائی دے رہی تھی۔

"تو کیا تمھارا بھائی مر گیا۔؟"

"مر تو وہ بوڑھا آدمی بھی جائے گا، کیونکہ اُمر کوئی نہیں ہے۔"

"ہم اسے بہت ہی قیمتی antibiotics دے رہے ہیں۔"

اس بار ڈاکٹر آر کی آواز صاف سُنائی دی۔

"اس کے لئے نہیں اپنے لئے ---" کسی نے کہا۔

"دوسروں کے لئے کوئی کچھ نہیں کرتا۔" کسی دوسرے نے جواب دیا۔

"میرا بھائی مر گیا۔ کیونکہ وہ مفلس اور نادار تھا۔ اس پر قیمتی دوائیں آزمانا بھی بیکار تھا کیونکہ اُن دواؤں کو خراب کرکے دوسرے کا حق ہی تو مارا جاتا ---" یہ پہلے والے کی آواز تھی۔

"ہمیں یقین ہے کہ لائف سیونگ ڈرگ اُسے بچا لیں گی لیکن آج اسکی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" یہ ڈاکٹر آر کی آواز تھی۔ "مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔ یہ بیچ میں نہ جانے کون گڑبڑ کر رہا ہے۔"

"یہی تو گڑبڑ ہے، ہمارے ہاتھ اس گروہ تک نہیں پہونچ سکتے۔" کسی نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہلو ہلو کی مختلف آوازیں ٹیلیفون میں آنا شروع ہو گئیں۔ مالک مکان نے ڈاکٹر آر کو گالیاں دیتے ہوئے سُنا۔ پھر اسکی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ٹیلیفون کی ایک ہی لائن پر کئی لائنیں Connect ہو جانا ایک ایسا المیہ ہے جس کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا۔

دوسرے دن کے اخبار میں ایک خبر چھپی تھی۔ اس بوڑھے لکھ پتی کے حادثہ کی خبر ---- لیکن اس میں نہ تو اُس کالی موٹر کا ذکر تھا اور نہ ان نمبروں کا اور نہ اس سنہری کمانی والی عینک کا جس کو مالک مکان نے اپنی تحریر میں نکھ کر دیا تھا۔ خبر میں کہا گیا تھا کہ کوئی بھاری ٹرک شہر کے متمول تاجر کو زخمی کرکے بھاگ گیا۔

اس رات مالک مکان نے اپنے مکان کا تفصیلی جائزہ لیا۔ کھڑکیاں، دروازے، دیواریں محرابیں اور چھتیں سب کئی بار کی آتش زدگی میں جھلس کر رہ گئے تھے۔ اور وہ خالی پڑا تھا۔ وہ لوگ جو اس مکان میں مدت سے آباد تھے روز روز کی آتش زدگی سے تنگ آکر چلے گئے تھے۔ ان کے چلے جانے نے اسے تنہا کر دیا تھا۔ اور تنہائی کا احساس اُسے کھائے جا رہا تھا۔ اس نے ساری رات کروٹیں بدل کر کاٹی۔ وہ مکان کو پھر سے بنوانا چاہتا تھا جلی ہوئی محرابیں اور چھتیں اگر از سر نو زیادہ خوبصورت اور مضبوط بن جائیں تو وہ اپنی موت پر ایک اطمینان محسوس کرتا۔ اس نے ساری رات مکان کی نئی کھڑکیوں اور دروازوں کے ڈیزائن پلان کئے اور غمگین ہو گیا۔

دوسرے دن سویرے مالک مکان کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"میں بول رہا ہوں ——" دوسری طرف سے آواز آئی۔ جس میں اس قدر اعتماد تھا جیسے اتنا کہنے پر ہی وہ پہچان لیا جائیگا۔ اور واقعی مالک مکان نے اسے پہچان لیا۔

"کہئے اب آپ کے باپ کی طبیعت کیسی ہے۔" مالک مکان نے پوچھا۔

"ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن آپ نے اخبار کے دفتر میں کیا لکھ کر دے دیا ہے۔ والد محترم کہہ رہے تھے کہ آپ انھیں بھی کچھ لکھ کر دے آئے ہیں۔"

"جی ہاں —— لیکن جو کچھ میں نے لکھ کر دیا ہے وہ اخبار میں چھپا کب۔؟"

"وہ چھپ نہیں سکتا تھا۔؟"

"کیوں —؟"

"اس سے امن عامّہ کو خطرہ تھا۔"

"جی —— یہ آپ کو کیسے معلوم؟"

"اس لئے کہ اس اخبار کی پالسی ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

"آپ کے ہاتھوں میں۔" مالک مکان حیرت سے بولا۔

"ہم اس کے سب سے بڑے شیئر ہولڈر ہیں۔"

"اوہ ——" مالک مکان کے ہاتھ میں ریسیور کانپ رہا تھا۔

"سُنئے۔" ادھر سے آواز آئی۔

"جی ——" مالک مکان سہم گیا۔

"کیا آپ اپنے مکان کا کوئی حصّہ کرائے پر اٹھا سکتے ہیں؟"

"جی نہیں ——"

"کیوں ——؟"

"میرے مکان میں کوئی رہنے کو تیار نہیں ہوگا۔ جب تک اس کی مرمت نہ ہو جائے۔" مالک مکان نے افسوس ظاہر کیا۔

"میں اس کی ترکیب آپ کو بتا سکتا ہوں۔ ایسی ترکیب جس سے آپکے مکان کی مرمت نہیں بلکہ نئی تعمیر بھی ممکن ہے اور بہت سے کرائے داروں کو رکھنے کی گنجائش بھی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔ بتلایئے وہ ترکیب کیا ہے۔؟"

"ہر بات ٹیلیفون پر نہیں کہی جا سکتی۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ اس کے لئے آپ کو مجھ سے ملنا ہوگا۔ آپ چاہیں تو ابھی مل سکتے ہیں۔ میرے مکان پر۔"

"کیا آپ سچ بول رہے ہیں۔"

"آپ کو اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟" سوال ہوا۔

"حیرت! اس لئے کہ ایک مکان کا مالک کہلانے کے لئے آدمی اپنی ساری زندگی دے دیتا ہے۔ اور پھر جس کے پاس مکان ہو اور وہ مکان اس کی آنکھوں کے سامنے قسطوں میں جل جل کر راکھ ہو جائے اس کا دکھ آپ نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں آپ کو نیا مکان دے سکتا ہوں۔"

"لیکن کیسے؟"

"ٹیلیفون پر ہر بات نہیں بتائی جا سکتی۔" جواب ملا۔ "آپ فوراً آجایئے۔" اور ٹیلیفون بند ہو گیا۔ مالک مکان کو اپنی حماقت پر بڑا افسوس ہوا۔ وہ اتنی سی بات نہیں جانتا کہ ٹیلیفون کی اپنی چند مجبوریاں ہیں۔

دوسرے دن اسے معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا زخمی جسے وہ اسپتال

میں داخل کرایا تھا اور جیسے اسکے لڑکے کے پہونچنے کے بعد پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ چل بسا۔ ڈاکٹروں نے اسکے جسم میں زہر پھیل جانے پر جو [illegible] دیا تھا اس نے کام نہیں کیا۔ ڈاکٹروں کو اس کے چل بسنے کا بڑا غم تھا۔ انھوں نے اس کیپسول کی جانچ کرائی تھی۔ جانچ کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ کیپسول میں اصل دوا کے بجائے کھریا مٹی بھری ہوئی تھی قبل اس کے کہ وہ لڑکا معاملات کو آگے بڑھا کر پولیس کے حوالے کر دیتا اور کیمسٹ کی دکان پر پولیس چھاپہ مارتی کیمسٹ نے ٹیلیفون پر ڈاکٹر سے بات کر لی۔

مالکِ مکان پر اس روز ٹیلیفون کی عظمت کا بہت احساس ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے مکان میں ایک کے بجائے دو ٹیلیفون لگوائے گا۔ اس نے اُسی وقت کیمسٹ کو ٹیلیفون کیا۔

"ہلو ۔۔ کیا آپ ہی نے وہ کیپسول بوڑھے آدمی کے لئے سپلائی کئے تھے" مالک مکان نے پوچھا۔

"ہمارے پاس بہت سے مکان ہیں اور بہت سے کرائے دار۔" جواب ملا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کیا آپ کے دئے ہوئے کیپسول سے کھریا مٹی نکلی تھی۔" مالک مکان نے زور دیکر پوچھا۔

"جی بات یہ ہے کہ ہم اسی کرائے دار کو کرائے پر مکان دیتے ہیں جو ہمیں زیادہ پیسہ دیتا ہے۔" جواب ملا۔

"کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آپ کی ٹیلیفون پر ڈاکٹر سے کیا بات ہوئی تھی۔ ؟" مالک مکان نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

"ہمارے یہاں بہت سے ٹیلیفون میں آپ کس ٹیلیفون کی بات کر رہے ہیں۔"

" دیکھئے خدا کے لئے مجھے یہ بتا دیجئے کہ آپ کی ڈاکٹر سے ٹیلیفون پر کیا بات ہوئی تھی۔ اس دوا کے بارے میں جس میں ۔۔۔ "

"ٹھہریئے" دوسری طرف سے کسی نے ٹوکا۔ "یہ ریزیڈنشیل لائن ہے۔ آپ دکان کا نمبر ملا کر بات کیجئے۔ ویسے دکان پر بھی کئی ٹیلیفون ہیں اس بات کا خیال رکھئے گا۔

مالک مکان نے ریسیور رکھ کر گردن لٹکالی۔ سارا دن اس نے بڑی الجھن میں گزارا۔ پھر اس نے سوچا کہ بغیر مکان کے کوئی نہیں رہ سکتا۔ اسے جلد از جلد اپنا مکان ٹھیک کرا لینا چاہیئے۔ وہ اس روز بوڑھے آدمی کے لڑکے سے ملنے گیا۔ لڑکے سے مل کر اُسے بہت خوشی ہوئی۔ جب لڑکے نے اسے نیا مکان بنانے کی ترکیب بتائی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ مگر لڑکے نے ایک کڑی شرط بھی ساتھ ساتھ مالک مکان کے سامنے رکھ دی۔

" وہ شرط کیا ہو گی بھلا ۔۔۔ ؟ " مالک مکان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم کو اپنے مکان میں ایک اور ٹیلیفون لگوانا ہوگا۔"

" وہ تو ٹھیک ہے پر پرانے نمبر پر اگر گھنٹی بجی تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

تم ریسیور کریڈل پر سے اٹھا کر الگ ڈال دینا۔ گھنٹی بجنا بند ہو جائے گی۔" لڑکے نے جواب دیا۔

کچھ دنوں بعد مالک مکان جو اپنا ایک مکان کھو دینے کے بعد پھر ایک نئے اور شاندار مکان کا مالک ہو گیا تھا اسکے پرانے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ بے خیالی میں اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہلو" یہ اُس کے پرانے دوست کی آواز تھی۔ "تو تمہارے خیال میں اس بوڑھے آدمی کو کسی ٹرک نے کچلا تھا کالے رنگ کی موٹر نے نہیں۔" اس کا دوست مالکِ مکان سے پوچھ رہا تھا۔ یکبارگی مالک مکان کو خیال آیا کہ اس نے غلطی کی ہے جلدی سے اس نے ٹیلیفون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی نے پرانے نمبر پر رنگ کیا۔ مالک مکان پھر بھول گیا کہ اُسے وہ ٹیلیفون لین نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ اس بار اسکی محبوبہ بول رہی تھی۔

"تم نے تو بہت شاندار مکان بنا ڈالا۔"

"لیکن اسمیں جگہ نہیں ہے۔ سارے حصے کرائے پر اُٹھ چکے ہیں۔" مالک مکان بولا۔

"میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں۔" اسکی محبوبہ نے اسے ڈانٹا اور مالک مکان ایک دم سے چونک پڑا۔ اس نے گھبرا کر ٹیلیفون پھر

کریڈل پر پٹک دیا۔ لیکن پرانے نمبر پر پھر تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی۔ مالک مکان کو غصہ آ گیا۔ رسیور اٹھا کر اکڑ کر بولا۔

"کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے کیمسٹ بول رہا تھا۔ "کیا آپ جاننا چاہیں گے کہ میں نے ڈاکٹر سے ٹیلیفون پر کیا بات کی تھی؟"

"آپ لوگ نئے نمبر پر رنگ کیوں نہیں کرتے؟" مالک مکان جھنجھلا کر بولا۔ اور ٹیلیفون پٹک کر باتھ روم چلا گیا۔ اور پھر لگاتار کئی روز تک مالک مکان کے پرانے نمبر پر گھنٹی بجتی رہی۔ جب بھی گھنٹی بجتی مالک مکان رسیور کریڈل پر سے اٹھا کر الگ رکھ دیتا۔

آخر کو مالک مکان اپنے پرانے نمبر سے تنگ آ گیا۔ اس نے بڈھے آدمی کے لڑکے سے ٹیلیفون پر مشورہ کیا۔

"جسے دیکھئے میرے پرانے نمبر پر ہی رنگ کرتا ہے بتائیے میں کیا کروں۔"

"جب تک نیا نمبر مشہور نہ ہو جائے صبر کیجئے۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ پرانا نمبر کسی طرح سے کٹ جائے۔" مالک مکان نے بے صبری سے پوچھا۔

"ممکن ہے لیکن اس میں وقت لگے گا۔" جواب ملا۔ اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔" مالک مکان گردن لٹکا کر بیٹھ گیا
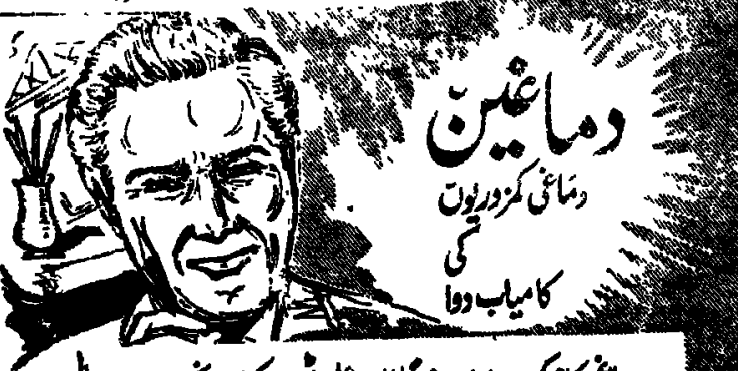
ساجدہ زیدی

سناٹے کی آواز

درد سینے میں دبائے ہوئے سو جاؤ
کہ شاید یوں ہی
نیند کی راہ کبھی موت کی وادی میں کھلے
راہ گم کردہ کو منزل تو ملے ۔ ۔ ۔ ۔

رات اندھیری ہے اگر اتنی کہ خود
اپنے پیکر کا ہی عکس آپ دکھائی نہ دے
ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے
اسی تاریکی کے دامن سے لپٹ جاؤ
کہ دامن کا سہارا تو ملے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کوئی آواز نہ ہو دور تلک ۔ ۔ ۔ ۔
اور سماعت کے بھی ویرانے ہوں گے،
اسی ویرانے کی گردن میں حمائل کرو باہیں غم کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(بعد مدت کے ملا ہو جیسے ــــ جسم محبوب کا قرب)
یہ تو ممکن ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کہ اس درد کے سناٹے میں آہنگ دل و جاں مل جائے

انگلیاں رات کی یخ بستہ سہی،
لمس سرد اُن کا،
اگر خون کی گردش بھی تھما دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کیا؟
خون جم جائے تو اس گردشِ بیکار سے فرصت مل جائے ۔

اور اس سرد اندھیرے میں اگر
ــــ اپنی ہی آگ کا پسماندہ
وہ ننھا سا شرارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھی سسک جائے
تو سمجھو کہ:
ہر آغاز کا انجام کوئی تو ہوگا

صبح ہو جائے اگر
ہاتھ منہ دھو کے مشاغل کا سہارا لے لو
اپنے معمول کے بڑھتے ہوئے ریلے میں بہو

کتاب [illegible]

اپنے چہرے پہ کفن ڈال لو اک بے حسیِ مطلق کا۔
اپنے ادہمات کی فہرست بنا لو۔۔۔ رکھو اعمالِ گزشتہ کا حساب۔
کبھی سر پھوڑو کتابوں سے
کہ آگاہیِ ہستی ہی ملے
کبھی لوگوں سے ملو، بات کرو، درد کا درماں ڈھونڈو
نہ ملے گر تو یہ سمجھو کہ :۔
"اگر دیر ہے اندھیر نہیں"

کبھی بیزاری کے لمحوں میں فراغت کی تمنّا لے کر
جلنے کی پیالی میں غرقاب کرو دن کی تھکن
کبھی سگرٹ کے دھوئیں کے ہمراہ
یوں اڑا دو، دلِ آشفتہ کے ناسور کبھی،
پھر کبھی ہاتھ نہ آئیں وہ تمہارے
نہ کسی اور کی آنکھوں میں چبھیں۔۔۔۔۔۔
ننگے زخموں کو پہناؤ کبھی بے جان ہنسی کی پوشاک۔
تاکہ تم دیکھنے والوں کی نگاہوں کے ترحّم سے بچو۔
اس سے بڑھ کر بھی کوئی نشتر و پیکاں ہوں گے۔۔۔؟

ٹوٹی اقدار کے،
بکھرے ہوئے افکار کے،
پابستہ تمناؤں کے،
لب بستہ وفاؤں کے،
سراسیمہ گزرتی ہوئی ہر ساعت کے،
اسی انبوہ میں گر،
اپنا چہرہ نظر آجائے تو اُس سے بھی چرا لو نظریں
(یہی ظالم کہیں آئینہ دکھانے نہ لگے۔)

تھک کے، لنگڑا کے، مگر شام تلک چلتے رہو،
اور پھر رات سے دیرینہ تعلق ڈھونڈو۔
آخرِ شبِ درد کی،
سناٹوں کی،
تنہائیِ احساس کی
دنیا بھی تو دنیا ہے، یہی
آخر اس جرمِ تمنا کی سزا کاٹنی ہے،
اس گنہِ شوق کا کفارہ ادا کرنا ہے۔

درد کو دل میں دبائے ہوئے سو جاؤ یونہی۔

غزلیں

پرکاش فکری

مری جلن کا مداوا نہیں ترے بس میں
پگھلتے لمحوں کے شعلے رواں ہیں نس نس میں

کڑا ہے وقت، مری پیاس کے تقاضوں پر
بھگو گئے ہونٹ وہ آیا ہے [illegible] کے رس میں

اسیرِ رنج ہیں شہروں کی بستیاں پہلے
نیا ہے خون ادا نئی ہیں قتل کی رسمیں

تلاش سمت نہیں سہل کہ اندھیرا ہے
رکے ہیں یادوں کے اہلِ دل کے نقش پا دیس میں

کٹھن ہے سہنا ہیں وفاؤں کے مرحلے فکری
دلا نہ مجھ کو یقیں کھا نہ جان کی قسمیں

جمیل کلیمی

سورج کی ایک آنکھ سے ڈھلنے لگا ہے وہ
ہر شام چاند بن کے ابھرنے لگا ہے وہ
قوس قزح کے رنگ میں سرتاپا ڈھل کر
ہر راہ رو کے دل میں اترنے لگا ہے وہ
انسان تو کیا فرشتے بھی ایمان بیچ دیں
کچھ اس ادا سے آج گزرنے لگا ہے وہ
پتھر کو گدگدا کے بڑی نرمیوں کے ساتھ
باتیں ہزار سال کی کرنے لگا ہے وہ
ہر کھڑکی [illegible] تہذیب خوشبو کے انگ میں
فن کار کی مثال بکھرنے لگا ہے وہ
نیت نہ آئینے کی بدل جائے پھر کہیں
سو سو طرح سے بننے سنورنے لگا ہے وہ
آنکھیں بچھائے کون پڑا ہے یہ راہ میں
کس کی صدائیں سن کے ٹھہرنے لگا ہے وہ
جی بھر کے آؤ دیکھ لو یارو جمیل کو
ہر لحظہ انتظار سے مرنے لگا ہے وہ

کچھ سوچ کچھ خیال کے در کھولیے جناب
الفاظ کی رگوں میں لہو گھولیے جناب
شیشے میں لمحہ لمحہ کوئی شے ہے منتظر
اس کو بھی منہ لگائیے ہنس بولیے جناب
کیوں کھوئے کھوئے پھرتے ہو اس در پہ شہر میں
اسرار اپنے دل کے کبھی کھولیے جناب
پھر بھی ہرا ہوا نہ مرے دل کا یہ درخت
ساون کی طرح آٹھ پہر رو لیے جناب
تاریکیوں کے جال میں لپٹی ہے کائنات
گھر سے نکلیے سڑکوں پہ پھر ڈولیے جناب
سورج کو زیر کرنے کے کچھ کیجیے جتن
مہتاب کے نگر میں بہت سو لیے جناب
آندھی گرانے آئی ہے پیپل کے پیڑ کو
اب گھونسلہ اٹھائیے پر تولیے جناب
آئی ہے پھر بسنت کی رت جھومتی جمیل
ہر کچے پکے آم میں رس گھولیے جناب
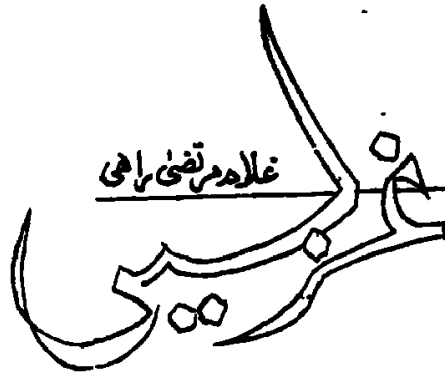
چہرہ، منظر منظر ڈھلتا رہتا ہے
کیسے کیسے رنگ بدلتا رہتا ہے

صحراؤں کی گودیں خالی خالی ہیں
چٹانوں سے دودھ نکلتا رہتا ہے

اکثر اک لمحے سے چل جاتا ہے کام
کبھی کبھی تو صدیوں چلتا رہتا ہے

اسی ندی میں ڈوبا کرتا ہے سورج
اسی ندی سے چاند نکلتا رہتا ہے

دن بھر اسکو خواب دکھائی دیتے ہیں
دلت رات بھر آنکھیں ملتا رہتا ہے

سورج میری تاک میں رہتا ہے شاید
سایا آگے پیچھے چلتا رہتا ہے

خیر مناؤں اپنے اپنے دامن کی
دھیرے دھیرے دھواں نکلتا رہتا ہے

جانے کیسے لہو فراہم کرتا ہوں
جانے کس کی آگ میں جلتا رہتا ہے

--

چلے تھے جسکی طرف وہ نشان ختم ہوا
سفر تمام کرو، آسمان ختم ہوا

نظام، جبر، بغاوت، شکست، قید، صلیب
صدیاں تمام ہوئیں، امتحان ختم ہوا

چھپک گئی تھی گھڑی دو گھڑی کو آنکھ کہیں
سفر ہمارا اسی درمیان ختم ہوا

درخت، راستے، انساں، عمارتیں، سورج
اس ایک فرد سے، اک خاندان ختم ہوا

کسی نتیجہ پہ پہونچا نہیں کوئی راہی
اک ایسے موڑ پہ میرا بیان ختم ہوا

--

نجم الہدیٰ

وقت

یہ گردشِ صبح و شام کہتی ہے، وقت کا کارواں رواں ہے
یہ زینتِ[1] آسماں ستارے
یہ ماہ و خورشید
آسمانوں کے بے کراں نیل میں تموج[2] پذیر ہیں جو
—— یہ سب مسلسل سفر کے مارے ہوئے مسافر
بتا رہے ہیں، یہ انقلابوں ہی کا جہاں ہے۔
نہ کوئی لمحہ اسیر ہو کر ٹھہر سکا ہے،
نہ کوئی موسم ہمیشہ سایہ فگن رہا ہے،
اُبھرتے سورج کی تازگی بخش دھوپ کب تک!
خنک ردا چاندنی کی کب تک کسی کے سر پہ!
چمن میں کب تک سموم کے ناگوار جھونکے!
(چمن ہی کب تک رہے گا باقی!)
خزاں کے بے رنگ نقش کا ارتسام تا چند رہ سکے گا!
سمٹتے اور پھیلتے یہ سائے
یہ گھٹتے بڑھتے ہوئے اُجالے
یہ رات کی بزمِ نور و ظلمت
یہ دن کی ہنگامہ آفرینی
یہ ابر کے شامیانے کچھ دن
یہ موسمِ برشگال کا رنگ
یہ گرمیاں اور یہ زمستاں
—— یہ سب پھیلتے ہوئے زمانے کے نقشِ پا ہیں۔

یہ عالمِ آب و گِل کا عالم
یہ دھوپ چھاؤں
نمودِ اضداد جس میں مدغم
کبھی محبت کا جام لبریز
ہے کبھی تشنگی کا شکوہ
کبھی یہ احساس، ساری دنیا مرے لئے ہے
کبھی یہ غم کہ جہاں میں میرا نہیں ہے کوئی
نہ کوئی احساس مستقل ہے،
نہ معبدِ حسن کوئی ہے ایسا دوام جس کے نصیب میں ہو
نہ معصیت کا وفور دو دن سے کچھ زیادہ
نہ پیکرِ خاک اور روح کا ساتھ کچھ دن
(یہ پیکرِ خاک تا بہ کے خود بھی!)
ثباتِ کنجِ عدم میں جانے کو گامزن ہے
بقا کی لہریں فنا کے ساگر میں ڈوبنے کو بڑھی چلی جا رہی ہیں پیہم
یہ سلسلہ روز و شب کا، روکے نہ رک سکا ہے
بڑھے چلو، وقت کی صدا ہے۔

---

[1] "ہم نے آسمان کو تاروں سے سجایا ہے" قرآن مجید۔ سورۂ صٰفّٰت۔ رکوع ۱
[2] "سارے کے سارے اجرامِ فلکی آسمان میں تیرتے ہیں" (قرآن مجید۔ سورۂ یٰسٓ رکوع ۳)

غزلیں

ظفر غوری

بھیگی رت میں روپ دھرتی کا رسیلا ہو گیا
آسماں کا رنگ بھی دھل دھل کے نیلا ہو گیا
چاند کے سانچے میں اب ڈھلنے لگا ہر انگ انگ
اور بھی کچھ آنکھ کا کاجل کٹیلا ہو گیا!

جان دینے آئے تھے وہ چاہنے والے یہاں
مرجعِ اہلِ وفا اک سبز ٹیلا ہو گیا
سنگدل صحرا کو بخشا شہرِ گل کا رنگ روپ
جس جگہ آباد زخموں کا قبیلہ ہو گیا!

ہر جنم کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہو دل کی پیاس
لمحہ لمحہ زہرِ غم پی کر نشیلا ہو گیا!!
زندگی پر اب نہیں جچتا کوئی موزوں لباس
کل جو جامہ چست تھا وہ آج ڈھیلا ہو گیا
اب ظفرؔ چل کر رہیں جنگل کی اجلی چھاؤں میں
روشنی کے زہر سے ہر شہر پیلا ہو گیا!!

ساجد اشر

میں الجھن سے خود کو بچاتا رہوں گا
مسائل کی بتی بجھاتا رہوں گا
اَمٹ نقش بن کر ابھرنے کی خاطر
لہو کی ندی میں نہاتا رہوں گا
اداسی کی بنجر زمیں پر ہمیشہ
مسرت کے پودے اگاتا رہوں گا
تم آنسو کی تتلی پکڑتے رہو گے
میں اپنی کہانی سناتا رہوں گا
خموشی کے اندھے تسلسل پہ پیہم
صداؤں کی بجلی گراتا رہوں گا
نہ چھوڑوں گا بچپن کی یادوں کا دامن
میں کاغذ کی کشتی بناتا رہوں گا
دھندلکوں کی سرحد سے کچھ دور ہٹ کر
اجالوں کی مرلی بجاتا رہوں گا
حوادث کے پرہول جنگل میں ساجدؔ
امیدوں کا میلہ لگاتا رہوں گا

ساجد اشر

وقت ایک بچہ ہے
آدمی کھلونا ہے
ذہن کی حویلی پر
الجھنوں کا سایہ ہے
آرزو کے ہاتھوں میں
درد کا صحیفہ ہے
میری سرد آہوں سے
قہقہوں کا رشتہ ہے
جس کی ذات محفل تھی
اب وہی اکیلا ہے
روشنی کو دعوت دو
ہر طرف اندھیرا ہے
رنگ و نور سے خالی
زندگی کا نقشہ ہے
دل کی بزم میں ساجدؔ
غم کا دور دورہ ہے

بدنام نظم

لہو، اتنا، اشارے

مندروں کے کلس پر بھی کائیاں دھل رہی ہیں
کالی ماں کے چرن میں

سُرخ کالا لہو بہہ رہا ہے
شہر کے ہاتھ خالی پڑے ہیں
سب مُردوں میں کانٹے چبھے گندے نالوں کی کیچڑ میں لت پت پڑے ہیں

کرسیاں بند کمروں میں چھپ کر
آگ اور خون کے رنگ سے خود کو محفوظ کرنے لگی ہیں

چیخ، نعرے، لہو، وردیاں، رائفل، بوٹ، بم اور دھماکے
گولیاں، سینہ، سر، ہاتھ پاؤں، شانتی، آتما

راہ کے لال پیلے ہرے سب اشارے
اپنی آنکھوں کو میچے ہوئے ہیں

داڑھیاں، ٹوپیاں، دھوتیاں، پائجامے
میکدے، فلم، ناچ اور گانے
سب کی پہچان ہے
سب میں تفریق ہے
کس کو جینے کا حق ہے؟
موت کے گھاٹ کس کو اتاریں؟
آگ کے درمیاں شعلوں کے بیچ بھی
برف کی سل پگھلتی نہیں ہے
کالی سڑکوں کے بیچ
گرم شعلوں کے بیچ
سرد لاشوں کے بیچ

سُرخ رانوں کے نیچے
نرم بستر لئے
جنس کی آنکھ میں دھول ———

مسجدوں کے منارے زمیں میں دھنسے جارہے ہیں

سُرخ کالا لہو بہہ رہا ہے
لاشیں گلیوں میں سڑنے لگی ہیں
پھر بھی ہابیل و قابیل دونوں میں کوئی بھی مرتا نہیں ہے
دونوں میں کوئی بھی تھکتا نہیں ہے

قطرہ قطرہ لہو
دریا دریا لہو
شہر گاؤں لہو
صحرا صحرا لہو
راہ کے لال پیلے ہرے سب اشارے
اپنی آنکھوں کو میچے ہوئے ہیں

مصوّر سبزواری

کچے معاشقوں کی ہے ہر لہر میرے ساتھ
چلتی ہے ریگ خوں سی کوئی نہر میرے ساتھ

ٹکرا کے اک ستارے سے میں پاش پاش ہوں
تجھ سے ملن کی شب میں ہے کیا قہر میرے ساتھ

بھیگی رُتوں کے ہاتھ سے کیوں چھو لیا مجھے؟
پھیلے گا تیرے جسم میں آبِ زہر میرے ساتھ

شاید عظیم نفرتوں کا اُترے یونہی زنگ
دریاؤں میں بہا دو یہ سب شہر میرے ساتھ

سنسان جنگلوں سے پلٹنا بھی تھا عذاب
اب اک ہوا کا کرب ہے ہر پہر میرے ساتھ

اک قطرۂ عتاب مصوّر تھا میں یہاں
اترا تو سارا ڈوب گیا دہر میرے ساتھ

■■

اِدھر اُدھر سے اکیلے بدن پہ وار ہوا
گناہ میں نے کیا تھا وہ سنگسار ہوا

پڑوسیو بڑھو کلہاڑے اور تبر لے کر
ہمارا سینچا ہوا پیڑ سایہ دار ہوا

گلی گلی کوئی پرچھائیوں کا قاتل تھا
جو سایہ گھر سے چلا قتل بار بار ہوا

بتا رہا تھا جو مجھ کو 'جہاز کا پنچھی'
اسی جہاز میں وہ شخص بھی سوار ہوا

سبھی نے کھینچا پھر اک دن حصارِ تنہائی
ہر اک کو اپنی نبوّت کا اعتبار ہوا

اب اور ڈھونڈ لو کوئی کنواں سرابوں میں
بساطِ ریگ سے وہ نقش تو فرار ہوا

پکارتا ہے بھرا شہر دن ڈھلے مجھ کو
میں ایک لمحہ تھا ٹوٹا تو بے کنار ہوا

کسی میں ظرف نہ نکلا بہ قدرِ موسم بھی
شراب پی تھی ہوا نے تجھے خمار ہوا

فضا میں زخمی پرندے کی سی کراہٹ ہے
یہ کس دعا کا مصوّر مآلِ کار ہوا

■■

غزلیں

شیخ رسول احمد

لاشوں کے ڈھیر پہ سے جو اُس کا گذر ہوا
دامن ہوا کا خون سے یوں تر بتر ہوا

برسوں وفا کے نام پہ ہم سے بحث رہی
شعلے جواب دے گئے یہ کس کا گھر ہوا

لُوٹے جلے مکان میں پھر لوٹ آ گئے
اپنوں کے جور و ظلم سے کس کو مفر ہوا

ملبے تلے دبی ہوئی چیخوں نے کہہ دیا
ایسا کوئی نہ تھا کہ جو سینہ سپر ہوا

در در بھٹک رہی تھی ہوا کس سے پوچھتی
اس شہر کے مکینوں پہ کیسا اثر ہوا

ڈوبے ہوئے کناروں کی تقدیر دیکھئے
پانی پہ تیرتی ہوئی تحریر دیکھئے

شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے پتّے گرا کئے
موسم کا ساتھ دینے کی تدبیر دیکھئے

میں اجنبی سا پھرتا ہوں لوگوں کے درمیاں
خوابِ تعلقات کی تعبیر دیکھئے

ہر شے لرز لرز گئی سائے کے روپ میں
گھر میں دیا جلانے کی تقصیر دیکھئے

عکسِ خیال سونے مکاں میں بکھر گیا
دیوار و در کی اور ہی تصویر دیکھئے

صلاح الدین پرویز

جانے اُن آنکھوں میں کیسی شام تھی

میری خوشیاں، میری جھولی، میرے ارماں
دھول ہیں
چاندنی کے دیس میں ہمراز میرا زہر ہے
جس کے ہاتھوں میں گلابی رنگ ہو
پکڑ لو اُسے
جس کی جھیلوں میں شفق کی تازگی ہو
اس کی آنکھیں چھین لو
میری خوشیاں، میری جھولی، میرے ارماں
دھول ہیں

جاؤ اب میرا ترنم
ریت کے اندھکار پر تم ڈال دو
ساری نظمیں، ساری غزلیں
داستانیں
اَن گنت پیاری کتابیں
پھاڑ دو
(کیونکہ میں نے پارک کے بینچ پہ اک دن لکھ دیا)
جانے اُن آنکھوں میں کیسی شام تھی، اے زندگی!
سادہ کاپی پر کئی شکلیں بنا کر سو گئی
میرے کمرے سے ہوا
مجھ کو اُڑا کر لے گئی
گھر کے آنگن سے تری باتوں کی مہندی اُڑ گئی
جانے اُن آنکھوں میں کیسی شام تھی

ظہیر غازی پوری

غزل

یوں رشتۂ حیات حریفانہ سا لگا
اپنا وجود خود مجھے بیگانہ سا لگا

حیرت سے دیکھتا رہا میں اپنے آپ کو
ہر ہوشمند جب مجھے دیوانہ سا لگا

میری سمجھ میں آ گیا دونوں کا جب مآل
جلتا ہوا چراغ بھی پروانہ سا لگا

ڈوبے ہوئے تھے میرے لہو میں تمام لفظ
جذبے کا کرب آپ کو افسانہ سا لگا

کہتے ہیں لوگ خود کو میں پہچانتا نہیں
میرا لباسِ شوق فقیرانہ سا لگا

پردا ہٹا تو میں نے یہ سمجھا وہ آ گئے
کمرہ، پھر اُس کے بعد ہی ویرانہ سا لگا

ہیرے دلوں کے مول بکتے ہیں پتھر بھی اب ظہیر
مجھ کو یہ دور، دورِ بیمانہ سا لگا

فاضل انصاری

لالے کا دا[illegible] گل کا گریباں سمیٹ لائے
ویرانے سار[illegible] گلستاں سمیٹ لائے

یہ دیکھ کر کہ اس کا کوئی قدر داں نہیں
دامن میں اپنے ہم غمِ انساں سمیٹ لائے

طوفاں وہ کیا کرے جو کشتی کو منتشر
کشتی وہ کیا۔ جو بڑھ کے نہ طوفاں سمیٹ لائے

دیکھی شعورِ غم کی بگڑتی ہوئی جو بات
ہونٹوں پہ ہم تبسمِ عریاں سمیٹ لائے

اٹھی جو موجِ مے تو کئے غرق رنج و غم
ساغر بڑھے، تو گردشِ دوراں سمیٹ لائے

بکھرا ہمارا خون ہے زنداں میں جا بجا
ہم وہ نہیں ؟ جو سلسلۂ جاں سمیٹ لائے

دامن پہ اشک دیکھ کے ہم اصطرار میں شاد
جیسے کہیں سے گوہرِ غلطاں سمیٹ لائے

واعظ! نگاہِ کم سے مرے جام کو نہ دیکھ
اک لمحہ اس کے دور کا صدیاں سمیٹ لائے

فاضل یہ شعر جن پہ تجھے ناز ہے بہت
ایسے تو میری فکر پریشاں سمیٹ لائے

حنیف کیفی بریلوی

تہذیب نو کی ہے یہ کرامات بے مثال
انساں کا کمال ہے انساں کا زوال

ہوتی ہے گم نمودِ سحر میں شبِ وصال
دوری کا پیش خیمہ ہے لمحوں کا اتصال

چلتا رہا اکیلا ہی میں اپنی راہ پر
ہمراہ کیا، ملا نہ مجھے کوئی ہم خیال!

کیوں جانے انکی خاطرِ نازک پہ ہو گراں
نازک سا میری چشمِ محبت کا اک سوال!

لب مسکرا اٹھے خلشِ خار پر کبھی
چہرے پہ لمسِ گل سے کبھی آ گیا ملال

کج مہریوں کا عکس گوارا نہیں ہوا
نازک ہے کس قدر میرا آئینۂ خیال!

کیوں نقشِ پا بنا کے جدا کر دیا مجھے
صدیوں سے ہو رہا ہوں میں راہوں میں پائمال

دے کر زباں ہونٹوں پہ تالے لگا دئے
کیا کام آئے آپ میری آزادیٔ خیال

چھا جاؤں گا فضاؤں پہ بن کر غبارِ راہ
مضمر ہے میرے عجز میں کیفی مرا کمال

فیروز

دیکھ کے حسن کو کبھی دل بھی نہ دھڑکا اپنا
یاد کیوں آتا ہو دفعتہً کے وہ چہرا ہم کو

ہر طرف سے جو یہ دل ٹوٹا تو دھیان آتا ہے
ہائے اس شخص نے کس درجہ تھا چاہا ہم کو

سارا دن دھوپ میں جلنے میں تو اب شام ڈھلے
کیوں بلاتا ہے ہر اک پیڑ گھنیرا ہم کو

اس کی چاہت کو سہارا کہو جینے کا
راس آتا نہیں کوئی بھی سہارا ہم کو

ہر نفس ہم نے صداؤں میں گزارا فیروز
ہر گھڑی کا پاس بلاتا رہا دریا ہم کو

اظہر افسر

ناکام آرزو

جمیل
ثروت
کلارنیٹ
زُلفن

قدیم طرز کا ایک دالان، عقب میں دریچے ہیں جن سے پھولوں سے لدی بیلیں نظر آ رہی ہیں۔

درمیان میں تخت بچھا ہے جس پر اُجلا فرش ہے، تخت پر ایک نوجوان (جمیل) ململ کا سفید کرتا اور سفید پاجامہ پہنے بیٹھے کے بل لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا ہے، کچھ کتابیں سامنے ہیں، بائیں جانب سے شوخ سوٹ پہنے چہرہ کدار ٹائی لگائے ہے پائپ میں سگریٹ کے (جو جلا ہوا نہیں ہے) کش لیتا ہوا ایک کلارنیٹ داخل ہوتا ہے۔

کلارنیٹ :۔ ہلو نوجوان

جمیل :۔ اوہ ہلو (ہنستا ہوا اُٹھ بیٹھتا ہے)

کلارنیٹ :۔ پڑھائی چل رہی ہے،

جمیل :۔ جی ہاں اسٹڈی کر رہا ہوں، کچھ ہی دن رہ گئے ہیں امتحان کو

کلارنیٹ :۔ پڑھو بھی پڑھو میں تمہیں ڈسٹرب کرنے نہیں آیا۔

جمیل :۔ تشریف رکھئے نا،

(کلارنیٹ پاس ہی بیٹھ جاتا ہے پھر جیب سے سگار لائٹر نکالتا ہے اور سلگانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ جلتا نہیں)

جمیل :۔ بغیر سگریٹ جلائے ہی آپ کش لے رہے تھے

کلارنیٹ :۔ ویسے بھی لطف آتا ہے ـــ ماچس ہو گی؟

جمیل :۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک کتاب کے نیچے سے ماچس نکال کر دیتا ہے) لیجئے۔

کلارنیٹ :۔ مکان کیسا ہے؟

جمیل :۔ بہت عمدہ ہے، ثروت بانو کی عنایتوں میں یہ ایک نیا اضافہ ہو

(کلارنیٹ ماچس سے پہلے سگار لائٹر سلگاتا ہے اور پھر لائٹر سے پائپ میں لگا ہوا سگریٹ)

کلارنیٹ :۔ ماچس رہنے دو، شاید پھر بجھ جائے اور جلانا پڑے، لو سگریٹ پیو،

جمیل :۔ جی نہیں ـــ

کلارنیٹ :۔ (ڈبیا جمیل کی طرف بڑھاتا ہے) ارے پیو میاں باہر کی سگریٹیں ہیں، دو کش لگا کر تو دیکھو۔

جمیل :۔ لائیے، (کلارنیٹ سگریٹ دیتا ہے، دیا سلائی سے اپنا سگار لائٹر جلاتا ہے پھر سگار لائٹر جمیل کی طرف بڑھاتا ہے۔)

جمیل :۔ (سگریٹ کا ایک کش لے کر) شکریہ، (پھر کتاب دیکھنے

دیکھتا ہے)

کلارنیٹ۔ (سگار لائٹر بند کر کے جیب میں رکھ لیتا ہے) ابھی ہم تمھیں شاید ڈسٹرب کر رہے ہیں؟

جمیل۔ جی نہیں، جی نہیں بالکل نہیں (کلارنیٹ کی طرف دیکھتا ہے)

کلارنیٹ۔ اس ویرانے کو بھی تم نے گلستان بنا دیا۔۔۔

جمیل۔ یہ سب ثروت بانو کی مہربانیاں ہیں، آپ تو ان کے مشفق، سرپرست، سکریٹری سبھی کچھ ہیں، آپ سے کونسی بات چھپی ہے؟

کلارنیٹ۔ (ہنستا ہے) بہت سی باتیں چھپی ہیں۔۔۔ تمھارے ماں باپ یا رشتہ دار کوئی نہیں؟

جمیل۔ کوئی نہیں،

کلارنیٹ۔ کوئی آس پاس یا قریب کا؟

جمیل۔ (لمبا سانس لیتا ہے) نہ دور نہ قریب کا کوئی نہیں (ایک کتاب دیکھنے لگتا ہے)

کلارنیٹ۔ بانو سے کیسے ملنا ہوا۔ ابھی دیکھو ہم تمھیں ڈسٹرب کرنے نہیں لگے۔

جی نہیں جی نہیں بالکل نہیں، (کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دیتا ہے)

کلارنیٹ۔ ثروت بانو سے کیسے ملنا ہوا۔

جمیل۔ دو مہینے پہلے میں بے یار و مددگار بھوک سے نڈھال درگاہ شریف میں ایک کونے میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک خاتون سیاہ برقعہ پہنے درگاہ میں آئیں ان کے ساتھ فقیروں کا انبوہ ہو گیا، میں نے نماز کے بعد دعا کی کہ اے دونوں جہان کے مالک مجھے بھی کوئی اپنا مہربان دلا دے جو میرا سہارا بن جائے، میں دعا ختم کر کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور فقیروں اور اس برقعہ پوش خاتون کو دیکھنے لگا، اچانک وہ مسٹنڈے فقیر آپس میں لڑنے لگے،

(کلارنیٹ ایک بار پھر دیا سلائی سے لائٹر اور لائٹر سے اپنا سگریٹ جلاتا ہے۔)

جمیل۔ جب وہ برقعہ پوش خاتون پر گرنے لگے تو مجھے بہت غصہ آیا میں فقیروں پر پل پڑا، انھیں الگ کیا اور خاتون کے لئے میں نے واپس جانے کا راستہ بنا دیا خاتون نے مجھے شکریہ کی نظروں سے دیکھا ایک لمحے میں سو بار خیال آیا کہ میں خاتون سے کچھ مانگ لوں اور روز روز کی بھوک مٹا لوں، وہ آگے آگے چلی جا رہی تھی اور میں پیچھے پیچھے، آخر میں نے دل کڑا کر کے کہا، محترمہ سنئے۔۔۔۔ خاتون نے گھوم کر مجھے دیکھا، میں نے کہا محترمہ میں پڑھنا چاہتا ہوں، بس اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے بھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا ایک نظر غور سے مجھے دیکھا، اپنے ساتھ آنے والی ماما سے کچھ کہا، ماما نے مجھ سے کہا تم گگن پور الیاس سیٹھ کی کوٹھی پر آ جاؤ، میں اتنا ہی سن سکا تھا کہ چکرا کر گر پڑا،

(کلارنیٹ پورے بیان کے دوران مناسب طریقے پر ہوں ہاں کئے جاتا ہے)

جمیل۔ مجھے ہوش آیا تو وہاں کوئی نہ تھا سب جا چکے تھے، اٹھ کر میں نے درگاہ کے حوض سے خوب بہت سا پانی پیا گگن پور چل پڑا، گگن پور پہنچ کر پتہ چلا کہ یہ خاتون ثروت بانو ہیں۔

کلارنیٹ۔ ہوں اس سے آگے تو میں جانتا ہوں یہاں سب سے پہلے تمھاری ملاقات مجھ سے ہوئی تھی۔

جمیل۔ (لمبا سانس لیتا ہے) اس دن کے بعد سے کھانا پینا ہی کیا رہنے سہنے، لباس، میری ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ضرورت بانو پوری کر رہی ہیں،

کلارنیٹ۔ ہوں۔

جمیل۔ اس عرصے میں میں نے کئی بار ان سے مل کر کچھ کہنے یا شکریہ کے الفاظ زبان پر لانے کی جب بھی کوشش کی ہے وہ مجھے فوراً منع کر دیتی ہیں اور کہتی ہیں۔

کلارنیٹ۔ کیا کہتی ہیں؟

جمیل۔ کہتی ہیں ابھی تم اس مقام پر نہیں پہونچ سکے ہو جہاں میں تمھیں پہنچانا چاہتی ہوں، یہ سب تو کچھ بھی نہیں ہے، شکریہ کی ابھی کوئی ضرورت نہیں،

کلارنیٹ۔ جی ہوں۔

جمیل۔ بار بار سوچتا ہوں اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں اس عظیم
محسن کا شکریہ جس کی مثال شاید ہی ملے کس طرح ادا کر سکونگا۔

کلارنیٹ۔ وہ خود بے حد ستم رسیدہ ہے اور ستم رسیدوں کے دل سے
بخوبی واقف، اتنی وسیع جائداد، مکانات، حویلیوں اور یہاں
سے وہاں تک پھیلی ہوئی زراعت کے باوجود وہ نہ تو اپنی ماں
کا پیار پا سکی نہ باپ کا، اور نہ ہی سوتیلے چچا کا، ہر دور میں
ہر ایک نے اس پر ایسے ایسے ستم کئے کہ خود اس کا ننھا سا دل
جانتا ہے، مگر جس جس نے ستایا ہے اُسے، آج اُن میں سے
کوئی بھی اس جہان میں باقی نہیں رہا، پہلے سب تھے روپیہ
میسر نہ تھا، اب اس قدر دولت و جائداد موجود ہے مگر اُنکا
اپنا کوئی نہیں، ـــــ اب تو شاید کبھی کبھی دل میں بھی
درد ہونے لگا ہے۔

جمیل۔ شادی بیاہ کیوں نہ کر لیا انہوں نے عمر بھی بیس بائیس سال سے
زیادہ نہیں معلوم ہوتی،

کلارنیٹ۔ میں نے خود کئی بار اس طرف توجہ دلائی مگر......

جمیل۔ کیا کہتی ہیں،

کلارنیٹ۔ کہتی ہیں ابھی وقت آیا ہے، آئے گا تو میں خود کہہ دونگی ـــ

جمیل۔ (ہنستا ہے) خوب، (پھر رک کر) آپ کے کتنے بچے ہیں کلارنیٹ
صاحب؟

کلارنیٹ۔ صرف بارہ

جمیل۔ بارہ! بہت کم ہیں، کب شادی کی تھی آپ نے ـــ؟

کلارنیٹ۔ آج تک شادی نہیں کی۔

جمیل۔ پھر؟

کلارنیٹ۔ (لمبا سانس لیتا ہے) جس سے شادی کرنا چاہتا تھا اُس نے
کسی اور سے شادی کر لی،

جمیل۔ اور بارہ بچے، ـــ؟

کلارنیٹ۔ اُسی کے بارہ بچے ہیں،

جمیل۔ بہت کم ہیں،

کلارنیٹ۔ ہاں کم ہی سمجھو۔

جمیل۔ یہ تو بڑے دُکھ کی بات ہے،

کلارنیٹ۔ دُکھ کیسا، جس کے لئے زندگی وقف کر دی، کر دی۔ کبھی
کلارنیٹ سُنا ہے اس میں دُکھ کے سُر زیادہ خوشی سے کم
ہوتے ہیں ـــ خیر کوئی اور بات کرو۔ لو سگریٹ پیو،

جمیل۔ نہیں بس اب نہیں، آپ پیجئے۔

کلارنیٹ۔ میں تو پیوں گا ہی، (ڈبیا سے سگریٹ نکالتا اور اسی طرح
پہلے سنا۔ لائٹر کو ماچس سے جلاتا اور پھر سگریٹ سلگاتا ہے)

کلارنیٹ۔ (تین، چار لمبے لمبے کش لینے کے بعد)۔ جمیل میاں۔

جمیل۔ جی۔

کلارنیٹ۔ بخدا میں تمھیں ڈسٹرب نہیں کر رہا ہوں۔

جمیل۔ جی نہیں نہیں بالکل نہیں،

کلارنیٹ۔ جس بات کے لئے میں آیا تھا وہ تو رہ گئی ـــ

جمیل۔ کیسی بات،

کلارنیٹ۔ مجھے ایک ہزار روپوں کی ضرورت ہے،

جمیل۔ ایک ہزار روپے کی،

کلارنیٹ۔ ہاں۔
جمیل۔ کا ہے کے لئے نہ بیوی ہے نہ بچے

کلارنیٹ۔ تم سے کیا چھپانا، اپنی محبوبہ کے لئے چاہئیں روپے، بارہ برس
بعد وہ مجھ سے ملی،

جمیل۔ اچھا۔ ملی۔ کچھ تبدیلی ہوئی ہے؟

کلارنیٹ۔ تبدیلی کیا، ایک دبلی پتلی لڑکی شکل شکل میں بدل چکی ہے مگر
سچ جانو میرے لئے وہ اب بھی وہی دبلی پتلی کامنی سی اندرینہ
ہے۔ کلارنیٹ نام اُسی کا دیا ہوا ہے ویسے میرا نام کلیم اللہ
ہے بارہ برس کے بعد کل وہ مجھ سے ملی کہنے لگی میں نے تم سے
آج تک کسی چیز کے نہیں کہا، میں اپنے گھر بار سے بہت پریشان
ہوں میرے شوہر کو کاروبار کے لئے صرف ایک ہزار روپیے کی
ضرورت ہے کیا تم۔۔ (رک جاتا ہے)

جمیل۔ کیا تم؟

کلارنیٹ۔ بس وہ اتنا ہی کہہ سکی اور میں نے کہا خدا کی قسم زندہ میں

اپنے آپ کو بیچ کر بھی تمھارے لئے ایک ہزار روپوں کا انتظام
کر دوں گا، پرسوں تمھیں روپیہ مل جائے گا۔

جمیل۔ اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتا ہوں۔

کلارنیٹ۔ ثروت بانو سے کہہ کر مجھے ایک ہزار روپے دلوا دیجئے،

جمیل۔ آپ خود کیوں نہیں کہتے،

کلارنیٹ۔ پہلے ہی میری طرف اتنے روپے ہیں کہ اور مانگتے شرم آتی
ہے، اسی لئے میں تمھیں زحمت دے رہا ہوں،

جمیل۔ خیر میں لے دوں گا ——

کلارنیٹ۔ کب؟

جمیل۔ پہلی ملاقات میں، بس

کلارنیٹ۔ (دریچے سے باہر دیکھتا ہے) اوہ ثروت بانو آ رہی ہیں۔

جمیل۔ ثروت بانو؟

کلارنیٹ۔ ہاں، آج اس طرف کہاں،

جمیل۔ خدا تمھارے لئے روپوں کا بندوبست کر رہا ہے،

کلارنیٹ۔ میں ایک طرف ہو جاتا ہوں، بتانا نہیں کہ میں آیا تھا،

جمیل۔ نہیں،

(کلارنیٹ ادھر ادھر دیکھتا ہوا دائیں جانب چلا جاتا ہے)
بائیں جانب سے ثروت سفید بلاؤز اور سفید ساری میں ملبوس
جو دُبلی پتلی گورے رنگ کی ایک نہایت سنجیدہ لڑکی ہے،
داخل ہوتی ہے،
جمیل اُٹھ کر سلام کرتا ہے ثروت صرف مسکراتی ہے ——)

ثروت۔ کہئے جناب کیا حال ہے،

جمیل۔ سب عنایت ہے آپ کی،

ثروت۔ (کتابوں کی طرف دیکھ کر) اسٹڈی بڑے زوروں میں ہو رہی ہے
جی ہاں ——

(دریچے کے قریب جا کر باہر دیکھتی ہے) واقعی تم نے اس اُجڑے
مکان کو کیا سے کیا بنا دیا ہے، جتنی تعریف سُنی تھی اس سے
کہیں بڑھ چڑھ کر پایا، کس قدر ویرانہ تھا دیکھنے سے ڈر لگتا
تھا اور آج وہی ویرانہ پھولوں سے مہکتے گلشن میں تبدیل ہو چکا ہے۔

جمیل۔ میری ویران زندگی کی سرزمین بھی تو آپ ہی کی بدولت ایک
شاداب گلستاں میں بدل گئی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا....

ثروت۔ کیا سمجھ میں نہیں آتا،

جمیل۔ یہی کہ میں کب اور کس طرح آپ کی ان بے پایاں عنایتوں کے
بارے میں سر اٹھا کر صرف شکریہ ادا کر سکوں گا،

ثروت۔ کوئی دوسری بات کرو —— (دریچے سے ہٹ آتی ہے) ہاں
تمھارے امتحان کب ختم ہوں گے۔

جمیل۔ اگلے مہینے کے تیسرے ہفتے میں شروع ہوں گے اور دس دن
میں ختم ہو جائیں گے،

ثروت۔ پھر ——؟

جمیل۔ آپ بتلایئے پھر۔

ثروت۔ خیر پہلے تم اپنے امتحانوں کو ختم ہو جانے دو،

جمیل۔ یہ کاغذ کیسا ہے آپ کے ہاتھ میں؟

ثروت۔ او —— یہ۔ ایسے ہی جرأت کی ایک غزل بڑی پسند آئی تو
اس کاغذ پر لکھ لی،

جمیل۔ میں دیکھنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔

ثروت۔ جرأت کی غزل کے لئے جرأت، خوب، لو —— کاغذ جمیل کی طرف
بڑھاتی ہے)

جمیل۔ (کاغذ لے کر پڑھتا ہے) دل میں کیا کیا آئے ہو بات اور کیا کیا جائے ہے
کان میں آواز اسکی سی جو کچھ آ جائے ہے
(پھر ترنم سے پڑھتا ہے) بزم میں آنکھوں تلے پھر جائے ہے جب اسکی شکل
آنکھ بھر کر پھر کسی سے کس کو دیکھا جائے ہے
دیکھ کر تصویر اُس کی ہو گیا تصویر میں
اب نہ دست و پا ہلتے ہیں نہ بولا جائے ہے

ثروت۔ خوب بہت خوب،

جمیل۔ تسلیمات بجا لاتا ہوں،

ثروت۔ برسات کا موسم ہے کل ہم لوگ دریا کے کنارے جا رہے ہیں۔
اپنی امرائیاں ہیں وہاں،

جمیل۔ ہم لوگ؟ —— اس سے آپ کا مطلب؟ ——

ثروت۔ (مسکراتی ہے) یہی، میں اجو ہی، کلارینٹ صاحب اور دو چار
نوکر، کلارینٹ صاحب نے آموں کے پیڑوں پر جھولے بھی ڈلوا
دئے ہیں، دوپہر کا کھانا ہم لوگ وہیں کھائیں گے۔
جمیل۔ ہم لوگ ــ
ثروت۔ (مسکراتی ہے) ہم لوگ ــــ سے مطلب ہے، میں جو ہی کلارینٹ
صاحب اور جو لوگ ساتھ چل رہے ہیں، کیا تم بھی آسکو گے،
ہاں اگر اسٹڈی میں خلل نہ ہوتا ہو۔
جمیل۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ اتنے اچھے موسم میں آپ لوگوں کے
ساتھ کچھ وقت دریا کے کنارے کٹ جائے۔
ثروت۔ ہاں ان کتابوں سے کہہ دو کل چھٹی ہے،
جمیل۔ جی
ثروت۔ تو پھر کل کلارینٹ صاحب گاڑی لائیں گے اور تمھیں دریا پر
لے آئیں گے۔
جمیل۔ کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا، یہی وہ موسم ہے جس
میں نہ صرف سارا جہان نکھرا ستھرا اور تر و تازہ ہو جاتا ہے
بلکہ ہر مردہ دل ایک بار پھر سے جی اٹھتا ہے ۔ ـــ
ثروت۔ بعض دل ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر موسموں کا کوئی اثر نہیں
ہوتا، بہاریں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں وہ شاید خزاں کے لئے
پیدا ہوتے ہیں اور خزاں ہی میں ختم ہو جاتے ہیں۔
جمیل۔ خیر یہ کل دریا پر معلوم ہوگا ـــــ
ثروت۔ اچھا؟
جمیل۔ جی ہاں۔
ثروت۔ کل گیارہ بجے کلارینٹ صاحب لینے آئیں گے، اب میں چلتی ہوں۔
جمیل۔ ایک گزارش تھی میری،
ثروت۔ بولو۔
جمیل۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح بات شروع کروں۔
ثروت۔ ارے سیدھی طرح بولو نہ، بات کیا ہے۔
جمیل۔ مجھے پندرہ سو روپوں کی ضرورت تھی،
ثروت۔ پندرہ سو روپے [illegible]

جمیل۔ جی ہاں۔ وہ امتحانوں کے سلسلے میں ــــ مزید کچھ کتابیں
خریدنی تھیں؟ اور کسی کو دینے بھی تھے۔
ثروت۔ ضرور، کتنی عجیب بات ہے آج ہی صبح ایک ایسے آسامی سے
چار ہزار روپے وصول ہوئے ہیں جن سے کوئی امید روپوں
کے وصول ہونے کی باقی نہیں تھی، میں نے بنک میں نہیں بھجوائے
ہیں۔ کل کلارینٹ صاحب آئیں گے تو روپے بھی ساتھ
لیتے آئیں گے۔
جمیل۔ تسلیمات۔ بجا لاتا ہوں ـــــ
(ثروت جواب میں گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیتی ہے اور مسکراتی
ہوئی بائیں جانب چلی جاتی ہے۔)
دائیں جانب سے ایک موٹے موٹے ہونٹوں والی سیاہ فام
عورت (زلفن) مسکراتی ہوئی آتی ہے،
جمیل اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اُسکی طرف بڑھتا ہے،
جمیل۔ تم سونے کی چوڑیاں چاہتی تھیں نا،
زلفن۔ ہوں ہوں،
جمیل۔ وہ کل شام ان پیاری پیاری کلائیوں میں ہونگی (کلائیاں
تھام لیتا ہے)
جمیل اور زُلفن ایک دوسرے کے کمر میں ہاتھ ڈالے
بائیں جانب پیٹھ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔
جمیل۔ ارے یہ کیا ہے تمھارے ہاتھ میں
(زلفن ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہے)
زلفن۔ (دُور جا کر ہنستی ہے) نہیں بتاتے ـــــ
جمیل اس کی طرف لپکتا ہے تو وہ تخت کے آس پاس
گھومتی ہے۔ آخر دوڑ کر زلفن کو پکڑ لیتا ہے
جمیل۔ (ہاتھ سے چھین کر) املی؟
زلفن۔ کچی ـــ لاؤ میری کچی املی۔ ہاتھ سے چھین لیتی ہے اور
بھاگتی ہے جمیل ایک بار پھر اُسے پکڑ لیتا ہے اور دونوں
قہقہے لگاتے پھر اسی طرح بائیں جانب سے پیٹھ کر کے بیٹھ جاتے
ہیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ہیں اور دونوں [illegible]

ملائے ہوئے ہیں۔

ثروت۔ (اچانک بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے) جمیل میں یہ کہہ رہی تھی......

دونوں کو اس حال میں دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے، ثروت کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ لڑکھڑاتی ہے اور پھر سنبھلنے کی کوشش کرتی ہے۔ آخر چکرا کر تخت پر گر جاتی ہے۔ جمیل اور زلفن۔ ثروت کی آمد سے بالکل بے خبر ہیں۔

کلارنیٹ۔ بانو۔۔۔ بانو۔ (قریب آتا ہے) ثروت بانو! آپ کا جسم تو بالکل سرد ہے،

(کلارنیٹ، ثروت کے سر اوپر کر کے اچھی طرح لٹا دیتا ہے)

کلارنیٹ۔ ثروت بانو۔

ثروت۔ (کراہتی ہے)

کلارنیٹ۔ بانو۔

ثروت۔ (کراہتی ہوئی) کیا کہوں اے ہم نشیں اپنی تو وہ حالت ہوئی۔ جوں کسی کا قافلہ رستے میں لوٹا جائے ہے۔

جمیل اور زلفی بھی چونک کر ثروت کی طرف لپکتے ہیں۔

ثروت۔ (جمیل اور زلفن کو دیکھتی ہے اور کراہتی ہوئی دم توڑ دیتی ہے)

کلارنیٹ۔ بانو ۔۔۔ ثروت بانو ۔۔۔

جمیل۔ بانو ۔۔۔ بانو ۔۔۔

(غمگین ساز ابھرتا ہے)

(سب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

■■

قاضی عُبَیدُالرحمٰن ھاشمی

امراؤ جان ادا۔ ایک مطالعہ

امراؤ جان ادا ایک اہم ناول ہے جو ایسے دور میں لکھا گیا جب ناول کا فن ہماری زبان میں بالکل ابتدائی مراحل میں تھا۔ ناولوں پر داستانوں کا رنگ چھایا ہوا تھا جس کے ثبوت میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کے ناول پیش کیے جا سکتے ہیں۔ فی الحال ہم نذیر احمد، سرشار اور شرر کی ناول نگاری سے بحث کو مناسب نہیں سمجھتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان حضرات کی ناولوں میں ترقی یافتہ ناول کا فن مفقود ہے، بیشتر کردار تمثیلی ہو گئے ہیں اور بقول آل احمد سرور "اس دور کی ناولوں میں دو طرح کے کردار پائے جاتے ہیں، شیطان یا فرشتے" مطلب یہ کہ ان پر ابھی داستان کی مثالیت پسندی غالب ہے، خود مرزا رسوا کے دوسرے ناول "شریف زادہ" اور "ذات شریف" وغیرہ اچھے ناولوں کے نمونے نہیں کہے جا سکتے اور نہ ان میں ناول کی فنی خوبیاں اس طور پر ملتی ہیں جس طور سے "امراؤ جان ادا" میں مل جاتی ہیں۔

مرزا رسوا کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ "امراؤ جان ادا" کا موضوع (THEME) ہے جو اپنے زمانے میں خاصا اہم اور دلچسپ تھا۔ اس کے علاوہ طوائف کی ذات وہ ذات تھی جو سماج سے وابستہ تھی اسی لئے امراؤ جان ادا جو خود ایک طوائف کا کردار پیش کرتی ہے اس کی حیثیت ایک (PIVOT) یا ایک ایسے بلند بام کی ہے جس پر کھڑے ہو کر ایک شخص پوری وسیع و عریض کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ بآسانی کر سکتا ہے۔ طوائف کی شخصیت میں بے شمار جلوے ہیں۔ اس کی زندگی میں اور ایک عام عورت کی زندگی میں جو گھر کی چہار دیواری میں مقید ہو بہت بڑا فرق ہے۔ اس عام عورت کے مقابلے میں طوائف زیادہ حسین، طرحدار، مہذّب، تعلیم یافتہ اور دلکش ہے اسی لئے تو لوگ جب ایسے ماحول سے جس میں محض جنسی بھوک کی تسکین کا سامان ہے، اکتا جاتے ہیں تو اپنی دوسری خواہشات اور جمالیات کے ذوق کی تسکین کے لئے طوائف کی طرف رجوع کرتے ہیں جہاں ان کی تمام خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا رسوا کے دور میں طوائف ایک ایسا ادارہ (INSTITUTION) تھا جہاں شرفاء اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور آداب محفل کا درس حاصل کرنے کے لئے بھیجتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرزا رسوا کے دور میں طوائف کی زندگی کس قدر ہمہ جہت تھی اور وہ اپنے اندر کتنی دنیائیں رکھتی تھی۔

لیکن مرزا رسوا کے پیش نظر صرف یہی باتیں اور ایک طوائف کے کردار کے منفی و مثبت پہلوؤں ہی کو پیش کرنا نہیں تھا بلکہ اس طوائف کے واسطے سے اس پورے دور اور معاشرے کی تصویر کشی کرنی تھی جو اب اپنے حقیقی رعب و جلال، سطوت و جبروت اور عظمت و کمال سے محروم ہونے کے بعد آمادۂ زوال ہے اور چونکہ ابتدا سے اس کی سرشت میں عیش پرستی اور ہوس دنیا رچی بسی ہوئی ہے لہٰذا وہ کس طرح اس انحطاط پذیر دور میں اپنی تکمیل آرزو پر مصر ہے جس میں چھوٹے بڑے، جوان بڈھے کی قید نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنی تسکین آرزو کے لئے ایک ہی سمت

میں دوڑ رہا ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم چاہیں تو اس ناول کے وسیلے سے اس دور کی ستم ظریفی کا بھی اندازہ کرسکتے ہیں جس میں ایک جبری قانون ہے 'عورت کی خرید و فروخت جائز ہے چنانچہ ایک معصوم بچی کس طرح وقت کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنی زندگی کی از سر نو تشکیل کرتی ہے اور ایک مکمل طوائف بننا گوارہ کرلیتی ہے۔

"امراؤ جان ادا" کی تکنیک کے سلسلے میں اب تک جن نظریوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہیں۔ ایک نظریہ تو وہ ہے جو خود ناول میں امراؤ جان ادا کی زبانی ادا کئے ہوئے جملے کی وجہ سے گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ امراؤ جان ادا کہتی ہے۔

"ناظرین مرزا رسوا نے جو میری سرگزشت تحریر کی ہے وہ
غالباً آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔"

اس جملے میں سرگزشت کا لفظ گمراہی کا سبب بنا، چنانچہ عزیز احمد اس ناول کو سرگزشت یا سوانحی فن کے انداز پر لکھا ہوا ناول تصور کرتے ہیں۔ دوسرا نظریہ ڈاکٹر آدم شیخ کا ہے جو لکھتے ہیں کہ:

"اس ناول کا فارم (PICARESQUE) ہے جس میں
ایک مرکزی کردار اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو پیش کرتا
ہے، اس قسم کے ناولوں میں مرکزی کردار کو اہمیت حاصل
ہوتی ہے اور ناول میں انھیں واقعات کا بیان ہوتا ہے
جو اس مرکزی کردار کی نگاہ سے گزرتے ہیں اور اس کردار
کی ارتقا میں معاون ہوتے ہیں۔"

تیسرا نظریہ عام طور سے مختلف نقادوں نے پیش کیا ہے کہ "امراؤ جان ادا" ایک مربوط وحدانی (UNITARY) پلاٹ کا حامل ہے۔ لیکن "امراؤ جان ادا" کا نکتہ رسی سے مطالعہ ان تینوں نظریات میں کوئی نقطۂ اتحاد نہیں پاتا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ناقدین نے صرف ناول کے سطحی رخ یا خارجی نقاب ہی کو اس کا اصل حسن تصور کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ تو صرف سرگزشت ہے اور نہ محض (PICARESQUE) کیونکہ ناول میں سوانحی جھلکیاں تو ضرور ہیں لیکن اس میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں دوسرے کردار مثلاً بسم اللہ، خورشید، رام دئی وغیرہ مرکزی حیثیت حاصل کرلیتے ہیں۔ اسی طرح یہ صرف بدمعاشوں کے کرتوت کی سرگزشت بھی نہیں ہے بلکہ یہ ان انسانوں کے باطنی حزن کا المیہ ہے جو بظاہر بدکردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان برے کرداروں میں بھی جگہ جگہ معصوم و مظلوم انسان درد سے کراہتا ہوا کروٹیں لیتا نظر آتا ہے اس لیے اس ناول کو PICARESQUE کہنا گمراہ کن ہے۔

پلاٹ زمانی افتاد سے مربوط ضرور ہے لیکن یہ ربط جگہ جگہ اور قدم قدم پر ٹوٹ جاتا ہے بلکہ ہر باب کے شروع میں اور اس کے درمیان اتنا بڑا وقفہ حائل ہو جاتا ہے کہ زمانی تسلسل ربط کے بار کو اٹھانے کا سزاوار نہیں ہوتا اس لئے اسے کلاسیکی یا وحدانی پلاٹ کا حامل بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ اس کی تکنیک کے سلسلے میں ہمیں کوئی رہنمائی ملتی ہے تو وہ بھی خود مرزا رسوا کے یہاں ہی ملتی ہے۔ وہ اپنے "تنقیدی مراسلات" میں لکھتے ہیں کہ:

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شے کی صرف ایک ہی صفت کا ہمیں
احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہم کو یاد آجاتی ہیں اگرچہ
وہ بالفعل غائب ہوں، مثلاً گلاب کے پھول کی خوشبو
سے ہم کو اس کی رنگت و شکل یاد آجاتی ہے یا مثلاً ایک
قسم کے عطر کی خوشبو ہم نے پہلے کبھی سونگھی تھی اب ایک
مدت کے بعد جب ویسی ہی خوشبو ہماری ناک میں آئی تو
ہم کو فوراً یاد آجاتا ہے کہ یہ اس عطر کی خوشبو ہے۔"

یہ ارتسامات خیال (ASSIMILATION OF IDEAS) دراصل اس نفسیاتی نظریے سے استفادہ کی غمازی کرتے ہیں جو مرزا رسوا کے زمانے میں نفسیات کا واحد سرمایہ تھا۔

اس بارے میں ہمیں کوئی معلومات میسر نہیں آتیں کہ آیا مرزا رسوا نے ولیم جیمز یا ہنری جیمز سے استفادہ کیا یا نہیں لیکن مرزا رسوا کے ذہن رسا اور علم النفس میں شغف سے یہ توقع بعید

نہیں کہ انھوں نے اپنے مغربی ہمعصر سے عدم واقفیت کے باوجود
اس سے مماثل تکنیک کو "امراؤجان ادا" میں برتا۔

ہندوستان اور خود مرزا رسوا کے بقول اردو میں نفسیات
اس زمانے میں ایک غیر معروف علم تھا۔ اس کے تعارف کی اولیت
کا سہرا بھی مرزا رسوا ہی کے سر ہے اور اس تعارف کے ساتھ
ساتھ اس علم کا ادب میں انطباق بھی اردو ناول میں پہلی مرتبہ
انھیں کے ہاتھوں ہوا۔

ناول کی ابتدا ایک خصوصی مشاعرے سے ہوتی ہے
پورے ناول میں رسوا خود ایک مبصر ہیں اور امراؤ جان ادا
راوی (NARRATOR) امراؤجان ادا قصہ نہیں بیان
کرتی بلکہ اس کے ذہن سے یادوں کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور
بہت سی باتیں جو بظاہر بہت معمولی ہیں اور مختصر العمر ہیں امراؤ
جان ادا کے لیے بے حد اہم اور بے حد واضح ہیں۔ ایک یاد سے
دوسری یاد اس طرح وابستہ نکلتی ہے کہ کبھی وہ ایک کردار کو بھول
جاتی ہے، کبھی ایک واقع کو فراموش کر دیتی ہے اور کبھی محو و گم ہو
جاتی ہے، پھر کہیں کوئی یاد ابھرتی ہے اور اپنے ساتھ کئی اور یادوں
کی کہکشاں کو روشن کر کے پھر اب تصور میں گم ہو جاتی ہے۔ ایک
موقعہ پر تو ایک ایسا بھی مرحلہ آتا ہے جو مرزا رسوا کے مذکورہ بالا
اقتباس پہ حرف بہ حرف منطبق ہوتا ہے:

"اتنے میں کریمن مہری پر نظر پڑی، کریمن کے نام پر مونڈی
کاٹے کریم کا نام آگیا، دل نے کہا وہ وہ انھیں کریم کے
مکان پر دیکھا تھا"

ایک اور مقام پر ذہن چھوٹے چھوٹے ارتسامات کے شرارے
اس طرح بکھیرتا ہے جیسے یادوں کی تاریک وادی میں بہت سے
جگنو بھٹک رہے ہوں:

"آگے چل کر ایک کچی سڑک ملی، اس پر کچھ گنوار راستہ چل
رہے تھے، کسی کے کندھے پر ہل تھا، کوئی بیلوں کو ہانکتا
ہوا چلا آتا تھا، ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لیے جاتی
تھی، ایک لڑکا بہت سی بھیڑیں اور بکریوں کے پیچھے تھا،

یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب
ہو گئے، پھر میں اکیلی رہ گئی، نہ معلوم کس دھن میں تھی"

اسی طرح ایک اور مقام پر جب وہ نواب سلطان کو سنائی ہوئی
غزل کا ذکر کرتے کرتے اچانک ماضی کی سرسبز و شاداب وادیوں
میں کھو جاتی ہے۔ کہاں ایک طرف غزل کا یہ مقطع ؎

کیا غزل کوئی کہے ہے - - - - - -
آج کیوں باد صبا یاد آئی

اور کہاں ایک دم اس ذکر کا شروع ہو جانا:

"برسات کے دن ہیں، پانی جھما جھم برس رہا ہے آموں
کی فصل ہے، کمرے میں مجمع ہے، بسم اللہ جان، امیر جان،
بیگا جان، خورشید جان رنڈیوں میں، نواب چھبن صاحب نواب
چھبن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضل حسین، امجد علی،
اکبر علی خاں مردوں میں، یہ سب موجود ہیں گانا ہو رہا ہے"

گویا ایک دنیا تصور میں آباد ہو جاتی ہے اور بہت سے کردار
ایک ساتھ مسرت و انبساط کے خوشنوا ساز پہ رقص کرنے لگتے ہیں
ایک اور باب میں امراؤجان ادا اپنی پرانی رہائش گاہ خانم
کے مکان میں اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور تخیل پھر بھٹکنے لگتا
ہے:

"آئینہ سامنے لگا تھا، منھ دیکھنے لگی، شباب کی تصویر آنکھوں
میں پھر گئی، اس زمانے کے قدردانوں کا تصور بندھ گیا،
گوہر مرزا کی شرارت، راشد علی کی حماقت، فیضو کی محبت،
سلطان صاحب کی صورت، غرضکہ جو جو صاحب اس
کمرے میں آئے تھے مع اپنی اپنی خصوصیات کے میرے
پیش نظر تھے، وہ کمرا اس وقت نزہت خیال بن گیا تھا،
ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی
پھر دوسری سامنے آتی تھی، جب کل صورتیں نظر سے گزر گئیں
تو یہ دورہ از سر نو پھر شروع ہوا، پھر وہی صورتیں ایک
دوسرے کے بعد پیش آئیں پہلے تو ویسے دورے جلد جلد ہوئے
اب ذرا توقف ہونے لگا اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد تھا

کرنے کا موقع ملا' جو واقعہ جس شخص سے متعلق تھا اس پر تفصیلی نظر پڑنے لگی' پہلے جب دماغ کو جکڑ ہوا تھا تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔"

ان اقتباسات سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ناول میں امراؤ جان ادا واقعات کے ساتھ ساتھ نہیں چلتی بلکہ بار بار اپنے خارج کی دنیا سے باطن کی دنیا میں لوٹ جاتی ہے اور اس دنیا میں اسے تجربات اور تاثرات کا دریا حزن آمیز رفتار سے بہتا ہوا ملتا ہے جس میں ماضی کے تجربات کی لاتعداد لہریں ابھرتی ہیں اور پھر گم ہو جاتی ہیں۔ ان میں ہر موج الگ حیثیت رکھتی ہے لیکن امراؤ جان ادا کی ذات ارتسامی رشتہ تلاش کر لیتی ہے اور ہر موج کو ایک واضح انفرادی حیثیت دیدیتی ہے۔ جب امراؤ جان ادا اپنی یادوں کی تفصیل میں اس قدر دور نکل جاتی ہے کہ اس کا وجود حال سے لاتعلق اور ماضی میں محدود و سرشار ہوتا ہے تو مرزا رسوا ایک تحقیقی محرک بن کر پھر اسے حال کی دنیا میں واپس لے آتے ہیں اور وہ لاشعور و تحت الشعور سے نکل کر خارج کی دنیا میں "سکون؛ قناعت اور صبر کی المیہ تصویر بن جاتی ہے۔ امراؤ جان ادا کے یہ دونوں ذہنی خارجی اور داخلی پورے ناول میں دو سخت ہیں۔ ان دونوں میں مرزا رسوا ایک رشتہ ہیں۔ داخلی وجود ایک طوفان اور ہیجان کا میدان کارزار ہے جہاں مجبوری نبلے سبے؛ رنج؛ غم؛ الم؛ محرومی اور ناکامی ان معدودے چند نقش و نشانات کے الوان پر چھا جاتے ہیں جو کبھی کبھی زندگی کو پرخار وادیوں سے نکال کر شاداب وادیوں میں لے آنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حقیقت کا دست ستم ان کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور یہ چند معصوم لمحے سسک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ خارجی وجود زندگی کے منجدھار سے نکل کر ساحل پر عافیت کی راحت لیتا ہوا اپنی قسمت پر شاکر اور اپنے ماضی پر متأسف ہے۔ یہاں ایک طوفان کے گزر جانے کا احساس اور شکستہ کشتی کے تار تار بادبان کا شعور ہوتا ہے۔ زندگی اپنے گرد سے بڑی ہوئی ہے لیکن سفینے کا ...

بھی ختم نہیں ہوا ہے' امراؤ جان ادا دوسری طوائفوں کی طرح زندگی سے شکست کھا کر سماج کے پیروں میں گر نہیں پڑتی' اسے ضعیفی میں سہارے کی ضرورت ہے لیکن وہ اس لئے سہارا نہیں لیتی کہ یہ شکست کا اعلان ہے اور اس اعلان کے لئے وہ آمادہ نہیں چنانچہ اپنی انا کا وہ چراغ جسے اس نے زندگی کی طوفانی ہواؤں کے سامنے گل نہ ہونے دیا آج بھی وہ اپنی یادوں کے سہارے روشن رکھنا چاہتی ہے اور اسی روشنی میں اس کتبے کو تلاش کرنا چاہتی ہے جو اسے مدت کے بعد فراموش گاری کی نذر نہ ہونے دے' یہ کتبہ اس کی سرگزشت ہے جو مرزا رسوا کے وسیلے سے ناقابل فراموش بن جاتا ہے' اس سے ہماری مراد نہ تو یہ ہے کہ امراؤ جان ادا واقعتاً کوئی ہستی تھی اور نہ یہ کہ یہ ناول سرگزشت ہے بلکہ وہ کردار جو اس ناول میں دو سطحوں پر کام لیتا اور زندہ رہتا ہے وہ زمانی و مکانی تسلسل کے بجائے احساس و تجربے کے تسلسل میں پروان چڑھتا ہے۔ اردو ناول کے لئے یہ تکنیک اپنے دور میں اس قدر نئی ہے کہ اسے وہی ناول نگار برت سکتا ہے جو "لزوم ذہنی" کے قانون کو سمجھا کر برتنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس قانون کو مرزا رسوا نے بڑے اجمال کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اول قانون مماثلت۔ دو یا زیادہ چیزیں ایک دوسرے کے مثل جب مختلف وقتوں میں ملاحظہ ہوں گی تو ایک دوسرے کی یاد دلا دیں گی۔"

"دوم قانون مفارقت۔ دو یا زیادہ چیزیں جو ایک وقت میں ایک ہی ساتھ ملاحظہ ہوں گی اگر فی الحقیقت مماثل نہ ہوں ایک دوسرے کو یاد دلا دیں گی۔"

اس اقتباس کا اگر رو شعور (Stream of consciousness) کی تکنیک سے موازنہ کیا جائے تو ایک حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے۔ ولیم جیمز کے مطابق۔

"شعور در اصل ماضی و حال کے تمام مشاہدات' مطالعات اور تجربات کا ایک حیرت ناک مجموعہ ہے اور ہر خیال ذاتی شعور کا ایک عنصر ہے جس کا اقدار و اعتبار اس کی ماہیت قلبی کی باعث

بڑھ جاتا ہے کیونکہ انسان بیک وقت مختلف سطحوں پر اپنے تجربے جاری رکھ سکتا ہے اس لئے وہ بیک وقت ذہنی شعور کے مختلف گوشوں سے استفادہ کر سکتا ہے۔ ذہنی زندگی کی یہ ہم وقتی (SIMULTANITY) مخصوص اہمیت کی حامل ہے اس لئے چشمۂ شعور کے فن کار اپنے کرداروں کی داخلی زندگی کی بازآفرینی کرتے ہوئے خارجی عوامل سے بھی تعلق دکھانے میں کامیاب رہتے ہیں۔"

(تلخیص۔ نظام صدیقی)

رسوا کے اس ناول میں داخلی زندگی کی بازآفرینی قدم قدم پر ہوتی ہے اور خارجی عوامل سے ان مشاہدات و تجربات کا تعلق واضح ہوتا رہتا ہے، چنانچہ کوئی کردار زیادہ عرصے تک شعور کی سطح پر حاوی نہیں رہتا، بہت جلد وہ فراموش ہوتا ہے اور اس طرح تحت الشعور میں چلا جاتا ہے کہ پھر اس کی یاد کافی عرصے تک نہیں آتی گویا ہر کردار بہت ہی قلیل المدت ہوتا ہے لیکن قلیل العمر نہیں ہوتا وہ ذہن کی زیریں سطح میں زندہ رہتا ہے اور پھر ایک بار اس کی بازآفرینی ہوتی ہے، چنانچہ اس ناول میں کرداروں کی کثرت کے باوجود وہ بطور مسلسل کردار نظر نہیں آتے، صرف دو کردار ایسے ہیں جو پورے ناول میں واضح اور مستقل وجود رکھتے ہیں۔ یہ امراؤ جان ادا اور مرزا رسوا ہیں لیکن مرزا رسوا کو اس ناول کا کردار قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ناول میں عمل اور ارتقا دونوں سے محروم ہیں۔ ان کی حیثیت صرف مہیج ... (STIMULOUS) کی ہے جو امراؤ جان ادا کو موقع موقع سے تحریک دیتا رہتا ہے اور مشاہدات و تجربات کے بند دروازے پر دستک دے دیا کرتا ہے البتہ دوسرے کردار جو مختلف وقفوں کے بعد ابھرتے ہیں۔ ان میں بسم اللہ، خورشید، رام دئی، بوا حسینی، اور خانم، نواب سلطان، دلاور خاں، اکبر علی، فیضو، مرزا گوہر وغیرہ اپنے اندر کردار بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں لیکن امراؤ جان ادا کی مرکزیت انھیں انفرادی آزادی بخشنے کے بجائے اپنے شعور کی رو کا وسیلہ بنا لیتی ہے اس طرح وہ ایک ایسا محور ثابت ہوتی ہے جس کے گرد بہت سے سیارے اس تیز رفتاری سے گردش کرتے ہیں کہ کبھی کوئی سیارہ مدار میں آتا ہے تو کبھی کوئی سیارہ مدار سے نکل کر تحت الشعور کی تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے اور پھر اچانک مدار میں آ جاتا ہے، یہ گردش دراصل شعور کے تسلسل کی ایک جھلک ہے جو ہمیں اس ناول میں ابتدائی شکل میں نظر آتی ہے۔

شعور کے تسلسل کی کارفرمائیوں کو ناول کے فن میں استعمال کرنے کا یہ تجربہ چونکہ اردو میں اولیں تجربہ ہے اس کی کوئی روایت مرزا رسوا کے سامنے نہ تھی، وہ خود چونکہ بڑا خلاقانہ ذہن رکھتے تھے اور ان کی ندرت اور جدت پسندی بعض اوقات رنگ کی انتہا تک پہنچ گئی تھی جس کا اندازہ ان کی زندگی کے اکثر واقعات سے ہوتا ہے اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ رسوا نے ایک بات سوچی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی دھن میں لگ گئے اور خود ایک ذہنی اختراع کے پیش رو بنے جس کی اولیت کا سہرا ان کے سر ہے۔ پہلی کوشش ہونے کی وجہ سے اس ناول میں رو شعور کی تکنیک کی وہ پیچیدگیاں اور ترقی یافتہ جلوے نظر نہیں آتے جو ہمیں جیمز جوائس اور اردو میں قرۃ العین حیدر کے یہاں ملتے ہیں۔ جیمز جوائس پلاٹ کو اس قدر پیچیدہ کر دیتا ہے کہ اس کے رشتے کو تلاش کرنا یا سرے کو پکڑنا بہت مشکل ہو جاتا ہے یولیسس (ULYSES) کا پلاٹ بہت سے تنقید نگاروں کی نظر میں ناقابل فہم ہے لیکن ہنری جیمز کے یہاں پلاٹ اس حد تک پیچیدہ نہیں ہوتا کردار پھر بھی ابھرتے ہیں اور ان کی ایک علامتی حیثیت ہوتی ہے جیسا کہ ہم (PORTRAITOFA LADY) میں تجربہ کرتے ہیں۔ یہی نوعیت قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" اور "سیتا ہرن" میں ہے۔ موخرالذکر انداز کا ابتدائی شکل ہمیں "امراؤ جان ادا" میں نظر آتی ہے۔

یہ کردار ایک خاص طرز زندگی کے ایک خاص گوشے کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہر کردار ایک علامت بن جاتا ہے مثلاً خانم متضاد کیفیتوں کی حامل شخصیت ہے۔ وہ مکمل طور پر تاجرانہ ذہنیت رکھنے والی کاروباری عورت ہے چنانچہ اس کے مزاج میں سڑکھا پن اور رفتار و گفتار میں مکاری ہے، وہ بڑی سوجھ بوجھ رکھنے والی مردم شناس عورت ہے جو ہر اس ادا سے واقف ہے جس کے ذریعہ لوگوں

کا ابھار لگ سکے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر ایک جمود ہے اور یہی جمود اسے کوٹھے کی چہار دیواری سے باہر نہیں جانے دیتا۔

بوا حسینی وفادار اور نیک سیرت عورت ہے۔ اس کے سینے میں شفقت و محبت کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں اور وہ وفاداری کا پتلا بن کر ممتا کا چراغ جلائے خانم کے ظلمت کدے میں سیر چشمی کے ساتھ زندگی گزار دیتی ہے۔

گوہر مرزا نہ صرف ڈومنی کی اولاد ہے بلکہ بدکردار بھی ہے لیکن امراؤ جان ادا کا خلوص اسے اپنے کاندھوں پر اٹھائے رہتا ہے یہاں تک کہ پھر وہ اپنی سرشت کے بوجھ تلے دب کر کچل جاتا ہے۔

نواب سلطان خاموش طبیعت اور ٹھنڈے مزاج کا نمائندہ ہے لیکن اپنی آن کے لئے جان پر کھیل جانے میں تکلف نہیں کرتا ہے وفائی اس کے لئے اتنی بڑی خلیج بن جاتی ہے کہ وہ اس ہستی کو بھی فراموش کر دیتا ہے جس کے لئے اس نے ایک بدتہذیب پر پستول چلا دیا تھا۔

اکبر علی خاں اور نواب محمود علی دونوں لکھنؤ کے انحطاط پذیر معاشرے کے ناسور ہیں۔ ایک فرد کا گنہگار ہے اور معاشرے کا مجرم۔

خورشید جان اور رام دئی دونوں اپنے حسن کے باوجود خلوص اور قربانی کی مثال ہیں۔

نواب چھبن بندھے ٹکے اصولوں کے پابند ہیں لیکن اپنی ہتک کو برداشت نہیں کر سکتے۔

بسم اللہ کے مولوی صاحب ایک کھلونا ہیں جن سے وہ کھیلتی ہے اور ایسے ہی ایک دوسرے مولوی صاحب سے خود امراؤ جان ادا لطف لیتی ہے، یہ کردار زندگی کے سیاٹ انداز سے اس حد تک پس چکے ہیں کہ ان میں جذبہ و تاثر ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔

غرض اس طرح کرداروں کی یہ کائنات پورے ناول میں بکھری ہوئی ہے اور ہر کردار ایک خاص تاثر کو ابھار کر ناول کے ماحول میں گم ہو جاتا ہے گویا زندگی کی یہ وہ منزلیں ہیں جن پر امراؤ جان ٹھہرتی ہے اور جن سے گزر کر بھٹک جاتی ہے لیکن کہیں

وہ سکون نہیں ملتا جو اسے طمانیت بخش سکے اسی لئے ناول میں ایک ایسا گداز (PATHOS) ابھرتا ہے جو کرداروں کے جذبوں سے مضطرب موجوں کی طرح سر ٹکراتا رہتا ہے اور قاری زندگی کے کھوکھلے پن سے اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ اسے طوائفوں کی زندگی میں کوئی کشش محسوس ہونے کے بجائے ان کی ناکام مرادوں سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل باصرار کہا جا چکا ہے کہ یہ ناول ایک نئی تکنیک پر پہلا تجربہ ہے اس لیے یہ اپنے اندر اس تکنیک کے لئے ناپختگی بھی رکھتی ہے۔ ہر بڑا فن کار اپنے زمانے سے بہت آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی وقت کی بیڑیاں اس کو تیز روی اختیار کرنے نہیں دیتیں چنانچہ وہ بہت کچھ نئے انداز اختیار کرنے کے باوجود اپنے دور کی روایتوں سے مصالحت کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے ایسی ہی غیر شعوری مصالحت ہمیں "امراؤ جان ادا" میں بھی نظر آتی ہے' مثلاً مرزا رسوا ناول کے شروع میں اور ناول کے اختتامیے میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ادا واقعی ایک عورت تھی اور یہ واقعہ سچا ہے' نہ صرف یہ بلکہ علی عباس حسینی اور تمکین کاظمی کو بھی مرزا رسوا نے استفسار کرنے پر بتایا تھا کہ امراؤ جان ادا واقعی ایک طوائف تھی جس کی تصدیق تقریباً ناممکن تھی اس اصرار کی وجہ صرف یہ تھی کہ قاری اسے محض افسانہ طرازی اور دور از کار خیال آرائی نہ تصور کرے۔

امراؤ جان ادا کو شاعر ثابت کرنے میں مرزا رسوا نے اپنی امکانی کوشش کی ہے لیکن بعض غزلیں ایسی ہیں جن میں تخلص کی جگہ بآسانی رسوا کا اپنا تخلص رکھا جا سکتا ہے دوسری روایت پسندی اس شعوری کوشش میں جھلکتی ہے جو واقعاتی تسلسل کے لئے مرزا رسوا نے کی ہے لیکن تکنیک کی اپنی قوت و توانائی اس تسلسل کو حسب خواہش برقرار نہیں رہنے دیتی اور جگہ جگہ توڑ دیتی ہے چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورے ناول میں روایت اور تجربے کی ایک کشمکش ہے جس میں بالآخر بالادستی تجربے کو حاصل ہوتی ہے چنانچہ بقول وقار عظیم بیسویں صدی کے ابتدائی چند سال میں ایسے ناول لکھے گئے

(امراؤجان ادا اور خواب ہستی سے مراد) جنھوں نے ہماری ناول کو فنی حیثیت سے ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے "امراؤجان ادا" میں زندگی کے اچھے اور برے سارے پہلوؤں کا تفصیلی مشاہدہ اور مطالعہ اس طرح ملتا ہے کہ جیسے اس میں صرف ان جزئیات کا انتخاب کر لیا گیا ہو جس سے ایک خاص قسم کا تأثر پیدا کرنے میں مدد ملے۔

رسوا نے فلسفیانہ فکر، نفسیاتی تجزیہ، ادبی اور شاعرانہ ذوق اور فنی حسن ترتیب سے اس ناول میں اس طرح کام لیا ہے کہ خود ناول کا فن گہرائی، لطافت، نزاکت و ہمہ گیری کی بلندیوں تک پہنچ گیا ہے اور تأثر گویا اس فن کی اہم قدر بن گئی ہے چنانچہ انسان کے ماحول سے ہمیشہ اس کے ماضی کا سراغ ملتا ہے اور ایک معمولی اشارے سے وضاحتوں اور صراحتوں کی ہزار ہا کرنیں پھوٹتی اور انسان کے مشاہدے، تخیّل، تصوّر، جذبے اور احساس کی تاریک راہوں کو منوّر کرتی ہیں۔

آخر میں "امراؤجان ادا" کے سلسلے میں اس امر کی طرف اشارہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اردو کے بیشتر نقادوں نے اپنی تنقیدوں میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ناول نفسیاتی اور منطقی نہج پر پہلی کوشش ہے، بعض نقادوں نے یہی بات دوسرے پیرائے میں کہی ہے۔

امراؤجان ادا کی فنی ندرت کو عام طور پر نفسیاتی اور منطقی ٹکنیک کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے لیکن نقادوں نے اس امر کی وضاحت نہیں کی ہے کہ آخر یہ ٹکنیک کون سی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر ان خلاؤں کو پر کرنے اور ان ٹوٹتی ہوئی کڑیوں میں سلسلہ تلاش لانے پر زیادہ زور دیا جو ان کے نزدیک اس ناول کی خامی قرار دی جا سکتی ہو۔ اگر توجہ اس طرف مبذول ہوتی کہ یہ ناول ارتقاءات ذہنی یا ادبی تجربے کی حیثیت سے تصنیف کی گئی ہو تو شاید اس میں شعور کی رو کی ٹکنیک کا ابتدائی عکس دیکھ سکتے جو اس ناول کی ندرت، تازگی اور زندگی کا ثبوت ہے جس کے لئے تجسّس اور نقطۂ عروج کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ ذہن کو تخیّل و تصوّر کی دنیا میں گم کر دینے اور تجربے اور تأثر کا گداز پیدا کرنے کی ہوتی ہے۔

نور شاہ

میرا اور اُس کا بُت

دفعتاً میرے من میں لیٹے ہوئے سانپ نے سر اُٹھایا، جھٹکا کر ایک بھرپور انگڑائی لے کر سرکا، سرک کر کسمسایا اور کسمسا کر زور سے میرے وجود کو ڈنک مارا۔

میں اپنے ذہن کی صلیب پر لٹکا ہوا ہوں۔

میرے اوپر بہت دور آکاش کی ننگی سطح پر کالے سیاہ بادل بکھرے ہیں اور میرے نیچے منوں مٹی کا ایک بُت ہے۔ اس بُت کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھیں کھو چکی ہیں۔ اس کا دو دھار سینہ پھٹ چکا ہے۔ اس کے ہونٹوں کے گلاب مرجھا چکے ہیں لیکن اس بُت پر ایک دائرہ سا بنا ہے، لمبا چوڑا اور بنا گول۔ میرے آنا کی بانسری اس دائرہ کو آہستہ آہستہ چھو رہی ہے۔

میں اب قبر میں اُتر چکا ہوں!

دیکھتے دیکھتے میں کتنی دور آ گیا ہوں۔ یہ قبر جو کبھی شباب سے معمور تھی اب کیسی بے رنگ، بے کیف اور بے لذت پڑی ہے۔ جانے میں کیوں اب بھی اس قبر کی خاموشیوں کو اپنی آنا کی بانسری کی لے میں چھپائے بھٹک رہا ہوں۔ جانے میں اپنے وجود کی پرچھائیں بن کر کیوں اس بُت کا تعاقب کر رہا ہوں جس کے جسم کی رعنائیوں میں کبھی شراب تھی، خوابوں کا گداز — پازیب کی جھنکار تھی۔ اور اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اب میں اس ویران قبر کا اندھیرا ہوں۔ ویران کھنڈروں کی تاریکی ہوں، یہاں چاند نہیں چمکتا، چاندنی نہیں بکھرتی اور وہ لمحہ جس میں محبوبہ کا حسن خیال ہوتا ہے۔ خیال کی حیات پر درد رعنائیاں ہوتی ہیں، سیلیوں کی بیساختہ دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ سفر اور منزل کے انجانے گیت ہوتے ہیں، ملاپ کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے کہیں بھی نہیں ہے — وہ لمحہ بے موت مر چکا ہے — !!

اُف یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے!

یہ مجھے کس نے شراب سے گنہگار کیا ہے۔ یہ کس نے اپنے سینے میں کس داغ کو جگہ دی ہے!

میری آنا کی بانسری سے ایک نغمہ پھوٹ پڑا ہے۔ اور مٹی کے اس بت میں زندگی جاگ پڑی ہے۔ یہ بت ایک شریر، ایک جسم، ایک روپ میں بدل رہا ہے۔ جانے یہ کس کا بدن ہے، کس کا شریر ہے، کس کا روپ ہے۔ یہ کس کے جسم کی چاندنی بکھر رہی ہے۔ یہ کس کے ہونٹوں کے گلاب سے کھیل رہی ہے، سینے پر اناروں جیسی دو گولائیاں اُبھر رہی ہیں۔ کلائیوں میں چوڑیوں کی مدھر کھنک گیتوں کو جنم دے رہی ہے — میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور میں پگھلی ہوئی چاندنی میں ڈبکی لگا رہا ہوں۔ دیر تک یہ عمل جاری رہتا ہے۔ ہاتھ ہاتھوں کو تھامتے ہیں۔ آنکھیں آنکھوں میں جھانکتی ہیں۔ ہونٹ ہونٹوں سے ملتے ہیں۔ سانسیں ایک دوسرے میں گم ہو جاتی ہیں اور پھیلے ہوئے جسم ایک ہو کر سمٹ جاتے ہیں — !

دفعتاً لمحاتی لذت کا احساس جاگتا ہے اور میرے من میں لیٹا ہوا سانپ سر اُٹھا کر میرے وجود کو ڈنک مارتا ہے!!

میں نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں۔ میرے سامنے کوئی

جسم نہیں، کوئی بدن نہیں، کوئی شریر نہیں بس ایک بت ہے، مٹی کا ایک بت جو بولتا ہے، دیکھتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور میرے اوپر آکاش کی ننگی سطح پر بادل بے تحاشا پھٹ چکے ہیں اور پھر رم جھم رم جھم پانی برس رہا ہے۔

میں بھیگ رہا ہوں۔

بت کیچڑ میں لت پت ہو رہا ہے۔

یہ بے حس خاموش بت نرگس کا ہے!

آج کی تنہائی کیسی تنہائی ہے کہ میں چاہتا ہوں دل سے وہ تہیں ——— اتار دوں جو ماہ و سال کے گزرے ہوئے کارواں نے گرد کی صورت جما دی ہیں تاکہ اپنے دل کی اس کروٹ کو کوئی نیا عنوان دوں، اپنی گزشتہ زندگی کے جو سسکتے لمحے میں اپنی شکست خوردہ یادوں کے ساتھ دفنا چکا ہوں شاید وہ پھر میرے سامنے سسکنے تڑپنے کے لئے آ گئے ہیں۔

یہ کیسی تنہائی ہے اور اس تنہائی کے شکستہ لمحوں میں مجھے ارشد یاد آ رہا ہے، بڑا ہی رنگین آدمی تھا۔ عمر ساٹھ سے تجاوز کر گئی تھی اور نرگس کی عمر صرف چھبیس برس کی تھی۔ نرگس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بیوی ارشد کی بن گئی اور پھر ارشد مر گیا۔

موت کا ایک دن معین ہے۔ ایک کار آئی اور ارشد کو کچل کر فراٹے بھرتی ہوئی بھاگ گئی۔ ایک اور قبر بنی، ایک اور بت بنا، ایک اور جوانی کیچڑ میں لت پت ہو گئی۔

کہتے ہیں نرگس روئی، خوب روئی۔ جوانی میں بیوہ ہو گئی نا۔ چھبیس برس کی عمر اور قید تنہائی۔ زار زار روتی رہی، آنسو اسکے رخساروں پر پھیلتے اور بکھرتے رہے!

میں نے نرگس کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔

میں نے اسے شراب سے گلنار ہوتے دیکھا ——— یہ وہ نرگس تھی جس کی موٹی موٹی نیلگوں آنکھیں ہر سمے سوچتی رہتی تھیں۔ جس کی بھیگی بکھری زلفیں ایک داستان کو چپ چپ دہراتی تھیں۔ جس کی شگفتہ کلی کی سی نوخیز صورت، محبت کی داستان کو جیتا [illegible] تھی اور جس نرگس کو اپنانے کے لئے میں نے کتنے ہی خواب بُنے پرستش کی تھی ———!

وہ نرگس کہاں تھی۔

وہ نرگس کہاں ہے ———

شاید خواب ٹوٹنے کے لئے جاگتے ہیں، داستانیں ادھوری رہنے کے لئے تکمیل پاتی ہیں۔

اے لوگو ——— ارشد کا قتل میں نے کیا ہے۔ میں قاتل ہوں!

اور پھر یوں ہوا۔ میں نے اپنی پلکیں اٹھا کر دیکھا اور ایک بار پھر نرگس سے شادی کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی تلاش میں بستی بستی گھوما پھرا ——— میں نے دیکھا وہ ہوٹل پائن میں بیٹھی پی رہی تھی، بے تحاشا پی رہی تھی، وہ اکیلی نہ تھی۔ ادھیڑ عمر کا کوئی اجنبی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ مجھے بے ساختہ اپنی جوانی، اپنی باہوں کی شکستگی سے نفرت ہو گئی ——— عورت جب رونے لگتی ہے تو بے تحاشا روتی ہے، جب پینے لگتی ہے تو بے تحاشا پیتی ہے۔ میں نے اسکی آنکھوں میں جھانکا کوئی آنسو نہ تھا، ایک عجیب سی چمک تھی، پیاس تھی، بھوک تھی ——— مجھے دیکھ کر اس کا ہاتھ تھر تھرایا!!

اور اب..... میرے نیچے جو منوں مٹی کا ایک بت ہو گیا یہ واقعی نرگس کا شریر ہے۔ میری انگلی بانسری سے جو نغمہ پھوٹ رہا ہے کیا اس کے ترنم میں واقعی نرگس کی سانسوں کا زیر و بم شامل ہے ——— لیکن یہ سب وہ نہیں جو میں سوچ رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں، یہ وہ خواب نہیں جن کی میں نے پرستش کی ہے ——— یہ بس ایک بت ہے خاموش، بے حس، بے زبان، کیچڑ میں لت پت نرگس کی پگھلی ہوئی چاندنی میں ڈبکی لگانے کے لئے مجھے ایک اور قتل کرنا پڑے گا۔ ایک اور قتل... قتل ——— قتل ——— ادھیڑ عمر کے لوگوں کا قتل؟!

پھر بھی اگر میں نرگس کو نہ پا سکا تو؟!!

میں اپنے ذہن کی صلیب پر لٹکا ہوا ہوں!!! ■

ابراہیم شیفتہ

آخری پناہ گاہ

تمام پرانی کتابوں کو دیمک چاٹ گئی تو ایک دن میں اور میرے ساتھیوں نے مل کر طے کیا کہ ان کو باہر پھینک دیں۔ لیکن وہ شخص جسکی ہم سے صدیوں کی شناسائی ہے اس کے لئے تیار نہ ہوا۔ اُس نے اپنی کتابوں کا ایک صفحہ نکال ہمیں تلقین کرنا شروع کی ۔ ہم سب اُکتا گئے ۔ سبھوں نے مل کر طے کیا کہ ان کتابوں کے ساتھ اس شخص کو بھی کہیں دور پھینک آئیں ــــ

اُسے پھینک دینے سے قبل ہم نے اس کے کپڑے اُتار لئے اور اسکی لمبی دم کو جو اس کے لئے بیکار تھی سبھوں نے مل کر بانٹ لیا۔

"کیوں نہ ہم اس شخص کا ناشتہ کرلیں!" ایک ساتھی نے تجویز پیش کی۔

ــــ اور ایک خوشگوار صبح کو ہم سب لوگوں نے مل کر اسے اپنے اپنے وجود کے اندر بعد خوشی دفنا دیا ــــ اور ــ تسکین کی آخری پناہ گاہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

میں بھی اُس کی دُم چھپائے شہروں کے جنگل میں کب سے بھٹک رہا ہوں۔ آسودگی کی کتنی منزلیں آسانی سے طے کر رہا ہوں۔ اب تو کاہ میں مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میری بھی اس شخص سے شناسائی تھی ــــ

لیکن ایک روز چوراہے پر کوئی شخص مجھے ننگا کر کے دکھائی دیا۔ اس کی برہنگی ہمارے لباس کا اعلان تھی مجھے یاد آیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کا ہم نے ناشتہ کیا تھا۔ ایک خوشگوار صبح کو اسے اپنے وجود کے اندر اسے دفنا دیا تھا۔ میں اس سے نظریں چرا کر گذر گیا۔ اس دن کے بعد جب بھی وہ شخص شہروں کے اس جنگل میں کہیں نظر آتا ہے، میں اپنی راہ بدل دیتا ہوں ــ لیکن میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں پہنچ کر اس کی طرح ننگا ہو جاتا ہوں تو اپنی برہنگی کے اعلان کو کھونٹی سے ننگا چھوڑ کر میرا جسم اس شخص کی تلاش میں شہروں کی ساری سڑکیں چھان مارتا ہے۔ سوچتا ہوں سارا شہر سمٹ کر میرا کمرہ کیوں نہیں ہو جاتا یا میرا کمرہ دیواروں کے حدود توڑ کر شہر کیوں نہیں بن جاتا۔ یہ محض دیواریں جو میرے کمرے کا اعلان ہیں۔

کبھی کبھی وہ شخص میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ میں فوراً جاگ پڑتا ہوں، اپنے آپ کو لباس کی چار دیواری میں چھپا کر دروازے کے روزن میں جھانکتا ہوں۔ وہ متواتر آواز دیتا ہے۔ لیکن میں اعلان کر دیتا ہوں کہ "میں نہیں ہوں"۔ کچھ دیر بعد جب میں پھر اس کمرے میں ننگا ہو جاتا ہوں تو میرا وجود پکار اُٹھتا ہے "میں ہوں۔ میں ہوں"۔ اپنے وجود کی اس پکار میں مجھے گھر کے باہر اس شخص کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور دروازے کے اسی روزن سے کوئی سیال در آ کر مجھے اپنی لپیٹ میں لینے لگتا ہے اور میں پناہ لینے پھر اپنے لباس میں گھس جاتا ہوں۔

راستے میں کبھی کبھی مجھے اسکی شکست و محرومی کی آواز مسجدوں، مندروں اور گرجا گھروں سے سنائی دیتی ہے، میں اور میرے ساتھی اس ہلکی آواز کی رائیگاں بازگشت کو ان ہی مسجدوں، مندروں اور گرجا گھروں کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرانے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں انھوں نے اس شخص کو مصر میں اہرام بنا دیا۔ یونان کے قید خانے میں زہر پلا دیا۔ اجنتا کی گپھاؤں میں اپنی سحرکاری

سے اُسے پتھر بنادیا۔ روم کے بازیچوں میں درندوں کو کھلا دیا، اسکے وجود میں کیلیں ٹھونک کر صلیب پر چڑھا دیا۔ مشرقِ وسطیٰ کے ریگستانوں میں اُسے سنگسار کیا۔ لنکن کے دیس میں اُسے گولی ماردی اور اسے جلاکر گنگا جل میں اسکی راکھ بہادی۔ آج تک بھی ہمارے ساتھی زندگی کے ہر میدان میں اس شخص سے برسرِپیکار ہیں۔ خلوت گاہوں سے لے کر مجموعی وجود کی ہر جلوہ گاہ تک ہم اسکی پرچھائیں کا قتل کرتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ شخص، جنون اور خود فراموشی کے ہر منفرد حصہ راستہ کا وہ مسلمہ روڑا ہے جو ہماری تسکین کی منزل کو ہم سے دور کر دیتا ہے۔ زمین کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک ہم گھروں، دفتروں، ملوں، گلی کوچوں اور بازاروں میں، رشتوں کی کھوکھلی دیواروں، کتابوں کے بوسیدہ اوراق، نئے سکّوں کی پرانی تجوریوں ڈائیننگ ٹیبلوں اور لچکدار جسموں کے ہر محاذ پر اس شخص سے نبرد آزما ہیں۔ ہم اُسے ہمیشہ کی نیند سُلا دینا چاہتے ہیں — اس پر بھی وہ شخص مر نہیں سکا تو ہم لوگوں نے اسے کتاب کے صندوق میں بند کر دیا...... شاید اب وہ کتاب کا صندوق توڑ کر زمین کی آخری حد اور سمندروں کے آخری کنارو تک پھیل گیا ہے میں جہاں بھی جاتا ہوں وہ دُم کی طرح میرے پیچھے چلا آتا ہے اور کسی نہ کسی روپ میں مجھے دکھائی دیتا ہے۔

مریضوں کو دی جانے والی دوا کے ہر قطرے میں، مسجد میں دعا کہتے ہوئے مُلّا کے لبوں پر، مُقدّس باپ کے روبرو قریب المرگ انسان کے اعتراف میں، میدانِ جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہی کو پلائے جانے والے پانی کے پہلے گھونٹ میں، ڈوبتے جہاز کے ملّاح کے پیشانی پر، ماں کی چھاتیوں سے پھوٹنے والی دودھ کی پہلی دھار میں، بلڈ بنک کی بوتلوں میں، پھانسی کے تختے کی طرف جاتے ہوئے آدمی کی آنکھوں میں، معصوم بچوں کی باتوں میں — ہر جگہ اور موڑ پر مجھے وہ شخص دکھائی دیتا ہے —

لیکن — — —

میں اُس شخص سے نہیں مل سکتا — کیا

مجھے اِن شہروں میں بہت سے کام ہیں۔

میں اور میرے ساتھی اپنے اپنے سروں پر جوک پین کے کتنے الاؤ لئے شہر شہر بھٹک رہے ہیں۔ دریا دریا گھوم رہے ہیں۔ ہم سب کو فکر ہے کہ ہمارے یہ دہکتے الاؤ سرد نہ پڑ جائیں۔ زمین کے بہت سے حصّوں پر ابھی ہمیں موت کی فصلیں اُگانی ہیں۔ اناج کے گودام خالی کرکے بارود کے خزانے بھرنے ہیں۔ کیمیا سازی کے مرحلوں میں کتنے جسموں کے شوربے تیار کرنے ہیں۔ پرانے قبرستانوں کی بچی کھچی ہڈیاں نکال کر انکی راکھ بنانی ہے تاکہ ہمارے لئے صاف شکر تیار ہوسکے۔ خواب، بیداری، بھوک، پیاس اور شہوت کو ڈھالنے والے کارخانے ابھی کچھ شہروں میں کھولنے ہیں — دفتروں، فیکٹریوں اور تجربہ گاہوں میں اپنی اپنی جگہوں پر مشینیں فٹ کرکے ہم اب خلا کی بلندیوں تک پہنچنے والی سیڑھیاں بنا رہے ہیں۔ ہمارے کچھ ساتھی تو پلاٹینم کے کیک کھانے چاند پر پہنچ چکے ہیں۔ ذہنی بموں کے چاکلیٹ تو ہم بہت پہلے بنا چکے — چاند کی پتھریلی زمین پر بھی ہمیں کوئی آسمانی فرشتہ نہیں دکھائی دیا جس سے ہم تسکین کی آخری پناہ گاہ کا پتہ پوچھ سکیں —

"چلو چلو بھاگو یہاں سے" چاند پر کھڑے ہوکر میرے ایک ساتھی نے کہا —

اُفق کے کنارے پر بھی اُسے وہ شخص ننگا کھڑا دکھائی دیا تھا جو راتوں کو میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کسی مُردہ شخص کی بھٹکی ہوئی روح کی طرح دربدر ٹھوکریں کھاتا ہے —

ایک لمحے کے لئے بھی میں اس شخص سے نہیں مل سکتا۔ مجھے اِن شہروں میں بہت سے کام ہیں۔

میں اور میرے ساتھی اپنی تسکین کی آخری پناہ گاہ کو کب سے کھوج رہے ہیں۔ مشرق سے لے کر مغرب تک ہم لوگ سڑکوں، بسوں، ٹرینوں، پارکوں، بازاروں، سینما ہالوں اور مکانوں کے نیم روشن کمروں میں نظر آنے والے منہ زور جسموں کے اندھیروں میں اُسے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد شہروں کی جھلملاتی ہوئی نیان روشنیوں میں اُسے تلاش کر رہے ہیں۔ جگمگاتے کلبوں کے کھوکھلے پن سے آراستہ کمروں میں، گھٹنے ٹیکے زمین دوز راستوں میں ہم کب سے چیخ رہے ہیں۔ اپنے اپنے جسموں کے عرق کو ہر شب قطرہ قطرہ نکال رہے ہیں۔

موسیقی کی کوئی لے، جسم کی کوئی جھیل، یا شراب کا کوئی قطرہ ہمیں اس پناہ گاہ کا راستہ نہیں بتلاتا ہے تو ہم ایک لامتناہی رقص میں کھو جاتے ہیں، اُبھرو دبیم کی اُسی نیم روشن کیفیت میں جو ہمیں کلبوں کے کمروں میں نظر آتی ہے۔ جو ساتھی ناتواں ہیں وہ روز و شب فولاد کی سوئیاں اپنے وجود میں چبھا کر تسکین کے نئے گوشے ڈھونڈھ رہے ہیں تاکہ اپنے بدن کے خنجروں کو معصوم فرشتوں کے بدن میں چبھانے کے لئے تیز کر سکیں۔

ہمارے وجود کی چار دیواری سے کتنے بھوکے سانپ نکل کر اپنی دو شاخہ زبان سے خوبصورت جسموں کے زمین دوز راستوں پر پڑے سیال کو چاٹ رہے ہیں۔ اور جب ہمیں تسکین کی یہ پناہ گاہیں بھی آخری نہیں معلوم ہوتیں تو ہم نائٹ کلب کی چار دیواری سے بغاوت کر کے اُن سڑے گلے کوچوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں روزانہ شام ڈھلے جسموں کے تنور سلگتے ہیں، جہاں راتوں کو آسودگی کے سستے بازار لگتے ہیں، جہاں ہماری پیشانیوں پر چسپاں لیبلوں کی عبارت پڑھی نہیں جا سکتی۔ جہاں جسموں کی ہر روندی کچلی کچلائی گلی ہمیں دعوت غرقابی دیتی ہے ــــ جسموں کی یہ کھوکھلی تاریکیاں اپنے اپنے گلے میں لذت فروشی کے لائسنس لٹکائے ہر شام ہماری راہ دیکھا کرتی ہیں اور ہم دفتروں، ملوں کالجوں اور عبادت گاہوں سے تھکے ماندے نکل کر بلا لائسنس ان کے ڈھیلے بدن میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمارے ساتھی ان ڈھیلے جسموں میں ڈوبنے کے لئے ہی ہر روز تھک رہے ہوں!

لیکن مجھے وہ آخری پناہ گاہ کیوں نہیں ملتی جس کے بیرونی دروازے پر وہ شخص میرے قدموں سے لپٹا نہ پڑا ہو ــــ بوسیدہ جسم پر پھٹی ہوئی دھجیاں چپکائے میرے سامنے ہاتھ پھیلائے نہ کھڑا ہو اس کی شکل کتنی ڈراونی ہے! ــــ فریاد کرتے کرتے اس کی زبان لمبی ہو کر پیٹ کی طرف جھول رہی ہے۔ راستے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے ہر بُن مو پر ان گنت آنکھیں لگی ہیں، آنکھیں۔۔ جن پر حسرت ناکامی اور مایوسی کے بورڈ ہیں۔ اور جسم کے ہر حصّے پر پیروں کے داغ نشان ہیں۔ اس کا جسم زخموں سے چھلنی ہے۔ ہر زخم پیپ اور خون کی ایک ندی ہے، اس کا چہرہ مسخ ہے۔ ہر طرف گرد و غبار کا طوفان ہو ان زخموں پر منڈلاتی مکھیوں سے میں دور بھاگنا چاہتی ہوں، گرد و غبار کے راستے سے بچ نکلنا چاہتا ہوں۔ پھر بھی وہ شخص ایک وفادار کتے کی طرح اپنی دُم ہلائے کیوں میرے پیچھے پیچھے آتا ہے؟ اپنی سڑاند کیوں میرے اطراف پھیلاتا ہے ــــ؟

میرے حصّے میں اسکی دم کا جو ٹکڑا آیا تھا وہ تو بڑھ کے کب کا ایک مجہول اژدہا بن چکا ہے۔ اپنے وجود کے اندر سے اب میں اس اژدہے کو نکال نہیں سکتا۔ اگر نکالنے کی کوشش بھی کروں گا تو وہ مجھے نگل لے گا ــــ وہ آگ بھی مجھے کسی نائٹ کلب میں نہیں ملتی جسے پی کر میں اس اژدہا کی پیاس بجھا سکوں۔

پھر یہ شخص یہاں نائٹ کلب کی سیڑھیوں پر کھڑا مجھ سے کیا مانگ رہا ہے۔ ان نائٹ کلبوں میں ہمیں سکون بانٹنے کا اعلان کرنے والے اس شخص کو اپنے زینوں سے کیوں نہیں اتار دیتے؟؟

یا پھر ــــ

اس کا شوربہ بنا کر اپنے مینو میں ایک آئیٹم کا اضافہ کیوں نہیں کرتے تاکہ نائٹ کلبوں میں اژدہام بڑھے اور ہم بھی ــــ کسی رات کو اس کا شوربہ پی کر اپنے اپنے خوابوں کو اُفق تا اُفق طول دے سکیں ــــ

رضوان احمد

آدم خور

دنیا کے اس چھور سے اس چھور تک ایک ایسا شور کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دے۔

زمین سے پرواز کرتے ہوئے ہنگامے اور فضا میں معلق آوازیں۔
میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا ـــــ
ایک بھیڑ اور سب کے چہروں پر لپا ہوا پیلا پیلا خوف۔
ذرا ذرا سی دیر پر تھوڑی ہلچل
"اندر کیا ہے؟"

میں نے یہ سوال کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھا تھا مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ کسی نے میری طرف دیکھا نہیں۔ جیسے وہ ایک لمحہ کے دور دیکھیں گے تو اس تماشہ سے محروم رہ جائیں گے جو اندر ہو رہا ہے۔

اندر کیا ہے ـــــ ؟

میں لوگوں کو دائیں بائیں چیرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔
اندر کئی بھاری بھرکم جسم والے آدمی ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ سب کے سامنے ایک طباق نما چوڑا برتن رکھا ہوا تھا۔
سب سے کنارے کھڑے ہوئے بھاری بھرکم آدمی نے اپنے ہاتھوں میں ایک پتلے دبلے آدمی کو اس طرح دبوچ رکھا تھا۔ جیسے کوئی بچہ اپنے ہاتھوں میں ربڑ کی گڑیا دبائے رہتا ہے۔

جادوگر ـــــ ؟

لیکن یہ کیسا جادو تھا جس نے لوگوں کے ذہن پر خوف مسلط کر دیا تھا۔ سب اپنی جگہ پر سہمے ہوئے تھے۔ اور جادوگر کی حریفانہ نظریں لوگوں پر تھیں۔

ہاتھوں میں دبا ہوا آدمی دھندلائی ہوئی نظروں سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں ناامیدی تڑپ رہی تھی۔ لوگ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ہاتھ میں دبے ہوئے آدمی کو قطار میں کھڑے ہوئے تو ندوالے لوگ بڑی امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اُس نے دبے ہوئے آدمی کے پیر اوپر کر دیئے اور سر نیچے۔ پر دھیرے دھیرے اس کے جسم کو اس طرح مروڑنے لگا جیسے بھیگے کپڑے کو گھما کر نچوڑا جاتا ہے۔ اس منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی پر منھ سے کچھ خون کے لوتھڑے زمین پر رکھے ہوئے برتن میں گر گئے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟
میں نے محسوس کیا دوسروں کی طرح میرے ذہن میں بھی خوف پیوست ہو گیا ہے۔

اوپر کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے اور بھاری بھرکم گدھ زور زور سے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔
آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟
غالباً سب کے سامنے یہی سوال تھا۔ لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ دوسرے سے دریافت کرے

پہلے والے آدمی نے ہاتھ میں دبے ہوئے آدمی کو دوسرے موٹے آدمی کے حوالے کر دیا۔ جو بڑی دیر سے للچائی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اب پہلے والے آدمی نے مجمع سے ایک اور پتلا دبلا آدمی اُٹھا لیا اور پھر وہی عمل دہرانے لگا۔ دوسرا والا نچوڑے ہوئے آدمی کو پوری طاقت سے اینٹھ رہا تھا۔ اس کے برتن میں بھی کچھ خون کے لوتھڑے گر گئے۔

پہلے نے دوسرے، دوسرے نے تیسرے اور تیسرے نے چوتھے کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آخری شخص نے اسکو پوری طرح سے نچوڑ لیا۔ پوری طاقت صرف کرنے کے بعد بھی جب خون کے چند ہی قطرے اس کے برتن میں ٹپکے اور بار بار کی کوشش کے بعد ایک بھی قطرے کی اُمید نہ رہی تو اُس نے دو چار گندی گالیاں بکیں۔ جھنجھلا کر اسے نچوڑے ہوئے کپڑے کی طرح جھٹکا۔ وہ مر چکا تھا۔ مردہ جسم کو اس نے ہوا میں اچھال دیا اور اوپر پرواز کرتے ہوئے گدھوں نے اپنے پر زور زور سے پھڑپھڑائے اور ایک گدھ نے اسے اپنے پنجوں میں سنبھال لیا اور تیزی سے ایک طرف اڑا۔ کئی گدھوں نے اسکا پیچھا کیا۔ وہ تیزی سے اڑا جا رہا تھا یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

عمل برابر جاری تھا۔

پہلا مجمع میں سے کسی آدمی کو اٹھا کر نچوڑتا پھر دوسرے کے حوالے کر دیتا، دوسرا اپنے حصّہ کا خون نچوڑ لیتا اور تیسرے کو دیدیتا سب سے آخری آدمی اسے نچوڑ کر ہوا میں اچھال دیتا۔ کوئی گدھ اسے اپنے پنجوں میں سنبھال کر پرواز کرتا اور بہت سے گدھ اس کا پیچھا کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھیڑ سے کئی آدمی اُٹھائے جا چکے تھے لیکن ایک بھی آدمی اپنی جگہ سے نہیں کھسک رہا تھا۔ نہ کوئی مدافعت کرتا تھا۔ بس انہوں نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھے ۔ ۔ ۔ جیسے وہ اسی لئے بنائے گئے ہوں۔

پہلے آدمی کا برتن سُرخ سیال سے لبالب ہو گیا تھا۔ اسمیں ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔ دوسروں کے برتن کچھ خالی تھے۔ لیکن آخری آدمی کا برتن اب بھی بہت خالی تھا۔ اس کے چہرے سے جھنجھلاہٹ اور ناگواری کے آثار عیاں تھے۔ اپنے برتن کی جانب دیکھنے کے بجائے دوسرے کے برتنوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دوسروں کے مقابلے میں انھیں اپنا برتن بالکل خالی خالی لگتا تھا۔ وہ اب آپس ہی میں ایک دوسرے کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا اگر ان کا بس چلے تو وہ اپنے بغل میں کھڑے ہو ۔ ۔ ۔ موٹے موٹے جسموں والے انسانوں کو نچوڑ کر اپنا برتن لبالب بھر لیں۔

آدم خور گدھ اب بھی اسی انتظار میں پرواز کر رہے تھے کہ ابھی کوئی جسم ہوا میں اُچھالا جائے گا اور وہ اسے اپنے پنجوں میں دبوچ کر اڑ جائیں گے۔ بہت سے گدھ پیڑ کی شاخوں اور کھنڈر کی دیواروں پر بیٹھے بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ کتنے گدھ ایسے ہیں جنھیں اب تک ایک بھی بوٹی نہیں ملی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ زندہ انسانوں کو پنجوں میں دبا کر اڑ جاتے اور ایک ایک ریشہ چن لیتے۔ لیکن شائد زندہ سانسیں ان کی راہ میں رخنہ انداز تھیں یا پھر وہ اس درجہ ظالم نہیں تھے کہ زندہ گوشت ہڈیوں سے الگ کر لیتے۔ غالباً انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان اجسام میں کسی دوسرے کا بھی حصّہ ہے۔ کچھ بھی ہو، انھیں کسی بات کا پاس ضرور تھا۔

سبھی لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ یقیناً سب کے پیر زمین نے پکڑ لیے تھے۔ ورنہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے جد و جہد ضرور کرتے۔ آخر وہ بھاگ بھی تو سکتے تھے۔ زمین تو بہت لمبی ہے ــــ انھیں آدم خوروں سے ڈر کیوں نہیں لگتا؟

میں خود بھی سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ ہر ایک کے سر پر موت ناچ رہی تھی۔ خوف کے باوجود، میں اپنے حواس بجا رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

اچانک پہلے والے شخص کا مضبوط پنجہ میری جانب بڑھا۔ اسنے میری گردن پکڑنا چاہی۔ لیکن میرے پیروں میں اس وقت نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی۔ وہ حرکت کرنے لگے۔ میں بھاگنے لگا۔ بے تحاشا بھاگا۔ ۔ ۔ کچھ دور تک دوڑنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے اور بھی لوگ بھاگتے چلے آ رہے تھے میرے پیروں کی پھرتی دیکھ کر شائد ان کے پیر بھی حرکت کرنے لگے تھے۔ انہیں بھی دوڑنے کی سکت پیدا ہو گئی تھی۔ یا پھر سبھی اس انتظار میں کھڑے تھے کہ کوئی پہل کرے تو سب اسکی تقلید کریں۔

ــــ مگر اب بھی وہاں بہت سے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ غالباً انہیں دوڑنے کی سکت نہ تھی یا پھر وہ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کسی جد و جہد کے قائل نہ تھے۔ اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا انھیں پسند تھا۔ جنگل ان کو نچوڑے اور ۔ ۔ ۔ ۔

میں بے تحاشا بھاگتا ہی جا رہا تھا۔ آگے اور آگے ــــ ■■

سلمیٰ شاکر

نِک نیم

"یار اس ملاوٹ اور چور بازاری کے دور میں کم از کم اولاد تو خالص پیدا کر دیا کرو" شکیل دوستوں کی بیویوں کو بدلتی ہوئی باہنوں میں کسمساتا دیکھ کر بڑے استہزائیہ انداز سے کہتا۔

"خاموش بھی رہو یار ـــ ایسی گھناؤنی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی ـــ اطراف و اکناف کا خیال کئے بغیر ضیاء نے اسے جھڑک دیا۔

"شرم!" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ـــ "ہندوستانیوں کی یہی حالت انھیں لے ڈوبے گی ـــ حرامی بچے پیدا کرینگے مگر حرامزدگی برداشت نہیں کرینگے۔"

محترم! شرافت کے پجاری اخلاق کے علمبردار ضیاء کبیر ـــ" دیکھئے نائٹ کلب نہیں آیا کرتے۔ اس سے بہتر ہوتا تم ایک گھنٹہ اپنی بیوی کے پیر داب لیتے۔" ـــ

"تم کیوں آن مرتے ہو یہاں خبیث۔" ضیا کا پارہ چڑھنے لگا۔"

"میں پروفیٹ جو نہیں ہوں۔ شرافت و ذلالت کی حدیں متعین کرتا ہوں نہ شارٹنگ کو چھپاتا ہوں۔ آوارہ عیاش اپنے پر میرا حرف مطلق گم نہیں ہوتا ـــ گھناؤنی باتیں بھی کرتا ہوں۔ گھناؤنی جگہ بھی آتا ہوں۔" ـــ

"تم پیدائشی سؤر ہو ـــ پاجی" ـــ

"یار چشمہ لگاؤ ـــ اگر بیچارہ سؤر مجھ جیسا خوبصورت ہوتا تب یہ ماڈرن پریاں شوہر کی مانند اس کے گلے میں جھکلا یہ ڈالے ساتھ ساتھ اٹھلاتی نہ پھرتیں۔" ـــ

"زندگی بھر یونہی لایعنی باتوں میں جھک مارتے رہوگے، پاگل بیوقوف، کہیں کے۔" ـــ

"ہر بڑے آدمی کو دنیا پاگل اور پاگل کو بڑا آدمی تسلیم کرتی آئی ہے۔ اس کا معیار فالتو ہے۔"

"جہنم میں جاؤ ـــ تم پکے شیطان ہو ـــ جینے نہ دوگے۔"

وہ پیر پٹختا دوسری میز پر چلا گیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک مہکتا دہکتا سایہ اُس کی پشت سے سرک آیا۔" بڑی خوبصورت باتیں کرتے ہیں آپ" ـــ نقرئی آواز کی کھنک جاگ اٹھی ـــ میز کے کناروں پر لمبی لمبی سفید پینٹ شدہ خوبصورت انگلیاں جم گئیں ـــ

"صرف باتیں" ـــ قاتلانہ انداز سے اس نے آنکھیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی" وہ بوکھلا گئی۔

"تشریف رکھئے محترمہ! باتیں پھر خوبصورت ـــ چھوڑیئے بھی حسن اور اس میں چھپے "حسن خیال" کو تاڑنا حسینوں کا شیوہ نہیں، صاف کہئے نا مابدولت کا یہ حسین چہرہ آپ کو خوبصورت لگا ـــ بالکل راجیش کھنہ سا ہے نا؟ بس آپ تعریف کرتی جائیے میں شرماتا جاؤں گا ـــ

"ہونہہ" ـــ وہ چیں بہ جبیں ہو کر اٹھنے لگی ـــ میک اپ پر پسینے کے قطرے ابھر نہ سکے

"اسی لیے آپ کے دوست آپ کو جہنم رسید کر گئے"
"مگر آپ جنت رسید کر سکتی ہیں ـــ بیٹھ جائیے"
اُس نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"معاملہ برعکس ہی، یعنی میں تعریف کرتا جاؤں گا آپ
شرماتی جائیے"ـــ
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "بڑے وہ ہیں آپ"
"وہ" نہیں خاکسار کو "شکیل بازید پوری" کہتے ہیں۔
"بازید پوری" ـــ اُسکی شیڈ دار آنکھوں کا تحیّر بھی
شیڈ آلود ہو گیا ـــ
"مجھے شاعر نہیں اُس کی حب الوطنی پسند ہے چنانچہ پنڈ
کی تقلید میں "بازید پوری" چپکا لیا ہے۔ طبع نازک پر گراں نہ
گذرے تو "جھنجھاوی" بھی ہو سکتا ہوں"
"مائی گاڈ ـــ بڑا اَن کلچرڈ نیم ہے یہ تو ـــ اس سے
تو سڑے آلو کی بو آتی ہے"۔
"اچھا تو پھر شکیل حسین نادری کیسا رہے گا"
"اُونہہ ـــ بس ـــ یہ تو جڑا کا ٹھو کا مُلّا ہے ـــ بغیر
مونچھوں کی چھدری داڑھی، اُونچے تنگ پاجامے بنا کف و کالر کی لمبی چاک دار
قمیص اور کاندھے پر رنگین رومال کے بِنا نہ ہوگا۔
"ذوالفقار شکیل دربھنگوی" ـــ کیسا رہے گا۔
"باپ رے! یہ تو پورا جین سنگھ کا دلوائی لگتا ہے
very difficult
"اچھا تو آپ ہی تجویز فرمائیے۔ بڑا ظلم ہو گا"ـــ
"دیکھئے میں نک نیم پسند کرتی ہوں"ـــ
"نک نیم"۔ یاد آیا "شکیب" ـــ کیسا رہے گا۔
"اوہو ـــ ونڈرفل ـــ ویری گڈ ـــ سویٹ ـــ لولی
آئی ایم گلیڈ ٹو میٹ یو۔
"مسٹر شکیب ـــ مجھے "نگی" کہتے ہیں"۔ اُسنے خوبصورت
ہاتھ آگے بڑھا دیا۔
"ویسے تو میں بڑا لکی ہوں مس نگی ـــ مگر تقدیر کو ڈھونڈ
لگتی ہوں ـــ خاص کر یہ تجریدی علامت۔ یعنی ـــ نگی"
"آئی ـــ سی ـــ میرا نام نگہت شہریار ہے"ـــ
"عورت ـــــــــــــــــ منفرد نہیں
رہ سکتی، منفرد نہیں جی سکتی، مرد کے خول میں کچھوے کی مانند چھپی
رہتی ہے ـــ اسی لئے مجھے بزدل نظر آتی ہے"ـــ
"جی ـــ میں بھی نہیں" ـــ آنکھوں کا شیڈ جھپکنے لگا۔
"جی آپ صرف نک نیم سمجھ سکتی ہیں"ـــ
دفعتاً ہال میں موسیقی کی لے تیز ہو گئی، رقاص جوڑے
اپنی اپنی کرسیوں سے اُٹھنے لگے۔
"کیا میں آپ سے رقص کی درخواست کر سکتا ہوں؟"
"کیوں نہیں ـــ ضرور"ـــ
چند لمحے بعد وہ پرانے شناساؤں کی طرح ایک دوسرے
سے بغلگیر چکنے فرش پر ہلکورے لے رہے تھے۔
"دراصل تعارف و تکلف دکھاوے کی چیز ہے"ـــ
"عورت" اور "مرد" تو ازل سے ایک دوسرے کو جانتے آرہے
ہیں ـــ ہیں نا"ـــ
"پھر بھی جانکاری ختم نہیں ہوتی"ـــ
"یہی تو ہے نیلی چھتری والے کی چالاکی ـــ ورنہ آپ
کارعنائی پیکر ہوتا نہ میرا جانثار سراپا، فرشتے ہوتے یا پھر
دیومالائی کہانیاں وجود میں آنے لگتیں"ـــ
"دیومالائی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں خاص کر
ان کا کردار جو اپنے آپ پر عاشق تھا ـــ آپ جانتے ہیں اسے؟"
"جانتا ہوں"ـــ
"کون تھا وہ"ـــ
"میں"ـــ
"کیا" ـــ کھنکتی ہوئی ہنسی۔ "بڑے شریر ہیں آپ!"
"شریر نہیں" ـــ "بدمعاش" کہئے ـــ "شریر" تو
صرف "بچے" ہوتے ہیں"۔
ـــ ایک راؤنڈ ختم ہو گیا وہ اپنی میز پر لوٹ آئے

"کیوں کیا خیال ہے — ایک دو دو ہسکی کا ہو جائے"
"ضرور — یہی تو آدمی زندگی ہے"
— دو جام ٹکرانے اور خالی ہونے لگے — زندگی
عریاں ہو گئی — بہت ہلکی — لطیف — نرم — گداز —
بادل کے ٹکڑے پر اڑی چلی —
"مسٹر شہریار کیا کرتے ہیں" —
"کرتے کچھ نہیں — فادر کی نلور مل — لیکر کلاتھ مل
تک کئی ملیں ہیں ان میں گھوما کرتے ہیں — خواب آلود سا ہے۔
"اور آپ" —
"میں — اپنا نصف تلاش کیا کرتی ہوں" —
"کیوں کیا مسٹر شہریار کہیں کھو گئے ہیں" —
"یہی تو مصیبت ہے ڈیر — وہ کہیں کھوتے نہیں۔
ایک پیگ اور —
ارے اتم خاموش کیوں ہو گئے — ایک جام میری طرف
سے، بنا سرور کے پی نا حرام ہے — حرر - ا - م —"
"نہیں بہت ہو گئی — آپ بہکنے لگی ہیں — چلئے
گھر چھوڑتا چلوں"
"بہکنا نہیں — سنبھلنا کہو — منزل قریب آنے پر
بہکنا کفر ہے" —
"شاید شہریار آپ کو پسند نہیں" —
"مجھ سے زیادہ میرے ڈیڈی کو پسند ہیں — مجھے تو
ان کی چیک بک پسند ہے، لمبی مرسڈیز پسند ہے — بنجارہ ہل
کا خوبصورت "نگار ولا" پسند ہے۔ مگر — ان کے بچے —
(ایک ہچکی)
بچے — تو کیا ان کے بچے بھی ہیں —
"نہیں — ہونے والے — اُف گاڈ — سر
چکرا رہا ہے، ذرا اپنا ہاتھ تو دینا — ہاں اب اُدھر بیلو پارکنگ
شیڈ میں میری کار ہے" —
"تم کیا جانو مجھے — ہاں — سنبھلو — مجھے نیچے

بہت پسند ہیں — گول گول — گورے گورے — پیارے پیارے
(شانوں پر مضبوط گرفت) بس — اوہ — وہ بچے —
بولی — بالکل تم جیسے — انٹیلیجنٹ — اسمارٹ
— ہینڈسم — پر یہ اپنا شہریار ہے نا — بالکل ڈفر
ہے — بھیجر — ارے — اسے تو نِک نیم بھی نہیں
آتا — مجھے نگار النساء بیگم کہتا ہے — اُس — وہی
ہے میری کار — ڈرائیور کو جگا لو — ڈیر —
اُس نے کار کا دروازہ کھولا اور اسے بہ مشکل سیٹ
پر لٹا دیا — مگر اُس کی باہیں اُس کی گردن کا طواف
کر چکی تھیں —
"تم — آؤ گے نا میرے پاس — جب منا ہو گا —
بڑا خوبصورت، تم جیسا — کیا نام رکھو گے اُس کا" —
اُس نے اپنی گردن سے اس کے ہاتھ ہٹائے اور تیار
ہو گیا —
"جیکب" — ڈوبتی آواز کے ساتھ اُسکی آنکھیں
بند ہونے لگیں — اور نِک نیم — جیکو — ہونا"
اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
"نہیں — وہ "ممی" ہو گا — آواز کے ساتھ
کار کا دروازہ بند کیجئے وہ ہٹ گیا —

■■

طنز و مزاح

محسن علی

ایک تحریک اور

ہمارا سیدھا سادا نام محی الدین ہے، لیکن ادیبوں شاعروں اور خصوصاً نقادوں نے پتہ نہیں کیوں ایک دوسرا نام دے دیا ہے۔ "قادری" اس لئے اب ہم کو قادری محی الدین کہا جا رہا ہے۔ قادری دراصل کہتے کس ہیں یہ ٹھیک سے ہم کو معلوم نہیں، ویسے ہمارے والد صاحب تو اُن صاحب کو "قاری" کہا کرتے تھے جو قرآن شریف قرأت سے پڑھا کرتے۔ مگر ہم کو تو قرآن شریف ٹھیک سے پڑھنا بھی نہیں آتا۔ لیکن ہم نے یہ سوچ کر یہ نام قبول کر لیا ہے کہ بورژوا ادیبوں اور شاعروں کی کونسی باتیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں۔ اور جس طرح اکثر ادیب مختصر و نامکمل نام رکھ لیتے ہیں اُسی طرح ہم کو بھی کوئی مختصر سا نام دیدیا گیا ہے

اگلے زمانوں میں ادیب بڑے ہی قوی ہیکل اور چوڑے چکلے ہوا کرتے تھے اس لئے ان کے نام بھی بھاری بھرکم اور وزن دار ہوا کرتے تھے جو اُن کے اونچے پورے قد اور اتنی جسامت کا پتہ دیتے تھے لیکن آج جب ہم اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم دراصل اپنے اجداد کا شارٹ فارم بن کر رہ گئے ہیں۔ لہذا ہمارا نام بھی اُن کے ناموں کا ایک شارٹ فارم ہونا چاہیئے سو ہم نے اپنا یہ شارٹ فارم قبول کر لیا۔

اپنے اس مختصر سے تعارف کے بعد ہم آپ کو ایک ادبی کانفرنس کا حال سنانا چاہتے ہیں جو کچھ ہی دن پہلے ایک بڑے شہر میں منعقد ہوئی تھی۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس کانفرنس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہم کو اس کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا اور ادب کی معتدد شخصیتوں کے ساتھ ڈائس پر ہم کو نمایاں مقام دیا گیا تھا۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے نمائندوں کے ساتھ ہم کو بھی ایک خوبصورت اعزازی بیج دیا گیا تھا۔ ہمارے بیج کا رنگ دوسرے اور Badges سے جدا تھا۔ سب کے بیج سرخ تھے اور ہمارا سبز۔ ہمارا بیج سائز میں گوبھی کے پھول کے برابر تھا جو ہمارے مختصر سے سینے کو ڈھال کی طرح چھپائے ہوئے تھا۔ اس لئے بھی ہر شخص ہم کو اور ہمارے بیج کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ بیج پر لکھا تھا "نمائندہ قارئین" کانفرنس میں بہت سے لوگوں کو ہم نے یہ کہتے سنا کہ "صاحب یہ تو بہت ہی مبارک اور قابلِ تحسین اقدام ہے کہ کانفرنس کی تاریخ میں پہلی بار نمائندۂ قارئین منتخب کیا گیا ہے"۔ اس پر ایک نقاد صاحب نے جو سیاست سے زیادہ اور ادب سے کم دلچسپی رکھنے والے لگتے تھے، تشویش ظاہر کرنے کے انداز میں پوچھا تھا "کیا ان کی حیثیت حزبِ مخالف کی ہوگی؟" تو ایک دوسرے آن بان قسم کے شاعر صاحب نے ہم پر ہمدردانہ نظر ڈال کر جواب دیا تھا کہ "نہیں صاحب، یہ بیچارے ہماری کیا مخالفت کریں گے۔ یہ اقدام تو صرف جمہوریت اور ترقی پسندی کے اصول کے تحت حفظ ماتقدم کے طور پر کیا گیا ہے کہ کل کوئی یہ نہ کہنے لگ جائے کہ ہم ادیب و شاعر لوگ جو آئے دن نئے نئے نظریات کا پرچار کرتے ہیں، نئی نئی تحریکیں چلاتے ہیں، اور عوام کی پر[illegible]

ہنگامہ پسند ہیں جو ہنگامے کھڑے کر دیتے ہیں، اُن کے بارے میں قارئین کی رائے نہیں لیتے۔ جمہوری حکومت میں جس طرح عوام کی رائے کو مقدم سمجھا جاتا ہے اسی طرح جمہوری ادب میں بھی قارئین کی رائے مقدم ہونی چاہئے۔ فی الوقت تو انکی رائے صرف پابندیٔ ضابطہ کیلئے ضروری سمجھی گئی ہے اسلئے کہ ہمارے عوام یا قارئین میں بھی اتنا شعور کہاں کہ انکی رائے ادب پر اثر انداز ہو سکے۔" یہ سُن کر ہماری حمیت تلملا اُٹھی۔ کھلی کانفرنس میں ہماری ہتک ہوتی تھی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کسی اعزاز کو نبھانے کے لئے تھوڑی بہت ہتک تو برداشت کرنی ہی پڑتی ہے۔ پھر ہمارے لئے ہتک کونسی نئی چیز تھی ـــــ لیکن ہم کو یہ خیال ضرور آیا کہ ہمارے دیش کی حکومت کی طرح ہمارے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے بھی ایک حکومت بنالی ہے۔ انکی بھی ایک پارلیمنٹ ہے، ایک کابینہ ہے، ایک صدر ہے، پرائم منسٹر ہے، کچھ وزرا ہیں اور اس پر یہ دھاندلی عجیب ہے کہ انھوں نے بنا کسی الکشن کے اپنی حکومت بنا ڈالی۔ ادب کے ان خود ساختہ حکمرانوں نے قارئین کو لوٹا ہے، [illegible] کیا ہے۔ قارئین کو اس دھاندلی کے خلاف آواز اٹھانا چاہئے۔ کیوں نہ بغاوت ہو جائے۔"

ہم نے انتقاماً یہ طے کر لیا کہ آج ان ادیبوں سے ہم بھی نپٹ لیں گے۔ آج کے پروگرام میں ہماری بھی تقریر شامل تھی اسلئے ہم کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہو کر آئے تھے۔ ہم جیسے کئی قارئین نے بیٹھ کر ایک دھنواں دھار تقریر تیار کی تھی۔ جس کو ہم نے کانفرنسوں میں ہونے والی تقاریر کی بہت ساری خوبیوں سے آراستہ کیا تھا۔ یعنی ہم نے کئی مشکل اور ادق اصطلاحات کو اپنی تقریر میں اس طرح ترتیب دیا تھا کہ تقریر کچھ اتنی موثر اور [illegible] ہو جائے کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور ہماری قابلیت ادبی اور ادب فہمی کا سکہ بیٹھ جائے۔ خصوصاً ان اصطلاحوں پر ہم نے زیادہ زور دیا تھا ، "ادب میں جمود، لاجیت، استحصال، رجعت پسندی، وجودیت، تشکیک، جدیدیت وغیرہ"۔ اپنی جیب کو چھو کر ہم نے یقین کر لیا کہ ہمارا اثاثہ محفوظ ہے۔ اس اثنا میں اعلان ہوا کہ جلسے کی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ اسٹیج پر نمایاں حیثیت ہے۔ بیٹھنے والوں میں صدر کانفرنس، معتمد کانفرنس اور کچھ سینیئر قسم کے ادبا و شعرا تھے۔ ہماری نظر کچھ دیر کے لئے مہمانِ خصوصی پر آکر ٹھہر گئی۔ وہ اسٹیٹ گورنمنٹ کے ایک منسٹر تھے، پتہ نہیں ادب سے ان کا کیا تعلق تھا لیکن تعلق کی ضرورت ہی کیا تھی ہم نے اُن منسٹر صاحب کو تو ہر سیمینار، ہر کانفرنس اور ہر مشاعرہ کا افتتاح کرتے دیکھا تھا۔ شاید وہ وزیرِ افتتاح یا اُدگھاٹن منتری تھے۔ ہال میں اگلی نشستوں پر کچھ مشہور و مقبول شاعر اور ادیب بیٹھے تھے۔ اُنکے پیچھے تازہ واردانِ بساطِ ادب کی قطار تھی۔ جن کے چہروں پر اعتماد کم اور جوش زیادہ تھا۔ اور ان کے پیچھے پرجا تھی یعنی قارئین۔ سکریٹری صاحب نے ایک ہلکی سی چٹکی بجائی، ہم سمجھے وہ مائکروفون ٹیسٹ کر رہے ہیں۔ لیکن دراصل وہ ہم کو ڈائس پر بلا رہے تھے۔ پہلے تو ہم گھبرا گئے۔ کچھ ہچکچائے۔ اس بھری محفل میں نمایاں ہو جانے کے خیال سے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ لیکن جانا پڑا۔ جب ہم ڈائس پر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے تو ایسا لگا جیسے ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ ہمارے سینے پر لگے ہوئے بیج کو بغور دیکھ رہے ہیں اور اس پر لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھ کر ہنس رہے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت معتمد کانفرنس نے اعلان کیا۔

"ہم بڑے ہی فخر سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ادبی کانفرنسوں کی تاریخ میں پہلی بار ہم نے قارئین کو نمائندگی کا موقع دیا ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ یہ اقدام بہت ہی قابلِ تحسین سمجھا جائیگا۔ ہم آج سب سے پہلے آپ سب حضرات سے "نمائندہ قارئین" کا تعارف کراتے ہیں"

معتمد صاحب نے ہماری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کچھ اُونچی آواز میں کہا۔ "جناب قاری محی الدین صاحب" ہم فوراً اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سارا ہال تالیوں سے گونجنے لگا ہمکو ایسا محسوس ہوا جیسے بھری عدالت میں ہم کو موت کی سزا سنا دی گئی ہو اور ساری دنیا ہم پر ہنس رہی ہے۔

ہمارے تعارف کے بعد تقاریر شروع ہوئیں۔ آج کے جلسے میں زیرِ بحث موضوع تھا ـــــ "قارئین کا شعور اور ہماری نئی تحریکات" کئی مشہور و مقبول ادیبوں اور نقادوں نے

تقریریں کیں۔ ہر مقرر ایک لفظ بار بار دہرا رہا تھا "قاری، قاری، قاری"۔ سارے ہال میں یہی ایک لفظ گونج رہا تھا۔ جب بھی کوئی مقرر یہ لفظ ادا کرتا ہم کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ہمارے گلے میں ایک ڈوری باندھ دی گئی ہے اور ہر مقرر لفظ قاری کہتے ہوئے ہم کو ایک جھٹکا دے رہا ہے اور ہم مسلسل جھٹکے کھا رہے ہیں۔ ہر مقرر اپنی اپنی اصطلاحات استعمال کر رہا تھا جیسے "ادب عالیہ سے قاری کا تعلق، ترقی پسند تحریک اور قاری کی ذہنی کیفیت، وجودیت اور قاری کا شعور، فلسفہ تشکیک اور قاری کی ذہنی کشمکش، جدیدیت اور قاری کا ذہنی انتشار۔ ماہیت، ہیئت، فارم، ڈکشن، تکنیک اور عام قاری کی ذہنی صلاحیت، اس کا حدود اربع ـــ

یہ باتیں سن کر ہمارا سر چکرانے لگا، ہم پر غش طاری ہونے لگا، ایسا محسوس ہوا کہ ہم بے ہوش ہو رہے ہیں، پھر ہم کو کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا، ہم کو بید کے ٹیبل پر لٹا دیا۔ اور ہمارے دماغ پر نشتر لگنے لگے۔ آریاں چلنے لگیں ـــ ہمارے دماغ کو کھولا گیا اور باضابطہ آپریشن شروع ہو گیا۔ دماغ کی ایک ایک نس کو ٹٹولا جا رہا ہو، ایک ایک رگ کو دبایا جا رہا ہو۔ سارے اعصابی نظام کو جانچا اور پرکھا جا رہا ہو۔ شعور کی پیمائش ہو رہی ہو۔ اُن نسوں کو جھنجھوڑا جا رہا ہو جہاں ہمارے مستحکم یقین اور اعتقادات محفوظ ہیں۔ ادب کی نئی تحریکات کے چھوڑے ہوئے نشانات اور نئے رجحانات کی پیدا کی ہوئی ہیجانی کیفیتوں کے زخموں کو ڈھونڈھا جا رہا ہو۔ پورے دماغ کو کھنگالا جا رہا ہو ـــ اس چیر پھاڑ کے دوران ہم کو اپنی بے ہوشی میں بھی کچھ ایسے الفاظ سنائی دیئے ـــ "قاری کا ذہن صاف نہیں ہے۔ خون کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے کیونکہ اس میں ایک ہیجان اور انتشار پیدا کر دیا گیا ہے۔ ذہن کو سکون و آرام کی ضرورت ہے۔" لیکن جب ہمارے دماغ کو بند کر کے ٹانکے لگا دیئے گئے اور ہم کو واپس کرسی پر بٹھا دیا گیا تو ہم کو محسوس ہوا کہ ہمارا دماغ اچھا خاصہ ہسپتال والا ڈبہ بن گیا ہے جس میں کئی زخمی پڑے کراہ رہے ہیں ـــ

ہم کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھے کہ تقریر کے لئے ہمارا نام اناؤنس کیا گیا اور سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ بڑے مضمحل انداز میں ہم مائک تک پہنچے۔ عادتاً ہونٹوں پر زبان پھیری۔ حاضرین پر کچھ ایسی نظر ڈالی جیسے چھری چلنے سے پہلے بکرا اپنے ذبح کرنے والے پر ڈالتا ہے۔ پھر کچھ الفاظ اپنے آپ ہی ہماری زبان سے نکل پڑے۔ ہم نے ہال کے کسی دور کے کونے سے آتی ہوئی اپنی ہی آواز سنی۔ "معزز حضرات! میں ایک ادنیٰ قاری ہوں۔" تو حاضرین جلسہ نے پھر تالیاں بجائیں۔ اس بار تالیوں نے ہماری کچھ ہمت بندھائی۔ ہم نے اپنا گلا صاف کیا تو ایک سیدھا سادا جملہ ہماری زبان پر آ گیا۔ "میں آپ کا ممنون و مشکور ہوں کہ آپ جیسے مشہور دانشوروں کو مخاطب کرنے کا آپ نے مجھے موقع عطا فرمایا۔ میں اُن سارے قارئین کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپکی تخلیقات اور آپکی دلچسپ و بابرکت شخصیتوں کے دلدادہ ہیں۔"

یہ کہہ کر ہم کچھ رُکے تو محسوس ہوا کہ ہماری رگوں میں کچھ گرم خون دوڑنے لگا ہو اور خون کی روانی ایک جوش میں تبدیل ہو رہی ہو۔ ایک اعتماد سا محسوس ہوا تو ہم نے کہا۔

"آپ نے ابھی ابھی جو بلند پایہ تقاریر سنی ہیں اُن میں قاری کے ذہن کا مکمل تجزیہ ہو چکا ہے۔ لیکن آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس تجزیے نے میرے ذہن کو بالکل جدید ذہن بنا دیا ہے۔" تمام حاضرین جلسہ اس بات پر ہنس پڑے۔ ہم کو لگا کہ اب ہم اپنے چھانے لگے ہیں۔ ہم نے کہنا شروع کیا۔

"آج کے معزز مقررین نے قاری کے جن مسائل پر روشنی ڈالی ہے ان کے علاوہ بھی قاری کے کچھ اور مسائل ہیں جو میں پیش کروں گا ـــ پہلا مسئلہ ہے۔ "قاری کا وجود، بہ حیثیت انسان کے" یہ سن کر حاضرین کچھ چونک پڑے۔ ہم نے جیب سے اپنی لکھی ہوئی تقریر نکالی اور پڑھنے لگے۔

"قاری بھی ایک انسان ہے۔ (حاضرین کی ہنسی) قاری کی بھی محدود آمدنی ہوتی ہے۔ اُس کے بیوی بچے ہوتے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ معاشی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ ان سب

پنٹ کردہ آپکی تخلیقات کو پڑھنے کا وقت نکالتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے پیسوں سے کتابیں خریدتا ہے گو مانگ کر بھی پڑھتا ہے۔ اپنے پیسوں سے کانفرنسوں اور مشاعروں کے ٹکٹ خریدتا ہے۔ کانفرنس میں اپنے پیسوں سے چائے پیتا ہے اور اپنے دوستوں کو پلاتا ہے۔ کانفرنس میں احساس کمتری کے مارے سگریٹ زیادہ پی جاتا ہے۔

آپکے ادب کو سمجھنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے لیکن نہیں سمجھ پاتا ہو جاہل کہلاتا ہے۔ آپکے ادب کو پسند نہیں کرتا تو بد ذوق جیسے لقب سے نوازا جاتا ہے۔

کسی تحریک یا رجحان کا ساتھ نہ دے تو قدامت پسند اور مُردہ پرست کہلاتا ہے۔ اور یہ سارے خطابات اُسے اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ وہ آپ کا ادب پڑھتا ہے، اور نہیں پڑھتا ہو تو غیر مہذب اور پسماندہ قوم کا فرد سمجھا جاتا ہے ــــ

لیکن میرے لئے اور سارے قارئین ادب کے لئے ایک قابل فخر بات ہے کہ آج ایک قاری کو آپکی کانفرنس میں ایک نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ مجھے آپ کی وسیع الدماغی اور بلند نظری سے توقع ہے کہ ایک قاری کے جو مسائل میں پیش خدمت کر رہا ہوں ان پر آپ غور فرمائیں گے۔

ناچیز ہستم کے احساس کے باوجود ایک معمولی سی تجویز پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جو ہمارے ادب کے نت نئے مسائل کا حل پیش کرتی ہے ــــ

ہم قارئین اس بات کو بڑی ہی شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ آجکل ہمارے ادب میں کچھ عجیب سی افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ ادب کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نظر نہیں آتا۔ ادبی بحث و مباحثے کچھ اس قدر طیش آمیز ہو گئے ہیں کہ ہر دلیل کٹ آدربن کر رہ گئی ہے۔ اور ان مباحث میں سوائے گالی کی بوچھار کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس افراتفری اور کشم کشی میں قاری کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں وہ اپنے ادب کے رہنماؤں کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہی نہ ہو جائے۔ میری عرض خدمت ہے کہ کیوں نہ ہمارے ملک کے دستور کی طرح ادب کا بھی ایک دستور بنا لیا جائے جس میں قاری کے بنیادی حقوق محفوظ ہو جائیں۔ اسی دستور کے تحت ہر پانچ سال میں ایک جنرل الکشن ہو جس طرح سیاسی پارٹیاں الکشن لڑتی ہیں اس طرح ادب میں مختلف تحریکات کے رہنما اپنی اپنی پارٹی بنا لیں اور الکشن لڑیں۔ ووٹ دینے کا حق ویسے صرف خواندہ بالغوں کو دیا جانا چاہیئے لیکن ناخواندہ بالغوں کو بھی دیا جا سکتا ہے کیونکہ بہت سے بالغ، شاعری، ناول اور کہانیاں دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ اس طرح ایک ادبی پارلیمنٹ کی تشکیل ہوگی اور اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی برسر اقتدار آئیگی ــــ اس پارٹی کو حق ہوگا کہ ایک ادبی کابینہ بنائے مختلف اصناف سخن کے پورٹ فولیوز (قلمدان) بنائے جائیں۔ کابینہ کی تشکیل اس طرح کی ہو۔

(۱) وزیر اعظم یا فنکار اعظم

(۲) وزیر تنقید

(۳) وزیر ناول و تمثیل

(۴) وزیر افسانہ

(۵) وزیر نظم

(۶) وزیر غزل

(۷) وزیر طنز و مزاح

(۸) وزیر تحقیق و ترجمہ

(۹) وزیر مرثیہ وغیرہ۔

اس ادبی دستور کے تحت ایک 'صدر ادب' کا بھی انتخاب ہونا چاہیئے۔ صدر کے انتخاب کا صرف پارلیمنٹ کو حق ہوگا اور صرف ایسے اُمیدوار صدارت کے لیے مجاز تصور کئے جائیں گے جن کے نام کے ایک یا ایک سے زیادہ رسالوں کے خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں اور جو ادب سے تقریباً ریٹائر ہو چکے ہیں۔

جس طرح ہم نے ملک کی معاشی ترقی کے لئے پنجسالہ پلان بنائے ہیں اسی طرح ادب کی ترقی کے لئے پنج سالہ پلان بنائے جائیں اور ایک پلاننگ کمیشن مقرر کیا جائے جس میں صرف تنقید نگاروں کو منتخب کیا جائے۔ پلاننگ کمیشن میں شاعروں کے لئے کوئی سیٹ نہ رکھی جائے۔

الکشن میں کھڑے ہونے والے امیدواروں کے لئے معیارِ قابلیت مقرر کیا جائے۔

پارلیمنٹ کی سیٹ کے لئے ہر اُس ادیب و شاعر یا تنقید نگار کو حق ہوگا جس کی کم سے کم دو کتابیں چھپ کر مارکٹ میں آچکی ہوں (خواہ وہ کسی ادارے کی طرف سے شائع ہوئی ہوں یا اُس کے اپنے صرفے سے) پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ ہر اسٹیٹ میں ایک ادبی اسمبلی کی بھی تشکیل ہوگی، اور اسٹیٹ اسمبلی کی سیٹ کے لئے الکشن لڑنے کا ہر اُس ادیب و شاعر یا تنقید نگار کو حق ہوگا جس کے کم از کم دس مضامین یا دس کہانیاں یا بیس نظمیں یا غزلیں یا اُن کی ہم وزن تخلیقات کسی ایک یا ایک سے زیادہ رسالوں میں چھپ چکی ہوں۔

ہم نے ادبی دستور کا ایک خاکہ پیشِ خدمت کر دیا ہے اور اب ہم ملک کے سارے ادبی رہنماؤں اور دانشوروں سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ مجوزہ دستور کے تعلق سے کوئی نئی بحث نہ کھڑی کی جائے۔ تاکہ جلد از جلد اس کو قانونی شکل دے کر اس کا نفاذ عمل میں لایا جا سکے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ قارئین اپنا حقِ رائے دہی استعمال کر کے یہ فیصلہ کر دیں کہ کونسی تحریک زیادہ مقبول ہو سکتی ہے اور کون سا نظریہ وہ اپنانا چاہتا ہے۔ اِسطرح ہمارے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی عظمت و مقبولیت کے تعلق سے اِن تحریکات کے سبب جو غلط فہمیاں ظہور پذیر ہو رہی ہیں اُن کا ازالہ ہو جائے گا۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اب آخر میں ہم قارئین کے کچھ مطالبات پیش کرتے ہیں اور آپ حضرات سے التجا کرتے ہیں کہ آپ ان پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔

ہمارے مطالبات

(۱) ہم کو ایک باعزت و باشعور قاری تسلیم کیا جائے۔

(۲) ہماری رائے لئے بنا ہم پر نئی تحریکات، نئے نظریات اور نئے فلسفے نہ تھوپے جائیں۔

(۳) ہمارے ذہن کو اپنا ذہن سمجھ کر اُس کا غیر ضروری تجزیہ نہ کیا جائے۔

(۴) ہمارے لئے ہمارا ادب تخلیق کیا جائے جسے صحیح معنوں میں ہم اپنا کہہ سکیں اور ہمارے ادب میں بیرونی زبانوں کی اصطلاحیں غیر ضروری طور پر استعمال کر کے ہم پر رعب نہ گانٹھا جائے خصوصاً ایسی اصطلاحیں جن کے لئے ہماری زبان میں بہت سی مترادف اور سلیس اصطلاحیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی مفکروں اور ادیبوں کے حوالوں سے حتی الامکان احتراز کیا جائے۔

(۵) وقت کی تیز رفتاری کے مدنظر ایک اور تحریک شروع کی جائے۔ "تحریک مختصریت" تاکہ ہم غیر ضروری طوالت سے محفوظ ہو جائیں۔

(۶) ہماری زندگی کے مسائل پر لکھا جائے تاکہ ایک ایسا ادب تخلیق ہو، جو ہمارا غم بانٹے اور ہماری خوشیوں میں برابر کا شریک ہو۔

(۷) قارئین کے مطالبات کو منوانے کے سلسلے میں قارئین کی اسٹرائک کو قانونی حق کی حیثیت دی جائے جس میں بھوک ہڑتال، گھیراؤ یا "ادب بند" تحریک بھی شامل ہو۔

اپنے مطالبات پیش کرنے کے بعد جب ہم نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی تو ہال میں قارئین کے حصے میں ایک بے چینی سی پیدا ہو چکی تھی۔ قارئین زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ کسی منچلے نے نعرہ لگایا۔

"قارئین"

تمام قارئین نے آواز لگائی۔ "زندہ باد"

"اپنی مانگیں"۔ "لے کے رہیں گے"۔

سارے ہال میں ایک بے چینی اور تناؤ سا محسوس ہونے لگا اور بجائے ادبی ماحول کے ایک سیاسی ماحول پیدا ہو گیا۔ ادیبوں کے رہنما کچھ حیران اور کچھ پریشان نظر آئے۔ ہم نے فوراً اپنے قارئین سے خاموش رہنے کی اپیل کی۔ اس وقت تک منتظم کانفرنس ہمارے پاس آچکے تھے اور جلسے کے برخواست ہونے کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔ ہال میں خاموشی چھا گئی لیکن ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ادب کی دنیا میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا ہے "تحریکِ قاریت"

شب گشت : عمیق حنفی : صفحات : پانچ روپے۔
کتابت وطباعت : خوبصورت اور جاذب نظر
پبلشر : شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد ۳

شب گشت ہمارا ایک قیمتی مجموعۂ کلام ہے اس لئے اس پر تفصیلی نظر ڈالی جائے گی۔

عمیق حنفی کا تجربہ عمیق، مشاہدہ وسیع، اظہار کثیر الوسائل اور شعری مضمون مختلف الجہت ہے۔ اس لئے وہ اکثر بجھ بڑی بے تکلفی سے ان مضامین کے دقائق سخن سے آسان گزر جاتے ہیں جن کا تصور بھی کسی اور کی خاطر نازک پہ گراں گزرتا ہوگا۔ ہمعصر مسائل، اور ہندوستان کے ماضی وحال کی تاریخ و ادب پر ان کی نظر ہے، قرآن حکیم سے بھی وہ بقدر ضرورت واقف ہیں اور جدید شہر والوں کے کھوکھلے پن یا حسن پر بھی ان کو آگاہی ہے، نیز ان سب معلومات اطلاعات کو اپنے مخصوص فطری مزاج میں ملاوٹ دینے کا فن بھی ان کو آتا ہے لیکن اس ملاوٹ نے گھلاوٹ نہیں پائی ہے اس لئے جو باتیں ان کے کلام کا حسن بڑھاتی ہیں وہی اس کے قبح کا بھی باعث ہوتی ہیں۔

ان کی نظم "سندباد" کو کسی صاحب نے ایلیٹ کی "دی ویسٹ لینڈ" کا چربہ بتایا تھا۔ ظاہر ہے یہ خیال غلط ہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ "سندباد" لکھتے وقت "ویسٹ لینڈ" ان کے پیش نظر ضرور رہی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں نظموں کو جب ہم ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر پڑھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ عمیق حنفی نے عمداً کوشش کر کے وہ مضامین چھوڑ چھوڑ دیئے ہیں جنہیں انہوں نے یقیناً سوچا ہوگا لیکن جنہیں ایلیٹ بیان کر چکا تھا۔ جب آپ ان نظموں کے ایک ایک ٹکڑے پڑھ کر آنکھ بند کر کے ان پر غور کرتے ہیں تو خیال بن آتا ہے کہ "سندباد" میں کبھی کبھی تو بالکل وہی موقع اور محل آگئے ہیں جو ایلیٹ کے یہاں ہیں اور عمیق حنفی نے بہ تکلف اپنے آپ کو ان کے اعادے سے باز رکھا ہے۔ اس سے قطع نظر "سندباد" کا ڈھانچا تقریباً وہی ہے جو "ویسٹ لینڈ" کا ہے۔ یہی فضل فروشی عمیق صاحب "سندباد" اور دوسری نظموں اور غزلوں میں کرتے ہیں جو ایلیٹ نے کی تھی۔ ایلیٹ نے اس فضل فروشی کو خود اپنے ایک مضمون The Frontiers of Criticism میں "bogus scholarship" کہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ "ویسٹ لینڈ" کے مقابلے میں اس کے نوٹس اصل نظم سے زیادہ مقبول ثابت ہوئے حالانکہ یہ نوٹس محض اس لئے لکھے گئے تھے کہ چند مطبوعہ صفحے اس نظم میں اور اضافہ ہو جائیں۔ اپنے اسی مضمون میں ایلیٹ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کی اس روش سے دوسرے ہمعصر شاعروں پر کوئی غلط اثر نہیں پڑا لیکن اس اظہار خیال کے وقت اس کے پیش نظر صرف انگریزی کے شاعر تھے ورنہ اگر وہ کہیں "سندباد" دیکھ سکتا تو افسوس کرتا کہ عمیق حنفی نے اس کا کسی قدر اثر قبول کیا ہے، البتہ دو فرق بہر حال نمایاں ہیں: ایک تو یہ کہ "سندباد" کے آخر میں ویسے نوٹس نہیں ہیں (اور دوسری نظموں کے آخر میں بھی نہیں ہیں) جیسے "ویسٹ لینڈ" کے آخر میں ہیں۔ دوسرا یہ کہ ایلیٹ اور عمیق حنفی میں جو فرق ہے وہ "ویسٹ لینڈ" اور "سندباد" میں نمایاں ہو کر

الف لیلوی سندباد کے ایڈونچرز کا مقصد حصول دولت تھا، عمیق حنفی کے یہاں "سندباد" علامت ہے آج کے حیرت و حسرت کے مارے انسان کے لئے جس کا سفر ایک بے نام مقام سے شروع ہو کر اپنی ذات کے صحرا میں ختم ہوتا ہے: ذات جو صحرا کی طرح وسیع بلکہ یہ کہ بیکراں ہے، جہاں انا جہان آرزو دبی ہوئی ہے۔ کیا ذات کا دشت بیکراں اس ازلی و ابدی تلاش کا حاصل ہے؟ اس سوال کا کوئی واضح جواب عمیق حنفی نہیں دیتے —— یہ اس نظم کی قوت ہے۔

لیکن صحرائے ذات کو آخری منزل کی تلاش کے سفر کا مقصود قرار دینے کے لئے انہوں نے جو وجہ بیان کی ہے کہ، "وہاں ایجلاشنی، ریڈیو اپریٹس اور ٹیلی ویژن نہیں پہنچے"، وہ صرف یہ کہ بے حد کمزور توجیہ ہے بلکہ فی الحقیقت اس شاندار نظم کے ایسے اچھے کلائمکس کے تاثر کو ایک اوسط درجے کی نظم کے کلائمکس کا تاثر دیتی ہے —— یہ اس نظم کی کمزوری ہے۔

"سندباد" کی ذیلی نظموں میں "جزیرے کا دل" اور "مقتابلہ کے آنے سامنے" ایسی نظمیں ہیں جو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انسان کی

محرومیوں اور مجبوریوں کے بعد امیدوں اور آرزوؤں کا جیسا دلدوز بیان ان میں ہے وہ کہیں اور مشکل سے ملتا ہے۔ ان دونوں ذیلی نظموں میں ترسیل کے لئے دو مختلف مظاہر استعمال کئے گئے ہیں اور دونوں کامیاب ہیں۔

اس پیراگراف سے قبل آنے والے اعتراضات کے باوجود میں خوشی سے عرض کرتا ہوں کہ باوجود ان خامیوں کے "سندباد" ہماری بہترین نظموں میں سے ایک نظم ہے۔

"شہرزاد" بھی ایک الف لیلوی کردار ہے۔ الف لیلہ میں شہرزاد ظالم خلیفہ کو کہانیاں سُنا کر اپنی اور اپنی ہم جنسوں کی زندگی میں ایک دن کا اضافہ ہر روز کر دیا کرتی تھی۔ عمیق حنفی نے اسی کردار کو بھی "سندباد" کی طرح بڑی مہارت سے انتخاب کرکے، اسے نئے مفہوم دے کر اور جدید حسیت کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ نظم بھی "سندباد" کی طرح [اور ایلیٹ کی نظموں کی طرح] مختلف حصوں پر منقسم ہے۔ ان میں بعض حصے بہت جاندار ہیں۔ آخری حصے میں انہوں نے اپنی شاعری سے جو مطالبہ کیا ہے وہ انہیں دوسرے بے مقصد جدید شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ حصہ جس کا عنوان "حرف آشنا" ہے ان کی شاعری اور مقصدیت شعری کا مینی فیسٹو ہے۔ یقیناً آج شاعر اور شاعری کا منصب یہی ہے کہ:

ہر گھڑی اپنی آواز کو نت نئے — سوز میں ساز میں ڈھال کر گائیے
ہر گھڑی نت نئے نقش کو سینچئے — ہر گھڑی نت نئی جوئے خوں لائیے
تجربوں میں ترے اتنی جان ہو — تیری آواز پر وقت کا دھیان ہو
شہریاروں کو ہو داستاں کی لگن — صبح سے شام کی چاپ پر کان ہو
اے مری شاعری اے شہرزادِ سخن

اقبال نے قلندر، شاہین، خودی وغیرہ نہ جانے کتنی ہی اصطلاحوں تلمیحوں اور استعاروں کو ایک نئی زندگی، نئی وسعت معنی اور نئی حیثیت عطا کی تھی۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ عمیق حنفی نے "سندباد" اور "شہرزاد" کو بھی نئی زندگی اور نئی حیثیت بخشی ہے۔ اس وقت یاد نہیں آتا کہ میں نے کسی ناول میں اپنی تلاش میں بھٹکتے ہوئے انسان کے لئے سندباد کی تلمیح دیکھی تھی۔ اسی طرح غالباً یہ کسی افسانے میں ہی ایک ہیروئن شہرزاد بنی ہوئی ہے۔ یعنی یہ دونوں تلمیحیں جدید استعارہ بنا کر پیش کی گئی ہیں۔ لیکن عمیق حنفی نے ایک ایک دو دو جملوں یا شعروں کی محدود فضا سے ان تلمیحات کو نکال کر اور انہیں مستقل نظموں کا مرکزی کردار بنا کر ان پر اپنی چھاپ لگا دی ہے۔ ان کی یہ دو نظمیں ان کے نام کو ایک مجازی خالق اور موجد کی حیثیت سے بھی زندہ رکھیں گی۔

نظم "شب گزشت" بھی کامیاب ہے لیکن "سندباد" اور "شہرزاد" پڑھنے کے بعد اُسے پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خیالات، تصورات، استعارات، تشبیہات کا اعادہ ہو رہا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلی دو نظمیں جگ بیتی تھیں تو یہ آپ بیتی ہے۔ ویسے تو ظاہر ہے کہ جگ بیتی اور آپ بیتی میں مرکزی دور مشترک ہی ہوتا ہے لیکن اس نظم میں تین مصرعے اتنے بلیغ ہیں کہ میں یہ عرض کروں گا کہ "سندباد" اور "شہرزاد" جیسی نظموں میں بھی ان کا جواب نہیں۔ صرف تین مصرعے:

درمیانِ بام و در
اپنے گھر میں دربدر
گھومتا ہوں رات بھر

کیا پتا کوئی میری اس رائے سے اتفاق کرے گا یا نہیں کہ اگر عمیق صاحب صرف یہ تین مصرعے لکھ کر انہیں "شب گزشت" کا عنوان دے دیتے اور ایمائیت کی مختلف جہات کو ہمارے ذہنوں اور ہماری حسیات کے سفر اور تجربے کے لئے چھوڑ دیتے تو ان تین مصرعوں کا تاثر اٹھارہ صفحوں کی طویل نظم سے زیادہ بلیغ، دیرپا اور توانا ہوتا ـــــ اتنا ہی بلیغ، دیرپا اور توانا تاثر جتنا شہریار کے ان تین مصرعوں کا ہے:

مائل بہ کرم ہیں راتیں
آنکھ سے کہو اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں

نظم "شب گزشت" میں دو مسلسل غزلیں ہیں۔ اور دونوں ترسیل کی کامیابی کا عمدہ نمونہ ہیں، مطلع میں بیدل کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے:

چناں کشتۂ حیرت کیستم من — کہ چوں آتش از سوختن زیستم من

یہ غزل پوری پڑھئے اور عمیق حنفی کی مذکورہ غزل دیکھئے۔ تاثر کم و بیش وہی ہے یا نہیں؟

مجموعے کی چوتھی طویل نظم "کیوپڈیا" نسبتاً کمزور ہے، شاید اس لئے کہ اس کا مرکزی خیال وہ توانائی و زندگی نہیں رکھتا جو "سندباد" یا "شہرزاد" میں تھی، بلکہ "شب گزشت" میں بھی تھی۔ بہر حال اس نظم کا آخری

شعر اس نظم کی جان ہے:

چلو یہ احساس کم نہیں ہے کہ ہم غلط دور میں پلے ہیں
اجالا پائیں گے آنے والے کہ مثلِ مشعل یہ دل جلے ہیں

"سندباد" اور "شہرزاد" کے بعد عمیق حنفی کا کمال ان کی ساتوں ثقافتی نظموں میں نظر آتا ہے، پوری قوت اور شوکت کے ساتھ۔ نظمیں "بکھرا ہوا" اور "پتھروں کی آتما" پڑھ کر شبہ ہوتا ہے کہ یہ تیشیں کی باز گشتی نظموں کے — جواب میں تو نہیں کہی گئیں! — "بکھرا ہوا" ایک مختصر نظم ہے، لیکن کامیاب — "پتھروں کی آتما" کے آخری چار مصرعے جو بھکشو کی زبان سے ادا کئے گئے ہیں اگر نہ ہوتے تو کیا اچھا ہوتا! نظم ان مصرعوں پر نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی تھی —

لمحہ لمحہ بڑھتی ہے یہ لفظوں کی زنجیر   اسکو توڑ نکلنے پر ہی بنتی ہے تقدیر

لیکن اس کے آگے چار مصرعے بڑھا کر عمیق صاحب نے گویا ایک سبق سا دیدیا ہے۔ کاش آئندہ اشاعت میں وہ یہ چار مصرعے نکال دیں۔

ثقافتی نظموں میں سب سے عمدہ، مکمل، بلیغ اور کامیاب نظم لتا منگیشکر پر ہے۔ اس عظیم مغنیہ کے فن اور اس کی آواز کو متعدد شاعروں نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے لیکن عمیق صاحب کا انداز، محسوس کرنے کا طریقہ، اظہار کا اسلوب سب سے جُدا، انوکھا اور پُراثر ہے۔ حال میں فلم فیئر نے "لتا اسپیشل" شائع کیا ہے۔ اگر مجھے اس رسالے کے اس پروگرام کا علم ہوتا تو میں عمیق حنفی کی "لتا منگیشکر" کا انگریزی میں ترجمہ کرکے فلم فیئر میں شائع کرواتا، گو یہ ترجمہ اصل کا پاسنگ بھی نہ ہوتا! اس نظم کے مقابلے کی عمیق صاحب کی صرف ایک اور نظم ہے جو انہوں نے ایک دو سال پہلے استاد ولایت خاں کا ستار سن کر کہی تھی — یہ نظم اس عظیم فنکار کو ہمارے ایک اچھے شاعر کا عظیم نذرانۂ عقیدت ہے۔ عمیق حنفی کو موسیقی سے جو لگاؤ اور ربط ہے اسکے پیش نظر انہوں نے ایک راگ اور تین راگنیوں پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ جن حضرات نے بھیرویں، ٹوڑی، ناد اور میگھ کی تصویریں دیکھی ہیں، ان راگ راگنیوں کے اوقات سے واقف ہیں یا انہیں خوب سنا ہے بس وہی ان نظموں کا صحیح لطف لے سکتے ہیں۔ سبحان اللہ! بہت حسین نظمیں ہیں۔ چند اور راگ راگنیاں عمیق صاحب کے تخیل اور الفاظ کی مشتاق و منتظر ہیں؛ مثلاً جوگ، درباری، کدارا، بھیرویں، مالکوس۔ [illegible] استاد ولایت خاں نے ایک نیا راگ کلاوتی میں "رکھب" لگا کر "کلاونتی" کے نام سے ایجاد کیا ہے۔ یہ راگ انہوں نے ۱۱ر اپریل ۱۹۶۸ء کو دہلی کے شنکر لال میوزک فیسٹول میں بجایا تھا۔ اگر وہاں عمیق صاحب سے ملاقات ہوتی تو میں ان سے فرمائش کرتا کہ اس پر بھی توجہ کریں۔

عمیق حنفی چونکہ موسیقی سے واقف ہیں اسلئے انہوں نے سنسکرت کے چھندوں اور پنگل کے اوزان میں غزلیں کہی ہیں۔ یہ تجربہ صرف تجربے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن ہماری غزل کا مزاج انھیں ہرگز قبول نہیں کرتا۔ عمیق صاحب کی طرح جو شخص موسیقی سے واقف ہو اُسے ان اوزان کو غزل میں رواج دینے پر زور نہ دینا چاہیئے۔

اپنے والد مرحوم کی رحلت پر انہوں نے جو غزل کہی ہے (صفحہ ۱۶۶) وہ نہایت کامیاب اور بیحد متاثر کن ہے۔ چھ شعروں میں، ایک مکمل مرثیہ کہہ دیا ہے —!

دوسری غزلوں کے چند شعر قابلِ ذکر ہیں:

صبح کا نیا سورج کچھ تو روشنی دے گا   شام سے جلایا ہے آس کا دیا ہم نے

—

یوں ہوا ہے چاک ملبوسِ یقیں سلتا نہیں   پھینک دینا بھی ہے مشکل دوسرا ملتا نہیں
خواب جو دیکھے نہ تھے ان کی سزا تو مل گئی   بارہا دیکھا جنھیں ان کا صلہ ملتا نہیں

—

ہے نورِ خدا بھی یہاں عرفانِ خدا بھی   یہ ذات ہے کہ وادیٔ سینا بھی حرا بھی

—

میرے لبوں سے تیرے لبوں نے کہا تھا کچھ   کیا بات ہو کہ سارے بدن میں بچی ہو دھوم
سننے کی زد میں اب تو ہو دھڑکن بھی دھیمے بول   وہ دیکھو بند ہو گئی اچکی مشین، لوم

مجموعے کے شروع میں جو ۲۵ مختصر نظمیں ہیں ان میں سے چند خصوصی طور پر ذکر کرنے کے قابل ہیں۔ یہ تبصرہ مضمون بنا جا رہا ہے اس لیے صرف چند اشارے کیے جائیں گے۔ نظم "ایک رات" "فراڈ لین" نظم ہے، اچھی ہے لیکن اس تمام نظم کا مضمون عمیق صاحب نے خود اپنے ایک شعر میں بہت بلاغت اور حسن کے ساتھ نظم کر دیا ہے:

میرے لبوں سے تیرے لبوں نے کہا تھا کچھ   کیا بات ہو کہ سارے بدن میں بچی ہو دھوم

نظم "بسنت، ایک لینڈ اسکیپ" واقعی ایک لینڈ اسکیپ ہے اور کیسا لینڈ اسکیپ جس میں رنگ اُڑتے، لپکتے، پلٹتے اور چھپتے آنکھوں سے نظر آتے ہیں:

رنگ بکھروں کی طرح لہراتے ہوئے ہیں

مشاہدے سے متعلق ان کی چند نظمیں غیر معمولی ہیں۔ مثلاً فاضلی کی بے بسی ... سلسلوں میں خوشبو
کھلتا جاتا ہے۔ لیکن ان کی چند غزلیں (مثلاً ان کی "سورج کو جو چاہیں لے کے
مرجھائے گا"۔ والی غزل بھی ہے) چند گیت (مثلاً "پانی برسا دو پانی!") اور مناظرِ
فطرت، بہار، دوپہر، شام اور رات وغیرہ سے متعلق چند نظمیں صرف جدید شاعری
ہی کے لیے نہیں، تمام اردو شاعری کے لئے قابلِ مسرت ہیں۔ اسی طرح عمیق حنفی کی چند
نظمیں: "خونِ شام" "اتر آئی ہے شام" "ایک صبائی نظم" اور "زوال کا وقت"
شام کے موضوع پر یادگار نظمیں ہیں۔ ان میں شام کے مختلف رنگ اور پہلو بڑی
فنکارانہ ندرت، قوت اور چابک دستی سے پیش کیے گئے ہیں۔

"نیم خوابی احساس کی نظم" میں مکمل حیثیت اور احساس ہے۔ لیکن،

ہر شے ہے اک علامت — ہر چیز اک نشانی

خدا گواہ کہ سچ ہے۔ علامتوں اور نشانیوں کی کثرت یقیناً ہو لیکن اگر اس
کثرت میں سے وحدت یا کم از کم دو ایک کو انتخاب نہ کیا جائے تو وہی مضمون ہوگا اور
ہوتا ہے کہ "شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا"

نظم "آئینہ خانے کے نیم روشن کمرے" میں وہی مجہول صوفیانہ، مابعدالطبیعیاتی
اور ماورائی انداز ہے جو آج کل بہت عام ہو گیا ہے۔ اس نظم کے شروع کے
چودہ مصرعوں میں جو بات کہی گئی ہے اسے کوئی استاد صرف دو مصرعوں میں کہا
کر گیا ہے:

یک چراغ است دریں خانہ و از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

چند سال ہوئے ایلیٹ کو سردار جعفری نے شاہ پرست اور مذہبی
آدمی کہہ دیا تھا تو عمیق حنفی بہت برا مانے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ عمیق حنفی کو
یہ ایلیٹ کا اعتقاد نہیں تھا بلکہ وہ ایک کٹر مذہبی آدمی تھا۔ اس کے کلام
میں جابجا انجیلوں کی آیات یا ان کی تلمیحات نہ صرف اس امر کی غماز ہیں کہ وہ ایک
مذہبی آدمی تھا بلکہ اس امر کی بھی کہ اس کا الہام بہت حد تک ان آیات کا
مرہونِ منت تھا۔ ایلیٹ کے تتبع میں ہمارے یہاں بھی اب قرآنِ حکیم کی آیات
سے استفادہ و استعانہ ہونے لگا ہے۔ چنانچہ عمیق حنفی کے علاوہ شمس الرحمٰن
فاروقی، عادل منصوری اور صہبا وغیرہ نے بھی یہی فیشن اپنا لیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ
[illegible] فیشن" کا اعتقاد بھی گستاخی ہے لیکن یقین نہیں آتا کہ یہ جدید شاعر صرف اپنی

فہم و حکمت کو یہاں بجائے کہ قرآنِ حکیم سے استفادہ کی سعی ہیں۔
بہرکیف عمیق حنفی نے جہاں جہاں قرآنِ حکیم کی آیات سے استفادہ کیا ہے
انھیں بر محل ہے اور ان کے کلام میں اعجازِ قرآنی نے بعض بعض مقامات پر ایک
عجیب شان اور ایک عجیب مافوق الفطرت رعب و غلبہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس جگہ ایک بہت ضروری بات کی طرف میں ان کی توجہ دلانا چاہوں گا۔
طویل نظموں کے شروع ہونے سے قبل، پہلا شعلہ نے سورۂ نور کی جو آیت
نقل کی ہے اسے لکھنے میں کاتب نے بے حد بے احتیاطی کی ہے۔ عمیق حنفی صاحب
کو چاہئیے تھا کہ وہ نہایت جوم و احتیاط سے اس کی تصحیح کر دیتے۔ مثلاً "یضیء"
کی "ی" پر کاتب نے زبر کی جگہ پیش لگا دیا ہے۔ پہلی سطر میں "سماوات" کے
بعد نشانِ آیت نہیں ہونا چاہئیے۔ اس لفظ کے بعد جو "ظلمات" کا لفظ آیا ہے
اس پر اعراب تنوین کے علاوہ مخفی "م" لگا ہونا چاہئیے۔ پھر "اذا" پہ مدّ ہونی
چاہئیے یعنی "اِذآ"۔ "یدہ" میں "د" پر معروف کی آواز کے لئے الٹا
پیش ہونا چاہئیے۔ "یدہ" کے بعد کاتب نے "لم" کا لفظ نہیں لکھا۔
عمیق صاحب نے اس آیت مبارکہ کا منظوم لفظی ترجمہ درست کیا ہے۔

اردو کے کسی نئے شاعر کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے بیشتر
خیالات مغربی (خصوصاً انگریزی) شاعری سے مستفاد ہیں تو وہ بہت برا مانتا ہے۔
میری رائے میں یہ برا ماننے کی بات نہیں۔ ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتے رہے ہیں
اور دوسروں کے خیالات سے استفادہ اور پھر ان کا ارتقا ہوتا رہا ہے۔
اگر اس حاصل اخذ و استفادہ کو ہمارا شاعر اپنے ماحول پر منطبق کر کے اپنے
نتیجے مرتب کرتا ہے، اپنے معاشرے میں بھی وہی بنیادی خصوصیات و صفات پاتا
ہے جو مغرب کے معاشرے میں وہاں کے شاعر دیکھ پائے تھے اور اپنے مخصوص سیاسی،
سماجی یا ذاتی نقطۂ نظر سے ان کا مطالعہ کرتا ہے تو یہ بات نہ کوئی بہت زیادہ
غیر مستحسن ہے نہ اس پر شرمندہ اور خفا ہونے کی ضرورت ہے۔

عمیق حنفی ہمارے ایک جدید شاعر ہیں۔ لیکن ان کے طرزِ فکر، طریقِ اظہار،
اندازِ ترسیل، شیوۂ گفتار سب پر مغربی شاعروں کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ
ان کی شاعری میں سب سے زیادہ متاثر کن لیکن اتنی ہی مایوس کن ہے وہ چیز کہ
ان میں بے پناہ شعری قوت ہے مگر وہ اسے مناسب ترتیب اور صحیح سمت نہیں
دیتے۔ "شب گشت" کی نظمیں نام نہاد لکھنؤ اسکول کی غزلوں کی طرح ہیں یعنی

(باقی صفحہ ۹ پر)

تلخ ، قند ، شیریں

میں کس طلسم ہوش ربا کے اثر میں ہوں ۔ غلام مرتضیٰ راہی

قیصر سرمست کا سرورق بامعنی اور دیدہ زیب ہے۔ پسند آیا۔ فن معمولا لکھنے کے تمام امکانات پیدا کر دیئے ہیں زبیر شفائی کے کئی اشعار عمدہ ہیں۔

گوشہ مصطفےٰ زیدی اس شمارہ کا اہم حصہ ہے۔ ڈاکٹر سید الزماں اور ڈاکٹر محمد عقیل صاحبان کے مضامین، مرحوم کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ رام لعل کا مضمون سوالیہ نشان سے شروع ہو کر سوالیہ نشان پر ہی ختم ہو جاتا ہے ــــ یہی نشان اب مصطفےٰ زیدی کی موت کے گرد حصار بن کر قائم ہو گیا ہے۔ مجھے مرحوم کے کلام میں ایک طرح کی تجرابیت سی محسوس ہوئی جو ان کے جذباتی ہونے کی غماز ہے ــــ اور جو انھیں بار بار زندگی کو داؤ پر لگانے کے لئے اکساتی رہی ــــ فیض اور جوش نے تعزیتی نوٹ ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ جوش نے تو کارن بگ کے رسنے والا انداز اختیار کیا ہے دیکھو اسی انداز کی تحریر انھوں نے مجاز (فتح پوری) کے سانحۂ ارتحال پر بھی لکھی تھی!! اس سے نہ تو زیدی کا بھلا ہوا اور نہ قاری کا جو مرحوم کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کا خواہاں ہے ــــ

احمد ندیم قاسمی نے مرحوم کو ایک خاص عینک سے دیکھا ہے۔ اور فن کی آڑ لے کر جدید شاعری پر سنگ ملامت کی بوچھار کی ہے حالانکہ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام بڑی حد تک قاسمی صاحب کے نقطۂ نظر کی نفی کرتا ہے۔ مرحوم بالآخر اپنی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس لئے محض ترقی پسندیت کا لیبل ان پر چسپاں نہیں ہوتا۔

ملامت ایسے حجرے میں تھا جہاں مجھ کو
ہر ایک ٹھوس حقیقت ملی گماں کی طرح
ہر ایک شخص طلب گار تھا کہ شام و سحر
اسی کا نام لیا جائے اور اذاں کی طرح
فکار خود حق [illegible] سے فن کی سرشت تھی
[illegible] کی [illegible] تھی

لاکھوں شہادتوں نے مجھے واسطے دیئے
میں شب گزیدہ پھر بھی تلاشِ سحر میں ہوں
جی چاہتا ہے مثلِ ضیا تجھ سے مل سکوں
مجبور ہوں کہ محبسِ دیوار و در میں ہوں
خوابوں کے رہرو! مجھے پہچاننے کے بعد
آواز دو کہ اصل میں ہوں یا خبر میں ہوں
کیسا حصار ہے جو مجھے چھوڑتا نہیں
میں کس طلسم ہوش ربا کے اثر میں ہوں

● ساجدہ زیدی

گوشہ مصطفےٰ زیدی، ان کی شاعری اور شخصیت کا اچھا تعارف ہے۔ مصطفےٰ زیدی کی بعض تخلیقات پسند آئیں۔ خصوصاً آخری غزلیں "بے نور ہوں کہ شمع رہگذر میں ہوں" اور "جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی"۔ زیدی کی نظم "چیرنگ کراس" تو اس شمارہ کا حاصل ہے۔ ویرا زیدی سے انٹرویو بے حد سپاٹ اور un imaginative ہے۔ اس کو بہت زیادہ جاندار بنانے کی گنجائش تھی.... آپ کی کوشش بہرحال قابلِ تعریف ہے...

اس کے علاوہ صہبا وحید کی دو غزلیں "مجھ سے کوئی چھڑا تماشا لے گئی ہے" اور "بیم و رجا میں قید ہر اک ماہ و سال ہے" اور [illegible] زیدی کی نظم پسند آئیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کتاب کا معیار ترقی پذیر ہے۔

● قیصر عالم

کتاب ان دنوں واقعی اچھا نکل رہا ہے۔ مثال کے طور پر مصطفےٰ زیدی پر تو بہت کچھ چھپ رہا ہے لیکن گوشہ مصطفےٰ زیدی سب سے زیادہ تسکین بخش اور معلومات سے بھرپور ہے۔ یہی بات گوشۂ ادیب کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ میں جون میں ایک ماہ کے لئے حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ یقین جانئے ادیب پر کتاب میں چھپے مضامین میرے لئے نئے تھے

...مسدود کیے تھے۔
روشنی کا تجزیہ کا اہتمام دعوت فکر دیتا ہے۔
● ... دیار دکن کا رؤف خیر بھی ہے ــــ رؤف خیر
بڑا تعجب ہوا جب دیکھا کہ اپنا خط روشن خلش کے نام

سے چھپا ہے۔ یہ شکایت ہوئی کہ میرا چھپا ... شریف ...
... آپ تو تعجب کا کیا ... صاحب تک یہ اطلاع پہنچا دیجئے۔
اسی دیار دکن کا رؤف خیر بھی ہے
میرے خط کا سارا کریڈٹ روشن خلش کو جا رہا ہے۔ یہ تو ظلم ہے۔

قاری کی گروپ بندی کا ذمہ دار کون ؟ ــ عبدالرحیم نشتر

اس دور میں خالص ادبی رسائل کا چل نکلنا بہت دشوار ہے۔ اس بار کتاب کے اداریہ میں بہت اہم مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ ادبی رسالوں کی زبوں حالی کا ذمہ دار کون؟ ظاہر ہے کوئی بھی رسالہ اپنے پڑھنے والوں کی بدولت چلتا ہے کسی بھی رسالے کے مارکیٹ بنا لینے کا انحصار قاری کی پسندیدہ چیزوں کی اشاعت پر ہے آج کل فلمی جرائد و رسائل کی مقبولیت اور فوراً آفسیٹ پر چھپنے والے ڈائجسٹوں کی قبول عام۔ آج کے اردو قاری کا رجحان کس طرف ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کم از کم اسی فیصد اردو دانوں کو اردو کے ادبی رسالوں سے نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ کوئی ہمدردی۔ ادبی رسالوں کے بیس فیصد قارئین میں کم از کم نصف ایسے لوگ ہیں جن کی تخلیقات ادبی رسائل میں چھپتی ہیں۔ ادیب صرف اپنی دلچسپی اور ہمدردی صرف متعلقہ رسالے تک ہی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر ادبی رسالہ کا اپنا اپنا ایک محدود سا طبقہ ہو گیا ہے قارئین کی اس گروپ بندی کے لئے ایڈیٹر حضرات کتنا اہم رول انجام دیتے ہیں یہ بھی سوچنے کی بات ہے! جہاں تک میری ... کا تعلق ہے میں ایسے علاقوں کے نام گنا سکتا ہوں جہاں کتاب، شب خون، تحریک، شاعر، صبا، شاخسار، پیکر، صبح دس، آہنگ اور سطور جیسے صرف کسی ایک یا دو رسالوں کو صحیفہ کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور بقیہ رسالے (گو کہ ان کے معیار و مقام سے انکار نہیں کیا جا سکتا) پوچھے تک نہیں جاتے یہ علاقہ کی پسندی جہاں تک میں سمجھتا ہوں مدیر حضرات کی عطا کردہ ہے۔ کوئی رسالہ اجتہاد پسندی میں بے تکی چیزوں کو شائع کرنا فخر سمجھتا ہے کوئی امریکی ادبی خیالات کے پس منظر میں لکھی گئی چیزوں کی اشاعت قبول کرتا ہے کسی کو ... جدیدیت کا بخار چڑھتا ہے کوئی ترقی پسندوں کی توسیع کرنا چاہتا ... جدیدیت اور جنسیات و لغویات کی ... [illegible]
[illegible]

پروڈکٹ کرتا ہے جس کی ایڈیٹر کی ضرورت ہے تو اس طرح لکھنے والوں کے حلقے قائم ہو جاتے ہیں اور ہر حلقہ اپنے زیر اثر احباب سے کبھی درخواست کرتا ہے اور کبھی زور ڈالتا ہے کہ صرف فلاں رسالہ کے خیالات پر تخلیقات بھیجی جائیں پھر یہ گروپ ان تخلیقات کی اشاعت پر موافقت میں بڑے چھوٹے خطوط مختلف ناموں اور مختلف علاقوں سے متعلقہ رسالہ کو بھجواتا ہے جس کی اشاعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں نئی تحریک کا پڑھنے والوں میں خاصا مقبول ہے چنانچہ نئے نئے رسائل کا اجرا ہوتا ہے اور دو تین اشاعتوں میں سارا سرمایہ اور سارا زور قلم خرچ کر کے گوشہ گمنامی میں بیٹھ جاتا ہے نئے رسالوں کے اجراء سے ایک خوش فہمی ہوتی ہے کہ اردو کا مستقبل ملک میں نہایت روشن ہے مگر یہ نری خوش فہمی ہے نہ اردو رسالے بہت زیادہ نکلتے ہیں اور نہ ہی اردو قاری کا ... جو اردو رسالے نکلتے ہیں بھی تو ان کے رسالے ادبی کم اور فلمی و سیاسی زیادہ ہیں اور ایسے رسالوں نے اردو قاری کو چٹخارہ پسند بنا دیا ہے وہ سادہ لیکن مفید ادبی غذا دماغ میں نہیں اتارنا چاہتا بلکہ اسے نیم عریاں اور عریاں فلمی حسینوں کی تصاویر ... چاہیئے نیز سیکس اور نفسیات کے لیبل تلے فحش تحریریں یہ سب ادبی رسالوں میں مفقود ہے اس لئے ایسے رسائل کا دائرہ نہایت تنگ ہے۔

● سید قسیم الحسن گیاوی

بات یہ ہے کہ اقتصادی بنیاد پر اردو میں رسالہ نکالنے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ رسالہ نکالا جاتا ہے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے۔ ایک دیوانہ یا چند دیوانے مل کر رسالہ نکالتے ہیں اور رسالہ میں کیا کیا چھپنا چاہیئے؟ اس بارے میں وہ صرف اپنی رائے کو رہنما سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ساری اردو دنیا ان کی پسند کو اپنی پسند بنالے ... [illegible]
[illegible]

...سمجھے جا سکتے ہیں۔ رسالے میں شامل کسی شاعر یا ادیب پر کبھی کبھی کسی کی
خصوصیت ہو تو سہو مگر جہاں کہ تان وہاں جا کر ٹوٹتی ہے کہ مجموعی طور پر آپ کا رسالہ
لاجواب ہے۔ یعنی لکھنے والے گدھے ہو سکتے ہیں مگر ایڈیٹر کسی طور بھی گدھا
نہیں ہو سکتا۔ میں صاف صاف باتیں کرنے کا عادی ہوں۔ قارئین کے
خطوط کبھی بھی ایڈیٹر کی بیجا مدح سرائی نہیں کرتے۔ اس لئے کہ اکثر خطوط نویس،
اس لالچ میں خط لکھتے ہیں ان کا خط رسالہ میں شایع ہو جائے۔ اور اس رسالے
رسالہ والوں نے اس کے کافی مواقع فراہم کر رکھے ہیں اس سے جہاں خطوط نویسوں
کے ذوق شہرت کی تکمیل ہوتی ہے وہاں ایڈیٹروں کی بھی تمنائے ناموری پوری
ہوتی رہتی ہے۔ مشاعروں کی داد تحسین جس طرح شاعر کو بر خود غلط بنا دیتی ہے
اسی طرح قارئین کے خطوط ایڈیٹروں کے دماغ کو عرش معلیٰ کی سیر کراتے رہتے ہیں۔

میرا تو خیال ہے کہ عام قاری ہی رسالہ کی مالی حالت مضبوط کر سکتا
ہے۔ اس بنیاد پر سوچئے اور یہ بھی مد نظر رکھئے کہ عام قاری کو خوش ذوق بنانا
ہے مگر آہستہ آہستہ، پہلے اس کی دلچسپی، اس کی تفریح کا سامان مہیا کیجئے کہ
وہ ادب کی طرف متوجہ ہو، پھر آہستہ آہستہ اسے سنجیدہ ادب کی طرف لائیے،
اس پر بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ وہ سنجیدہ ادب کی طرف آ ہی جائے گا۔ اس لئے
رسالہ کو "مکسچر" بنائیے۔ زیادہ تر عوام کے ذوق کا لحاظ کیجئے۔ اس سے معیار
ادب پر آنچ آ سکتی ہے مگر اردو زبان کو فائدہ پہنچے گا۔

● سید شکیل دسنوی

اپنے ادبی جریدوں کی زبوں حالی کی وجوہات کا بہت ہی
Realistic جائزہ لیا ہے۔ ادبی رسالوں کے مدیر اب تک اس رُخ
کو Deal کرنے سے گریز کرتے آئے ہیں۔ ادبی صحیفوں کی بقا کے لئے اس
اہم مسئلے کا حل پوری دیانتداری اور غیر جانبداری سے فوری طور پر ڈھونڈنے
کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں آپکی پہلی دو باتوں سے میں پوری طرح
متفق ہوں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ ادبی رسائل کے
مدیروں نے انھیں اپنی شہرت اور شوق کی تکمیل کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور
قاری کی پسند یا ناپسند کو وہ زیادہ اہمیت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے
یہ میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ دوسرا گروہ ان مدیروں کا ہے
، جو اس سلسلے میں تو پر خلوص ہیں مگر وہ [illegible]
نظر انداز کرتے ہیں اور اس [illegible] کرنے
پڑتا نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبی رسائل میں [illegible]
کی پسند کو Discuss کر کے پیش کیا جائے تاکہ قاری بھی محسوس کر سکے
مدیر اسکی مرضی کے خلاف اپنی پسند Dictate کرنے کی کوشش کر رہا ہے

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادبی فیشن اور نام نہاد [illegible]
گریز کیا جائے۔ چلتے ہوئے فنکاروں کے نام پر یا جدید ادبی رجحانات کی آڑ
میں اکثر غیر معیاری اور نامناسب تخلیقات اشاعت پذیر ہو جاتی ہیں [illegible]
"کتاب" کے زیر نظر شمارے سے ہی لے لیجئے۔ محمد علوی کی سات عدد تخلیقات
شامل اشاعت ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے بیشتر تخلیقات پر اگر
محمد علوی کی بجائے کسی غیر مانوس فنکار کا نام ہوتا تو آپ انھیں مسترد کرنے
میں ذرا بھی تامل محسوس نہیں کرتے۔

بہر حال یہ کہنا غلط ہوگا کہ اردو کے قارئین میں اعلیٰ رسالے
خریدنے کی صلاحیت یا ذوق کا فقدان ہے بلکہ آپ ہی کے الفاظ میں ادبی
جریدوں نے ابتک ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بولی اور
سمجھی جانے والی اس زبان کے قارئین تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

● مانک ٹالہ

اردو کے ادبی رسائل کی اشاعت تقسیم سے پہلے بھی بہت محدود تھی۔
لیکن ان دنوں اخراجات بہت کم تھے اور اشتہارات کافی زیادہ دستیاب
ہو جاتے تھے۔ اب حالات بالکل برعکس ہیں۔

لیکن کیا سبب ہے کہ اردو کے ادبی رسائل لوگ خریدنا پسند
گوارہ نہیں فرماتے لیکن فلمی اور جاسوسی رسائل اور کتابوں کی خرید پر توجہ
دیتے ہیں۔ اس میں زیادہ قصور ادبی رسائل کا ہے۔ ادبی رسائل کے مدیر
ایک اونچی مسند پر بیٹھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ پڑھنے والے خود ان کے حضور
میں دست بستہ حاضر ہوں گے اور رسالے کی اشاعت خود بخود بڑھنے لگے گی۔
سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ادبی رسائل صرف باشعور طبقہ کی ذہنی غذا کا سامان
مہیا کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ باشعور طبقہ ہمیشہ
کم ہوتا ہے اور اب تو اردو میں باشعور طبقہ بالکل ہی سکڑ گیا ہے۔ اگر ادبی
رسائل یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام صرف باشعور طبقہ کے ذوق کے لئے مسالہ
مہیا کرنا ہے تو انھیں اپنی کم اشاعت کا رونا نہیں رونا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ
چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کا پرچہ خریدیں اور پڑھیں تو

[illegible] ہوگئے ہیں۔ ان میں ادیبوں کی تصویریں آپ شائع کرتے ہیں یہ بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔ لیکن آپ سے ایک درخواست ہے۔ اس میں صرف مشہور ادیبوں کی تصویریں ہی شائع کریں۔ اسے زیادہ cheap نہ کیجئے۔

بہت دنوں سے کتاب میں سہیل عظیم آبادی اور امرت رائے کی کہانیاں پڑھنے کو نہیں ملیں۔ کیا یہ لوگ کتاب کے قارئین سے ناراض ہیں۔ آپ جلد ہی سہیل عظیم آبادی اور امرت رائے کی کہانیاں شائع کریں۔ یہ ہم لوگوں کی درخواست ہے۔

ذوقِ معت نحوی

افضل حسین

میرے ایک ساتھی کے پاس "کتاب" تھی۔ ان سے لی ایک سرسری نظر ڈالی تو بس

ع   وہاں کا جذب وہاں کی کشش معاذ اللہ

نگاہ کی ہے جہاں ایک سرسری میں نے

مسکراتا ہوا۔ التجائیں کیں۔ خوشامدیں کیں مگر وائے ناکامی

"ابھی لا ہی رہا ہوں" کہہ کر میرے دوست نے مجھے "کتاب" دینے سے ٹال دیا۔ مگر اں جاتے جاتے وہ آپ کا پتہ دیجئے اور فرما گئے۔ "افضل تم اس پتہ پر خط لکھ دوگے تو نمونہ کی کاپی فوراً آجائیگی۔" اب آپ ہی بتائیے میں کیا کرتا۔ خلش مٹانے کے لئے اگر آپ مہربانی کریں۔

لفظ محبت سے پیر کیوں

قیصر سرمست

جنوری کے شمارے کی ابتدا میں سرورق سے کرتا ہوں، آپ نے "صادق" کے نام کے ساتھ قیصر سرمست کا نام بھی دیا ہے، شاید آپ قارئین پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ "آرٹ" کے علاوہ کتاب کے سرورق کا پورا ڈیزائن میرا بنایا ہوا ہے۔ اور جو کچھ کے اندر کا آرٹ (اس ماہ کا) صادق کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ ماہ سے ایسا مت کیجئے۔ اور صرف اسی آرٹسٹ کا نام دیجئے جس کا آرٹ [illegible] زینت بنا ہے۔

[illegible] پر جناب مختار احمد صاحب اور جناب مغنی تبسم کے مضامین [illegible] ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ حضرت مختار احمد کو "محبت" سے پیر کیوں ہے اور یہ کیا ضروری ہے کہ محبت ہی کا نام ہر علمی ادبی ناچاتی پاکر لی جاتی ہیں۔ خواہ وہ کسی طرح بھی ہے کیوں نہ ہو [illegible] کے نام کے ساتھ "مس پیٹی" کی شیرازن کا نام بھی لیا جاتا ہے حالانکہ وہ جگر بڑے نفیس انسان تھے۔ میں ان سے ذاتی طور پر کافی اچھی طرح واقف ہوں۔ ظاہر کردار کے لحاظ سے ان میں کوئی جھول نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ میرے والد حضرت تمکین سرمست کے قریبی دوست تھے۔ والد صاحب نے بھی کبھی ان کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ اور تو اور ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور شبلی نعمانی کے نام بھی "عطیہ فیضی" کے ساتھ لئے جاتے رہے ہیں۔ عطیہ فیضی جنجرہ ریاست کی ایک ترقی یافتہ اور علم دوست خاتون تھیں۔ وہ شبلی کی بڑی قدر دان اور ان سے مخلصانہ تعلقات رکھتی تھیں چنانچہ دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ قائم تھا۔ ایک مرتبہ عطیہ فیضی کی دعوت پر شبلی جنجرہ گئے تھے اور عطیہ کی شخصیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ پہلا ایک غزل نہ صرف کہی بلکہ جنجرہ سے واپس ہوتے وقت خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر عطیہ کو دی۔ اسی غزل کے دو شعر اپنے ایک خط میں جو انہوں نے مولانا آزاد کو لکھا تھا نقل کئے ہیں۔ شعر ہیں

ہوائے دیر پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی

کہاں یہ لطف، یہ سبزہ، یہ منظر، یہ بہارستاں۔
عطیہ تم کو یادِ لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

محمد عظیم صاحب نے شیرازن سے ایک انٹرویو نگار (شمارہ ۴، مارچ [illegible]) کے لئے قلمبند کیا تھا۔ اسمیں شیرازن ان سے کہتی ہے "مشاعرہ کے بعد یہاں شعر و سخن کی مجلسیں جمتی تو تھیں اور کبھی کبھی ان میں باہر سے آئے ہوئے شعرا بھی تشریف لاتے تھے لیکن فانی کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتی۔" محمد عظیم صاحب کے فانی سے ایک سوال کرنے پر کہتی ہے "مشاعرہ کے بعد یہاں شعر و سخن کی مجلسیں جمتی تو تھیں اور کبھی کبھی ان میں باہر سے آئے ہوئے شعرا بھی تشریف لاتے تھے لیکن میں فانی کے علاوہ کسی کو نہیں جانتی" اور فانی سے متعلق ایک سوال پر کہتی ہے۔ "ہاں ایک سوگواری تو جھلکتی تھی" اور آگے چل کر کہتی ہے "آگرہ کی ایک طوائف نور جہاں سے وہ محبت کرتے تھے۔"

[illegible] کا احساس دلا کر کہ اردو زبان ہی ان کی تہذیب، اپنی [illegible] کچھ اپنی روایت اور اپنے شاندار ماضی کی [illegible] ہے اور ہر اردو کے طالب علم کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی بقا و ترقی کے لئے صرف اتنی قربانی دے کہ اپنے مذاق و مزاج اور پسند کے مطابق ادبی رسائل خرید کر پڑھا کرے۔ اگر اتنا بھی ہو سکے تو بھارت میں اردو رسائل کی بہت کچھ توسیع ممکن ہو سکتی ہے۔

کم پڑھے لکھے لوگوں میں بھی ذوق پیدا کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ طبقہ ایسا ہے جو نہ اخبار پڑھتا ہے نہ رسائل ——— ان لوگوں تک اپنی آواز پہونچانے کا واحد ذریعہ ہیں مذہبی پیشوا اور ایماندار قومی و سیاسی لیڈر۔ اگر یہ لوگ اپنی تقاریر میں اس موضوع پر بھی ہلکی سی روشنی ڈال دیا کریں کہ اپنی زبان کو زندہ رکھنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ادبی رسائل خریدنا اور پڑھنا اپنا فرض اولیں سمجھے کیونکہ زبان کو بنیادی استحکام بخشنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے رسائل، کتابیں اور اخبار خرید کر پڑھے جائیں۔ اس سے اردو پریس کی حالت بہتر ہوگی، کتابت و طباعت کے نئے وسیلے سامنے آئیں گے، اردو فنکاروں کی حالت میں سدھار پیدا ہوگا۔ آنے والی نسلوں کو اپنے ادب اور زبان سے لگاؤ پیدا ہوگا اور وہ اپنے تہذیبی ورثہ سے بخوبی واقف ہو سکیں گے۔

اردو کے علاوہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے قارئین اپنے ادب کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں انکا مطالعہ کرتے ہیں، اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں اور حقیقتاً زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ میرے ایک صحافی دوست چودہ برس تک مسلسل اردو اخبارات میں ایڈیٹوریل اور مضامین لکھتے رہے۔ چند ماہ کے لئے اردو صحافت سے علیحدہ ہوئے تو ہندی میں ایک مضمون لکھا۔ اس سے انھیں نہ صرف ایک مناسب رقم بطور معاوضہ ملی بلکہ تائید و تردید میں بے شمار خطوط بھی موصول ہوئے۔ جاگتے ہوئے ذہن ہمیشہ اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایک ملاقات پر میرے دوست نے بڑی ہی بے دلی کے ساتھ کہا "میں ۱۴ برس تک اردو صحافت میں جھک مارتا رہا۔ ابھی تک میرا مستقبل فضا میں معلق ہے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کے قارئین نہ صرف اپنے ادب کا بغور مطالعہ کرتے ہیں بلکہ اپنی رائے دینا بھی فرض سمجھتے ہیں۔ اردو ادب یقیناً بہت ترقی یافتہ ہے لیکن اس کے قارئین انتہائی پس ماندہ۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ اردو رسائل کے مدیران بڑی سرد مہری [illegible] بے توجہی برتتے ہیں اور اپنے قارئین کی آراء کا گرمجوشی سے استقبال نہیں کرتے۔ نئے لکھنے والوں کو تو چھوڑیئے بہت سے نامور فنکاروں سے بھی ایسی شکایتیں عموماً سنی جاتی ہیں جبکہ اردو کے بالکل ہی نئے لکھنے والے بھی جب ہندی میں کچھ لکھتے ہیں تو نہ صرف ان کا استقبال کیا جاتا ہے بلکہ مناسب جواب اور معاوضہ بھی ملتا ہے۔ قارئین اور مدیران کا براہ راست قریبی رشتہ ہے جسے اردو ادب میں کبھی خصوصی اہمیت نہیں دی گئی۔ دوسری زبانوں والے اس بے توجہی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ اردو کے فنکاروں پر ایک نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں انکی دلجوئی کرتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور ہندی لکھنے کی جانب ان کی توجہ مبذول کرا لیتے ہیں۔ میں ایسی کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ اس سے اردو ادب کو مستقبل میں جو نقصان پہونچے گا اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا انتہائی ضروری ہے۔

زیر نظر شمارہ میں کرامت علی کرامت کی نظم "سرگزشت صفر" آزاد نظموں میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہت دنوں بعد کوئی آزاد نظم بامعنی اور با مقصد پڑھنے کو ملی ہے۔ ظہیر صدیقی اور مظہر امام کی نظمیں بھی خوب ہیں۔ جاں نثار اختر، زیب غوری، محمود سعیدی، ذکا صدیقی، وقار خلیل اور مہدی پرتاپگڈھی کی غزلیں معیاری اور لائق تحسین ہیں۔ محمد علوی کی فورتھ کلاس کی تخلیقات کو بھی اس اہتمام کے ساتھ شائع کئے جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ خصوصاً مرغیوں والی غزل قطعی لچر ہے۔

سلسلہ صفحہ ۷۲

کسی جگہ وہ آڈن کی مانند سوشیل رپورٹنگ کرنے لگتے ہیں، کہیں اسے ترک کرکے انفرادی ارتقا اور انکشاف ذات کو اپنی شاعری کا محور بناتے ہیں۔ کسی جگہ ڈیلن ٹامس کے تتبع میں فرائڈ اور عہد نامۂ عتیق (ان کے یہاں قرآن حکیم) میں مجھ د کر لیتے ہیں تو کہیں ایلیٹ [[illegible]] کے آستانے پر سربسجود نظر آتے ہیں۔

منزل ہو کہاں تیری اے لالۂ صحرائی!!

بہرحال اس سے انکار نہیں کہ یہ منزل بمنزل کی جستجو ان کے یہاں محض شوقِ فضول ہو کر نہیں رہ گئی۔ وہ ہر منزل سے کچھ نہ کچھ سوغات لے کر آئے ہیں۔

سقوطِ ثروت و سقوطِ اقدار کا ہم نے دانستہ ذکر نہیں کیا ہے!! جو قوتِ مشاہدہ، قوتِ تجربہ اور قوتِ اظہار حقی کی بعض نظموں اور غزلوں کے ٹکڑوں میں بھی نظر آتی ہے اس کے پیشِ نظر خود انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اوپر کڑا احتساب کریں تاکہ وہ ان نعمتوں کو بے مصرف اصناف فروشتہ [?] حقیقت یا عینیت میں ضائع نہ کر دیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بھی ان کا کڑا احتساب کریں کیونکہ یہ صلاحیتیں اور دوسرے جدید شاعروں میں نہیں ہیں اس لیے وہ مغتنم ہیں اسی لیے ہمیں عزیز ہیں اور پھر اسی لیے ہم ان کی ان صلاحیتوں کو ضائع یا بیکار جانے دینا نہیں چاہتے۔ — ب

ناول، افسانے، طنز و مزاح

نظمیں، غزلیں

تبصرے، خطوط